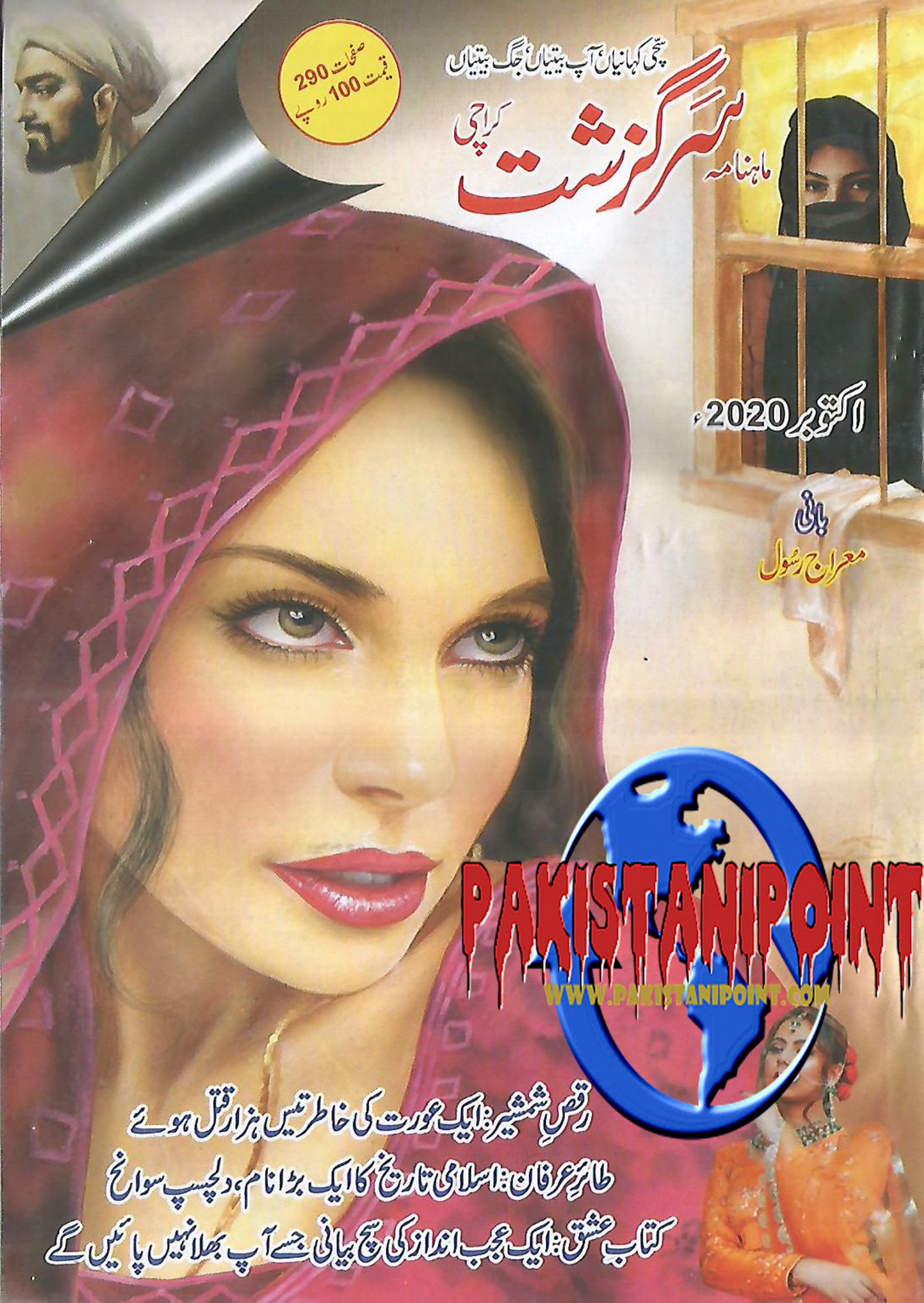


سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
صفحات 290
قیمت 100 روپے
اکتوبر 2020ء
بانی
معراج رسول
رقصِ شمشیر: ایک عورت کی خاطر تمیں ہزار قتل ہوئے
طائرِ عرفان: اسلامی تاریخ کا ایک بڑا نام، دلچسپ سوانح
کتابِ عشق: ایک عجب انداز کی سچ بیانی جسے آپ بھلا نہیں پائیں گے

[illegible] — [illegible]
روسیاہ
عاطر شاہین
ایک شوریدہ سر نوجوان کی جنوں خیزی

200 — پہلی سچ بیانی
کتاب عشق
کنیز زہرا
عشق کی انتہا کا بیان

223 — دوسری سچ بیانی
لمحہ آگہی
عالی مان آفاقی
اور جب حقیقت کا ادراک ہوا

230 — تیسری سچ بیانی
بھرم
محمد وسیم نیازی
وہ محلے کا سب سے بڑا غنڈا تھا

237 — چوتھی سچ بیانی
بازی
مونا شہزاد
دیار غیر سے دکھ بھری سچ بیانی

245 — پانچویں سچ بیانی
ہم نشیں ٹھہرا
تنزیلہ احمد
ایک ایسی سچ بیانی جس کی توجیح ممکن نہیں

249 — چھٹی سچ بیانی
بولنا منع ہے
ظفر حامد
وہ لوگوں کو روک کر وقت برباد کرتا تھا

255 — ساتویں سچ بیانی
دوڑ
منیر الحسن
ایک لڑکی کے دو دیوانے تھے

261 — آٹھویں سچ بیانی
جے ڈی
سید محمود الحسن
وہ ایک الگ انداز کا شخص تھا

265 — نویں سچ بیانی
جائیں تو جائیں
علی عمران ممتاز
زبان کے زہر سے بھی قتل ہوتے ہیں

267 — دسویں سچ بیانی
سیاست
امجد اقبال
دور حاضر کی گندی سیاست کی جھلک

** — سوغات
پارچے
قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

جلد 30 ❖ شمارہ 7 ❖ اکتوبر 2020ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◈◈◈

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◈◈◈

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1500 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63' فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس' ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

گزشتہ اتوار کو ہم کئی دوست ایک بڑے مال کے ریسٹورنٹ میں جمع ہوئے ادبی نشست تھی۔ ریسٹورنٹ کے جس حصے میں نشست کا اہتمام تھا اس کے برابر میں ایک خوبصورت سا بک اسٹال تھا۔ میری نظریں بار بار ادھر اٹھتیں اور پیاس بڑھا کر لوٹ آتیں۔ نشست کے اختتام پر میں نے بک اسٹال والے سے پوچھا ''ہر روز کی سیل کیا ہوگی؟'' اس نے جواب دیا آٹھ سے دس ہزار۔ خوش ہونا ضروری تھا لیکن مجھے ویسی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ بک اسٹال پر 70 فیصد انگلش کتابیں تھیں دس فیصد وہ اسلامی کتب جو اسلامی نہیں مگر اسلامی کہلاتی ہیں یعنی مختلف بادشاہان کے قصے نہایت خوبصورت پرنٹنگ میں باقی دس فیصد اوراد و وظائف۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہاں بس یہی بکتی ہیں۔ بچے ان غیر ملکی کتابوں کو پسند کرتے ہیں عورتیں ان اوراد کو یعنی کہ کتابیں بھی اب ضرورت و سجاوٹ میں آرہی ہیں۔ عام لوگ تو دور ہی ہوتے جارہے ہیں پوچھو تو کہتے ہیں کیا کریں قیمت ہی اتنی زیادہ ہوچکی ہے۔ پہلے کتنی سستی تھیں۔ ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جب ہمارا جاسوسی ڈائجسٹ ڈیڑھ روپے کا تھا کلرک کی تنخواہ چھ سے آٹھ سو روپے تھی۔ اس وقت ... میرے سامنے 1933ء کا ماہنامہ عالمگیر کا عید قرباں نمبر ہے۔ صفحات 180 اور قیمت ایک روپیا چار آنے۔ اب ذرا غور کریں 1933ء کے ایک روپے چار آنے آج کے حساب سے کتنے روپے بنیں گے؟ غور کریں تو کتابوں کی خریداری میں کمی کا سبب قیمت نہیں ہے اس کی واحد وجہ اپنی زبان سے بے توجہی ہے۔ ذہنی نشو نما، بصارتی بالیدگی کے لیے ہم مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ بچوں میں مطالعے کو فروغ دینے کے لیے تصویری کہانیوں کی کتابیں خرید کر نہیں دیتے ہیں۔ ہاتھ میں موبائل دے کر عریاں کارٹون دکھا کر شکوہ کرتے ہیں کہ معاشرہ بگڑ رہا ہے۔ معاشرے کو سدھارنا ہے تو کتابوں سے رشتہ استوار کرنا پڑے گا۔ کتابیں خریدنے کا چلن عام کرنا پڑے گا۔

مدیر

معمار رثائی ادب

دہلی اجڑ کر پھر بس گئی تھی۔ اب حکومت لال قلعہ تک محدود نہ تھی، عنان حکومت انگلیشیہ کے ہاتھ میں تھی۔ دہلی میں اب بھی مسلمانوں کا بول بالا تھا۔ اگر حکمت میں حکیم اجمل کا توتی بول رہا تھا تو ڈاکٹری میں بھی مسلمانوں کی تعداد کم نہ تھی۔ انہی ڈاکٹروں میں ڈاکٹر ناصر عباس بھی تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ وہ اگر مریض کی نبض پکڑ لیتے تو مریض کی آدھی بیماری ختم ہو جاتی تھی۔ انہی ناصر عباس کے گھر 21 فروری 1917 کو ایک بچے نے جنم لیا۔ بچے کی والدہ کا نام محمودہ بیگم تھا۔ گھرانا تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل تھا اس لیے وقت کے ساتھ بڑھتے بچے کو بھی تعلیمی میدان میں آگے لانے کی کوشش ہونے لگی۔ رسم بسم اللہ کے فوراً بعد اسے ابجد سے روشناسی کے لیے ایک استاد کو گھر بلایا جانے لگا۔ گھر کے ماحول کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔ بچے نے بھی اثر قبول کیا۔ اشعار سے روشناسی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ وہ دور بھی کچھ ایسا تھا کہ شرفاء میں شاعری بہت زیادہ مقبول تھی۔ ابھی وہ صرف نو سال کا تھا کہ اسے بھی شوق ہوا کہ وہ بھی کوئی شعر کہے۔ بحور اور اوزان کی پہچان نہ تھی مگر شاعری سے اسے رغبت محسوس ہوئی اور اس نے زندگی کا پہلا شعر 1926 میں کہہ دیا۔ اس ایک شعر پر اسے وہ داد ملی کہ حوصلہ سوا ہو گیا۔ اسی حوصلہ افزائی نے اسے مزید کچھ کہنے پر اکسایا اور اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ کچھ کہنے کے لیے کسی کی شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے لیکن اتنی عمر میں اسے شاعری کے رموز کون سکھاتا اس لیے وہ مسلسل مشق میں مصروف رہا۔ اس نے 1926 میں ایک پوری غزل کہہ لی اور آغا شاعر قزلباش کے پاس اصلاح کے لیے جا پہنچا۔ انہوں نے اس کی غزل دیکھی اور کہہ دیا کہ اگر تھوڑی سی محنت اور کرو تو اچھی غزلیں کہنے لگو گے۔ اتنے بڑے شاعر کا یہ کہنا ہی اس کے لیے بہت تھا۔ اس نے محنت کرنا شروع کر دیا۔ محنت میں ہی عظمت ہے۔ اس کی شاعری میں نکھار لانے لگا۔ اب وہ نا صرف غزلیں کہتا بلکہ دوسری اصناف پر بھی توجہ دینے لگا تھا۔ نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، رباعی سب پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ دیگر اصناف پیش کرنے کے لیے اساتذہ کے آگے پیچھے پھرنا پڑتا تھا لیکن مرثیہ اور سلام کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی پہنچ جاتا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ اتنی کم عمری میں ایسی پُرسوچ شاعری۔ جس جگہ بھی وہ سلام پیش کرتا اسے خوب داد ملتی۔ پہلے گھر پر میر انیس یا مرزا دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے لیکن اس نے خود اپنا کہا ہوا مرثیہ سنانا شروع کیا تو اور بھی اس کی شہرت بڑھ گئی۔ اسے جگہ جگہ سے دعوتیں آنے لگیں۔ اس وقت پنجہ شریف کی بارگاہ کو مرکزیت حاصل تھی۔ وہاں صرف منجھے ہوئے شاعر ہی اپنا کلام سنا سکتے تھے لیکن اس نوعمر کو بھی وہاں پڑھنے کی دعوت ملنے لگی۔ اب وہ اسکول پاس کر کے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ دہلی میں کالج کی کمی نہ تھی پھر بھی والدین نے اسے لاہور بھیج دیا کیونکہ لاہور کا ماحول تعلیم کے لیے زیادہ سازگار تھا۔ اس نے ایف سی کالج میں داخلہ لیا اور انٹر کرنے کے بعد عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن سے ڈاکٹری پاس کی۔ ابھی اس نے میڈیکل پریکٹس شروع ہی کی تھی کہ سیاسی ماحول جو پہلے ہی گرم تھا اور گرم ہو گیا۔ 1944 میں عابدہ بیگم سے شادی ہوئی تھی۔ ابھی شادی کا خمار اترا بھی نہیں تھا کہ سیاسی ماحول نے عصبیت کا چولہ اوڑھ لیا اس لیے کہ مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ مطالبہ ہندوؤں کو گراں گزرا تھا اور اس کا بدلہ نہتے مسلمانوں سے لیا جانے لگا تھا۔ بنگال سے شروع ہونے والا فساد پورے برصغیر میں پھیل گیا تھا۔ اب ہر جانب سے ایک ہی خبر آ رہی تھی کہ مسلمانوں کا خون سستا ہو گیا ہے پھر یہ آگ دہلی میں بھی بھڑک اٹھی۔ دہلی میں اس کی شدت سب سے زیادہ تھی کیونکہ مغربی پنجاب سے نقل مکانی کرنے والے غیر مسلم دہلی اسٹیشن پر اترتے ہی مسلمان بستیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ بحالت مجبوری اس کے گھرانے نے بھی ہجرت کا کرب جھیلنے کا ارادہ کر لیا۔ مال لٹا کر جان بچا کر وہ سب کراچی آ گئے اور پھر ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ کراچی میں ہر صوبے سے لوگ آ رہے تھے۔ ان میں جو ادب پرور تھے انہوں نے یہاں بھی ادبی ماحول بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے وقت میں اس ڈاکٹر نے بھی اپنا ادبی کردار اجاگر کیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری اس گھرانے کی اوّلین پسند تھی پھر اس نے بھی اپنا تصنیف مرثیہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح کراچی کے ادبی ماحول میں رثائی ادب کو اہمیت حاصل ہونے لگی۔ غزل گوئی پر توجہ کم ہو گئی اور مذہبی شاعری پر توجہ مرکوز ہو گئی۔ اسی دوران میں اس کے ایک نعتیہ رباعی "قسمت میں میری چین سے جینا لکھ دے" کو بہت مقبولیت ملی جسے صابری برادران نے اپنی قوالی "تاجدارِ حرم" میں شامل کیا۔ انہوں نے بیشمار نعت سلام اور منقبت کے علاوہ مرثیے بھی بڑی تعداد میں لکھ کر معمار رثائی ادبِ پاکستان کہلائے۔ 25 اگست 1985 میں کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔ آپ ڈاکٹر یاور عباس کے نام سے مشہور تھے۔

..............☆......☆......☆..............

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



☆ **آفتاب احمد نصیر اشرفی، شاہ فیصل کالونی کراچی سے لکھتے** ہیں۔ ''اس مرتبہ آپ نے شجر کاری کی اہمیت کو بنیاد بنا کر دنیا کے مستقبل کی جو خوفناک تصویر پیش کی ہے یقین جانیے کہ پڑھ کر ہمیں تو جھرجھری آگئی۔ خوش قسمتی سے ہمارا موجودہ وزیراعظم ماحولیاتی پیچیدگیوں سے آگاہ ہے اور بلین ٹری منصوبوں پر عملی کام بھی کر رہا ہے لیکن اسے کام تو کرنے دیا جائے۔ ''ٹائیگر'' کی پھرتیوں کو حیرت سے دیکھا اور جب یہ پڑھا کہ ہیلی کاپٹر سے کودنے کے بعد ان کا پیراشوٹ کھلا ہی نہیں تو حیرت دوچند ہوگئی کہ مستعد اور ذہین بریگیڈیئر طارق محمود سے خوفزدہ بھارتی Raw کی دلی مراد پوری ہوگئی۔ وہ کامیاب ہوگئی۔ زویا اعجاز حسبِ روایت دل موہ لینے والی تحریر کے ساتھ آئیں۔ کیپٹن آکاش آفتاب کی شجاعت و دلیری کی روداد نے دم بخود کر دیا دورانِ تربیت اس نوجوان نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ سلام کرنے کے قابل تھے۔ ہماری فوج یوں ہی دنیا کی بے مثال فوج نہیں کہلاتی۔ تئیس سال کی عمر میں ہم اپنے بچوں کو لاڈ پیار میں ہی رکھتے ہیں جبکہ ماں کا آکاش اس عمر میں ارض کے فرض کا قرض اتار کر جنت میں بھی جا بیٹھا۔ اس سے وابستہ ہر رشتے کو ہمارا خراجِ تحسین۔ شہر خیال میں صاحب صدارت سمیت تقریباً سبھی نے ندیم اقبال کو دولہا بنا رکھا تھا۔ یعنی وہ سپر سپر ہٹ نہیں بلکہ ڈو پر ہٹ ہوگئے۔ یہ فلمی اصطلاح ہم نے اس لیے استعمال کی کہ وہ اپنی تصاویر میں کسی ہیرو سے کم نظر نہیں آتے اور اپنی تحریروں کے تو وہ ہیرو ہیں ہی۔ اس مرتبہ بھی کنول سے ان کا رومانس عروج پر تھا لیکن ایک زیادتی وہ یہ کر رہے ہیں کہ غزالہ کی شبہات کو ترجیح دے رہے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ کنول کو اس کی اپنی شخصیت میں قبول کریں۔ سائیں کا کردار سفر پہلا پہلا کی جان بنتا جا رہا ہے۔ کنول کی والدہ کی ان سے عقیدت بھی ضرور کوئی گل کھلائے گی۔ ہمارے معاشرے میں ضعیف الاعتقادی کا شکار خواتین زیادہ ہیں اور ڈھونگی پیروں جعلی عاملوں کی آمدنی کا ذریعہ بھی دیکھتے ہیں۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ ندیم اقبال اپنے کینوس پر اس ناسور کو کس شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اعجاز حسین سٹھار اور رانا محمد شاہد صاحب کے تبصرے شہر خیال کا حسن ہیں محترمہ بشریٰ افضال کی انٹری سرپرائز تھی۔ چند لمحوں تک تو ہماری ہونق صورت دیکھنے کے لائق تھی۔ روبینہ نفیس صاحبہ کی طرح وہ بھی پُرعزم ہیں کہ وہ شہر خیال سے اب غیر حاضر نہ ہوں گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ روبینہ نفیس صاحبہ ہم سب سے پوچھ رہی ہیں کہ وہ اپنی طرف سے اعزازی پرچہ کیوں اور کس کو دیں۔ اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ ہمیں پچیس سال ہوگئے شہر خیال کا ممبر بنے۔ بس اعجاز حسین سیٹھار صاحب ہم سے سینئر ہیں۔ ایک وجہ تو یہ بن گئی دوسری یہ کہ ہم ایک سال میں تین مرتبہ مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ مسلسل گیارہ گیارہ خطوط لکھنے اور چھپوانے کا اعزاز الگ ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کو ہمارے تبصروں میں دم نظر نہ آئے تو خدا ترسی بھی نیکی ہی ہوتی ہے۔ نیک کام سمجھ کر ہی کر گزریئے۔ موساد کا شکار ہو کر سمیرا نے عالمگیر شہرت تو حاصل کر لی لیکن انسانیت کے کام آنے والی اس کی تحقیق ضائع ہوگئی۔ اس کا منگیتر سرمد اس کا ذمّے دار ہے۔ اس نے ہی اکسایا تھا سمیرا کو کہ وہ امریکی یونیورسٹی کی اسکالرشپ قبول کر لے۔ دوسری ذمّے داری مصری حکومتی کی تھی کہ اتنے اہم پروجیکٹ پر کام کرنے والی سمیرا کو سیکیورٹی فراہم نہ کر سکی۔ اتنا اہم اثاثہ کھو دیا۔ زرین قمر نے ایک اہم تحریر دی

ہمیں پڑھنے کو۔ انور فرہاد کراچی کے پردہ سیمیں دکھا رہے ہیں اور ہم دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے کہ بھولا بسرا زمانہ یاد آ گیا۔ زین مہدی کا قیدی شہنشاہ بے حسی، بے کسی اور بے بسی کا ملغوبہ اس لیے تھا کہ اس میں عملی شہنشاہوں والی کوئی بات نہ تھی۔ مغل شہنشاہوں کی میراث کو آسانی سے دوسروں کے حوالے کر دیا۔ مغل تاریخ میں عبرت انہی کی وجہ سے زندہ ہے۔ ان کی باقیات پر ڈھایا جانے والا ظلم ایک المیہ ہے۔ سلمیٰ اعوان کا گھروندا ریت کا اس لیے نہیں پڑھا کہ ابھی نامکمل ہے مکمل ہونے پر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ ترانے کا سفر ہمیں کوئی بھی کرائے ہمیں ہمیشہ ہی بھلا لگتا ہے۔ چھاگلہ صاحب کی بنائی گئی دھن پر بعد میں حفیظ جالندھری نے شاعری کی کیا کمال کی بات ہے۔ آفرین ہے چھاگلہ صاحب پر بھی کہ اشعار کے بغیر ہی دھن تخلیق کر ڈالی۔ روسیاہ کا ساتواں حصہ کچھ کیا بہت بہتر تھا۔ علی کا ایک ایکشن میں آ جانا اور اسماعیل شاہد کی کچھار میں گھس جانے کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ عاطر شاہین کو احساس ہو گیا ہے کہ اب تک کہانی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ سچ بیانیوں میں ایک تھی حسینہ ہی پڑھ سکے ہیں اور اس پر بھی تبصرہ اس لیے نہیں کر رہے کہ آپ سے کچھ دیگر گذارشات کرنا تھیں جنہیں آپ فرمائش بھی سمجھ لیں۔ پہلی گزارش تو یہ ہے کہ کسی زمانے میں غلغلہ ہوا تھا کہ شہر خیال کے ساتھیوں کا تعارف کے لیے ایک صفحہ مختص کیا جائے گا جس میں ہم ایک دوسرے کے بارے میں جان سکیں گے۔ یہ تجویز چونکہ ہماری تخلیق ہے لہٰذا ہم ہی یاد دہانی بھی کروا رہے ہیں۔ ایک تجویز ہم نے یہ بھی دی تھی کہ لکھاری خواتین و حضرات کا انٹرویو لے کر شائع کیا جائے تا کہ ہم بھی ا[illegible] بارے میں جان سکیں۔ [illegible]بازی کا سلسلہ بھی بند کر دیا گیا ہے۔ ہر ماہ ایک شاعر کا نام [illegible] آزمائش کے معاملے میں ہمارا ذہن کام ہی نہیں کرتا لہٰذا اس کی بات ہی نہیں کریں گے۔ سرگزشت میں ایک تاریخی سلسلے کی بھی خواہش ہے جو روسیاہ کے ختم ہونے پر [illegible] عدد کر کے بچنے والے صفحات پر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی سلسلہ سے مراد سیریز [illegible] کہ ایک مکمل واقعہ احاطۂ تحریر میں لایا جائے (ابتداء میں جو شخصیت ہوتی ہے وہ تاریخی ہوتی۔ اس کا مرکزی کردار تاریخی ہوتا ہے بس کبھی کبھی کسی نئے قلمکار کا تعارف دے دیتے ہیں)۔ خواہش تو بہت سی ہیں جو غالب کی طرح ہمارا بھی دم نکالنے پر تلی رہتی ہے لیکن ابھی ہم اپنا دم بچا کر رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا کچھ گوش گزار کر دی ہیں۔ آخر میں جناب معراج رسول کو ایصال کا تحفہ اور ان کے درجات میں بلندی کی دعا۔ اراکین ادارہ کی محنت کو سلام۔“

☆ سلمان بشیر کی آمد روجھانوالی بہاولنگر سے۔ ”کسی بھی ڈائجسٹ میں قلمکاروں اور قارئین سے گفتگو کرنے کا یہ میرا اوّلین تجربہ اور کوشش ہے۔ مابدولت اِک عام سا انسان ہے جسے شاید سرگزشت کے گھرانے میں بھی کم کم لوگ جانتے ہیں۔۔کیونکہ سرگزشت میں جہاں بہت بڑے بڑے قلمکار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر، معروف و مقبول ہو چکے ہیں وہیں مجھ ناچیز نے بھی ”سفید خون“، ”رنگ زندگی“ اور ”بندھن“ جیسی سچ بیانیاں لکھ کر، اپنی الگ سے پہچان بنانے کی ناکام سی سعی کی ہے۔ میرے لیے سب سے بڑا چیلنج کسی بھی معروف رسالے میں اپنی کہانی کی اشاعت تھا۔ جب میں نے سرگزشت میں اپنی پہلی کہانی بھیجی تو مجھے یقین نہیں تھا کہ میری کہانی سلیکٹ ہو جائے گی اور اتنی جلدی سلیکٹ ہو جائے گی۔ مجھے ”سفید خون“ کی اشاعت کی خوشخبری میرے بہت ہی محترم و عزیز مدیر نے دی۔ مجھے پہلے تو یقین ہی نہیں ہوا کہ میں اتنے بڑے انسان سے بات کر رہا تھا۔ جب یقین ہوا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانی کی اشاعت کے ساتھ ہی سر نے کہانی میں میری کمیوں کوتاہیوں پر بھی روشنی ڈالی اور ان کمیوں کوتاہیوں کو دور کرنے میں میری مدد بھی کی۔ سرگزشت میں جہاں یکے بعد میری تین کہانیاں طبع ہوئیں، وہیں گزشتہ دنوں میری تین کہانیاں ریجیکٹ بھی ہوئیں۔ دکھ تو ہوا اور بہت زیادہ ہوا لیکن میں نے ہمت نہ ہارنے کا عزم کر رکھا ہے۔۔کیونکہ ہارنے کے بعد جیتنے، اور ریجیکشن کے بعد سلیکشن کی جو خوشی ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہوتی ہے۔۔اور ان شاء اللہ میں اِس خوشی کو پانے کے لیے بہت محنت اور لگن سے کام کروں گا۔ اس خط کے ساتھ میں نے ایک نئی کہانی بعنوان ”قرض“ ارسال کر دی ہے۔ اس کہانی کا پلاٹ .... ان شاء اللہ آپ سبھی کو بہت پسند آئے گا۔ میں دعا گو ہوں کہ میری کہانی جلد از جلد پبلش ہو جائے اور سرگزشت کے بابِ ادب پر میری اِس ہلکی سی دستک کی آواز سدا گونجتی رہے۔ جہاں میں اپنی کامیابی کے لیے ہر لحہ دعا گو ہوں وہیں میرے عزیز ڈائجسٹ کی کامیابی کے لیے بھی تمنائیں و دعائیں کرتا ہوں۔ اللہ رب العزت میری دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخشے (آمین ثم آمین)

☆ فرح انیس کا مکتوب خاص لاہور سے۔ ”قارئین سرگزشت کو تہ دل سے سلام۔ شمارے کا سرورق ہمیشہ کی طرح دلکش لگا، اپنے سروق کی طرح سرگزشت کی تحریریں بھی کافی دلکش ہوتی ہیں۔ یہ ایک زبردست ڈائجسٹ ہے جس

میں پڑھنے اور سیکھنے کے لیے بہترین مواد موجود ہے۔ ستمبر کے شمارے میں میری تحریر ''ایک تھی حسینہ'' کو ٹائٹل کے فرنٹ پر لگانے کے لیے سب سے پہلے میں سرپرویز بلگرامی کا شکریہ ادا کروں گی کہ انہوں نے میری تحریر کو اس قابل سمجھا۔ (اچھی تحریر اپنی جگہ خود بناتی ہے) سچ بیانیاں میں ایم الیاس کی تحریر کے اختتام نے چونکا دیا بہت عمدہ۔ امجد جاوید کی تحریر ملامتی عورت نے اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھا۔ ماورا کی کھوج نے مجھے بھی بے چین کر دیا اور آخری سطر نے آنکھیں نم کر دیں۔ ''اگر ہو سکا تو قیامت کے دن ملوں گی اور رب سے کہوں گی، دنیا میں یہی بندہ میرے لیے نعمت تھا ورنہ تیری دنیا بڑی ظالم ہے۔'' دل کو چھو جانے والی بہترین تحریر۔ غلام قادر کی اکلوتا شوہر میں رومانہ اور خالدہ کے بیچ میں پھنسے اکلوتے شوہر پر بیک وقت رحم بھی آیا اور ہنسی بھی مگر سنتھیا کے آنے سے جہاں یہ گمان تھا مزید مشکلات کھڑی ہوں گی مگر کہانی کے موڑ نے مزید حیران کیا کہ وہ اکلوتا شوہر اب تین بیویوں کے ساتھ زیادہ خوش باش ہے اور یہ سب سنتھیا کی عقلمندی سے ہوا۔ اس تحریر کو پڑھ کر کافی لطف آیا۔ سیدہ صائمہ کاظمی کی تحریر بھی بہت زبردست تھی انسان کو اس کے کیے کا پھل ضرور ملتا ہے چاہے دیر سے ہی صحیح مگر گناہ کی پکڑ ہے۔ کنیز زہرا کی بھی تحریر پسند آئی۔''

☆ انیلہ ظفر کا پیام لاہور سے۔ ''پیارے سرگزشت کے باذوق قارئین کو خطوط کی اس محفل میں میرا بہت بہت سلام۔ اس بار میرے معصوم دل نے سوچا کہ جاسوسی اور سسپنس کی محفل میں تو کئی بار انٹری ہو چکی ہے اس بار کیوں نہ سرگزشت کی محفل کے لوگوں سے دعا سلام کر لی جائے۔ باذوق اور ہم مزاج لوگوں سے ملنا بھی اک عمدہ تجربہ ہوا کرتا ہے۔ میں سدا کی جذباتی اور دل ہی کی ماننے والی۔ اس لیے فوراً ادھر آ گئی تو سب اچھے لوگ مجھے ویلکم شیلکم کریں۔ (گویا شک ہے کہ یہاں برے لوگ بھی ہیں۔ نہیں نہیں سب اچھے لوگ ہیں۔ سرگزشت صرف اور صرف معلومات کے شائقین کا پرچہ ہے اس لیے اس کے 90 فیصد ریڈر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں) اب بات کرتے ہیں ان نگینوں کی جو سرگزشت کی انگوٹھی کو دیدہ زیب بناتے ہیں۔ رواں ماہ کا شمارہ پڑھا تو پہلی تحریر زویا اعجاز کی ارض فرض قرض تھی۔ فوجیوں کی لف لائف کے متعلق ڈراما سیریل عہد وفا میں بھی بہت کچھ دیکھا لیکن اب ایس ایس جی کمانڈو بننے اور پھر کمانڈو بنے رہنے کی داستان نے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ میں بھی ایک ماں ہوں اس لیے کیپٹن آکاش کی والدہ کے دھڑ کے دل گداز کرتے رہے۔ زرین قمر کی ''موساد کا شکار'' ان کی پچھلی تمام تحریروں سے زبردست تھی۔ سادہ رواں اور خوبصورت انداز۔ سفر پہلا پہلا اپنی طرز کا منفرد سفرنامہ ہے یہ تحریر پڑھ کر ہی مجھے سفرناموں میں دلچسپی پیدا ہوئی ورنہ اس سے پہلے یہ ادبی صنف بہت بور کرتی تھی۔ زین مہدی کی قیدی شہنشاہ ایک عبرتناک تحریر تھی۔ سلمیٰ اعوان ایک بڑی مصنفہ ہیں مگر بہت مشکل لکھتی ہیں۔ ان کی تحریر اسی لیے ابھی نہیں پڑھی۔ ان کی تحریر پہ رائے پھر کبھی سہی۔ عاطر شاہین روسیاہ میں اچھا رنگ جما رہے ہیں اور بہت سے لوگوں کی طرح یہ تحریر مجھے بھی پسند ہے۔ سچ بیانیاں معمول سے زیادہ تھیں۔ ایک تھی حسینہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ خوبصورتی کا اصل معیار سرخ و سفید رنگت ہی کیوں قرار پاتی ہے۔ سیرت کا حسن رکھنے والی حسینہ اصل حسینہ کیوں نہ بن سکی۔ ایم الیاس کی فائدہ نے شاک کیا مجھے تو لگا تھا کہ کوئی پری وش تلاش کی جا رہی ہے مگر وہ تو بھکاری تھا اور بھکارن ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ (حق ہاء)۔ امجد جاوید کی سرگزشت میں انٹری اچھی لگی اور ملامتی عورت اس سے بھی زیادہ اچھی رہی۔ شوبز سے جڑی تلخیاں امجد جاوید پہلے بھی سامنے لاتے رہے ہیں اس بار بھی مزہ آ گیا۔ ان کا اندازِ تحریر بہت عمدہ ہوتا ہے۔ غلام قادر کی ایک اکلوتا شوہر متاثر نہ کر سکی۔ حقیقت سے کافی دور لگی یہ تحریر۔ مجھے نا جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ جب سے وہ اک لمبے گیپ کے بعد رائٹنگ کی طرف دوبارہ آئے ہیں ان کے طرزِ تحریر میں وہ پہلے والا رنگ کچھ زیادہ نظر نہیں آ رہا۔ سیدہ صائمہ کاظمی کی دست راست بھی اچھی تھی۔ انتقام نے آخر اپنی راہ ڈھونڈ ہی لی۔ معاف کرنے کا ظرف کہیں کہیں ہی ہوتا ہے۔ دوراہیں پڑھ کر ان عورتوں پر غصہ ایک بار پھر بڑھ گیا جو شوہر کی قدر کی بجائے سراب کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ ایسی عورتیں اپنی آخرت اور دنیا دونوں تباہ کر لیتی ہیں۔ اللہ ہدایت عطا کرے (آمین) توکل میں مہ جبیں کو صبر کا اچھا پھل ملا لیکن شوہر کا اسے آزمانا معیوب سا لگا۔ یہ تو رشتہ ہی اعتبار اور اعتماد کا ہوتا ہے۔ کنیز زہرا کی حیات جاوداں نے بہت متاثر کیا۔ اندازِ تحریر بہت عمدہ اور متاثر کن تھا۔ گناہ کا ڈول پڑھ کر ان خواتین و حضرات پر بہت تاسف ہوا جو اپنے مخلص شریکِ حیات کی بجائے اپنے نفس سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور گھر سے باہر سکون اور نام نہاد محبت کی تلاش میں منہ مارتے ہیں۔ عنائشہ چوہدری کی پون صدی بعد نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہم اپنے دشمنوں کو آخر کب پہچانیں گے۔ تقسیم سے چلنے والی یہ

آندھی جنگ ستمبر جنگ اکہتر اور اب بھی اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔۔اور ایک ہم ہیں جو اپنی تہذیب ثقافت سب کچھ بھول چکے ہیں۔ ہمیں اغیار کا کلچر ہی کیوں قابلِ تحسین اور قابلِ عمل لگتا ہے۔ لیجیے اپ سب پڑھ چکے میری رائے اپنے پیارے سرگزشت پہ۔سب قارئین کو چاہیئے کہ ہر تحریر پہ اپنی رائے مثبت اور مہذب انداز اور الفاظ میں رائٹرز تک پہنچانے کی کوشش کریں اور تنقید برائے تنقید سے گریز کرتے ہوئے مثبت تنقید کو فروغ دیں۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو (آمین)‘‘۔

☆ ملتان سے عاطر شاہین لکھتے ہیں۔ ’’ستمبر کا شمارہ مقررہ وقت پر مل گیا۔ ایجنسی والوں کی مہربانی تھی کہ اس بار انہوں نے وقت پر پرچہ تقسیم کیا ہے ورنہ وہ مقررہ وقت کی بجائے تین سے چار روز بعد پرچہ تقسیم کرتے ہیں۔ فون کر کے پوچھیں تو بتاتے ہیں کہ ابھی پرچہ نہیں آیا حالانکہ دوسرے شہروں میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر جاسوسی پبلی کیشنز کی طرف سے اشتہار شائع ہوا ہے جس میں چاروں رسالوں کے جاری کرنے کی تاریخیں دی گئی ہیں اور قارئین سے رائے بھی مانگی گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ اچھا اقدام ہے اس طرح قاری کو پتا ہوتا ہے کہ اس کا پسندیدہ رسالہ فلاں تاریخ کو مارکیٹ میں آئے گا۔ قاری کو طویل انتظار کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ یک صفحی میں پاک فوج کے ہیرو طارق محمود ٹائیگر کے بارے میں پڑھا تو بے حد فخر محسوس ہوا۔ ٹائیگر واقعی ٹائیگر ہی تھے۔۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ زویا اعجاز اور زرین قمر حسبِ سابق بہترین کہانیوں [illegible] انور فرہاد نے سینماؤں کے حوالے سے کافی معلومات دیں۔ اب تو سینمانہ ہونے کے [illegible] اس قابل نہیں کہ فیملی کے ساتھ جا کر فلم دیکھی جائے۔ سفر پہلا پہلا میں ایسا لگتا ہے جیسے ہم خود ہی سیر [illegible] رہے ہیں۔۔ تاریخی اسٹوری اور معلوماتی اسٹوری ترانے کا سفر پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ چند سچ بیانیاں [illegible] جو پڑھی ہیں وہ متاثر کن اور حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہوئی لگیں۔ دکھ اور افسوس بھی ہوتا ہے کہ اپنے مطالب کے لیے لوگ کس قدر سفاک ہوجاتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور ہمیں دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) آخر میں، میں ایک بار پھر سرگزشت ٹیم اور قارئین کا بے حد مشکور ہوں جو میرا ناول ’’روسیاہ‘‘ پڑھ کر اپنی پسندیدگی کی سند سے نواز رہے ہیں۔ قارئین کی حوصلہ افزاء رائے میرے لیے رہنمائی کا درجہ رکھتی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو شہرِ خیال میں حاضر ہوتا رہوں گا۔‘‘

☆ افسانہ آفتاب، اورنگی کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ’’سر میرا نام افسانہ آفتاب ہے۔ میں نے ’’سرگزشت‘‘ کے مزاج کے مطابق ایک کہانی تخلیق کی ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ کو میری کاوش پسند آئے گی۔ برائے مہربانی کہانی کی نوک پلک سنوار کرا سے شاملِ اشاعت کیجیے گا۔ سر اس بار میرا حوصلہ بڑھائیے۔ میں نے کہانی پہ بے حد محنت کی ہے۔ لکھنے کا مجھے جنون کی حد تک شوق ہے۔ (آپ کی سچ بیانی ’’گناہ کا ڈول‘‘ گزشتہ ماہ شائع ہوچکی ہے لیکن افسوس آپ نے کہانی پر پتا غلط لکھا تھا کیونکہ منی آرڈر واپس آ گیا ہے۔ دوبارہ صحیح پتا بھیجیں)۔‘‘

☆ عذرا سلطان داؤد لاہور سے لکھتی ہیں۔ ’’میں ایک نانی اور دادی ہوں۔ میری عمر 78 سال ہے۔ میرے سینے میں بہت غم اور خوشیاں اور ذہن میں بہت سی سچی آپ بیتیاں ہیں۔ جنہیں میں نے قلمبند اپنی بیاض میں کر رکھا ہے۔ میں عرصہ دراز سے سرگزشت کی قاری ہوں۔ دوسروں کی حالاتِ زندگی پڑھ پڑھ کر آج میں نے بھی ہمت کی کہ کچھ آپ کے رسالے کی وساطت سے عرض کروں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ (انشاء اللہ آپ بھیج دیں)۔‘‘

☆ سید امتیاز حسین بخاری، شاہ سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ’’اگست کا سرگزشت 4 محرم الحرام 24 اگست کو رات ساڑھے 9 بجے کے بعد ملا تھا سخت ایام غم تھے، ہم عزاداری حضرت امام حسینؑ میں مشغول عبادت تھے۔ عاشورہ گزر جانے کے بعد مطالعہ کیا۔ خط ملنے کی تاریخ گزر چکی تھی اس لیے خط لکھنے سے قاصر رہا۔ ایک ماہ مطالعے میں لگ گیا۔ اگست کا شمارہ ہر لحاظ سے بہت سی خوبیوں سے مزین تھا۔ باقی ماہ ستمبر کا تازہ ترین شمارہ 26 ستمبر کو ملا۔ کافی انتظار کی اذیت و کوفت بوریت کے بعد میسر آیا۔ شمارہ دیکھ کر دل وفورِ مسرت سے کھل اٹھا، باغ باغ ہوگیا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا جو دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں تھا۔ آبادی تو دنیا میں بڑھتی ہی جارہی ہے کنٹرول کرنا کسی کے بھی بس میں نہیں ہے۔ البتہ ٹائیگر کے بارے سیر حاصل معلومات ملیں بریگیڈیئر طارق محمود دلیر جانباز مجاہد تھے۔ شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ شہرِ خیال میں داخل ہوا۔ نئے اور

پرانے ساتھی اپنی گوہرافشانیاں ضیا پاشیاں بکھیر رہے تھے۔ ہر خط لاجواب تھا۔ بہت ہی بے پایاں مسرت ہوئی، میں آفتاب احمد نصیر اشرفی، قیصر خان، ناصر خان نیازی گجرات، رانا محمد شاہد نعمان احمد مصطفوی کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ میرے خط کو پسند کیا اور تعریف سے نوازا ہے۔ ارض فرض قرض بہت ہی نادر روزگار کہانی تھی۔ محبت وطن میں انسان سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ ''اے وطن ہم ہیں تیری شمع کے پروانوں میں۔'' واقعی فوجیوں کی زندگی دشوار اور کٹھن ہوتی ہے مگر ان پر وطن کی محبت غالب رہتی ہے۔ انور فرہاد نے کراچی کی فلمی صنعت کا بھرپور انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ عزیز تبسم کا مفصل تعارف کرایا ہے۔ اس پشتو مصنف کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ بھئی سفر پہلا پہلا اس بار ندیم اقبال نئے انداز سے جلوہ افروز ہوئے ہیں ہر لفظ رومان و نشاط مستی وطرب میں ڈوبا ہوا ہے۔ ساحر لدھیانوی کی نظم بہت ہی زیادہ پسند آئی۔ پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی۔ تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں۔ ندیم اقبال نے تو مجھے فراموش کر دیا ہے میرا نام بھی بھول گئے ہیں مگر میں نے ان کو برابر یاد رکھا ہوا ہے ان کا سفر نامہ شوق و شغف سے پڑھتا ہوں۔ بہت ہی بے پایاں لطف آتا ہے واقعی آپ الفاظ اور لفظوں کے جادوگر ہیں۔ ان کی تحریر میں جادو بیانی ہے سحر انگیزی ہے۔ قیدی شہنشاہ جسے زین مہدی نے سوز و گداز سے سپرد قلم کیا تھا اشکوں کے ساتھ ایک ہی نشست میں اختتام تک پڑھتا رہا اور روتا رہا۔ ترانے کا سفر کرن صدیقی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ قومی ترانہ کی تخلیق کا لمحہ لمحہ اجاگر کیا گیا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ قومی ترانہ فارسی زبان میں ہے۔ فقط ایک لفظ اردو کا ہے۔ باقی سارا کا سارا فارسی ہے اتنا تبصرہ ہی کافی ہے۔ سلمیٰ اعوان کا گھر وندا ریت کا اعلیٰ ادبی تخلیق ہے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں میری طرف سے آپ کو خصوصی دعا و سلام۔ انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔''

☆ ماسٹر بسیم الدین غوری، اورنگی کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ''یہ بندہ ناچیز آپ کے اعلیٰ ترین درجے کے رسالے میں اپنی چند کہانیاں چھپوانے کا خواہش مند ہے لیکن کہانیاں قلم سے لکھ کر ڈاک سے روانہ کروں گا۔ کمپوز کر کے نیٹ سے نہیں بھیج سکتا۔ میں نے آج سے کافی عرصہ پہلے رسالوں کو مضامین اور کہانیاں بھیجیں جو رسالوں کی زینت بنتی رہیں۔ میرے ساتھ سب سے زیادہ تعاون ایک سرکاری رسالے نے کیا تھا۔ جس میں میرے مضامین اور کہانیاں تین سال سے بھی زیادہ عرصے تک چھپتی رہیں اور ہر ماہ ان کی طرف سے مجھے منی آرڈر مل جایا کرتا تھا۔ وہ سستا زمانہ تھا۔ ان کی طرف سے ہر ماہ جو معاوضہ ملتا تھا وہ آج کے چار سے چھ ہزار روپے کے برابر ہوتا ہے۔ میرے والد صاحب چمن علی غوری بہت قابل انسان تھے۔ آپ اعلیٰ درجے کے لکھاری تھے مختلف رسالوں میں آپ کی کافی کہانیاں چھپتی رہیں۔ میرے بڑے بھائی شمیم الدین غوری کی کئی کہانیاں آپ کے سرگزشت میں چھپی ہیں۔ پہلے صرف ایک کہانی آپ کی اجازت ملنے پر روانہ کروں گا۔ اس کے بعد ہر ماہ ایک کہانی بھیج دیا کروں گا۔ میرے بھائی نے بتایا کہ آپ ایک کہانی کا معاوضہ 500 روپے دیتے ہیں اور کہانی کم از کم پانچ صفحات کی ہونا ضروری ہے۔ (انہوں نے غلط بتایا اس سے بہت زیادہ ادارہ پیمنٹ کر رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تحریر میں جان ہو) خیر آپ اجازت دیں تو میں فی الحال ایک کہانی لکھ کر بھیج دوں گا (آپ کہانی بھیج دیں)''

☆ قیصر خان کی تشریف آوری بھکر سے۔ ''اداریہ میں دنیا کے سب سے بڑے مسئلے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ باقی ممالک میں کچھ اقدامات ہوئے ہیں لیکن ملک پاکستان میں اس مسئلہ پر کوئی فکر نہیں ہے۔ آبادی کا بڑھنا، کھیتوں والی زمینوں پر کالونیاں بنانا اور درختوں کا بے دریغ کاٹنا سب کے واسطے بہت بڑی مصیبت بنے گا۔ یک صفحی میں پاک فوج کے ایک دلیر جانباز کے بارے میں پڑھا عرض ہے ان کی مکمل زندگی پر کوئی تحریر لکھی جائے۔ ان کے ساتھ جو تبصرے اچھے لگے ہیں ان میں اشرفی صاحب، ساحلی صاحب، رانا شاہد، سدرہ نعمان صاحبہ، بشریٰ افضل، روبینہ نفیس صاحبہ تھیں۔ زویا اعجاز صاحبہ کا مضمون بہت اچھا لگا۔ زریں قمر، زین مہدی، سلمیٰ اعوان، کرن صدیقی کی تحریریں اچھی لگی انکل ندیم کا سفر نامہ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ انور فرہاد صاحب کا یہ مضمون بھی ایک ادبی شہ پارہ لگا۔ سچ بیانیوں میں ایک تھی حسینہ، ملامتی عورت، توکل، حیات جاوداں، گناہ کا ڈول، پون صدی بعد بہت اچھی لگیں۔''

☆ رانا محمد شاہد کی آمد بورے والا سے۔ ''اس دفعہ کا سرگزشت کا بنڈل میں خود ڈاک خانے سے نیوز ایجنسی لایا۔ دکاندار کو معلوم ہے کہ میں روزانہ اپنی ڈاک کے لیے ڈاک خانہ جاتا ہوں تو گرمی اور حبس کی وجہ سے اس نے مجھے فون کر کے کہا کہ آتے ہوئے سرگزشت کا بنڈل لے آنا، زیادہ بھاری نہیں ہے۔ سو اس دفعہ سرگزشت کا بنڈل لانے، اسے کھولنے اور پہلا شمارہ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یک صفحی سرگزشت پاکستانی کمانڈو طارق محمود ٹائیگر کے بارے میں تھی۔ جوفری فال کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیراشوٹ نہ کھلنے سے شہادت پا گئے۔ ان کے بارے میں بچپن میں بچوں کے کسی رسالے میں تفصیلی مضمون

پڑھا تھا۔ آپ نے اس مختصر تحریر میں بہت سی اہم باتیں بتائیں۔ اداریہ شجرکاری اور درختوں کی اہمیت کے حوالے سے تھا۔ میں فیس بک پہ ایک تصویر دیکھ رہا تھا جس میں ہمارے ہاں پانی کی لائن ڈالنے کے لیے ایک پرانے گھنے سایہ دار درخت کو کاٹ دیا گیا تھا۔ جبکہ جاپان میں ایک مہنگے ترین علاقے اور گنجان آبادی میں روڈ کے کنارے پولیس چوکی کے لیے درخت کو بچا کر بلڈنگ تعمیر کی گئی اور درخت کو کوئی نقصان پہنچنے نہیں دیا گیا۔ جس دن ہمیں بھی درختوں کی اہمیت کا احساس ہوگیا ہماری یہ زمین بھی جنت کا نمونہ ہوجائے گی۔ شہرخیال میں اعجاز حسین سٹھار اپنا خط نہ ملنے پر پریشانی کا اظہار کررہے تھے۔ یہ پاکستانی ڈاک خانے کا ہی کمال ہے کہ بعض اوقات رجسٹرڈ ڈاک بھی نہیں پہنچ پاتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سدرہ نعمان ناگوری کا نام دیکھ کر سدرہ بانو ناگوری یاد آگئیں۔ مگر جب خط پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ چند ماہ قبل سدرہ نعمان ہوچکی ہیں۔ زندگی کے اس نئے سفر پر انہیں مبارکباد۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کچھ زیادہ ہی عاجزی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ تبصرہ اچھا لگا۔ عطاء اللہ شاہ آپ نے اپنے اداریے میں جو لکھا۔ وہ پڑھ کر مجھے بھی اپنا نیوز ایجنسی والا یاد آگیا جس سے سرگزشت لیتے ہیں۔ کرونا کے بعد سے تو اخبارات ورسائل بیچنے والوں کے حالات بہت خراب ہیں۔ 50 فیصد تک خریدار کم ہوچکے ہیں۔ اخبارات ورسائل کا یہ کام وہ عرصہ 40 سال سے کررہے ہیں، چھوڑ نہیں سکتے۔ کہہ رہے تھے اب اس کے ساتھ موبائل کا یا کھانے پینے والی اشیاء کا کام کروں گا کیونکہ اس سے گزارہ کرنا مشکل ہے۔ تحریر کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ بشریٰ افضل کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دراصل کرونا کی وجہ سے رسالے کی اشاعت میں مسئلہ ہوا۔ ڈاک کا نظام رکا تو معمول کے مطابق تبصرہ کرنے والے بھی اِدھر اُدھر ہوگئے۔ بہت سوں کو سرگزشت وقت پر نہ ملا اس لیے مستقل ساتھی آہستہ آہستہ واپس آجائیں گے۔ روبینہ نفیس انصاری احباب کو بطور تحفہ تین مہینا تک سرگزشت بھیجنے کا آپ کا سلسلہ قابل ستائش ہے۔ اب ہم شہرخیال کے افراد کی کیا خوبیاں بتائیں کہ انہیں کس خوبی کی وجہ سے آپ سرگزشت دیں۔ آپ خود دیکھ لیں۔ جو آپ کو بہتر لگے کیونکہ یہ آپ کی صوابدید اور آپ کا ہی حق ہے۔ آپ نے صحیح لکھا کہ کرونا اور لاک ڈاؤن کے بعد بارش اور سیلاب نے لوگوں کو بے گھر کردیا ہے۔ خصوصاً کراچی جس طرح ایک ہفتے تک پانی میں ڈوبا رہا اور لوگ کشتیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہے یہ مناظر بہت دکھ دینے والے تھے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ان مشکل حالات میں غریبوں و مجبوریوں کا سہارا بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)۔ نعمان احمد [illegible] اوقات کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ جیسے بیماری میں صحت کی قدر ہوتی ہے۔ اسی طرح مصروف زندگی میں وقت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح فراغت کے دنوں میں اپنی مرضی سے وقت گزارا کرتے تھے۔ شوق کی خاطر تو وقت نکالا جاسکتا ہے۔ انجم فاروق ساحلی، قیصر خان اور محمد اکرم نے بھی عمدہ لکھا۔ نزاہت اقبال، عمران جونانی اور ناصر حسین رند کا انتظار ہے۔ چند سال پہلے ایک بہادر کمانڈر نے دہشت گردوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی تھی۔ اس بہادر کمانڈر کی زندگی پر کتاب ''ماں کا آکاش'' اشتہار کی صورت کئی بار نظر سے گزری لیکن کتاب خریدنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اب زویا اعجاز نے کیپٹن کی حالات زندگی بہترین انداز میں لکھی۔ ممکن ہے کتاب پاس ہوتی تو ضخامت کی وجہ سے پڑھ نہ پاتے۔ سمیرا نامی لڑکی شاید مسلمان سائنسدان ہونے کی وجہ سے موساد کا شکار ہوگئی۔ جس انداز سے اس لڑکی کا قتل کیا گیا وہ ثابت کرتا ہے کہ رافیہ ابراہیم اس میں ملوث تھی۔ اگر اس اہم قتل کی تحقیقات ہوجائیں۔ رافعہ سے پوچھ گچھ ہوتی تو اس کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ مگر یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے تحقیقات کرنا تھی۔ اگر کسی نہ کسی حوالے سے وہ خود اس میں ملوث تھے تو پھر کون اور کیوں تحقیقات کرتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ زرین قمر کی اس تحریر کو پڑھتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بھی یاد آئی کہ جو اس وقت امریکا کی قید میں ہے اور ہم دنیا بھر کے مسلمان اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ عجیب بے بسی ہے۔ انور فرہاد کی کراچی کی فلمی صنعت کے حوالے سے معلوماتی تحریر تھی۔ ندیم اقبال کے سفرنامے میں وہ سب کچھ ہے جو ایک اچھے سفرنامے میں ہونا چاہیے۔ پڑھنے والا بھی ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ لاک ڈاؤن میں زیادہ تر تاریخ کے حوالے سے پڑھا۔ مغلیہ تاریخ خاص طور پر 1857ء کی جنگِ آزادی اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں۔ زین مہدی نے ''قیدی شہنشاہ'' کی صورت میں معلومات میں مزید اضافہ کیا اور ایک دلچسپ داستان کی صورت میں ایک کمزور و مجبور بادشاہ کے آخری ایام کے حالات لکھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام کی یہ تصویر (جس میں ان کے چہرے سے بے چارگی اور بے بسی عیاں ہے) دیکھ کر دل کھنچ جاتا ہے۔ برسوں پہلے ''قومی ترانے کی ان کہی کہانی'' کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا۔ مگر اس میں بہت سی باتیں رہ گئی تھیں جو کہ کرن صدیقی کی تحریر ''ترانے کا سفر'' میں موجود تھیں۔ حفیظ جالندھری خوش قسمت تھے کہ سات سوتیس ترانوں میں ان کا لکھا ترانہ منتخب ہوا۔ مگر بات وہی کہ جسے اللہ عزت دینا چاہے۔ حفیظ صاحب کی بیگم کے بقول وہ ترانہ لکھنے کے لیے تین ماہ تک اپنے

کرے میں بند رہے تھے۔ لکھ لکھ کر کاغذ پھاڑتے رہے کہ وہ اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ بالآخر یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ پھر کیسے انہیں اس محنت کا صلہ نہ ملتا ؟

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ''اس ماہ ایک ساتھ کتنی خوشیاں، خوش خبریاں اکٹھی آئی ہیں۔ کرونا منحوس کے شکنجے کمزور پڑ چکے ہیں، شکار پھڑ پھڑا کر، احتجاج کرتے ہوئے اس کے پنجوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ دریاؤں، ندی نالوں کی بغاوت بھی دم دوڑ چکی ہے۔ کناروں سے اطراف میں پھیلا پانی صدیوں پرانے راستے پر گامزن ہو کر اپنی روانی پکڑ چکا ہے۔ چند گہرائی کے مقامات پر اور کھڈوں میں بچ رہنے والا سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں منہ چھپائے ہے جسے آگ برساتا سورج بخارات میں تبدیل کر دے گا۔ ادھر تین دن کے زمینی سفر کے بعد پرچا ہمارے ہاتھوں میں آگیا ہے اور بادشاہ کے نالائق بیٹے کو وراثت میں ملنے والی بادشاہت کی طرح کرسی صدارت بھی میرے حصہ میں آئی۔ ایک بار سارے غم، گلے شکوے بھلا کر خوش ہو لیتے ہیں، کل کی کل سوچی جائے گی۔ ''پردہ سیمیں'' میں انور فرہاد نے یادداشت کے سہارے پر معلومات کے دریا بہا دیئے۔ خاص طور پر کراچی کے ہر گلی، محلہ کا حال تفصیل سے بیان کر کے ماضی میں بھٹکنے پر مجبور کر دیا، کیا زمانہ تھا اور شوقین تھے کہ بے شمار سینما گھر ہو کر بھی کھڑکی توڑ رش لگتے اور تفریح ملنے کے ساتھ ذہن بٹ جاتا، سارے مسائل، پریشانیاں اور محرومیاں لمبی نیند پر چلی جاتیں اور پوری فیملی ایک ساتھ رہ کر خوب مزے لیتی اور نئے پرانے گلے شکوے دور ہو جاتے۔ ایسی کئی شخصیات تھیں جنہوں نے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں عوام کو خوش رکھنے کے لیے آزمائیں، جو کار خیر میں شامل رہے اور یہ قصے ہم تک دلچسپ انداز میں پہنچائے، سب کے درجات کو بلندی ملے۔ ''سفر پہلا پہلا'' میں اصل کمال ندیم اقبال کا ہے سرسراتی ہواؤں، بکھرتے پتوں، جھولتے درختوں اور ان دیکھی مخلوق کی حرکات کو قلم کی زبان سے امر کر رہے ہیں گویا آنکھوں کے سامنے حقیقی کرداروں کی فلم چل رہی ہے جہاں اس سفرنامہ کی بازگشت سنائی دے گی وہاں لکھاری کی لفاظی اور واقعات پر گرفت کی ضرور بات ہوگی۔ ''روسیاہ'' میں تجسس، مہم جوئی، روانی اور ہیجان عروج پر ہے۔ علی صدمے میں ہے اور اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن اس کی طرف سے اٹھایا گیا ہر قدم بے وقوفی، جلد بازی اور بغیر منصوبہ بندی کے ہوتا ہے۔ انہیں جب جانثار کرنے والے دوست اور صحیح رہنمائی کرنے والے سرپرست ملے ہیں تو باہم مشورہ سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے وہ انتہائی نازک اور خطرناک حالات کا شکار ہیں لیکن بغیر نکیل کے مست اونٹ کی طرح ان دیکھے راستوں پر نکل کھڑے ہوتے ہیں وہ بدقسمتی کا ایک ... برداشت نہیں کر پائیں گے جب معاملات بگڑتے جائیں، بے بسی منہ چڑانے لگے اور جائز ضرورتوں کے حصول میں ناکامی راستہ روک لے تو صبر کر کے سارے حالات کے نتائج اللہ کی رضامندی پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ رحمت خداوندی ضرور جوش میں آئے گی۔ ظالم، عدل نہ کرنے والا، غریب کے حقوق، عزتیں لوٹنے والا اور زمین پر گردن اکڑا کر چلنے والا جابر ایسا گرفت میں آئے گا کہ ایک دنیا تماشا دیکھے گی اور عبرت کا نشان بن جائے گا بس اللہ کی ذات، انصاف پر پختہ یقین رکھنا ضروری ہے سامنے کی بات ہے ایسے کئی نظارے ہماری، تمہاری اور گزری نسل نے خوب مزے لے کر دیکھے ہوں گے۔ سچ بیانیوں میں ابتدائی کہانی ''ایک تھی حسینہ'' معاشرتی، گھریلو اور حسن کی کارستانیوں کی عکاس ہے۔ حسینہ شروع سے ہی احساس کمتری کا شکار ہو کر حوصلہ ہار بیٹھی تھی اسے اپنی تعلیم اور صلاحیتیں آزما کر خود کو منوانا تھا آج لوگ دولت کے پیچھے اردگرد دیکھے بغیر آنکھیں بند کر کے بھاگ رہے ہیں۔ اس کے پرس میں ہر ماہ تگڑی رقم آتی تو فائق نہ سہی کوئی حالات کا ستایا اور مجبوریوں کا مارا اس کو دل میں بسا لیتا بس اسے حساس مزاج ملاوہ ہر بات دل پر لے کر خاموشی سے ماتم بپا رکھتی یوں آخر موت نے اسے درد، اذیت اور باتوں کے نشتر سے بننے والے زخموں کے ناسور بننے سے بچا لیا۔ حسینہ نے بے حس اور بے انصاف معاشرے کے نامناسب رویہ سے دلبرداشتہ ہو کر شکست قبول کر لی جس کا افسوس ہے کیونکہ اس کا رویہ، سوچ اور برتاؤ خوبصورت تھا جو اس کے ساتھ دفن ہو گیا۔ ''فائدہ'' ایک انسان کے ذاتی خیال، لالچ اور سوچ کی روئیداد ہے لیکن کبھی پیسے کے لیے ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جس پر کوئی پابندی، جبر اور گن پوائنٹ والا معاملہ نہ ہو، مجھے ایسے کردار سے گھن آرہی ہے۔ وہ لاکھوں، کروڑوں پتی ہو جائے جب زندگی میں رومانس، ناز، خوشی اور جذبات کا دخل نہ ہو تو دولت، محل، بنگلا اور جائیدادیں کاغذی کھلونے ہیں۔ وہ کل کسی جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جائے یا آج کے ہنگاموں میں کسی حادثہ کی بھینٹ چڑھ جائے تو سارا ٹھاٹھ یہاں پڑا رہ جائے گا اور بنجارہ پھیکے، سوکھے روز و شب گزار کر چیتھڑے سنبھال کر مٹی اوڑھ لے گا۔ ایسے کرداروں کی حوصلہ شکنی کر کے ہم معاشرہ سدھار مشن میں حصہ ڈال سکتے ہیں۔ ''ملامتی عورت'' میں

ماورا نے ایک قدم غلط کیا اٹھایا کہ پوری زندگی پر حاوی ہوگیا۔ جتنے دن جیتی رہی، دوسروں کے اشاروں پر چلتی رہی یہاں تک کہ بربادیوں کی طویل داستان رقم ہوگئی۔ البتہ وہ ایک عزت مند خاندان سے تھی کس منصوبہ بندی اور چالاکی سے آصف اور تنویر سے کردہ ناکردہ کرتوتوں کا بدلہ چکا لیا وہ جذباتی ہو کر واویلا کرتی اور شرمندگی کو بنیاد بنا کر خودکشی کر لیتی تو زمانے کی سرگرمیوں میں کیا تبدیلی آنی تھی الٹا اس کی معصوم بیٹی کیسے ہاتھوں میں چلی جاتی، کچھ کہا نہیں جاسکتا اخبارات میں فیچر شائع ہوتے، ٹی وی کے ہر چینل پر مذاکرے ہوتے، دوسروں کی عزت اور پگڑیاں اچھالی جاتیں۔ حاصل وصول کچھ نہ ہوتا البتہ بدنامی کے کٹھے بیٹھے بیروں سے جھولی بھر جاتی۔ اس نے محفوظ سرمایہ کاری جیسا قدم اٹھا کر سب کو بھلا کر دیا۔ مجرموں کی استطاعت کے مطابق ہرجانہ وصول کیا یوں سب ویب میں عزت بچا کر معتبر بنے رہ گئے۔ میں سمجھتا ہوں اس سے بڑھ کر عقل مندی، امن اور بیٹی کا مستقبل سنوارنے کا بے ضرر فیصلہ کیا ہوگا؟ ‘‘

☆ ارباب خان کا ای میل ہنگو سے۔ ’’ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے سرگزشت کی جانب۔ ستمبر کا پرچہ بارہ تاریخ کو ڈاک سے مل گیا۔ ان دوستوں کا شکریہ جنہوں نے مجھے سالانہ خریداری کا مشورہ دیا تھا۔ میں کئی کئی بار بک اسٹال کا چکر لگانے پر مجبور ہوتا تھا۔ لیکن اب کوئی فکر کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ادھر سرگزشت کا اشتہار آیا اور ادھر میرے گھر ڈاکیہ سرگزشت [illegible] گیا۔ میں ا[illegible] تمام دوستوں کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ بھی میری طرح فکر [illegible] مبرا ہو جائیں۔ اس بار [illegible] شمار [illegible] معلوم لمال لی تھی۔ طارق محمود ٹائیگر کے بارے میں عام لوگ کم کم ہی جا[illegible] [illegible] حالانکہ ہم ا[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اہمیت نہیں دیتے۔ ٹائیگر جیسے جانباز مجاہد پر تھوڑا بہت علم مجھے تھا۔ [illegible] [illegible] پڑھا تھا لیکن اس یک صفحہ کی تحریر نے مکمل تعارف کرا دیا۔ ہمارے ازلی دشمن نے ٹائیگر کے کئی واقعا[illegible] فلم میں جمع کر کے دکھائے۔ اس فلم کا نام ’’ایک تھا ٹائیگر‘‘ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ واقعہ ہمارے ہیرو کا اور نام د[illegible] دیا اپنے ملک کا۔ ایسے ہیرو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ارض فرض قرض از زویا اعجاز بہت بہت، بہت اچھی تحریر تھی جو لوگ یہ نہیں جانتے کہ کتنی محنت کے بعد پاک فوج کا ایک جوان تیار ہوتا ہے۔ میں خود بھی فوج کا ریٹائرڈ بندہ ہوں اس لیے جانتا ہوں کہ ٹریننگ کتنی مشکل سے پوری ہوتی ہے۔ زویا اعجاز کو بہت مبارک باد۔ ’’موساد کا شکار‘‘ بھی غضب کی تحریر تھی۔ یہ یہود و ہنود اور نصاریٰ ہمیں ہر مقام پر شکست دینے میں لگے رہتے ہیں۔ کاش اس معصوم سی سائنسدان کی تھیسس مکمل ہو جاتی تو آج بم کی تیاری کی بجائے ایٹم سے بنی نوع کی خدمت ہو رہی ہوتی۔ مگر یہ سازشی لوگ ہم مسلمانوں کو کبھی آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اب تو ان کی ایک بڑی سازش بہت حد تک کئی ممالک میں پوری ہوگئی ہے یعنی مسلمان آپس میں ہی لڑنے لگے ہیں۔ لڑلڑ کر اپنے اپنے ملک کو تباہ کر رہے ہیں جیسے شام، عراق، افغانستان۔ سفر پہلا پہلا کیا بات ہے، بہت مزہ آ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ سفرنامہ نہیں دلچسپ رومانی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ قیدی شہنشاہ بھی لاجواب تھی۔ کرن صدیقی کا ترانے کا سفر بھی لاجواب تھا۔ روسیاہ اچھی جا رہی ہے۔ ایک تھی حسینہ نے اندر سے ہلا دیا۔ اتنی زبردست کہانی پڑھتے ہوئے آنسو آگئے۔ ایک اکلوتا شوہر جیسی کہانی کو سرگزشت میں جگہ نہ دیں تو بہتر ہے۔ یہ کہانی کسی بھی طرح سے سچ نہیں لگ رہی ہے۔ ایک باپ جان بوجھ کر اپنی کم عمر بیٹی کو سوتن کے حوالے نہیں کرے گا پھر یہ بھی جان رہا ہے کہ ساس کو اس کی بیٹی پسند نہیں (وہ واقعہ ہی کہانی بن سکتا ہے جو انوکھا ہو، ملتان کی دولڑکیوں کی شادی آپ کو یاد ہوگی) حیات جاوداں جسے کنیز زہرا نے قلمبند کیا ہے پسند آئی۔ پون صدی بعد بھی دلچسپ لگی۔ ‘‘

☆ محمد احتشام نے لاہور سے ای میل کیا ہے۔ ’’میں نے ایک سچا واقعہ کہانی کے انداز میں لکھا ہے۔ کیا میں بھیج دوں؟ (ضرور بھیجیں)۔

☆ اشفاق حسین کا تجزیہ فیصل آباد سے۔ ’’ہر بار کی طرح اس بار کا شمارہ بھی لاجواب لائق تعریف ہے۔ ہر تحریر اپنی جگہ مکمل لیکن مجھے ارض فرض قرض، قیدی شہنشاہ، موساد کا شکار جیسی تحریر بہت پسند آئی۔ سچی کہانیوں میں ایک تھی حسینہ، دوراہیں، حیات جاوداں اور پون صدی بعد بہت پسند آئی۔ ‘‘

تاخیر سے موصول خطوط:

ریاض تبسم، ملتان۔ رانا فیصل، گوجرانوالہ۔ شگفتہ منیر، وہاڑی۔ سید مصور حسین شاہ، لاہور۔ سید ذوالفقار نقوی، رحیم یار خان۔ محسن خان، بنوں۔ عرفان، کراچی۔ عامر خان، کوئٹہ۔ دانش ظہیر قریشی، کراچی۔

طائرِ عرفان

زویا اعجاز

اس میں شک نہیں کہ کب سے انسان تلاش کرتا ہے ایک نئے دور کی توانائی، وہ بھی اسی تلاش میں تھا۔ ملکوں ملکوں پھرتا رہا۔ طائر آوارہ کی مانند طواف گردِ باد کرتا رہا برف و باد حالات سے ٹکراتا رہا۔ شاید یہ اس کی سعیٔ مسلسل کا ثمر تھا کہ بار بار قسمت در پہ خود ہی دستک دے دیا کرتی تھی، نہال کر دیا کرتی تھی مگر کچھ ایام گزرتے کہ مرحلہ سودو زیاں درپیش ہو جاتا۔

ایک معروف مسلم تاریخ داں کا احوال زیست

مسجد میں نماز فجر کی تکمیل ہو چکی تھی۔ سروں پر ٹوپیاں جمائے اور ہاتھوں میں تسبیح کے دانے گھماتے نمازی خاموشی، باوقار اور منظم انداز میں باہر آئے اور زیرِ لب مناجات کرتے ہوئے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان نمازیوں کی ایک تہائی تعداد مسجد میں بیٹھی تھی۔ وہ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد ہی واپس آیا کرتے تھے۔ مسجد سے باہر آنے والے گروہ میں ایک کم عمر لڑکا بھی تھا۔ وہ اپنے والد اور بڑے بھائی کے جلو میں بظاہر بہت خاموشی سے سر جھکائے چلا آرہا تھا لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے ذہن میں بہت زیادہ سوال اور الجھنیں تھیں۔ اس کی فطری ذہانت اور حساسیت والد کے مزاج میں غیر معمولی تبدیلی اور سکوت بھانپ چکی تھی۔ اب اسے اپنے سوالات اور الجھنوں کا جواب درکار تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتا رہا پھر والد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یا ابی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

''ہاں پوچھو فرزند!'' محمد بن الحسن اپنے خیالات سے چونکے۔

''کل یکم رمضان ہے ناں؟''

''ہاں! آج شعبان کی تیس تاریخ ہے۔ کل رمضان کی آمد میں کوئی دورائے نہیں۔'' محمد بن الحسن نے بڑی محبت سے بیٹے کے بال سہلائے۔ ان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ عبدالرحمٰن اپنے یومِ پیدائش کی وجہ سے یکم رمضان کے متعلق استفسار کر رہا ہے۔

''میں بھی روزہ رکھوں گا یا ابی! آپ نے گزشتہ برس کہا تھا کہ پہلے نماز کی پابندی کرو پھر روزہ رکھنے کی اجازت ملے گی۔''

''ٹھیک ہے فرزند! اللہ پاک تمہاری یہ عبادت قبول فرمائے اور تمہیں مکمل روح سے رمضان کے یہ روزے رکھنے کی سعادت بھی نصیب فرمائے۔'' وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ان کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں اضطراب کے رنگ مزید نمایاں ہو گئے۔ عبدالرحمٰن کی نظروں سے والد کی یہ کیفیات پوشیدہ نہ رہ سکیں لیکن اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ ان سے کس طرح ان کیفیات کی وجہ دریافت کرے۔

کچھ ہی دیر میں وہ گھر پہنچ گئے۔ محمد بن الحسن اسے قرآن کا سبق دہرانے کی ہدایت کرتے ہوئے ایک جانب بیٹھ گئے۔ عبدالرحمٰن کی ابتدائی تعلیم کی مکمل ذمے داری انہوں نے ہی سنبھال رکھی تھی۔ عبدالرحمٰن ایک ذہین اور معاملہ فہم لڑکا تھا۔ اپنے والد کی دی گئی تعلیم اور ان کی محنت کا بھرپور انداز میں ردِعمل دیتا تھا۔ محمد بن الحسن اپنے اس ہونہار شاگرد کی کارکردگی سے بہت خوش و مطمئن رہا کرتے تھے۔

''آج اتنے پژمردہ کیوں دکھائی دے رہے ہیں آپ؟ نصیب دشمناں مزاج تو بخیر ہے ناں؟'' عبدالرحمٰن کی والدہ ان کے پاس چلی آئیں۔

''رمضان کے مقدس مہینا کا آغاز ہونے والا ہے۔



ایسے مواقع اور تہواروں پر وطن کی یاد دل میں چٹکیاں بھرتی ہے۔'' محمد بن الحسن نے بتایا۔

''بالکل درست فرما رہے ہیں آپ!! آہ وطن...... میرا پیارا وطن......اس کی بہاروں میں سمائی خوشبو مجھے آج تک کہیں اور محسوس نہیں ہوئی ہے۔ اس کے پت جھڑ کی دلکشی ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتی۔ میرے وطن کے گرما کی چمکیلی دوپہریں' سرما کی یخ بستہ راتیں مجھے بھی بہت تڑپاتی ہیں۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کہتیں عبدالرحمٰن کو مزید حیران کر رہی تھیں۔ یکم رمضان 732ھ (بمطابق 27 مئی 1332ء کچھ روایات میں 1334ء) میں تونس کی فضاؤں میں آنکھ کھولنے والا عبدالرحمٰن تونس کو ہی اپنا وطن سمجھتا تھا۔ شمالی افریقا میں بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع اس ملک سے اسے فطری طور پر بہت محبت تھی۔ اس کے صحرائے اعظم' طویل ساحلی علاقوں اور زرخیز زمینوں کی مقامی کہانیاں اور روایات بھی بڑی مرغوب تھیں۔

''آپ عبدالرحمٰن کا سبق سن لیجیے۔ میں ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔'' والدہ نے اپنی آنکھوں میں آنے والی نمی صاف کرتے ہوئے منظر سے ہٹنے میں ہی بہتری سمجھی۔

''کیا سوچ رہے ہو فرزند؟'' محمد بن الحسن نے عبدالرحمٰن کی غائب دماغی بھانپ کر پوچھا۔

''وطن......وطن کی محبت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کیا کہ وہ انسان کو آبدیدہ اور افسردہ ہونے پر مجبور کر دے؟'' عبدالرحمٰن نے اپنی الجھن بیان کی۔

''بے شک فرزند! تم نے بالکل درست کہا۔'' محمد بن الحسن نے سرد آہ بھری۔

''لیکن ایسا کیوں ہے یا ابی؟'

''پروردگار نے کچھ جذبے انسان کی جبلت میں گوندھ دیے ہیں۔ فطرت میں مضبوط قوت ارادی سے تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے لیکن جبلت میں تبدیلی ناممکن ہے اس لیے ان جذبوں سے فرار بھی ممکن ہی نہیں اولاد کے لیے ماں باپ کی تڑپ' والدین کے لیے اولاد کی محبت' بہن بھائیوں کی باہمی قربت اور وطن کی محبت یہ سب انسانی جبلی جذبے ہیں۔ وطن تو بے آب وگیاہ صحرا یا سنگلاخ' پہاڑ بھی ہوں تو بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ ہمارا 'اشبیلیہ' تو بہت خوبصورت تھا فرزند! وہاں ہماری جڑیں پیوست ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں صرف اپنا وجود یہاں لے کر آیا ہوں۔ میری روح تو اب بھی وہیں کہیں بھٹک رہی ہوگی۔'' محمد بن الحسن کو بھی اندرونی گھٹن کا اخراج درکار تھا، اس لیے بلا تکان کہتے چلے گئے۔

''اشبیلیہ کے بارے میں کچھ اور بھی بتایئے ناں یا ابی!'' عبدالرحمٰن نے فرمائش کی۔

''اور کیا بتاؤں فرزند؟ بس اتنا جان لو کہ ہر انسان کو اپنا وطن جنت نظیر لگتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ تاریخی اہمیت کا حامل ہے اشبیلیہ۔ تمہاری پیدائش سے قبل ہمیں وہاں سے ہجرت کرنی پڑی تھی۔ جلاوطن کر دیے گئے تھے ہم۔ قوم جلالقہ کا بادشاہ 'ابن ادفوش' قابض ہوگیا تھا وہاں۔'' انہوں نے مختصراً بتایا۔

''فرزند کو ہمارے آباؤاجداد کے متعلق بھی کچھ بتایئے۔ اب وہ سمجھدار اور معاملہ فہم ہے۔ ان باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔'' اس کی والدہ نے صدا دی۔

''درست کہہ رہی ہو! اب وقت آگیا ہے کہ عبدالرحمٰن اپنے آباؤاجداد اور نسب کے متعلق تفصیل جان لے۔'' محمد بن الحسن مسکرائے۔ ''سنو فرزند! تمہیں علم ہونا چاہیے کہ تمہارا مکمل نسب 'عبدالرحمٰن بن محمد بن محمد بن الحسن بن محمد جابر بن محمد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن خلدون' ہے۔ ہمارا یہ نسب ''حضرموت'' کے علاقہ میں قوم یمنی عربوں میں 'وائل بن حجر' تک پہنچتا ہے۔'' محمد بن الحسن کے لہجے میں یہ نام لیتے ہوئے ایک عجیب سی حلاوت اور احترام در آیا۔

''وائل بن حجر کون تھے یا ابی؟'' عبدالرحمٰن متجسس ہوا۔

''ان کا شمار عرب کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ بہت مشہور شخص تھے وہ۔ وائل بن حجر بن سعید بن مسروق بن وائل بن النعمان بن ربیعہ بن الحارث ابن عوف بن سعد بن عدی بن مالک بن شرجیل بن حارث ابن مالک بن مرۃ وہ کچھ دیر کے لیے رکے سانس لی پھر ادھورے جملے کو مکمل کیا بن حمیری بن زید بن الحضرمی بن عمرو بن عبداللہ (ابن ہانی) بن عوف بن جرشم بن عبدشمس بن زید بن لائی بن شبت ابن قدامتہ بن اعجب بن لائی بن قحطان۔''

وہ روانی سے بتاتے چلے گئے پھر ایک توقف کے بعد مسکرا کر بولے جانتے ہو۔'' وائل بن حجر کو رسول اللہ کی صحبت بھی نصیب ہوئی تھی۔''

''کیا واقعی؟'' عبدالرحمٰن دم بخود ہوا۔ ''کس قدر خوش نصیبی تھی یہ۔'' اسے اپنا بدن سنسناتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”بے شک یہ بہت خوش بختی تھی۔ وائل بن حجر حضرت محمدؐ کی بارگاہ میں گئے تو آپؐ نے ان کے لیے اپنی چادر بچھائی، انہیں اس چادر پر بٹھایا اوران کے لیے دعا فرمائی کہ یااللہ! وائل بن حجر، اس کے بیٹوں اور پوتوں میں تا قیامت برکت رکھنا۔ اس کے بعد وائل بن حجر کو ان کی قوم کی جانب بھیجا گیا تاکہ وہ قرآن واسلام کی تعلیم دیں۔“

”کاش مجھے بھی ایسی سعادت نصیب ہوجائے۔“ عبدالرحمٰن نے حسرت سے کہا۔

”علم کی طلب اور محبت ترک نہ کرنا فرزند! بے شک علم ہی ایک ایسا زینہ ہے جس سے شہرت اور کامیابیوں کی معراج حاصل ہوسکتی ہے۔ اب دیکھو ناں! اندلس کے الموحدون کی سلطنت کے سقوط اور عیسائیوں کی فتوحات کے بعد ہی ہمارا خاندان سبتہ چلا گیا تھا۔ تمہارے پردادا ’الحسن‘ کو علم ہی کی بنیاد پر حفصیہ خاندان کے حکمران ’ابوزکریا‘ نے ’بونہ‘ میں قیام کے لیے مدعو کیا۔ حفصی امراء اور رؤساء نے الحسن اور میرے والد ابوبکر محمد کو بے شمار مراعات عطا کیں۔ ابوبکر محمد کو ’عامل الاشغال‘ (محاسب اعلیٰ) کا لقب دیا گیا۔“

”لیکن دادا جان کو تو قید خانہ میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا ناں؟“ عبدالرحمٰن کو یاد آیا۔

”حق کی راہ پر چلنے والے شخص کی زندگی میں بہت سی رکاوٹیں آیا کرتی ہیں۔ یہ راستہ آسان تھوڑی ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے سرکاری عہدے قبول نہیں کیے۔ میں نے ہمیشہ اپنی توجہ مطالعہ اور مراقبہ میں ہی مبذول رکھی ہے۔ وہ اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بولے میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا! سرکاری عہدے اور دربار سے وابستگی نفس واعصاب کا بہت بڑا امتحان ہوتی ہے۔ اس امتحان میں اپنا دامن بچاتے ہوئے سرخروئی حاصل کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہے۔“

عبدالرحمٰن نے والد کے وہ الفاظ گرہ سے باندھ لیے۔ علم دوست شخص تو وہ پہلے ہی تھا۔ اس تاکید کے بعد اسے اپنے دل میں ایک نئی شمع جلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کی خواہش تھی کہ وائل بن حجر کے علاوہ خاندان کو اس کے نام سے بھی یاد رکھا جائے۔

اس روز کے بعد اس نے والدین کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دیا۔ بڑا بھائی ’محمد‘ البتہ پڑھائی لکھائی کی طرف بالکل راغب نہ تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی ’یحییٰ ابوزکریا‘ پڑھائی میں قدرے بہتر تھا۔ ابتدائی تعلیم کے مدارج نہایت

کامیابی سے طے کیے۔ اب وہ نوجوانی کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔

''فرزند! میں بحیثیت معلم تم سے بہت شاد ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم مکتب کے اساتذہ سے شرف یاب ہو جاؤ۔'' والد نے اسے ایک نئی راہ سجھائی۔ گو کہ یہ ایک عام سی بات تھی مگر اس جملے کا اثر بعد میں کس طرح سامنے آیا اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

''آپ یقیناً میرے لیے بہترین فیصلہ ہی کریں گے۔ میں آپ کی منتخب کردہ راہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' عبدالرحمٰن نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی ایک نیا موڑ لے رہی ہے جو حوادث زمانہ کا رخ موڑ دے گی۔

والد نے اسے مکتب کے استاد 'ابوعبداللہ محمد بن نزال انصاری' کے حوالے کر دیا۔ ابوعبداللہ کا تعلق بھی ان افراد سے تھا جو اندلس سے جلاوطن ہونے کے بعد تونس آئے تھے۔ وہ 'بلنسیہ' کے مضافات میں رہائش پذیر تھے۔ ابوعبداللہ قرأت کے ایک نمایاں امام تھے۔ قرأت سبع میں خاصے نامور سمجھے جاتے۔ (قرأت سبع ان اقراء کو کہا جاتا ہے جن سے قرآن کریم کی قرأت کے سلسلہ میں متعدد روایتیں وارد ہوئی ہیں۔ ان روایتوں میں بعض مقامات پر کلمات' اعراب وغیرہ کا اختلاف پایا جاتا ہے) انہوں نے 'ابوالعباس احمد البطرنی' سے فیض حاصل کیا تھا۔ احمد البطرنی کے مشائخ اور سند کی بے حد توقیر تھی۔ عبدالرحمٰن نے قرآن کریم مکمل حفظ کر کے اسے معروف عام سات قرأتوں' اکیس ختموں میں افراداً اور جمعاً سنایا۔ اس مرحلہ میں کامیابی کے بعد قرآن ایک 'ختم' میں جمع کیا اور بعد ازاں ایک ختم میں دونوں روایتوں کے توافق سے سنایا۔ ابوعبداللہ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو نہ صرف قرأت کے بارے میں 'شاطبی' کے دو قصائد اور کتابت کے بارے میں قصیدہ رائیہ کے متعلق آگاہ کیا بلکہ ابوالعباس البطرنی وغیرہ کی ان دونوں قصائد کی بابت دی گئی تعلیم بھی اس کے گوش گزار دی۔

اگلا مرحلہ احادیث کی کتب سے استفادہ کا تھا۔ عبدالرحمٰن نے یہ کتب بہت لگن اور دل جمعی سے پڑھیں مگر اس نے یہ کتابیں حفظ تو نہ کیں البتہ ابن عبدالبر کی موطاء کے بارے میں 'کتاب التقصی' کے علاوہ ابن مالک کی 'التسہیل' فقہ کے متعلق ابن الحاجب کی 'مختصر' نامی کتب پڑھ کر سنا دیں۔

اساتذہ کے متعلق عبدالرحمٰن ہمیشہ خوش قسمت ثابت ہوا۔ مقدر کی یاوری نے اسے ایک سے بڑھ کر ایک قابل اور نامور معلم فراہم کیے۔ والد نے بھی اس سے چشم پوشی نہ کی۔ دیگر اساتذہ کے ساتھ وہ بھی اسے بھرپور وقت دیا کرتے۔ تونس کے ان اہل اساتذہ اور والد سے عربی زبان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہ اس زبان پر مکمل دسترس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اساتذہ میں 'شیخ ابوعبداللہ محمد بن العربی الحصایری' سرفہرست تھے۔ وہ علم نحو کے مشہور امام تھے (علم نحو قواعد زبان اور لسانیات کا وہ حصہ ہے جس میں مرجبات اور جملوں کی بناوٹ کا علم حاصل کیا جاتا ہے) انہوں نے 'کتاب التسہیل' کی مفصل شرح لکھی تھی۔ اس کے بعد 'ابوعبداللہ محمد بن الشواش الزرزانی' نے بھی عبدالرحمٰن پر بہت محنت کی۔ ابوالعباس احمد بن القصار نے علم نحو میں اپنی مہارت عبدالرحمٰن میں منتقل کر دی۔ ابوالعباس کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کی تعریف میں تحریر کردہ نامور قصیدہ بردہ کی شرح تحریر کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اسے عربی زبان و ادب کے امام 'ابو عبداللہ محمد بن بحر' سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا۔ عبدالرحمٰن کی عقیدت بھی ایسی شدید تھی کہ اس نے خود کو امام ابوعبداللہ کی مجلس سے وابستہ کر کے ان کی ہم نشینی اختیار کر لی۔ وہ بلاتعطل ان کے پاس حاضری دیا کرتا۔

''عبدالرحمٰن! میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تم افق کے ایک روشن ستارے بنو گے۔'' وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا کرتے۔

''یہ سب آپ کی ذرہ نوازی اور محبت ہے استاد محترم!'' وہ عاجزی سے سر جھکا کر بولا۔ علوم اللسان کے اس عمیق سمندر سے استفادہ کرنا اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

''میرا ایک مشورہ مانو تو اشعار یاد کرنا شروع کر دو۔'' انہوں نے کچھ سوچ کر تجویز دی۔

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ علم کا سمندر اپنے اندر اتارنے میں کوشاں ہے اسی لیے اس نے ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اشعار کی چھ کتب' الاعلم کی 'الحماسہ جیب' کی 'شعر'.. متنبی کے اشعار کا کچھ حصہ اور 'کتاب الاغانی' کے کچھ اشعار یاد کر لیے۔

اب اس کی زندگی ایک نیا موڑ لے رہی تھی اسی لیے اس نے امام ابوعبداللہ کے علاوہ عبدالرحمٰن نے تونس کے

ثین شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن جابر بن سلطان
الواد یاشی‘ کی مجلس سے بھی وابستگی اختیار رکھی۔
الدین ’الرحلتین‘ نامی کتاب کے خالق تھے۔
عبدالرحمٰن نے انہیں ’مسلم بن الحجاج‘ کی کتاب ’الافو تا لیسیرا
ن کتاب الصید‘ اور ’کتاب الموطاء‘ مکمل سنائیں۔ اس کے
علاوہ ’امہاتمس‘ میں سے بھی بعض کتابیں سننے کے بعد شمس
الدین نے اسے عربی اور فقہ کی کئی کتابوں کی سند عطا کر کے
تعلیم دینے کی عام اجازت بھی دے دی۔

”میرے لیے مزید کیا حکم ہے استاد محترم؟“
عبدالرحمٰن اس کامیابی اور حصول علم کے باوجود خود کو تشنہ لب
محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ ایک اہم منزل کی جانب بڑھتا جا
رہا تھا۔

”میں تمہاری کیفیات سمجھ رہا ہوں میرے بچے!“ وہ
مسکرائے۔ ”علم کی یہ پیاس کبھی بجھنے نہ دینا۔ میں تمہیں چند
مشائخ کے متعلق آگاہ کروں گا۔ تم ان کی بھی مجلس سے
وابستہ ہو جانا۔“

”میں بسرو چشم راضی ہوں استاد محترم! ایک پیاسے کو
دریا کے پاس جانے سے انکار کیونکر ہوگا بھلا؟“ وہ بے تابی
سے بولا۔

”ابھی میں تمہیں تونس کے قاضی الجماعۃ ’ابوالعباس
احمد بن الغمار الخزرجی‘ کے پاس بھیجوں گا۔ اس کے بعد تم...
تونس ہی کی ایک جماعت سے فقہ کا علم بھی ضرور حاصل کرنا۔“
ان کے مشورہ پر عبدالرحمٰن نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس نے
’ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الجیانی‘ اور ’ابوالقاسم محمد القصر‘ سے
خوب استفادہ کیا۔

ان سے ابوسعید البرداعی کی ’کتاب التہذیب‘
’مختصر المدونہ‘ اور ’کتاب المالکیہ‘ کی اصل روح سمجھی۔
’قاضی الجماعۃ ابوعبداللہ محمد بن عبدالسلام‘ کے توسط وہ تونس
کے نامور مشائخ سے میل جول قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔
اسی دوران اس نے ’امام مالک‘ کی کتاب ’موطاء‘ پر بھی
دسترس حاصل کر لی۔

قاضی الجماعۃ کے تجویز کردہ مشائخ نے عبدالرحمٰن کی
زندگی سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے احادیث
کی ان گنت کتابوں کا علم حاصل کیا۔

عبدالمہیمن کے علاوہ عبدالرحمٰن نے مغرب کے امام
المقرئین ’شیخ ابوالعباس احمد الزواوی‘ کے ساتھ وقت بسری
الزواوی کی جانب سے بھی عام اجازت مل گئی۔

اجمالی خاکہ

پیدائش......27 مئی 1334ء۔ (بعض روایات میں 1332 بھی درج ہے۔)
فاس میں کتابت......1357ء
اسپین آمد......1374ء
مقدمہ ابن خلدون......1377ء
اسکندریہ آمد......دسمبر 1382ء
قاضی القضاۃ مصر......اگست 1384ء
دمشق آمد......1401ء
وفات......26 رمضان 808ھ......مارچ 1406ء

زندگی بظاہر بہت مہربان اور پُرسکون تھی لیکن کسے علم تھا کہ
تعلیمی افق کے ان روشن ستاروں اور والدین جیسی عظیم
ہستیوں سے جدائی کا وقت آ گیا ہے۔

☆☆☆

موت ایک ایسی آفاقی سچائی ہے جس سے کائنات
کے کسی ذی نفس کو فرار حاصل نہیں ہے۔ زندگی کو اپنی امانت
سمجھ کر اس کی حفاظت کرنے والی یہ موت اپنی تمام تر سچائی
کے باوجود ہر ایک کے لیے کسی گہرے زخم سے کم نہیں ہوتی۔
زندگی میں موت کا سفر اختیار کرنے والی کسی ایک ہستی کا غم
مندمل ہونے میں برسوں بیت جاتے ہیں۔ وقت کی دھول
اس زخم کو مندمل تو کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بچھڑنے
والوں کی کمی خلش اور کسک بن کر تا عمر ستاتی ہے۔ عبدالرحمٰن
کی بدقسمتی کو کیا کہیے کہ وہ ایک ہی جھٹکے میں اپنے والدین‘
عزیز و اقارب اور مذکورہ بالا تمام تر مشائخ سے محروم ہو گیا۔
اس کے دکھ اور کرب کا اندازہ لگانا کسی عام شخص کے لیے
ممکن ہی نہیں۔ تونس میں پھوٹنے والی طاعون جارف نامی
وبا نے ان گنت زندگیوں کے چراغ گل کر دیے۔ عبدالرحمٰن
بھی بیسیوں افراد سے دائمی جدائی کا شکار ہو گیا۔ وہ وقت
اس کے لیے اذیت اور کٹھنائیوں کی ایک نئی انتہا تھا۔ اس
کے کرب کا اندازہ صرف وہی افراد کر سکتے ہیں جنہوں نے
کسی حادثہ یا وبا میں اس قدر کثیر تعداد میں اہل و عیال اور
گوہر نایاب کھو دیے ہوں۔ عبدالرحمٰن کے لیے زندگی کی
بے وفائی سے سمجھوتا کرنا ہرگز آسان نہیں تھا۔ والدین کی
محبتوں سے مہکتا گھر موت کی ان چاہی خوشبو کے باعث
نہایت ہولناک لگتا۔ در و دیوار اسے نگلنے کے لیے بے تاب

نظر آتے۔ گھر جانے کو دل ہی نہ کرتا لیکن جاتا بھی تو کہاں؟ علمی مجالس بھی تو اجڑ چکی تھیں۔ ان مجالس کے روح رواں بھی منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ علم کے پھول جھڑتی زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی تھیں۔ وہ وقت عذاب ناک تھا لیکن اسے کسی نہ کسی طور بیتنا تو تھا ہی۔ سو بیت گیا۔ تنہا، افسردہ اور ملول عبدالرحمٰن پہلے سے بھی زیادہ لگن سے حصول علم کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس بار اس نے 'شیخ ابو عبداللہ الآبلی' کی مجلس سے منسلک ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ الآبلی علوم عقلیہ کے ماہر تھے۔ ان کا تعلق تلمسان سے تھا۔ تعلیم و تربیت اور پیشہ ورانہ قابلیت کے مراحل طے کرنے کے بعد انہیں بھی ساتویں صدی ہجری میں ہونے والے محاصرہ کی وجہ سے تلمسان سے فرار ہونا پڑا۔ تلمسان سے نکلنے کے بعد حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ دگرگوں حالات اور اپنے آبائی وطن سے جلاوطنی نے الآبلی کو ذہنی بیماری میں مبتلا کردیا۔ ان کی علوم عقلیہ میں قابلیت کا یہ عالم تھا کہ تونس آنے سے پہلے مراکش میں شاہی دربار سے منسلک ہوکر اہل مغرب میں علوم عقلیہ کی ترویج کرتے رہے۔ ان کی تدریس میں اس قدر تاثیر تھی کہ شاگردوں کی کثیر تعداد ماہر ترین معلم کے عہدوں پر فائز ہوتی گئی۔ عبدالرحمٰن الآبلی کے اس غائبانہ تعارف سے ہی متاثر ہوا تھا۔ زندگی کے مصائب سے لڑتے ہوئے اور اپنوں کی دائمی جدائی کی خلش جھیلتے ہوئے اسے ایسے ہی کسی شخص کی رفاقت درکار تھی جو اس کے لیے بھی مثبت تحریک ثابت ہو۔

عبدالرحمٰن نے الآبلی سے 'الاصلین' منطق اور تمام فنون حکمیہ اور تعلیمیہ سیکھے۔ اگلے تین برس تک وہ الآبلی سے علوم سیکھنے اور سنانے میں مشغول رہا۔ اس دوران سلطان ابوعنان نے الآبلی کو اپنے پاس دربار میں طلب کرلیا۔ اس کے جانے کے بعد تونس کے حاکم ابومحمد بن تافراکین نے سلطان ابواسحاق کی علامت کی کتابت کے لیے بلوا بھیجا۔ اس وقت صاحب علامت ابوعبداللہ محمد بن عمر تھا۔ اس نے تافراکین سے بخشش بڑھانے کی درخواست کر دی۔ یہی درخواست اس کی خطا ثابت ہوئی۔ اس 'جرم' کی پاداش میں ابوعبداللہ کو عہدہ سے معزولی کا پروانہ تھما کر منصب عبدالرحمٰن کو سونپ دیا گیا۔ عبدالرحمٰن اس عہدہ پر فائز ہوکر بھی خوشی محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے دل میں اضطراب، خلش اور احساس محرومی پنپ رہی تھی تاہم اس نے چاروناچار سلطان کی جانب سے علامت تحریر کی۔ 'بسم اللہ' کے درمیان

موٹے قلم سے 'الحمدللہ والشکر اللہ' کے الفاظ تحریر کرنے کے بعد سلطان کا خطاب اور فرمان درج کر دیا گیا۔ سلطان کو اس کا یہ انداز پسند آیا۔ اسے اس اکیس سالہ جوان میں ہنر اور قابلیت کا سمندر موجزن دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بہرصورت اسے اپنے ساتھ ہی منسلک رکھنا چاہتا تھا اور دوسری جانب عبدالرحمٰن کو یہ عہدہ خار کی طرح چبھ رہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح اس بلائے ناگہانی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی بخوبی علم تھا کہ اگر سلطان کو اس کے ارادوں کی ذرا سی بھنک بھی لگ گئی تو عتاب در عتاب کا طویل سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ سابقہ شیوخ کے انتقال اور حصول علم میں مزید رکاوٹوں نے دل و دماغ میں الگ انتشار برپا کر رکھا تھا۔ اب وہ تونس سے نکل کر دیگر علاقوں کے قابل ذکر اور اہل افراد سے مستفید ہونا چاہتا تھا۔

انہی دنوں 'بنومرین' اپنے مرکز میں لوٹے۔ ان کے ہمراہ فضلاء میں اکثریت دوست و احباب کی تھی۔ عبدالرحمٰن کو بھی آنے کی دعوت دی گئی مگر اس نے ان کے ہاں جانے سے انکار کردیا لیکن جب کام کرنے کی دعوت ملی تو اس وقت وہ انکار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس عمل سے مغرب روانگی کا مقصد حاصل ہو رہا تھا۔

تونس سے نکلنے کے بعد وہ سب 'ہواراہ' پہنچ گئے۔ یہاں سپاہی ایک دوسرے کی جستجو میں 'مرماجنہ' کی طرف بڑھنے لگے۔

اس دستے کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ عبدالرحمٰن کسی طرح بچ کر 'ابتہ' آ گیا۔ اس کی قسمت از خود راہیں متعین کر رہی تھی۔ اسے مرابطین کے رؤسا میں سے 'شیخ عبدالرحمٰن ابوشستانی' کے ہاں قیام کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد 'سبتہ' میں حاکم محمد بن عبدون کے پاس چند روز بسر کیے۔ عبدون نے اس کی مشکلات بھانپ کر اسے عربوں کے ایک دوست کے ہمراہ راستہ دے دیا۔ الوداعی ملاقات اور شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنے کے بعد عبدالرحمٰن 'قفصہ' روانہ ہوگیا۔ قفصہ میں کئی روز قیام کا موقع ملا۔ اسی دوران الزاب کا حاکم یوسف، اس کا بھائی منصور بن مزنی اور فقیہ محمد بن الرئیس اس سے ملاقات کے لیے آئے۔ تبھی انہیں خبر موصول ہوئی کہ مغرب پر سلطان ابوعنان قابض ہو گیا ہے اور امیر ابوزید نے تونس کا محاصرہ کرلیا ہے۔

حالات میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اس خبر کے بعد علم ہوا کہ ابوعنان نے تلمسان پر حملہ

کر کے نا صرف قبضہ کرلیا ہے بلکہ تلمسان کے سلطان اور اس کے بھائی 'ابو ثابت' کو بھی قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ 'المریۃ' پہنچ گیا اور بجایہ کو سلطان ابو یحییٰ کے پوتے امیر ابو عبداللہ سے چھین لیا۔ یہ قبضہ بھی سیاست اور مصلحت پسندی کی ایک انوکھی مثال تھی۔ بجایہ کے نزدیک پہنچتے ہی ابو عنان نے ابو عبداللہ سے خط و کتابت کا آغاز کر دیا۔ ابو یحییٰ نے شہر سے دست برداری میں ہی عافیت سمجھی۔ ابو عنان نے بنی وزیر میں سے شیخ بنی اطاس عمر بن علی کو بجایہ کا حاکم بنا دیا۔

عبدالرحمٰن کی بصارت سیاسی افق پر تند و تیز تبدیلیاں رونما ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ بجایہ کے حاکم کی تعیناتی کی اطلاع ملتے ہی امیر نے تونس کا محاصرہ ترک کر کے فرار کو ترجیح دی۔ فرار کے اس سفر میں اسے 'قفصہ' سے گذرنا تھا۔ محمد بن مزنی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ الزاب روانہ ہونے سے پہلے وہ عبدالرحمٰن سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔ حالات و واقعات کے پیشِ نظر عبدالرحمٰن نے بھی اس کے ساتھ ہی روانگی کا ارادہ کرلیا۔ وہ بسکرہ تک اس کے ہمراہ ہی رہا۔ اس کے بعد محمد بن مزنی اور دیگر افراد اپنے لیے محفوظ پناہ گاہیں، راہیں اور ضمانتیں تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اقتدار سے محرومی اور جنگ و جدل میں ناکامی ایسے ہی لامتناہی سلسلوں کو جنم دیا کرتی ہے جس کا انجام گمنامی کی زندگی یا عبرتناک موت ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

سرما کا اختتام ہو چکا تھا۔ بہار نے ہر سو اپنے رنگ بکھیرنے شروع کر دیے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے لدی فضائیں دلوں میں امنگ اور ولولہ پیدا کرتی تھیں لیکن سیاسی افق پر چھائے بادل اس قدر دبیز اور ہولناک تھے کہ کوئی بھی خوبصورتی محسوس ہی نہیں ہونے دے رہے تھے۔ بجایہ پر قبضے کے بعد ابو عنان نے شیوخ بنی اطاس میں سے عمر بن علی الوزیر کو حاکم بنا دیا تھا۔ ابو عنان کے اس عمل اور انتخاب نے مقامی افراد میں اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ منہاجتہ کا ایک جذباتی اور نا سمجھ شخص عمر بن علی کے قتل کا منصوبہ بنا کر اسے اسی کی نشست گاہ پر مار کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہ صورتِ حال قطعی ناقابلِ برداشت تھی۔ امیر ابو زید کو قسطنطنیہ سے بلایا گیا۔ اہلِ شہر سلطان کے جلال سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ مزید سیاسی جھمیلوں میں الجھنے سے بچاؤ کے لیے عبدالرحمٰن نے سلطان ابو عنان کے پاس تلمسان روانگی کا ارادہ کرلیا۔

بسکرہ سے روانہ ہونے کے بعد اس کی ملاقات 'بطحا' میں 'ابی عمرؒ' سے ہوئی۔ ابی عمر و علوم و فنون کے اس شیدائی نوجوان سے کافی متاثر ہوا۔ ابی عمرو کی جانب سے ملنے والی محبت عزت اور عقیدت عبدالرحمٰن کے لیے منفرد تھی۔ اس کے ساتھ کچھ عرصہ وقت گذاری کے بعد عبدالرحمٰن وفود کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ ابی عمرو بجایہ چلا گیا۔ عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت بائیس سال ہو چکی تھی۔ حالات میں ایک بار پھر تبدیلی پیدا ہوگئی۔ سرما میں سلطان ابو عنان واپس 'فاس' چلا آیا۔ انتظامی امور سے نمٹنے کے بعد ابو عنان نے ہر علم دوست حکمران کی طرح علمی مجالس کے اہتمام کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ ان مجلسوں میں مذاکرہ کے لیے طلباء کا انتخاب کرنا چاہتا تھا۔ اسے عبدالرحمٰن کے متعلق بتایا گیا۔ ابو عنان اپنے مصاحبین کی گفتگو اور عبدالرحمٰن کی تعریفیں سن کر اس سے ملاقات کے لیے متجسس ہو گیا۔

عبدالرحمٰن 755ھ میں اس کے پاس پہنچا۔ اسے فوری طور پر مجلس کے علماء میں شامل کرلیا گیا۔ اس شمولیت کے علاوہ اسے نمازوں میں حاضر رہنے کی تاکید بھی کر دی گئی۔ بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ مسئلہ کا آغاز تو اس وقت ہوا جب عبدالرحمٰن کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے ابو عنان کی کتابت اور اس کے سامنے مہر ثبت کرنے کا کام سونپ دیا گیا۔ عبدالرحمٰن اس عہدہ سے بہت خار کھاتا تھا۔ کتابت درحقیقت ایک نازک منصب تھا۔ اس منصب کا حامل ان 'والیوں' اور 'عاملوں' کو احکام سلطنت لکھتا تھا جو بذات خود بادشاہ کے حضور موجود نہ ہوں۔ غیر ممالک سے مراسلت اور غائب اشخاص کے حق میں ضروری اور امر کا بیان بھی کاتب کی ذمے داری ہوتی تھی۔ یہ منصب کسی بھی وزارت سے کم نہ تھا۔ وزارت میں بھی وزیر کارِ سلطنت کا بار اٹھا کر ہر قسم کی مہمات میں بادشاہ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ موجودہ وقت کی اصطلاح میں کاتب کو 'فارن سیکریٹری' کہا جا سکتا ہے۔

عبدالرحمٰن نے چار و ناچار یہ ذمے داریاں سنبھال لیں۔ اس کے علاوہ وہ مطالعہ، غور و فکر کرنے، اہلِ مغرب کے مشائخ، اندلس کے سفارت کاروں سے ملاقاتوں میں وقت گذاری کرنے لگا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات مراکش سے تعلق رکھنے والے استاذ ابو عبداللہ محمد بن الصفار سے ہوئی۔ الصفار ایک نامور 'امام القرأت' تھا۔ اس نے مغرب کے مشائخ اور محدثین کے شیخ ابو عبداللہ محمد بن رشید الفہری

سے علم حاصل کر رکھا تھا۔ الصفار اہل مغرب کے لیے سند کا درجہ رکھتا تھا۔ الصفار سے علم کی پیاس بجھانے کے بعد عبدالرحمٰن فاس کے قاضی الجماعۃ ابوعبداللہ محمد المقری سے روابط بڑھائے۔ المقری کی قابلیت میں بھی کوئی دو رائے نہ تھی۔ اس کی اہلیت اور جدوجہد دیکھ کر عبدالرحمٰن رشک میں مبتلا ہونے لگتا۔ المقری سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ملاقات ’المریہ‘ کے رہائشی ’شیخ ابوالبرکات محمد بن ابراہیم بن الحاج البلفیقی‘ سے بھی رہی۔ وہ اندلس کے فقہاء محدثین‘ ادباء‘ صوفیاء اور خطیبوں کے شیخ تھے۔ معارف کی اسالیب اور ملوک کی صحبت کے آداب بہترین انداز میں بیان کرنے میں لاثانی تھے۔

عبدالرحمٰن کی ذاتی اہلیت‘ علم دوستی‘ پیشہ وارانہ مہارت اور اہل علم سے متواتر ملاقاتوں نے دربار میں موجود سازشی عناصر کو مضطرب کرنا شروع کر دیا۔ حاسدین اپنے دل میں بھڑکنے والی آگ کی تپش سے سوختہ ہو گئے تو نئی سازش کے تانے بانے بننے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

”سلطان کی عقل کو جانے کیا ہو گیا ہے؟ ایک اجنبی اور پردیسی کو کتابت کا کام سونپ دیا۔ ہم اسے نظر نہیں آئے کیا؟“ ایک شخص نے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

”ہاں! ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ایک غیر مقامی شخص شاہی مجلس میں مناظرہ کرنے اور مہر لگانے کے کام پر معمور نظر آتا ہے تو میرا دل بھی جلنے لگتا ہے۔ مجھے قوی اُمید تھی کہ کتابت کا عہدہ مجھے مل جائے گا۔“ دوسرے شخص نے بھی زہر اگلا۔

”اس ایک سال میں اس شخص نے کافی پُر پرزے نکال لیے ہیں۔ کسی نجی محفل‘ دعوت یا اجتماع میں شریک ہونے کی بجائے ابن صفار‘ المقری‘ البلفیقی کی مجلسوں میں شریک ہوتا ہے،۔ اور سلطان اس کی علم دوستی پر مسرور ہوتا رہتا ہے۔“ تیسرے شخص نے بھی اپنے جذبات کو گویائی دی۔

”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ان علمی مجلسوں میں شرکت کے بہانے وہ اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی نظریں وزارت کے کسی عہدہ پر ہوں۔ شادی بھی رچائے بیٹھا ہے۔ مجھے تو وہ یہاں سے جاتا دکھائی نہیں دیتا۔“ پہلے شخص نے نکتہ اٹھایا۔

”تمہارے منہ میں خاک! وزارت تو ہم لوگوں میں سے ہی کسی کو ملنی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ دوسرا ساتھی تڑپ اٹھا۔ اس کی یہ تڑپ کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ وزارت کا عہدہ تمام تر مناصب سلطنت سے بالاتر ہوتا تھا۔ دیگر سبھی منصب کسی نہ کسی طرح اسی کی شاخ ہوتے تھے۔ وزیر تمام کار سلطنت کا بار اٹھاتا تھا۔ ہر قسم کی مہمات میں بادشاہ کا ہاتھ بٹاتا۔

”عبدالرحمٰن جس طرح علمی مجالس میں شریک ہو کر علم حاصل کرتا دکھائی دے رہا ہے مجھے تو اس کے ارادے کچھ اور ہی لگتے ہیں۔ المقری سے مراسم بڑھانے کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کتابت کے علاوہ فقیہہ کے فرائض سنبھالنا چاہتا ہو۔“ دوسرا عہدیدار بھی دور کی کوڑی لایا۔

اس کی بات سن کر بقیہ دو افراد کے چہرے متغیر ہونے لگے۔ ریاست میں فقیہہ کا منصب اور اس کی اہمیت ناگزیر تھی۔ فقیہہ ملوک اور سلاطین کے مراتب اور ان شرائط کی جانچ پڑتال کرتا تھا جن کی بدولت کسی بھی عہدیدار کو ملک و سلطنت میں کوئی عہدہ مل سکتا تھا۔ فقیہہ وہ شرائط بھی قائم کر سکتا تھا جن سے سلطان اپنے فرائض ادا کر سکے۔ مختلف احکام و معاملات مثلاً وزارت صیغہ‘ خراج ولایۃ میں فقیہہ کی رائے بہت اہم اور ناگزیر ہوتی۔

”پروردگار بھی ایسا وقت نہ لائے دوستو!“ تیسرے شخص نے جھرجھرا کر کہا۔

”یہ تو نوشتہ دیوار ہے میرے عزیز! ہمیں کوئی حل نکال لینا چاہیے۔ سلطان کی نظر میں عبدالرحمٰن کا مقام گرانے اور اس کے دل میں گرہ باندھنے کا آغاز کر دینا ہی بہتر ہے۔“ پہلے عہدیدار نے تجویز دی۔

”کیا سلطان ہماری بات پر اعتبار کرے گا؟“ دوسرا شخص متامل تھا۔

”اسے اعتبار کرنا ہی ہوگا۔ کچھ عرصہ سے وہ صحت کے کافی مسائل کا شکار ہے۔ جسمانی عوارض ایک حد سے بڑھ جائیں تو دل و دماغ میں موت کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے میں زندگی کی بھوک اور نعمتوں سے فیض یاب ہوتے رہنے کی تمنا عام حالات سے کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ابوعنان تو پھر ایک حکمران ہے۔ کسی حکمران میں جاہ طلبی اور زندگی سے محرومی کا خوف عام انسان سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔“ پہلے شخص نے کہا۔

”ہاں! اور اس کے لیے ہم حاکم بجایہ کا نام استعمال کریں گے۔ کیسے اور کس طرح؟ یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ تیسرے عہدیدار نے معنی خیزی سے کہا اور اسی روز سے اپنے کام میں جت گیا۔

سلطان ابوعنان کافی بیمار ہو چکا تھا۔ اسے یہ بات گوش گذاری گئی کہ حاکم بجایہ اپنا شہر واپس لینے کے لیے فرار پر عمل کر رہا ہے۔ ان دنوں اس کا وزیر اعلیٰ 'عبداللہ بن علی' تھا۔ ان دونوں افراد کے گرد سازش کے تانے بانے بن کر عبدالرحمٰن کی ذات بھی اچھی خاصی رگید ڈالی گئی۔ سلطان نے کسی تحقیق یا گہرائی میں سوچنے کی بجائے ان دونوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اٹھارہ صفر 758ھ کو عبدالرحمٰن زندان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ وقت صبر اور برداشت کی ایک نئی آزمائش بن کر وارد ہوا تھا۔ عہدہ' طاقت' تعلیمی مجالس' گہما گہمی' رونق' احباب سے گفتگو' مناظرے سب کچھ ایک ہی پل میں کھو گئے۔ اب صرف تنہائی' قید' جبر' قہر' زندان کی نیم تاریکی اور الجھی ہوئی لامتناہی سوچیں باقی رہ گئی تھیں۔ عبدالرحمٰن ذہنی طور پر شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے زندان کے پہریداروں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ اس طرح وہ قرب وجوار کے اہم ترین حالات سے آگاہ ہو جایا کرتا۔ اس تنہائی و فراغت میں اس نے بارہ سو اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ لکھ کر سلطان کو مخاطب کیا جس نے اس کا دل موم کر دیا۔ سلطان اس وقت تلمسان میں تھا۔ اس نے فاس آنے کے بعد اس کی رہائی کا عزم بھی ظاہر کیا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ واپسی کے بعد اس کی علالت ایک بار پھر عود آئی۔ یہ علالت اور اذیت اس قدر بڑھی کہ اسے کوئی بھی عزم' فیصلہ یا معاملات حل کرنے کا یارا ہی نہ رہا۔ صورتِ حال اس قدر تیزی سے بگڑی کہ پندرہ روز کے بعد چوبیس ذی الحج 759ھ میں وہ موت کی وادی کا مکین بن گیا۔ تجہیز و تدفین کے مراحل کی تکمیل اور حکومتی معاملات کی تشکیل کے بعد نئے منتظم وزیر حسن بن عمر نے قیدیوں کی رہائی پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ حسن بن عمر نے عبدالرحمٰن سمیت بہت سے قیدی رہا کر دیے۔ وہ ذاتی طور پر عبدالرحمٰن کی قابلیت اور پیشہ وارانہ اہلیت کا بہت معترف تھا۔ حسن بن عمر نے اسے خلعت اور سواری عطا کر کے سابقہ عہدہ پر بحال کر دیا۔ عبدالرحمٰن قسمت کی اس ستم ظریفی پر کراہ کر رہ گیا۔ وہ کتابت کا عہدہ کسی صورت نہیں سنبھالنا چاہتا تھا۔

''کیا بات ہے ابن خلدون؟ تم کچھ ناخوش دکھائی دے رہے ہو۔'' حسن بن عمر نے اس کی کشمکش بھانپ لی۔

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ فوری طور پر سنبھل گیا۔ اپنے کسی بھی غیر فطری ردِعمل سے وہ حکومتی عہدیداران کے مزید کسی عتاب کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''دروغ گوئی تم جیسے شخص کو زیب نہیں دیتی۔'' وزیر نے قدرے سختی سے کہا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے محترم! بات صرف اتنی سی ہے کہ مجھے آبائی وطن کی بہت یاد ستاتی ہے۔ قید میں رہنے کے بعد تو وہ گلی کوچے' مہربان چہرے اور مانوس فضائیں اور بھی یاد آتی ہیں۔ دل میں کسک سی سمائی ہے کہ ایک بار وہاں ہو آؤں۔'' عبدالرحمٰن نے حتی الامکان ملتجی انداز اختیار کیے رکھا۔

خلدون کا بھائی (یحییٰ ابوزکریا)

یحییٰ ابوزکریا تونس میں پیدا ہوا تھا۔ وہ عبدالرحمٰن سے ایک ڈیڑھ برس ہی چھوٹا تھا۔ اس نے بھی ابتدائی تعلیم بہت محنت وجانفشانی سے حاصل کی۔ حفصی دارالحکومت کے علماء سے بہت گہرے روابط رہے۔ اس کا زیادہ تر رجحان شعر وشاعری اور ادب کی طرف تھا۔ اس کی سیاسی زندگی کی ابتداء فاس میں ابوسالم کے دربار(1356) سے ہوئی 1366ء میں قسطنطنیہ کے امیر نے بجایہ پر قبضہ کے بعد یحییٰ کو بونہ میں قید کر دیا۔ جائیداد ضبط کر لی۔ رہائی کے بعد وہ عبدالرحمٰن کے پاس بسکرہ چلا گیا۔ دو برس بعد تلمسان میں 'کاتب الانشاء' مقرر ہوا۔ تلمسان کے سیاسی حالات منتشر ہوئے تو وہ ابوحمو کے احسانات فراموش کر کے سلطان عبدالعزیز مرینی اور اس کے بعد اسی کے جانشین محمد السعید کی ملازمت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ 1373ء میں تلمسان لوٹا۔ ابوحمو نے سبھی رنجشیں فراموش کر کے اس کا خوشدلی سے استقبال کیا اور دوبارہ کاتب الانشاء کے عہدہ پر بحال کر دیا۔ اس کی واپسی اور دربار میں بڑھتے رسوخ سے کئی منصب دار اور ابوحمو کے ممکنہ جانشین ابوتاشفین ثانی حسد اور غم وغصہ میں مبتلا ہو گئے۔ ابوتاشفین نے اسے دسمبر 1378 کی ایک رات کرائے کے قاتلوں کی مدد سے محل سے باہر آتے دیکھ کر قتل کر دیا۔ اپنے بڑے بیٹے اور جانشین کی اس جسارت پر ابوحمو اسے کوئی سزا نہ دے پایا اور خاموشی ونظرانداز کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ یحییٰ نے ایک تاریخی کتاب 'مسمی بہ بغیہ الرواد فی ذکر الملوک من بنی عبدالواد' لکھی تھی۔

''تمہارے جذبات بجا ہیں۔ بے شک وطن کی یاد بہت ظالم ہے لیکن میں یہ چاہوں گا کہ تم تونس جانے سے پہلے ہماری بہترین مہمان نوازی کا بھی لطف اٹھاؤ۔ بری یادیں لے کر جانا تو میں ہرگز گوارا نہیں کروں گا۔'' حسن بن عمر کا انداز اٹل تھا۔

عبدالرحمٰن کے پاس سرِ تسلیم خم کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ حسن بن عمر کی نگاہ خصوصی ہمیشہ ہی اس پر مرکوز رہی۔ اس نے مال و دولت، معاونت اور اخلاقی لحاظ سے عبدالرحمٰن پر بے شمار احسانات کیے۔ حسن بن عمر کا مطمعِ نظر اس کی قابلیت اور پیشہ وارانہ یکتائی سے مستفیض ہوتے رہنا تھا۔ عبدالرحمٰن کتابت کے پیشہ وارانہ امور میں یکتا ہو چکا تھا۔ وہ مرسل کلام ارسال کرنے اور موصول کرکے اس کے مطالب سمجھنے میں ماہر تھا۔ مرسل کلام درحقیقت ایک خصوصی تکنیک تھی جس کی رو سے لوگوں پر مراسلہ کے اصل مطالب پوشیدہ ہی رہتے تھے۔ عبدالرحمٰن کی عمر کے پیشِ نظر اس ہنر کے ماہر دیگر افراد کے لیے اس کی مہارت خاصے اچھنبے کا باعث بھی تھی۔

سلطان ابوسالم اور وزیر حسن بن عمر کا دورِ حکومت کچھ عرصہ تو بہت پُرسکون انداز میں گذر گیا۔ اس کے بعد بنی مرین نے بغاوت کرکے اس پُرسکون قومی زندگی میں تلاطم برپا کر دیا۔ اس بغاوت کے نتیجہ میں ابوسالم قتل ہو گیا۔ نئی حکومت اور انتظامیہ اس کے بارے میں چند تحفظات کا شکار تھی۔ عبدالرحمٰن خود بھی اپنے اس عہدہ سے کہاں مطمئن اور خوش تھا؟ اس کے دل میں تونس واپسی کی خواہش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ نیا وزیر پرویز مسعود اس کے بارے میں کلی طور پر مطمئن نہیں تھا تاہم اس نے عبدالرحمٰن کو مشروط واپسی کی اجازت دے دی۔ ان شرائط کی رو سے وہ تلمسان کے علاوہ دیگر کوئی بھی راہ اختیار کر سکتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے براستہ اندلس روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ اہلیہ اور بیٹے اس فیصلہ پر افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ اہلیہ کی آنکھوں میں محبت، اندیشوں اور شکوؤں کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

''ہمیں بھول تو نہیں جائیں گے آپ؟ واپس تو آئیں گے ناں؟'' اس کی آواز جذبات سے مرتعش ہو رہی تھی۔

''اپنے وجود کے حصے اور ذات کی تکمیل کو کوئی بھلا کیسے بھلا سکتا ہے؟ میرا تم لوگوں کے سوا اور ہے ہی کون؟ بھائی اپنی زندگیوں اور کاموں میں مگن ہیں۔ میری حیات کا محور تو صرف تم لوگ ہی ہو ناں۔'' اس نے نرمی و محبت سے یقین دلایا۔ اپنے بیٹوں کے معصوم چہروں میں مرحوم والدین کی جھلک اسے ماضی میں بھٹکنے پر مجبور کر دیا کرتی۔

''ہم آپ کے منتظر رہیں گے۔'' اہلیہ نے آنسو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

''قسطنطنیہ میں اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔ اگر لوٹ نہ سکا تو تم لوگوں کو اپنے پاس بلوا لوں گا۔'' عبدالرحمٰن نے اُمید کا ایک اور جگنو تھمایا۔ اس نے اہلِ خانہ کو ان کے ننھیال میں ماموؤں کے پاس روانہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ یہ خاندان قسطنطنیہ کے قائد 'محمد بن الحکیم' کا تھا۔ (عبدالرحمٰن کا یہ فیصلہ ذاتی صوابدید پر تھا یا وزیر پرویز مسعود کی کوئی شرط۔ اس بارے میں خود ابن خلدون کی تحریر کردہ سوانح میں بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔)

اہلِ خانہ کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنے کے بعد اس نے اندلس کا سفر شروع کر دیا۔ ان دنوں اندلس کا سلطان 'ابو عبداللہ مخلوع' تھا۔ اسے مخلوع سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ماضی قریب میں مخلوع فاس میں سلطان ابوسالم کے ہاں رہائش پذیر رہا تھا۔ اس عرصہ میں عبدالرحمٰن کے وزیر ابو عبداللہ بن الخطیب سے بہت اچھے دوستانہ مراسم تھے، الخطیب کے توسط مخلوع سے کی خدمت گذاری کا موقع بھی ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب مخلوع کے ستارے کافی گردش میں تھے۔ وہ طاغیہ کے بلاوے پر اندلس واپس حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا تو اپنے اہلِ خانہ کو فاس میں ہی چھوڑ گیا۔ عبدالرحمٰن نے اس کے اہل و عیال کے رزق اور دیگر حاجات کے معاملات بخوبی سنبھال رکھے تھے۔ اندلس میں کچھ وقت گذارنے کے بعد وہ 'سبتہ' کی بندرگاہ روانہ ہو گیا، اس دور میں وہاں کا رئیس الشریف ابوالعباس احمد بن الشریف حسنی تھا۔ اہلِ مغرب اس کے صحیح النسب ہونے کی وجہ سے الحسنی کی بہت توقیر کرتے تھے۔ الحسنی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے آباؤ اجداد صقلیہ سے سبتہ آئے تھے، سبتہ کا سلطان اس سے مشاورت کے بغیر شاذ ہی کوئی فیصلہ کیا کرتا تھا۔ الحسنی نہایت باوقار، خوش اخلاق، صاحبِ علم، ادب، شاعر، سخی، باوفا اور سادہ مزاج کا مالک ہونے کے ساتھ اپنے مہمانوں کو گرمجوشی اور یادگار انداز میں خوش آمدید کہا کرتا تھا۔ 764ھ میں عبدالرحمٰن کی اس سے سبتہ میں ملاقات ہوئی تو الحسنی نے اسے جامع مسجد کے سامنے اپنے گھر میں اتارا۔ عبدالرحمٰن کو اس کی مہمان نوازی بہت پسند آئی۔ الحسنی کی طاقت، اختیار، قوت ارادی اور قوت فیصلہ کسی حاکم وقت سے بھی زیادہ مضبوط

لی نے خوب مہمان نوازی کے بعد اسے الحراقہ (بحری جہاز) میں سوار کروایا۔ الحراقہ میں یادگار لمحات بیتے ہوئے وہ 'الفتح' سے ہوتا ہوا 'غرناطہ' پہنچ گیا۔ غرناطہ پہنچنے سے قبل اس نے سلطان ابن الاحمر اور اس کے وزیر ابن الخطیب کو اپنی آمد کے متعلق مطلع کیا۔ ابن الخطیب نے اس کے خط کا گرمجوشی سے جواب دیا۔ اس کی آمد کو خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے بھرپور چاہت ومحبت سے اس کے استقبال کا عندیہ ظاہر کیا۔ عبدالرحمٰن چاہتوں سے لبریز وہ خط موصول کر کے بہت خوش ہوا۔

اگلے روز (آٹھ ربیع الاول 764ھ) وہ علی الصبح شہر میں وارد ہوا۔ سلطان بھی اس کی آمد پر بے پناہ مسرور تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو اپنے محلات میں خصوصی جگہ عنایت کی۔ اس کی رہائش گاہ میں قالین، آرائشی سامان اور دیگر ضروری اشیاء بھی رکھی گئیں۔ عبدالرحمٰن کے بارے میں سلطان کی سوچ اس قدر مثبت تھی کہ اس نے اپنے مقربین کو بھی اس سے ملنے کے لیے روانہ کیا۔ اس کے علاوہ جب عبدالرحمٰن خود اس سے ملاقات کے لیے پہنچا تو سلطان نے بھرپور گرم جوشی سے استقبال کیا اور اسے خلعت بھی عطا کی۔ دوسری جانب وزیر ابن الخطیب بھی عبدالرحمٰن کو عزت دینے میں پیش پیش تھا۔ سلطان سے ملاقات سے واپسی کے وقت وہ عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کی رہائش گاہ تک ہمراہ رہا۔ اس کے علاوہ اپنی مجلس کے سرکردہ افراد میں شمولیت کا پروانہ بھی تھما دیا۔ وہ خلوت میں بھی اس سے گفتگو کر لیا کرتا۔ سواری پر اپنے ساتھ بٹھانے لگا۔ خورونوش میں بھی اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا۔ حالات بے حد پُرسکون اور ہموار ہو چکے تھے۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن کی غرناطہ آمد کو ایک سال بیت چکا تھا۔ سلطان اور ابن الخطیب سے معاملات بہتر سے بہترین کی جانب گامزن تھے۔ 765ھ میں عبدالرحمٰن کو ایک خصوصی ذمے داری سونپی گئی۔ اسے سفیر بنا کر 'قشتالہ' کے بادشاہ 'طاغیہ بطرہ ابن النشہ ابن اذفونس' کے پاس صلح نامہ کی تکمیل کے لیے روانہ کیا گیا۔ یہ صلح سلطان اور ساحل کے بادشاہوں کے درمیان طے پائی تھی۔ عبدالرحمٰن کے پاس بے شمار قیمتی تحائف تھے۔ ریشمی کپڑے اور اصیل گھوڑے ان کے علاوہ تھے۔ ان گھوڑوں کے طلائی زین دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کرتے۔ طاغیہ سے عبدالرحمٰن کی ملاقات 'اشبیلیہ' میں ہوئی۔ اس مقام سے ایک الگ ہی جذباتی وابستگی تھی۔ اپنے اسلاف کے آثار دیکھنے اور آباؤاجداد کی نادیدہ آہٹیں محسوس کرنا بھی منفرد تجربہ تھا۔ طاغیہ نے عبدالرحمٰن کی بہت تکریم کی۔ یہ مقام ومرتبہ خود عبدالرحمٰن کے تصورات سے بھی بالاتر تھا۔

طاغیہ اس کی قابلیت سے بہت متاثر تھا۔ اس پر مستزاد جب اسے اشبیلیہ میں عبدالرحمٰن کے اسلاف کے مقام کا علم ہوا تو یہ تاثر مزید پختہ ہو گیا۔ سوئے اتفاق اس روز دربار میں طبیب ابراہم بن زرز بھی موجود تھا۔ ابن زرز طب ونجوم میں یکتا تھا۔

''واللہ! میں نے ایسا قابل اور ذہین آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شخص تاریخ میں اپنا نام ضرور امر کرے گا۔'' سلطان نے بے ساختگی سے کہا۔

''میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں سلطان معظم! ابن خلدون سے سلطان ابوعنان کی ایک مجلس میں میری ملاقات ہو چکی ہے۔'' طبیب نے مسکرا کر کہا۔ سلطان ابوعنان نے اسے اپنے علاج کے لیے طلب کیا تھا۔ اس وقت وہ اندلس میں ابن الاحمر کے دربار میں تعینات تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اس حکومت کے وزیر رضوان کی وفات کے بعد طاغیہ کے دربار سے منسلک ہوا تھا۔

''سلطان معظم! چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ ایک خیال یونہی ذہن میں آیا تھا کہ ایسے قابل شخص کو ہمارے دربار سے وابستہ ہونا چاہیے۔'' طبیب کی اس بات پر سلطان نے مبہم انداز میں سر کو جنبش دی۔ طبیب ابراہیم نے اس کی رضامندی بھانپ کر عبدالرحمٰن سے ذاتی صوابدید پر بھی ایک بار گفتگو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ موقع اسے بہت جلد میسر آ گیا۔ عبدالرحمٰن اس سے ملاقات کے لیے خود ہی چلا آیا۔

''کیسے ہو میرے عزیز؟ سلطان ابوعنان کے دربار کے بعد تم سے یہ دوبارہ ملاقات میرے لیے بہت خوش بختی ہے۔ میں اپنے علم کی بنیاد پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا مستقبل بہت تابناک ہے۔ قدرت تم سے بہت بڑے کام لے گی۔''

''غیب کا علم تو صرف پروردگار کے ہی پاس ہے محترم! آپ اور میں اس معاملہ میں کوئی حتمی دعویٰ نہیں کر سکتے۔'' اس نے عاجزی سے جواب دیا۔ طبیب ابراہیم مسکرا کر رہ گیا۔

''تم یہیں کیوں نہیں رہ لیتے ابن خلدون؟ سلطان

معظم بھی اسی بات کے خواہشمند ہیں۔ وہ اشبیلیہ میں تمہارے اسلاف کی وراثت واگزار کرنے کے معاملہ میں بھی قطعی سنجیدہ ہیں۔“

”میں سلطان معظم کی اس پیشکش کا شکر گذار ہوں محترم طبیب! لیکن دلی طور پر معذرت خواہ ہوں کہ میں ذہنی طور پر اس عمل کے لیے آمادہ ہی نہیں۔“

”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار اچھی طرح غور و فکر کر لینا ابن خلدون! اسلاف کی وراثت بلاکوشش حاصل ہو جانا بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔“ طبیب نے سمجھایا۔

”بلاشبہ ایسا ہی ہے لیکن میرے دل و دماغ میں اپنے والدین کی وہ اذیت و کرب بھی زندہ ہے جو انہیں اشبیلیہ سے جلاوطنی کے بعد اپنی ذات پر جھیلنا پڑا تھا۔ میرے اسلاف کی وراثت حاصل کرنے کے اصل حقدار وہی تھے۔ میں نے ابھی تک ایسا کون سا کارنامہ کیا ہے جو ان اسلاف کی ارواح کو خوش کر سکے۔“ وہ دھیمے لیکن مضبوط انداز میں کہنے لگا۔

”کارنامہ تو خیر تم یقینی طور پر سرانجام دو گے میرے عزیز! وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔“ طبیب ابراہیم نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ عبدالرحمٰن کے انکار پر بالکل بھی مکدر نہیں ہوا تھا۔ دلی طور پر وہ کہیں نہ کہیں اس بات سے آگاہ تھا کہ اسی فیصلہ میں بہتری ہے۔

اشبیلیہ سے واپسی کے وقت طبیب ابراہیم نے اسے تعزہ اور سواری عطا کی۔ ان دو خچروں پر طلائی لگامیں اور بھاری زین تھی۔ عبدالرحمٰن نے غرناطہ آنے کے بعد دونوں لگامیں سلطان کو بطور تحفہ پیش کر دیں۔ جوابی طور پر سلطان نے اسے غرناطہ کی چراگاہ میں ’السقی‘ کے علاقہ ’البیرہ‘ نامی بستی میں جاگیر عطا کر کے شاہی حکم نامہ بھی جاری کر دیا۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن کے غرناطہ میں قیام کو دو برس بیت چکے تھے۔ کسی بھی دربار میں سلطان اور وزیر کی نظروں میں اس قدر توقیر، مراعات اور مقام و مرتبہ دیگر درباریوں کی نظروں میں بے طرح کھٹکا کرتا ہے۔ سلطان ابن الاحمر کے مصاحبین کو بھی ایک غیر مقامی شخص کا یہ رتبہ بری طرح کھٹکنے لگا۔ تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرا رہی تھی۔ شطرنج کی بساط دوبارہ بچھی اور مصاحبین نے اچھی طرح سوچ بچار کے بعد وزیر ابن الخطیب کی سماعت میں نفرت و حقارت کا زہر انڈیلنا شروع کر دیا۔ وہ ابن الخطیب کو بھڑکاتے رہے کہ عبدالرحمٰن کا سلطان سے میل جول غیر اخلاقی حدود میں شمار ہونے لگا ہے اور افواہوں کا بازار گرم ہے کہ ابن الخطیب اس کو مکمل تحفظ و آڑ فراہم کیا کرتا ہے۔ ابن الخطیب کی غیرت جوش میں آگئی۔ اس نے ان الزامات کی بھرپور تردید کی لیکن مخالفین مکمل تردید کے ساتھ میدان میں اترے تھے۔ انہوں نے دلائل اور جھوٹے ثبوتوں کے انبار لگا دیے۔ ابن الخطیب کا دل بری طرح کھٹا ہو گیا۔ عبدالرحمٰن سے اس کے تعلقات میں سرد مہری در آئی۔ جہاندیدہ عبدالرحمٰن بھی اس کا گریز اور کدورت بھانپ گیا۔ اب وہ حکومتی معاملات میں اسے کسی مشورہ کے لیے درخور اعتناء نہ سمجھتا۔ اگر عبدالرحمٰن کوئی صائب مشورہ دینے کی کوشش کرتا تو وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی من مانی جاری رکھتا۔ اس پُرخلوص دوستی اور شاندار رفاقت کا ایسا انجام اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ شاہی دربار سے وقتاً فوقتاً منسلک ہوتے رہنے کے بعد اسے اس بات کا ادراک ہونا چاہیے تھا کہ سازشی عناصر کس طرح تخت سے تختہ کر دیا کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ ادراک اس کے ذہن میں بھرپور انداز میں راسخ بھی ہو لیکن ابن الخطیب کی دوستی اور ماضی کے خوشگوار تعلقات نے ہی اسے اس نئی صورت حال پر رنج پہنچایا تھا۔ ابن الخطیب کی اس کم ظرفی کے جواب میں وہ اپنا ظرف تنگ نہ کر پایا تھا۔ ماضی کے برادرانہ تعلقات کے بھرم میں وہ اس سے بالکل قطع تعلق نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی دلی دعا تھی کہ اس صورت حال سے نکلنے کی کوئی مثبت راہ میسر آ جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس کی یہی اعلیٰ ظرفی اور روشن خیالی پسند آگئی۔ اسی دوران اسے بجایہ کے حاکم ’سلطان ابوعبداللہ‘ کے خطوط موصول ہوئے کہ وہ رمضان 765ھ سے بجایہ پر قابض ہے۔ سلطان نے اسے بڑی چاہت و خلوص سے اپنے پاس آنے اور ’حجابت‘ کے منصب پر فائز ہونے کی دعوت دی تھی۔ عبدالرحمٰن کو اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ ٹلتا محسوس ہوا۔ (حجابت ایک اہم ترین منصب شمار ہوتا تھا۔ حکومت کی حجابت سے مراد حکومت کی خود مختاری اور سلطان کے علاوہ ارباب حکومت کے مابین براہِ راست واسطہ تھا) اس نے سلطان ابن الاحمر سے براہِ راست اجازت طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”کیا تمہیں یہاں کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق ہے ابن خلدون؟“ اس کا مدعا جان کر بامروت اور کشادہ دل

الاحمر کی حیرت بجا تھی۔
''بالکل نہیں سلطان معظم! آپ کے زیرسایہ اس سلطنت میں اپنی زندگی کا یادگار اور بہترین وقت گذارا ہے میں نے۔'' عبدالرحمٰن نے متانت سے جواب دیا۔
''میرے علم میں کچھ ایسی باتیں آئی ہیں جن پر میرا تشویش زدہ ہونا لازم ہے۔ ابن الخطیب سے تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟'' سلطان نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔
''بہترین ہیں۔ وہ میرے بھائی' دوست' مربی اور سب کچھ ہی تو ہیں۔ میرے دل میں ان کی تکریم روزِ اوّل جیسی ہے اور ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔'' اس نے بھرپور اعتماد اور خلوص سے کہا۔ ابن الاحمر اس کی ادا پر افسردگی سے مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اس علم دوست شخص کے کردار اور اعلیٰ ظرفی کا قائل ہو گیا تھا۔
''اور اگر میں تمہیں جانے کی اجازت نہ دوں تو؟''
''تو میں اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کرلوں گا لیکن اس کے بعد اپنی افسردگی اور ذہنی جمود کو کبھی ختم نہ کر پاؤں گا۔'' عبدالرحمٰن کی صاف گوئی پر ابن الاحمر خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس پروانۂ رخصتی تھمانے کے سوا اب کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو رخصت کرنے سے پہلے زادِ راہ کے ساتھ بجایہ کے سلطان کے لیے ابن الخطیب سے املاء کروا کے ایک خط بھی تیار کروایا۔ اس خط کا متن ملاحظہ ہو۔
''ابن خلدون ایک بہترین معاون ہے۔ اس کی قابلیت وذہانت اکرام ورفعت کی حقدار ہے۔ یہ ہر کام حسن انداز میں سرانجام دیتا ہے۔ دربار میں گذارا گیا وقت شاندار تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس معتمد کی بہترین ثناء خوانی کی ہے۔ اسے ہر ایک نے ہمیشہ پُرخلوص پایا۔ ریاستی معاملات بھی بخوبی نبھائے۔ ان معاملات کو مختلف حصوں میں بانٹ کر ہر ایک مسئلہ پر ذاتی توجہ دی۔ امیر ابوعبداللہ محمد بن مولانا امیر المسلمین ابوالحجاج بن مولانا امیر المسلمین ابوالولید بن نصر! ابن خلدون کے لیے میری دلی دعا ہے کہ پروردگار اس کے ہر کام میں اس کی مدد فرمائے۔ اپنا خصوصی کام جاری رکھتے ہوئے اس کا مقام ومرتبہ بلند رکھے اور اسے اپنے ہر جائز مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ یہ علماء' رؤسا اور دوستوں کے لیے بہترین انسان ہے۔ اس کے تابناک مستقبل اور ترقی میں کوئی دورائے نہیں ہے۔''
ابن الاحمر نے یہ خط انیس جمادی الاول 766ھ کو

ابن خلدون کی تصانیف

ابن خلدون کی کئی ایک کتب اب ناپید ہو چکی ہیں۔ چند ایک کے نام ملاحظہ ہوں۔

1۔ مقدمہ ابن خلدون
2۔ کتاب العبر۔ العقیدہ الجرفی امام العرب والعجم والربرومن عاصرمصم زوی السلطان الاکبر تاریخ
3۔ التصریف رحلۃ ابن خلدون فی المغرب والمشرق
4۔ سہاب العصصل مواصل الدین
5۔ رسالہ علم الحساب
6۔ رسالہ تنقید بر منطق' خلاصہ' تشریحات فلسفہ ابن رشد
7۔ شرح قصیدہ بردہ
8۔ تبصرہ براصول شریعت
9۔ کتاب الاول الاسلامیۃ بالمغرب
10۔ خلاصہ التحصیل فخر الدین رازی

تحریر کروا کے اس پر علامت لگوا دی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ یہ عبارت بالکل درست ہے۔ عبدالرحمٰن نے اس کے حسن سلوک اور مہربانی کا بھرپور شکریہ ادا کرنے کے بعد 766ھ کے وسط میں المریہ کی بندرگاہ سے بحری سفر کا آغاز کر دیا۔ اس سفر کا اختتام پانچویں روز بجایہ میں ہوا۔ سلطان ابوعبداللہ نے اس کی آمد پر بھرپور جشن منایا۔ وہ اس بندرگاہ پر اس کے استقبال کے لیے بنفس نفیس تشریف لایا تھا۔ سلطان ابوعبداللہ کی یہ گرم جوشی اور محبت شہریوں پر بھی براہِ راست اثر انداز ہوئی۔ جمعہ کے اس روز بندرگاہ کی رونق بجایہ کی تاریخ میں شاید پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ شہری اس عجوبہ روزگار شخص سے ملاقات اور زیارت کے لیے جوق در جوق اُمڈ آئے۔ وہ اس کے ہاتھ چومتے اور کبھی کندھے چھو کر خود کو اس کی موجودگی کا یقین دلاتے۔ یہ ہنگامے تھمے تو عبدالرحمٰن سلطان سے بالمشافہ ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔ ابوعبداللہ نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ عبدالرحمٰن کو خلعت اور سواری بھی عطا کر دی گئی۔ سلطان اس کی موجودگی سے خود کو بے حد توانا محسوس کرنے لگا تھا۔ جوابی طور پر عبدالرحمٰن نے بھی اپنی تمام تر قابلیت اور ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے بجایہ کے حکومتی معاملات میں بہتری کی راہیں تلاش کرنے کا آغاز کر دیا۔

سلطان ابوعبداللہ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو حجابت کے بعد شہر کی جامع مسجد کا تاعمر خطیب مقرر کردیا۔ ابوعبداللہ کو اپنی حکومت اور عبدالرحمٰن کے اس کے ساتھ منسلک رہنے کا بے حد یقین تھا۔ وہ تقدیر کی کاریگری فراموش کر بیٹھا تھا اور تقدیر خود کو فراموش کیے جانے کا بہت عبرتناک انتقام لیا کرتی ہے۔ بجایہ کے سلطان عبداللہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ عبدالرحمٰن کی زیرک نگاہی اس کے گرد خطرات و مسائل بھانپ چکی تھی۔ اسے علم ہوگیا تھا کہ ابوعبداللہ اور اس کے چچازاد بھائی سلطان ابوالعباس میں کافی اختلافات ہیں۔ ابو العباس قسطنطنیہ میں بنی مرین کا حکمران تھا۔ ان اختلافات کو بڑھانے میں عوام اور لالچی عمال کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مسائل بڑھتے ہوئے اس قدر شدت اختیار کرگئے کہ ریاح کے عربوں کے علاقوں میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ ان علاقوں کی اہمیت اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ یہ ایک اہم تجارتی راستہ تھا۔ 766ھ میں ہونے والی اس جنگ میں سلطان ابوعبداللہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی بدحالی کا یہ عالم تھا کہ وہ برہنہ پا بجایہ لوٹا۔ اپنے مختصر انتظامی دورانیہ میں عبدالرحمٰن نے اس کے لیے مالی مسائل کافی حد تک حل کر رکھے تھے۔ سلطان ابوعبداللہ نے وہ مال و دولت عربوں پر خرچ کردی تھی۔ بجایہ لوٹنے کے بعد اب نئے اخراجات کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے اسے نگلنے کے لیے بے تاب تھے۔ عبدالرحمٰن اس نازک صورت حال میں ابوعبداللہ کی مدد کا عزم کرتے ہوئے جبال روانہ ہوگیا جہاں بربر قبائل کی طرف کئی سالوں سے ٹیکس واجب الادا تھا۔ ان قبائل کو اطاعت پر آمادہ کرکے ٹیکس کی رقم حاصل کرتے ہوئے عبدالرحمٰن کو دانتوں پسینا آگیا تاہم کامیابی نے ہر مشکل اور پریشانی کا ازالہ کردیا۔ اس جمع شدہ رقم سے ریاستی معاملات سنبھالنے میں بہت مدد ملی۔ اس کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ ابوعبداللہ کو تلمسان کے حاکم کی جانب رشتہ جوڑنے کا عندیہ موصول ہوا۔ ابوعبداللہ نے حاکم تلمسان سے اپنی بیٹی کی شادی کردی۔ اس کے پیش نظر ابوالعباس سے صلح اور معاملات میں بہتری تھی۔ ابوعبداللہ کی کوئی بھی حکمت یا منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہو پارہی تھی۔ 767ھ میں حاکم تلمسان بجایہ میں وارد ہوگیا۔ اس نے شہر کے اہم معززین سے خط وکتابت کرکے اپنی راہیں پہلے ہی ہموار کرلی تھیں۔ معززین اور اہلِ شہر ابوعبداللہ کے مزاج کی سختی اور پرسش سے بہت خار کھانے لگے تھے۔ ابوعبداللہ اپنے شہر کے دفاع کے لیے جبل لیزو میں اتر کر پناہ گزین ہوگیا۔ اس موقع پر سلطان ابوالعباس بھی میدان میں اتر آیا۔ اس نے اپنی اور عربوں کی افواج کے ساتھ ابوعبداللہ کے ٹھکانوں پر شب خون ماردیا۔ ابوعبداللہ اپنے فرار ہونے کی کوشش میں اس متحدہ فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

عبدالرحمٰن ان دنوں بجایہ میں سلطان کے محلات میں ہی مقیم تھا۔ سلطان کی ہلاکت کی خبر ملتے ہی اہل شہر کا ایک گروہ اس کے پاس آیا۔ ان کی خواہش تھی کہ عبدالرحمٰن سلطان کے کسی بھی فرزند کو ولی عہد مقرر کرکے خود بھی اس کی بیعت کرلے۔ ایسی صورتِ حال میں اگلے امیر کو عبدالرحمٰن کے سبھی معتقدین کی حمایت اور پشت پناہی بھی حاصل ہو جائے گی۔ عبدالرحمٰن نے سوچ بچار کے بعد خود کو اس معاملہ سے الگ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اس ڈوبتے ہوئے جہاز میں مزید قیام کے بعد خسارے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے سلطان ابوالعباس کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا۔ ابوالعباس بھی اس کی اہمیت اور قابلیت کا بے حد معترف تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کی آمد کی بہت تکریم کی۔ عبدالرحمٰن نے اپنے وسائل اور روابط استعمال کرتے ہوئے ابوالعباس کو بجایہ کا قبضہ دلوادیا۔

اس قبضہ کے بعد کچھ عرصہ تو پرسکون بیت گیا لیکن پھر سازشی عناصر کی جانب سے ازسرنو نئی چالوں کے تانے بانے بننے کا آغاز ہوگیا۔ ابوالعباس کو اس کے عہدہ، اختیارات، وسائل اور روابط سے خوفزدہ کرتے ہوئے اچھی خاصی بدگمانی پیدا کردی گئی۔ عبدالرحمٰن ان سازشوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے حالات مزید خراب ہونے سے قبل ابوالعباس سے براہِ راست گفتگو کا فیصلہ کرلیا۔ عبدالرحمٰن نے سلطان کو اس باہمی معاہدہ کی یاددہانی کروائی جس کی رو سے ابوالعباس نے اسے بجایہ رخصت ہونے کی غیرمشروط اجازت دی تھی۔ ابوالعباس نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا تاہم بعد میں روانگی کی اجازت دے دی۔

بجایہ سے رخصت ہوکر عبدالرحمٰن عربوں کے علاقوں کی جانب کوچ کرگیا۔ اس نے یعقوب بن علی کے پاس قیام کیا۔ یعقوب اس سے قبل ابوعبداللہ سے جنگ میں ابوالعباس کی معاونت کرچکا تھا۔ عبدالرحمٰن کی مشکلات میں کمی ہونا ابھی مقسوم نہیں تھا۔ ابوالعباس نے اس کے بھائی

ابوزکریا' کو بونہ میں قید کر کے ان دونوں کے گھر پر قبضہ کرلیا۔ اس کا گمان تھا کہ ان دونوں کی رہائش گاہوں میں مال و دولت یا جواہرات کا کوئی ذخیرہ ضرور موجود ہوگا۔ ابوالعباس کا یہ گمان غلط ثابت ہوا۔ عبدالرحمٰن نے بھی اس موقع پر اس کے اتحادی یعقوب بن علی کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنے کا خطرہ مول نہ لیا۔ اس نے ان قبائلی علاقوں سے نکل کر 'بسکرہ' روانگی کا ارادہ کرلیا۔ بسکرہ کے سردار 'احمد بن یوسف بن مزنی' اس کے والد اور عبدالرحمٰن کے مابین دوستانہ تعلقات تھے۔ احمد بن یوسف نے حسبِ توقع اسے تکریم دیتے ہوئے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ مال و مقام سے اس کی معاونت کر کے زن کٹھن حالات کے خاتمہ میں بھی بھرپور مدد کی۔

☆☆☆

بسکرہ آمد کے بعد عبدالرحمٰن کی ذاتی زندگی میں تو قدرے سکون پیدا ہوگیا لیکن سیاسی ہلچل میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ تلمسان کا حاکم 'ابوحمو' بجایہ پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار لشکر کشی کرتا رہا۔ اس مقصد کے لیے وہ ریاح کے قبائل سے بھی دوستانہ تعلقات قائم کیے ہوئے تھا۔ اسے عبدالرحمٰن کی ذہانت اور فراست پر بھرپور اعتماد تھا۔ وہ عبدالرحمٰن سے مشورہ کر کے اس کی معاونت کے اعتماد پر ہی کوئی قدم اٹھایا کرتا۔ ابوحمو کے توسط عبدالرحمٰن کے مراسم بنی حفص کے حاکم تونس 'سلطان ابواسحٰق بن ابوبکر' سے بھی قائم ہوگئے۔ ابواسحٰق درحقیقت قسطنطنیہ اور بجایہ کے حاکم ابوالعباس کا قرابت دار تھا لیکن ان دونوں میں قرابت داری سے زیادہ عداوت تھی۔ یہ عداوت اس قدر گہری تھی کہ نسب اور ملک کی تقسیم کے بغیر ان کے پاس کوئی بھی چارہ نہ تھا۔ تلمسان اور تونس کے ان حاکموں میں وفود کا تبادلہ ایک عام بات تھی۔ یہ وفد بسکرہ میں عبدالرحمٰن کے پاس سے ہی گزرتے تھے۔ ان دونوں فریقین کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر سے بہترین کی جانب گامزن تھے۔ ابوحمو کا چچا زاد بھائی 'ابوزیان' بھی مسائل کھڑے کرنے میں لاثانی تھا۔ ابوزیان نے تلمسان کے مضافات پر حملہ کردیا۔ ناکام ہونے پر وہ 'حصین' میں مقیم ہوگیا۔ اقتدار کی رسہ کشی' حملوں اور دفاع کا یہ سلسلہ وقتاً فوقتاً یونہی جاری رہا۔ ابوحمو شکست کھا کر تلمسان واپس چلا آیا۔ زغبہ اور ریاح کے قبائل ہنوز اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دل سے بجایہ پر قبضہ کی تمنا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دوسری جانب عبدالرحمٰن 'دواودہ' اور 'تونس' کے حاکمین سے اس کے تعلقات معمول پر لانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ اس موقع پر وہ خود بھی بسکرہ سے تلمسان چلا گیا۔ اس کا مطمع نظر حالات کی بہتری اور باہمی روابط میں سدھار کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تقدیر عبدالرحمٰن کی ان کوششوں پر خندہ زن تھی کیونکہ ابوحمو کا زوال تو مقسوم تھا۔ ان دنوں ابوحمو بطحا میں موجود تھا جب اسے خبر ملی کہ بنی مرین کے سلطان عبدالعزیز نے تلمسان پر قبضہ کرلیا ہے۔ ابوحمو یہ خبر سنتے ہی بطحا سے فرار ہو کر اپنی قوم اور بنی عامر کے حمایتیوں کے ساتھ بلاد ریاح کی جانب نکل گیا۔ سلطان عبدالعزیز نے اس فرار کو ناکام بنانے کے لیے اپنے وزیر ابوبکر بن غازی کو بہترین سپاہ کے ساتھ ابوحمو کے تعاقب میں روانہ کردیا۔ حالات مکمل طور پر عبدالعزیز کی موافقت میں بھی نہ تھے۔ اس کے قریبی مصاحب 'ونزمارا' کی حکمت عملی سے زغبہ اور معقل کے قبائل عبدالعزیز کے خلاف متحد ہوگئے۔ اس صورتِ حال کا بغور جائزہ نے کر عبدالعزیز کی نگاہ انتخاب عبدالرحمٰن پر آٹھہری۔ اس نے عبدالرحمٰن کو بلاد ریاح روانہ کردیا تاکہ وہ ماضی میں اپنے کارناموں کی طرح اس مرتبہ بھی حالات معمول پر لا کر مخالفین کو رام کرسکے۔

عبدالرحمٰن ان دنوں ولی یومدین کے ہاں تدریسی فرائض سرانجام دیا کرتا تھا۔ وہ دلی طور پر کہیں نہ کہیں اقتدار کی اس رسہ کشی اور آئے روز کے بگڑتے معاملات سے خاصا اوب چکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ان سیاسی معاملات سے خود کو لاتعلق کرلے۔ عبدالعزیز کی طلبی پر وہ جزبز ہو کر رہ گیا لیکن روانگی بھی بہرحال ضروری تھی۔ عبدالعزیز نے اسے بہت محبت اور عزت سے نوازا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو اپنے مثبت رویّہ سے ایسے گھیرا کہ اسے انکار کی تاب ہی نہ رہی۔ عبدالعزیز نے اسے خلعت اور سواری عطا کر کے زواودہ کے سرداروں کو اس کے احکامات کی تکمیل کا تحریری حکم ارسال کیا۔ اس کے بعد اس نے یعقوب بن علی اور ابن مزنی کو بھی عبدالرحمٰن کی پیروی اور امداد کا پابند کرتے ہوئے بنی عامر کے قبائل سے ابن حمو کو نکال دینے کا حکم دیا۔

حالات معمول پر لانے کے لیے سرگرداں عبدالرحمٰن کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ بسکرہ کا حاکم احمد بن یوسف مزنی (وہ بسکرہ میں اسی کی پناہ گاہ میں رہتا تھا) عربوں پر اس کے اثر و رسوخ کے متعلق حسد و بغض کا شکار ہوگیا ہے۔ ایک پناہ گزین شخص کی ایسی آو بھگت' ذہانت اور' کام کو برداشت

کرنا کسی بھی حاکم کے لیے بہرحال آسان نہیں تھا۔ اس پر مستزاد سازشی اور حاسدین امراء نے بھی جلتی پر تیل ڈالنے کا کام جاری رکھا۔ احمد بن یوسف کی برداشت اور ظرف کا پیمانہ بالکل ہی لبریز ہوگیا۔ اس نے اپنی نفرت وحسد صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے سلطان عبدالعزیز کے قریبی دوست و مشیر 'ونزمار بن عریف' کو خط ارسال کردیا۔ ونزمار نے وہ خط سلطان کی خدمت میں پیش کردیا۔ عبدالعزیز پر اس لگائی بجھائی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو اپنے پاس طلب کرلیا۔ بارہ ربیع الاول 774ھ کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ عبدالعزیز کے پاس جانے کے لیے روانگی کے وقت عبدالرحمٰن کو اندازہ ہی کہاں تھا کہ تقدیر نے اپنے ترکش میں رکھے تیر اگلے وار کے لیے مکمل تیار کر رکھے ہیں۔ احمد بن یوسف کی آہ وفغاں پر مشتمل خط پڑھ کر پرسش کے لیے عبدالرحمٰن کو طلب کرنے والا عبدالعزیز اپنے ایک دیرینہ مرض کا شکار ہوکر لقمۂ اجل بن گیا۔ عبدالرحمٰن کو جس وقت یہ اطلاع ملی وہ مغرب اوسط کے نواحی علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد علم ہوا کہ عبدالعزیز کا بیٹا 'ابوبکر سعید' وزیر ابوبکر بن غازی کی زیر کفالت امیر مقرر ہوکر مغرب اقصیٰ روانہ ہوچکا ہے۔ ان کی منزل فاس تھی۔ حالات و واقعات بڑی تیزی سے تبدیل ہورہے تھے۔ سلطان کی موت کی خبر ملتے ہی صحرائی علاقوں میں پوشیدہ ابوحمو بھرپور قوت سے تلمسان لوٹ کر مضافاتی علاقوں پر بھی قابض ہو گیا۔ اس کے بعد وہ عبدالرحمٰن کی جانب متوجہ ہوا۔ ابوحمو نے پہاڑی علاقوں میں مقیم بنی یغمور کو پیغام بھجوا کر عبدالرحمٰن کے قافلہ کو ان کی ملکی حدود 'راس العین' پر وادی زاہ کی راہ میں ہی روک لیا۔

عبدالرحمٰن کے لیے وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ بنی یغمور نے ان کے مال ومتاع پر مکمل قبضہ کر کے سواریوں سے بھی محروم کردیا۔ اس صحرائی علاقہ میں پڑنے والی افتاد غیر متوقع سہی تاہم قافلہ سے کچھ افراد گھوڑوں پر جبل دبدو کی جانب فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ عبدالرحمٰن کی حالت دگرگوں تھی۔ صحرا میں بے دست وپا ہونے کی اذیت اٹھاتے وہ بہت دشواری سے ایک قریبی آبادی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں اس کی ملاقات اپنے قافلے کے افراد سے ہوگئی۔ قسمت نے کچھ یاوری کی اور اس کی کٹھنائیاں قدرے کم ہونے لگیں۔ اس دوران وہ فاس کی جانب روانہ ہوگیا۔ ستارے ایک بار پھر عروج حاصل کر رہے تھے۔ ہر قدم بالکل درست سمت اٹھ رہا تھا۔ فاس میں اس کی ملاقات وزیر ابوبکر اور اس کے چچازاد بھائی محمد بن عثمان سے ہوئی اور کیا ہی خوب وقت پر ہوئی۔ وزیر ابوبکر سے اس کی دیرینہ واقفیت تھی۔ ماضی قریب میں عبدالرحمٰن نے اندلس میں اس کی کافی مدد بھی کی تھی۔ ابوبکر بن غازی ایک احسان شناس شخص تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کے اس حسن سلوک کا جواب مزید حسن سلوک اور عزت افزائی سے دیا۔ عبدالرحمٰن کے دگرگوں حالات اور خستہ حالی کے باعث اس کے اندازے سے بھی زیادہ وظائف وجاگیر عطا کی۔ ابوبکر بن غازی کے باعث وہ حکومت میں بھی اچھے عہدہ پر فائز ہو گیا۔ اس کی پیشہ وارانہ اہلیت اور دیانت داری کے باعث عزت وتکریم میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا۔ سلطان بھی اس کی صلاحیتوں سے کافی متاثر ہوچکا تھا۔

سرما کے اختتام تک حالات بہت ہموار اور مثالی تھے پھر یکایک تنفر اور تبدیلی کی ایسی لہر اٹھی کہ بے یقینی کی فضا نے ہر سو رنگ جما لیا۔ اس تبدیلی کا آغاز ابوبکر بن غازی اور سلطان ابن الاحمر کے درمیان ابن الخطیب کے باعث ہوا۔ اگلے کچھ ہی عرصہ میں نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ابن الاحمر' ابوبکر بن غازی' بطویہ قبائل کے امیر عبدالرحمٰن کے درمیان کشیدگی بڑھنے لگی۔ وقت مزید آگے سرکا تو ابوبکر اور محمد بن عثمان کے تعلقات بھی خاصے اختلافات کا شکار ہو گئے۔ غلط فہمیوں' کدورتوں اور رنجشوں کی یہ آندھی تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس آندھی کی لپیٹ میں آکر ابوبکر بن غازی اور ونزمار میں بھی عداوت پیدا ہوگئی۔ علم قرأت اور تدریسی مشاغل میں مصروف عبدالرحمٰن ان حالات سے اوبنے لگا تھا۔ شاہی معاملات کا یہ الجھاؤ ہر دور میں ہی اس کے لیے آزمائش بنا رہا تھا۔ درباری امور فطری طور پر ہی کچھ ایسی نوعیت کے تھے کہ وقتی توازن کے بعد حالات بغض' کدورتوں اور نفرتوں کی جانب مائل ہو جاتے۔ ایسی صورت میں اس کی پیشہ وارانہ اہلیت اور حکومتی امور کے لیے سبھی کوششیں پل بھر میں ہی ملیامیٹ ہوکر رہ جاتیں۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ امیر عبدالرحمٰن سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے تھے۔ وہ موجودہ کشیدہ صورت حال کے تحت اسے مشورہ کے لیے بھی طلب کرلیا کرتا۔ محمد بن عثمان کو یہ بات ناگوار گزرنے لگی۔ وہ تحفظات کا شکار ہو چلا تھا۔ اس نے حسب سابق اور حسب دستور سلطان کو ورغلا کر عبدالرحمٰن کو پابند سلاسل کروادیا۔ امیر

عبدالرحمٰن اس صورتِ حال پر برافروختہ ہوگیا۔اس نے سلطان کو سنگین صورتِ حال کی دھمکی دے کر اس کی رہائی یقینی بنوائی۔ عبدالرحمٰن کے لیے اب وہاں مزید قیام ممکن نہ رہا تھا۔ اسے وزراء اور امراء کا نفاق سلطان کے غیر متوقع ،متعصبانہ اور بلاتحقیق یکطرفہ فیصلے مستقبل میں بھی وبالِ جان ثابت ہو سکتے تھے۔ انہی دنوں امیر عبدالرحمٰن کو مراکش روانہ ہونا پڑا۔ ان غیر یقینی حالات میں وہ ذہنی طور پر خاصے دباؤ اور دہشت کا شکار ہو چلا تھا۔اسی پس وپیش میں اس نے اندلس جانے کا ارادہ کرلیا۔فاس کا حاکم ابوالعباس اور امیر عبدالرحمٰن اس کی روانگی پر ناخوش تھے۔وہ ایسے گوہر نایاب سے محرومی ذاتی اور ریاستی سطح پر نا قابلِ تلافی نقصان گردانتے تھے۔عبدالرحمٰن کے پاس مزید تعلیم حاصل کرنے کا عذر تراشے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔یہ آفاقی بہانہ کارگر ثابت ہوا اور ربیع الاول 776ھ میں وہ اندلس کوچ کرگیا۔

عبدالرحمٰن اپنے سفر کی رکاوٹیں ختم ہونے پر بہت خوش اور مطمئن تھا۔اندلس کے حاکم کی جانب سے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔اسے یقین تھا کہ وہاں قیام کے دوران اسے مزید رکاوٹوں یا مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا تاہم یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد فاس جاتے ہوئے جبل الفتح میں اس کی ملاقات سلطان ابن الاحمر کے کاتب 'ابوعبداللہ بن زمرک' سے ہوئی۔ابوعبداللہ نے ابن الخطیب کے متبادل ذمے داریاں سنبھالی تھیں۔اس نے جبل الفتح میں پہلے پہل تو عبدالرحمٰن سے بظاہر دوستانہ انداز میں گفتگو کی لیکن فاس پہنچنے کے بعد اس کی ناراضگی اور کدورت کھل کر سامنے آگئی۔حکومتی اعلیٰ عہدیداروں کو اس کا اندلس میں قیام اب تک ناگوار گزر رہا تھا۔یہاں آتے ہی عبدالرحمٰن کی ذات کو ایک اور الزام نے گھیر لیا کہ وہ سلطان ابن الاحمر اور امیر عبدالرحمٰن کے خوشگوار تعلقات کا خواہشمند نہیں ہے۔ان کی باہمی منافرت کی بنیادی وجہ اس کی سازشیں ہیں۔امیر سے اس کا میل جول انہی سازشوں کے تانے بانے بننے کے لیے ہوتا ہے۔بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو وہ کسی نہ کسی طور سلجھا لیتا۔معاملات اس حد تک بگڑ گئے کہ ابوعبداللہ اور ابن الاحمر نے اس کے اہلِ خانہ کو اس کے پاس اندلس بھیجنے سے انکار کردیا۔

فاس میں حالات کی ان خرابی کے بعد وہاں مزید قیام دشوار تھا۔اہلِ خانہ کو ہمراہ لیے بغیر اندلس واپسی بھی

ابن خلدون مشاہیر کی نظر میں

''قرونِ وسطیٰ کے عیسائی مؤرخین معیار کی اس سطح پر نہیں پہنچ سکے کہ انہیں تاریخ نویسی میں ابن خلدون کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔'' (ڈوزی)

''افلاطون ٗ ارسطو اور آگسٹائن ہر چند بہت نامور ہیں لیکن ابن خلدون کی برابری نہیں کر سکتے۔یہ تمام سیاسی مفکرین تو اس قابل بھی نہیں کہ ابن خلدون جیسی مایہ ناز شخصیت کے ساتھ ذکر بھی کیا جا سکے۔'' (رابرٹ فلنٹ)

''ابن خلدون تاریخ کو وسعت دینے کا ہی نہیں بلکہ عمرانیات کی اساس کا بھی مؤجد ہے۔عرب اور یورپی مؤرخین میں سے کسی نے بھی تاریخ کے بارے میں اتنا واضح وفلسفیانہ نظریہ پیش نہیں کیا۔'' (پی کے ہٹی)

''ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ اس بات کا حقدار ہے کہ دورِ جدید کے فلسفی اور علمائے اجتماعیات اس سے مستفید ہوں۔اس کے مطالعہ کے بغیر فلسفہ اجتماعیات سے آگاہی ممکن ہی نہیں۔عربی ادب ابن خلدون کے نام سے ہی درخشندہ ہے۔دنیائے عیسائیت اس کا متوازی پیدا ہی نہیں کر سکی۔افلاطون ٗ ارسطو اور آگسٹن بھی اس کی خصوصیات کی گرد نہ پا سکے۔'' (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

''ابن خلدون انسانی علوم وخیالات کا سب سے پہلا مبصر ہے۔اس نے تاریخی واقعات کو سائنس بنانے کی بنیاد رکھی ہے۔اقتصادیات اور اجتماعیات کو بطور فن پیش کرنے میں اسی کی زیرک نگاہی کا ہاتھ ہے۔'' (سید سلیمان ندوی)

''ایک فلسفی ومؤرخ کی حیثیت سے کسی عہد یا ملک میں ابن خلدون سے پہلے اس کا مقابل پیدا ہوا اور نہ ہی بعد میں ایسی کوئی مثال ملتی ہے۔'' (ڈاکٹر عنایت اللہ)

''ابن خلدون یکتائے روزگار تھا۔اس جیسے افراد ہر دور میں پیدا نہیں ہوا کرتے۔اس نے ابن رشد کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا۔اپنے زما ، کے اکثر معتقدات کو جذب کرنے کی کوشش کی۔وہ انیسویں صدی کے تمام یورپی فلسفیوں کا پیش رو ہے۔'' (محمد لطفی جمعہ)

''وہ قرونِ وسطیٰ کا عظیم ترین مؤرخ ہی نہیں بلکہ تاریخ کے سب سے پہلے فلسفی میکاوَلی اور ویلو کا پیش رو بھی ہے۔'' (جارج کاٹن)

''مغربی مؤرخین ابن خلدون کی تاریخ کے بغیر تاریخ کو مکمل طور پر پیش ہی نہیں کر سکتے۔'' (عبدالرحمٰن لکھساسی)

''ابن خلدون کو نا صرف اپنے زمانے بلکہ سترہویں صدی تک کے مسلم مفکرین نے نظر انداز کیے رکھا۔اسے گزشتہ صدی کے یورپی محققین نے دریافت کیا۔اس کی اہمیت کا انحصار اس کے بصیرت افروز خیالات اور دائمی اقدار پر مبنی لاتعداد نئے خیالات پر ہے۔'' (روزینتھال)

ممکن نہ تھی۔اس کے بہی خواہوں نے اسے تلمسان کے کنارے جانے کا مشورہ دیا۔ یہ خیر خواہ اس کے اہلِ خانہ کی منتقلی میں مدد کے لیے تیار تھے۔تلمسان روانگی بھی کسی خطرہ سے کم کہاں تھی۔تلمسان کے حاکم ابوحمو سے اس کے تعلقات معمول پر نہ تھے۔ماضی میں ہونے والے واقعات کے بعد اندھا دھند اس کے پاس منتقلی حماقت ہی تصور کی جا سکتی تھی۔اسی پس وپیش میں مبتلا عبدالرحمٰن عباد کے ایک قبیلہ میں قیام پذیر ہوگیا۔اس کٹھن زدہ اور کٹھن ماحول میں خوشگواریت وسکون کا پہلا روزن عیدالفطر 776ھ میں اہل وعیال کی آمد تھا۔بیٹوں سے بغلگیر ہوکر اپنے وجود میں بھینچتے ہوئے خوشی اور تشکر سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔قسمت کچھ مزید مہربان ہوئی۔اس دوران سلطان ابوحمو کو'زواودہ' کے متعلق کچھ ضروری امور طے کرنے اور ان سے دوستانہ تعلقات کے قیام میں کسی ذہین اور تجربہ کار شخص سے مشاورت کی ضرورت درپیش آئی تھی۔اس کے دربار میں موجود عبدالرحمٰن کے بہی خواہوں نے دبے الفاظ میں ابوحمو کی توجہ اس کی جانب مبذول کروائی۔ابوحمو نے بھی کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی انا بالائے طاق رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔اس نے عبدالرحمٰن کو دربار میں طلب کرکے زواودہ میں بطور سفیر بھیجنے کا حکم صادر کردیا۔عبدالرحمٰن متضاد کیفیات کا شکار تھا۔اس کی مخصوص حس مسلسل ذمے داری قبول نہ کرنے کی تحریک دے رہی تھی۔ماضی قریب وبعید میں بھی اس پر یہ کیفیات وارد ہوتی رہی تھیں۔اس پر مستزاد وہ ابوحمو سے اپنے رویئے'تلخیوں اور رنجشوں کو بھی فراموش نہیں کر پایا تھا۔یہ خلش اسے کلی طور پر مطمئن ہونے ہی نہیں دے رہی تھی۔اس نے بظاہر ابوحمو کی بات تسلیم کرلی لیکن دلی طور پر وہ کسی محفوظ فرار کی حکمت عملی تیار کرتا رہا۔بالآخر اسے ایک راہ نظر آہی گئی۔وہ تلمسان سے مسافر کے روپ میں نکلا اور بطحاء پہنچ گیا۔بطحاء سے منداس ہوتے ہوئے وہ جبل گزول کے سامنے اولاد عریف کے قبائل کا مہمان بن گیا۔اولاد عریف نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور قیمتی تحائف سے نوازتے ہوئے کئی روز تک بھرپور مہمانداری کا حق نبھایا۔عبدالرحمٰن کی افسردگی اور الجھن ان سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''ابن خلدون! کیا ماجرا ہے؟ کیا ہماری مہمانداری میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟'' قبیلے کے سردار نے دریافت کیا۔

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔آپ کی شاندار آؤ بھگت سے تو میں خود کو مقروض سمجھنے لگا ہوں۔'' اس نے متانت سے جواب دیا۔

''تو پھر اس افسردگی'پریشانی اور اضطراب کی کیا وجہ ہے؟ غیریت نہ برتو ابن خلدون! جو بھی ماجرا ہے ہمیں کھل کر بتاؤ۔ ہوسکتا ہے ہم کوئی بہتر راہ نکال لیں۔''

''میں سلطان ابوحمو کے دیے گئے اس نئے منصب پر متامل ہوں۔ میرا وجدان مجھے اس دربار سے منسلک ہونے پر روکتا ہے۔مجھے اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ اس سے علیحدگی اختیار کرلوں لیکن اپنے اہلِ خانہ کا خیال مضطرب کردیتا ہے۔'' اس نے اپنے جذبات کو گویائی دی۔

''پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ہم یہ معاملہ بہت جلد سلجھالیں گے۔'' سردار نے یقین دہانی کروائی اور پھر کچھ ہی عرصہ میں مکمل خلوص و ذمے داری سے عبدالرحمٰن کی پریشانی دور کردی۔اولاد عریف کے ان قبائل کی جانب سے معمر وسرکردہ افراد تلمسان میں ابوحمو کے پاس روانہ کیے گئے۔ انہوں نے شیریں بیانی'چرب زبانی' خوشامد اور فراست کا سہارا لے کر ابوحمو کو یہ بات باور کروائی کہ عبدالرحمٰن نئی ذمے داریاں سنبھالنے سے قاصر ہے۔ذہنی و دلی آمادگی کے بغیر فرائض ادا کرنے میں برکت ہوگی نہ ہی مثبت نتائج برآمد ہوسکیں گے۔ابوحمو کو یہ بات سمجھ آگئی۔اس نے دانش مندی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے عبدالرحمٰن کی معذرت قبول کرلی۔ اولاد عریف کا یہ وفد سلطان کا بھرپور شکریہ ادا کرتے ہوئے لوٹ آیا۔عبدالرحمٰن اور اس کے اہلِ خانہ کو ابوبکر بن عریف نے بنی توجین کی سرزمین پر واقع 'قلعہ ابن سلامہ' میں پہنچادیا۔عبدالرحمٰن اس مسئلہ کے حل پر شکرانہ بجالایا۔

قلعہ میں قیام خوشگوار تھا۔اس پُرسکون ماحول میں عبدالرحمٰن کے دل میں برسوں سے پوشیدہ ایک خواہش مچلنے لگی۔فرصت'ذہنی سکون' تنہائی اور اطمینان قلب میسر آتے ہی اس نے اپنے مشاہدات' تجربات اور نظریات کو کتابی شکل میں سمونے کا آغاز کردیا۔ ابن سلامہ میں اس کا قیام چار سال تک طویل رہا۔اس دوران چند ہی ماہ میں 'مقدمہ ابن خلدون' نامی تصنیف مرتب کرکے ایک شاہکار تخلیق کر دیا۔ اس تاریخ کا پورا نام ''کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر فیایام العرب العجم والبربر ومن عاصرھم من ذوی السلطان الکبر'' ہے۔اس کتاب میں ایک دیباچہ'ایک مقدمہ شامل ہے۔کتاب کی تین جلدیں ہیں۔دیباچہ میں عبدالرحمٰن نے اپنی اس تصنیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے

وضاحت کی کہ تاریخ درحقیقت ایک آفاقی اور دلچسپ مضمون ہے۔ حکمت و فلسفہ اس کی اہم شاخ ہے۔

کتاب کی پہلی جلد میں انسانی معاشرہ کے تمام گوشوں اجتماعی، تمدنی، جغرافیائی، اقتصادی، علمی، ادبی اور مذہبی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ (اسی حصہ کو دیباچہ اور مقدمہ کے ساتھ شامل کرکے مقدمہ ابن خلدون کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے فلسفیانہ اور پُرحکمت مضامین عوام اور خواص میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ابن خلدون کو بانی فلسفہ تاریخ کا لقب دے دیا گیا)

کتاب کی دوسری جلد میں عرب قبائل کی روایات بیان کی گئی ہیں۔ زمانہ قدیم سے لے کر عبدالرحمٰن کے عہد حیات تک مختلف سلطنتوں کے قیام کا احوال درج کرنے کے بعد نامور تاریخی قوموں اہل ایران، بنی اسرائیل، یونانیوں، رومیوں، ترکوں اور فرنگیوں کی تاریخ بھی درج کی گئی۔

تیسری جلد بربر اقوام، ان کے ہمسایہ قبائل کی تاریخ کے لیے مخصوص ہے۔ اس جلد میں شمالی افریقا میں قائم شدہ حکومتوں اور خاندانوں کی تاریخ بھی شامل ہے۔ کتاب کا یہ حصہ موجودہ دور میں بے حد دقیق اور قیمتی تصور کیا جاتا ہے کیونکہ عبدالرحمٰن نے ان ممالک اور اقوام میں ذاتی زندگی بسر کررکھی تھی۔ اس کا ذخیرہ معلومات اور ذاتی واقفیت وسیع تر ہے۔

تین جلدوں پر مشتمل یہ نادر روزگار کتاب محض پانچ ماہ کے عرصہ میں مکمل ہوئی تھی۔ قلعہ ابن سلامہ میں یہ قیام یادگار تھا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ اسی دوران حالات نے ذرا کروٹ لی۔ عبدالرحمٰن کو چند ایسی کتب کی ضرورت پیش آن پڑی جو صرف شہروں میں ہی دستیاب تھیں۔ کتاب پر نظر ثانی اور تصحیح کے لیے ان کتب کا مطالعہ بے حد ضروری تھا، عبدالرحمٰن نے کبھی کسی بھی مقام یا علاقہ کو اپنے لیے جذباتی وابستگی کا سامان نہیں بنایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہ آسانی نئے سفر کے لیے تیار ہو جاتا۔ انہی دنوں وہ ایک مرض میں بھی مبتلا تھا تاہم کسی بھی داخلی و خارجی کیفیت کی پروا کیے بغیر نئے سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہ سلطان ابوالعباس سے ملاقات اور تونس جانے کا خواہشمند بھی تھا۔ اس نے روانگی سے قبل تونس میں سلطان کی رضامندی بھانپنے کے لیے ایک خط لکھ بھیجا۔ جوابی طور پر سلطان نے بھی متانت، خوشدلی اور گرمجوشی سے سرزمین تونس کے اس سپوت کو وہاں چلے آنے کا خط بھیج دیا۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن کے سفر کا آغاز جب 778ھ میں ہوا۔ وہ ریاح کے صحرا سے عربوں کے ہمراہ اولاد عریف کے علاقہ سے روانہ ہوگیا۔ قسطنطنیہ کی سرحد تک پہنچ کر اس کی ملاقات حاکم میر ابراہیم بن سلطان ابوالعباس سے ہوئی۔ سلطان اپنے پڑاؤ کے ایک خیمے میں قیام پذیر تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کی خوب خاطر تواضع کی اور اسے قسطنطنیہ میں قیام کی دعوت تک دی۔ عبدالرحمٰن نے اپنے اہل خانہ کو سفر کی مزید صعوبتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے وہیں چھوڑ کر خود یعقوب بن علی کے بھتیجے ابو دینار اور اس کی قوم کے ایک گروہ کے ہمراہ تونس کی جانب روانہ ہوگیا، سوئے اتفاق ابوالعباس ان دنوں تونس سے بلاد الجرید کی طرف کوچ کر چکا تھا جہاں کچھ سردار شرانگیزی پر مائل تھے۔ ابوالعباس سے اس کی ملاقات 'سوسہ' میں ہوئی۔ سلطان نے بھرپور اور باوقار انداز میں اس کا استقبال کیا۔ وہ عبدالرحمٰن کی قابلیت سے بے پناہ متاثر تھا۔ اس نے بلاد الجرید میں درپیش مہم کے حوالے سے چند مشورے لیے اور بصد احترام اسے تونس روانہ کرکے اپنے نائب 'رفاح' کو خصوصی تاکید کی کہ عبدالرحمٰن کو رہائش، وظیفہ اور ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے۔

عبدالرحمٰن اس آؤ بھگت سے مطمئن ہوکر ماہ شعبان میں تونس پہنچ گیا۔ اس کی رہائش گاہ نہایت آرام دہ تھی۔ معاملات پُرسکون ہوتے ہی اس نے اپنے اہل خانہ کو بھی تونس بلوالیا۔ ابوالعباس کی مہم قدرے طویل ہوگئی تھی۔ بالآخر بلاد الجرید فتح ہوا تو باغی قریبی علاقوں میں منتشر ہوگئے۔ ان کا سردار یحییٰ بن یملول بھی مزید کسی مزاحمت کے بغیر اپنے داماد 'ابن مزنی' کے پاس پناہ گزین ہوگیا۔ ابوالعباس نے بلاد الجرید اپنے بیٹوں محمد المنتصر اور ابوبکر میں تقسیم کرکے تونس واپس چلا آیا۔ اس کامیاب مہم کے بعد وہ حکومتی معاملات میں عبدالرحمٰن کے تجربہ اور فراست سے مستفید ہونا چاہتا تھا۔

سلطان سے قربت اور ذہنی ہم آہنگی بڑھتے ہی دربار میں موجود سازشی عناصر مضطرب ہونے لگے، نتیجتاً سازشوں، بدگمانیوں، نفرتوں، حسد اور کینہ کا بازار گرم ہوتے ہی ابوالعباس کی سماعت میں زہر انڈیلنے کا سلسلہ ازسرنو شروع ہوگیا۔ سازشوں کی ابتداء عبدالرحمٰن کے ابن عرفہ کے ہمراہ سفر سے کی گئی۔ فارح کو بھی اس بات پر قائل کیا گیا کہ عبدالرحمٰن اس کا منصب حاصل کرنے کے درپے ہے۔ مزید جوڑ توڑ کے بعد انہوں نے ابن عرفہ کو بھی اس بات کے

لیے راضی کرلیا کہ سلطان ابوالعباس کے دربار میں گواہی دے کر یہ بات ثابت کی جاسکے کہ عبدالرحمٰن نے اس قتل کی منصوبہ سازی کررکھی ہے۔ سلطان نے ان باتوں پر بالکل کان نہ دھرے۔ وہ عبدالرحمٰن کے متعلق کسی بھی بدگمانی کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ان مصاحبین کو سختی سے متنبہ کرنے کے بعد وہ عبدالرحمٰن کے ساتھ ایک نئے سفر پر روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ عبدالرحمٰن نے اس کی پیشکش تسلیم کرلی۔ اس سفر کے لیے گراں جذبات کے باوجود وہ اپنی پیشانی ذرا بھی شکن آلود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ درباری عناصر سے محفوظ رہنے کے لیے سلطان کے ہمراہ رہ کر اس کا اعتماد مزید جیتا جاسکے۔

اس سفر کا اختتام افریقی تلول کے وطن کے وسطی علاقہ متبسہ' میں ہوا۔ ابوالعباس اپنی افواج کے ہمراہ نشیبی علاقوں میں روانہ ہوگیا۔ محمد المنتصر کو دیے گئے علاقہ پر ابن یملول نے دوبارہ قبضہ کرلیا تھا۔ ابوالعباس کی اس لشکرکشی کا مقصد اپنے بیٹے کی عسکری مدد اور تسلط شدہ علاقہ کی بازیابی ہی تھا۔ اس کامیاب مہم کے بعد روانگی کا وقت آیا تو ابوالعباس نے عبدالرحمٰن کو پہلے ہی تونس بھیج دیا۔ عبدالرحمٰن نے الریاحین کی جاگیر میں قیام کو ترجیح دی کیونکہ یہاں نواحی علاقہ میں اس کی زرعی جاگیر بھی تھی۔ اس جاگیر کے معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے کچھ وقت گذرا تو سلطان ابوالعباس کی واپسی کی اطلاع ملتے ہی وہ بھی تونس میں اس سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی یہی دعا تھی کہ اب مزید کچھ عرصہ کوئی سفر یا غیر یقینی صورتِ حال درپیش نہیں آئے گی لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اس کی قسمت میں ابھی بہت سے موڑ دیکھنے باقی تھے۔

☆☆☆

شعبان 784ھ طلوع ہوچکا تھا۔ حکومتی معاملات میں سلطان کے مشیر خاص کا کردار بھرپور انداز میں نبھاتے ہوئے عبدالرحمٰن کو محسوس ہوچکا تھا کہ وہ ایک نئی مہم کے درپے ہے۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ گذشتہ برس کی طرح وہ اس بار بھی اسے اپنے ہمراہ رہنے کے لیے اصرار کرے گا۔ عبدالرحمٰن کسی نئی مہم میں الجھنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ اسی دوران ابوالعباس نے اسے اپنے دربار میں طلب کرلیا۔

''ابن خلدون میں تمہاری صلاحیتوں اور فراست کا ہمیشہ ہی سے قائل رہا ہوں۔'' ابوالعباس نے فراخدلی سے اسے کہا لیکن عبدالرحمٰن کو بھی علم تھا کہ یہ اصل مدعا کی طرف تمہید کا آغاز ہے۔

''میں سلطان معظم کی اس ذرہ نوازی پر سدا مشکور رہوں گا۔'' اس نے تعظیم دی۔

''تم جانتے ہو اس وقت حکومت کو فی الفور کون سی مہم درپیش ہوسکتی ہے؟''

''میں کم علم اور کم فہم شخص آپ کی سوچ اور مقام و مرتبہ تک رسائی تو حاصل نہیں کرسکتا۔ میری کم فہمی بس اتنا جانتی ہے کہ ابن یملول کو پناہ دینے والے ابن مزنی کی سرکوبی بہت ضروری ہے۔ اس نے ابن یملول کو اپنے پڑوس میں رہائش اور متعلقہ سہولیات دے کر براہ راست عداوت مول لی ہے۔ اس کی سرکوبی نہ کی گئی تو دیگر لوگوں کے حوصلے بھی بڑھ سکتے ہیں۔''

''تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے ابن خلدون! دشمن کو اگر بروقت اس کی حیثیت یاد نہ دلائی جائے تو وہ کسی موذی سانپ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ تم اس مہم میں میرے ساتھ ہی رہو گے۔''

''سلطان معظم کا یہ اعتماد میرے لیے بہت بڑا شرف ہے لیکن جان کی امان پاکر ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے حج بیت اللہ کی زیارت کا قصد کررکھا ہے۔ زندگی کا کیا بھروسا محترم! نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کو بیماری یا جابر حکمران نے روک نہ رکھا ہو تو حج کی ادائیگی کے بغیر مرنے والا یہودی یا نصرانی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے بڑے ملتجی انداز میں اپنا داؤ کھیلا۔ اسے علم تھا کہ ان دنوں بندرگاہ پر اسکندریہ کے تاجروں کی مال و دولت سے بھرا ایک بحری جہاز روانگی کے لیے بالکل تیار کھڑا ہے۔ سلطان ابوالعباس کی رضامندی ملتے ہی وہ بلا تاخیر تونس سے روانہ ہوجاتا۔

''ٹھیک ہے ابن خلدون! میں اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں تمہارے لیے بالکل رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ میری طرف سے اس سفر کی اجازت ہے تمہیں۔ زادِراہ کے لیے جو بھی چاہو حاصل کرلینا۔'' ابوالعباس کی اس فراخدلانہ پیشکش نے عبدالرحمٰن کے سر سے گویا بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا، اس نے فوری طور پر اسباب باندھا اور بندرگاہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

اس کی روانگی کی اطلاع اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کی شہرت' علمیت سے مستفید ہونے کے لیے کئی حکومتی عہدیدار' عوام اور مختلف الانواع کے طلبہ جوق درجوق

آنے لگے۔ ان معاملات سے نمٹتے ہوئے شعبان اپنا وسطی سفر طے کر چکا تھا۔ سمندری سفر تقریباً چالیس روز پر محیط تھا۔ بحری جہاز عیدالفطر کے روز اسکندریہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اسکندریہ کے سیاسی حالات بھی تلاطم زدہ تھے۔ سابقہ حکمران بن قلاون کی جگہ ملک الظاہر کو تخت نشین ہوئے ابھی دس روز ہی ہوئے تھے۔ شہر کے معاملات کو اپنے انداز میں ڈھالتے ہوئے ملک الظاہر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اسکندریہ کے لنگر شدہ اس جہاز کے مسافروں کو شہر میں داخلہ کے لیے قدرے انتظار کرنا پڑا۔ شہر منتقل ہونے کے بعد عبدالرحمٰن نے حج کی تیاریوں کا آغاز کر دیا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر اس برس بیت اللہ کی زیارت ممکن نہ ہو سکی۔ ملول اور پژمردہ عبدالرحمٰن نے یکم ذی القعد کو قاہرہ کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اس تاریخی شہر کی دید اس کے لیے کسی حیرت کدہ سے کم نہ تھی۔ فضائیں دلکش، شاندار محلات، عمارتیں، خانقاہیں، مدرسے، افواج، علمیت وقابلیت سے بھرپور علماء، پھل، میوے، اناج، راہ گیروں سے پُرہجوم بازار، دکانوں پر نعمتوں کی فراوانی اور سب سے بڑھ کر دریائے نیل جیسے تاریخی مقام کی دید کسی حیرت کدہ سے کم نہ تھی۔ یہاں کا ہر ایک نظارہ بے مثال تھا۔ اسے ماضی قریب میں فاس کی جماعت کے سردار اور المغرب کے جید عالم ابو عبداللہ المقری، بجایہ کے عالم شیخ ابوالعباس بن ادریس، فاس کے الفقیہ الکاتب ابوالقاسم البرجی کی باتیں یاد آنے لگیں جن کا کہنا تھا کہ قاہرہ کے متعلق لاعلم شخص اسلام کی عزت سے ناآشنا ہے۔ یہاں کے باشندے بادلوں کی مانند ناقابل شمار ہیں۔ قاہرہ کی خوبصورتی کسی بھی انسانی تخیل سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

اس لازوال حسن کو سراہتا عبدالرحمٰن کئی روز شہر میں مقیم رہا۔ طلباء تک اس نادر روزگار شخص کی شہرت پہنچنے کی دیر تھی۔ بس پھر کیا تھا؟ وہ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ عبدالرحمٰن کا قلیل قیام اور عذر بھی ان کی آتش شوق سرد نہ کر پا رہا تھا۔ ان کی محبت، اشتیاق اور خلوص کو دیکھتے ہوئے اس نے 'الازہر' میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ زندگی بھر مختلف حکمرانوں سے ملنے والی مراعات اور عہدوں سے لطف اندوز ہوتے عبدالرحمٰن نے ایسے کسی بھی لمحے کے بارے میں تصور بھی نہ کیا تھا۔ الازہر میں ذمے داریاں نبھاتے اس کی ملاقات سلطان ملک الظاہر سے ہوئی۔ سلطان نے بھی اس کی خوب تکریم کی۔

یادگار ابن خلدون

1۔ تیونس شہر میں ابن خلدون کا ایک مجسمہ نصب ہے۔

2۔ 1332ء میں تیونس کی ایک مسجد 'القبہ' میں ابن خلدون نے درس دیا تھا۔

3۔ دس تیونس دینار پر ابن خلدون کی تصویر نقش ہے۔

4۔ قاہرہ میں ابن خلدون کا ایک مجسمہ نصب ہے۔

5۔ 2004ء میں تیونس کمیونٹی سینٹر نے طلباء کے ابن خلدون ایوارڈ کا اجراء کیا۔

6۔ 2006ء میں اٹلس اکانومک ریسرچ فاؤنڈیشن نے مسلم طلباء کے سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ جاری کیا جو ابن خلدون کے اعزاز میں منعقد ہوتا ہے۔

7۔ 2006ء میں اسپین نے ابن خلدون کی چھ سوویں برسی کا انعقاد کیا۔

8۔ تیونس میں ابن خلدون انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔

9۔ مصر نے ابن خلدون کی تصویر کے ساتھ ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔

10۔ انڈونیشیا میں ابن خلدون یونیورسٹی قائم ہے۔

ابن خلدون کی تاریخ نویسی کی خصوصیات

1۔ اس نے اپنے سابقین کی طرح واقعات کو سنین کی ترتیب کے مطابق بیان نہیں کیا۔ عمومی انداز اختیار کرتے ہوئے ہر حکومت ومعاشرے کا الگ الگ بیان ہے۔

2۔ اقوام بربر اور بنو احمر کا حال بہت تفصیل اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

3۔ اپنی تصانیف میں اس نے کشادہ دلی، غیر جانبداری اور بے تعصبی برتی ہے۔

4۔ اس کی معلومات ہمہ گیر اور جامع ہیں۔ وہ ایشیا کے علاوہ یورپ کے حالات سے بھی واقف نظر آتا ہے۔

5۔ ایک قوم یا معاشرہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے قلم وسوچ کا رخ ضمنی یا اہم عصر تہذیب وثقافت کی طرف نہیں مڑتا۔ قلم کی روانی پُرسکون دھارے کی طرح ہے۔

"یہ بات یقیناً ہمارے لیے بڑی سعادت ہے ابن خلدون! تم جیسا عالم ہماری درس گاہ سے منسلک ہے۔"

"ذرہ نوازی ہے سلطان معظم! آپ قدردان نہ ہوتے تو میں خاموشی سے سیاحت کے بعد روانہ ہو جاتا۔"

"تم نے بالکل درست کہا۔ اہلِ علم کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ ان کے سفر کے اخراجات اٹھانے کے لیے میں صدقات سے خصوصی وظیفے بھی جاری کرتا ہوں۔ تم بھی انہی سہولیات سے مستفید ہوا کرو گے۔" سلطان نے فراخدلی سے بتایا۔

"اس کرم فرمائی کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں۔ اگر آپ میرے اہلِ خانہ کی یہاں منتقلی میں تعاون فرما دیں تو میں احسان مند رہوں گا۔" اس نے بڑے سلیقہ سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"ٹھیک ہے! میں اس بارے میں جلد ہی انتظامات کرلوں گا۔" ملک الظاہر نے یقین دہانی کروائی۔

عبدالرحمٰن اس یقین دہانی پہ قدرے پُرسکون ہو گیا لیکن حسبِ سابق یہ اطمینان وسکون اسے بالکل راس نہ آیا۔ تونس کے سلطان ابوالعباس نے اس کے اہلِ خانہ کو قاہرہ روانگی کی اجازت ہی نہ دی۔ یہ افراد درحقیقت اس کے لیے عبدالرحمٰن کی واپسی اور دربار سے منسلک رہنے کی ضمانت تھے۔ وہ اس کے سیلانی مزاج سے واقف تھا اس لیے یہ بھی جانتا تھا کہ ہوا کو قید رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے اہل وعیال کو روانہ کر دینے کا مطلب اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنا تھا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن کی ذات سے استفادہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس انکار اور رکاوٹوں کے بعد عبدالرحمٰن نے یہ معاملہ مصر کے سلطان کے گوش گزارا۔ ابوالعباس اس کی سفارش ٹال ہی نہیں سکتا تھا۔ سلطانِ مصر نے اس معاملہ میں ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے عبدالرحمٰن کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ حالات وواقعات میں ایک بار پھر تیزی رونما ہونے لگی۔ انہی دنوں صلاح الدین ایوبی کے دور میں قائم شدہ 'مدرسہ قمحیہ' کے استاد کے انتقال نے انتظامیہ کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ سلطانِ مصر نے مرحوم کی یہ ذمّے داریاں عبدالرحمٰن کو تفویض کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اسی دوران 786ھ میں کسی رنجش یا بدگمانی کے باعث سلطان نے مصری حکومت کے فقہ مالکی کے قاضی کو معزول کر دیا۔ اس وقت مالکی مذہب بلحاظ تعداد' چہارم' شمار ہوتا تھا۔ ان چاروں مذاہب کے قاضی 'قاضی القضاۃ' بننے کے لیے سرگرداں تھے۔ فقہ شافعیہ کے قاضی کا سلطان سے بہت پرانا تعلق تھا۔ اس کی توقعات کا بار بھی قدرے زیادہ تھا۔ اس اندرونی سیاست اور تمام تر ماحول سے واقف عبدالرحمٰن یہ عہدہ قبول کرنے میں خاصا متامل تھا۔ یہ نئی ذمّے داری سنبھالنے کا مطلب بہت سی ذہنی الجھنیں اور اپنی ذات کو نئی سازشوں کے سپرد کر دینا تھا۔ اس نے سلطان کے سامنے کئی عذر پیش کیے لیکن ایک نہ چلی۔

سلطان کی جانب سے خلعت عطا ہونے پر وہ اس کے حکم پر ایک اعلیٰ عہدیدار کے ساتھ مدرسہ صالحیہ میں یہ ذمّے داریاں سنبھالنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ ابتدائی پس وپیش کے بعد عبدالرحمٰن نے عہدہ کی نزاکت واہمیت سمجھتے ہوئے اسے مکمل دیانت داری اور پیشہ وارانہ خلوص سے نبھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے رضائے الٰہی کا حصول سب سے مقدم تھا اور خدائی احکامات کی تکمیل ونفاذ اوّلین ترجیح۔ وہ دونوں فریقین کے مدعا کی مکمل توجہ سے سماعت کرتا۔ رشوت وسفارشات سے وہ روزِ اوّل سے ہی کوسوں دور تھا۔ کمزور کے حقوق دلوانا' غاصب کی سرکوبی کرنا اور عدل کے تقاضے پورے کرنا اسے محبوب تھا۔ ان نئی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے اسے علم ہوا کہ وہاں قاضیوں میں بھی بددیانتی اور پیشہ وارانہ غفلت پنپ چکی تھی۔ درباری امراء بھی ذاتی پسند وناپسند کے مدار میں جکڑے ہوئے تھے۔ دولت مندوں سے ان کے تعلقات مثالی تھے۔ یہ دولت مند طبقہ ایسے افراد سے بھی روابط قائم کیے ہوئے تھے جو قرآن کی تعلیم اور نمازوں کی امامت پر مامور تھے۔ دولت' جاہ طلبی اور اقربا پروری نظام عدل میں بہت بڑی رکاوٹ بن رہی تھی۔ یہ قاری اور امام ذاتی مفاد کے لیے امراء کے لیے صفائی کے گواہ بن جاتے۔ ان کی علمیت' عہدہ اور نیک نامی کے باعث گواہی قبول نہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے غیر جانبداری سے ان حالات کا جائزہ لے کر سخت سزاؤں کا رواج ڈالا۔ اس نے ایسے افراد کو گواہی دینے سے بالکل منع کر دیا۔ ان لوگوں میں وہ طبقہ بھی شامل تھا جو قاضیوں کے لیے کتب تحریر کرنے اور ان کی جگہ مہر ثبت کر دینے کے مجاز تھے۔ امراء کے تحفظات کو محفوظ آڑ فراہم کرنے اور عدالت کو الجھائے رکھنے کے لیے اپنے قلم سے جھوٹ کو سچ پر غالب کر دیتے۔ صرف یہی نہیں یہ قاضی فقہ کی کتابوں سے ایسے باطل دلائل سامنے لاتے جو امراء کو جرائم سے بالکل سبکدوش کر دیتے۔ جوابی طور پر وہ

امراء انہیں تحائف سے لاد دیا کرتے۔ چاروں مذاہب میں ہی یہ طریق کار اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ جائیدادوں اور معاہدوں میں بھی دھوکا دہی کے عناصر شامل ہو چکے تھے۔ اعلیٰ عہدیداران چھوٹے عہدوں سے ان امراء کو نوازنے کے انعام میں اس مقام پر پہنچے تھے۔ طب اور عدالت کا نظام دیمک زدہ ہو چکا تھا۔ اس شہر میں من پسند فتوے صادر کرنا ایک معمول تھا۔ اکثر فتوے قابل اعتراض اور ناقص ہوا کرتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی اہم عدالتی فیصلے کے بعد کوئی فتویٰ جاری ہو جاتا جس سے نقصِ امن اور بھی بڑھ جاتا۔ چاروں مذاہب کا یہ اختلاف شدید سنگین ہوتا جا رہا تھا۔ باہمی جھگڑے، اقربا پروری اور عناد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ہر روز جانے کتنی مرتبہ انصاف کا قتل عام ہوا کرتا۔

عبدالرحمٰن کے لیے ان حالات میں خود کو ڈھالنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس نے روشن ضمیری اور خدا خوفی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے عہدہ کی ساکھ برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے زخم خوردہ عدالتی نظام کو ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کرنا تھا۔ ندائے حق بلند کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے 'جراحی' کا آغاز کر دیا۔ جہلاء کو عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ ان افراد میں مغربی خطہ میں آنے والے ایسے افراد بھی شامل تھے جن کے پاس کسی بھی معروف' سند یافتہ استاد کی شاگردی کا حوالہ یا اپنے فن کی بابت کوئی بھی کتاب موجود نہ تھی۔ ناقص' من پسند اور قابلِ اعتراض فتوے صادر کرنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ اپنے مدعین کی ایماء پر فریق ثانی کے معززین کو بدنام کرنا ان کا شیوہ تھا۔ خواتین سے دل بستگی اور عیاشی کے لیے مجلسوں کا اہتمام کوئی ان سے سیکھتا۔

عبدالرحمٰن کی اس 'جراحی' نے انہیں سخت برافروختہ کیا۔ اضطراب اور غم وغصہ میں انہوں نے اس طبقہ سے رجوع کیا جو 'زاویہ نشین' کہلاتا تھا۔ اب ذرا ان کا حال بھی ملاحظہ ہو۔ احکام الٰہی ان کے لیے موم کی ناک بنے ہوئے تھے۔ بے ضمیری اور دینی بے حمیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ان احکامات کی پامالی اور توڑنے مروڑنے سے بھی نہ چوکتے۔ ان کی عبادات اور منصب کے بھرم میں اگر کوئی حقدار اپنا مقدمہ لیے ان کے پاس چلا جاتا تو وہ شیطانی افکار کے زیر اثر بلا سوچے سمجھے کوئی بھی من پسند حکم صادر کر دیتے۔ عبدالرحمٰن نے ان کی قوت (زاویہ نشینی کا منصب) ہی چھین لی۔ اسے کسی بھی ایسے شخص سے کوئی ہمدردی نہ تھی جو پروردگار کی زمین پر فساد برپا کرے۔ ان بے باک اقدامات کے تحت وہی ہوا جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ چوروں' لٹیروں' دھوکا بازوں اور مذہبی چولہ پہن کر شیطان کی پیروکاری کرنے والے یہ افراد اپنے تمام اختلافات پس پشت ڈالے متحد ہو گئے۔ انہوں نے عبدالرحمٰن کے کردار کی دھجیاں اڑانی شروع کر دیں۔ آئے روز نت نئے جھوٹ اس کی ذات سے منسوب کیے جانے لگے۔ عوام الناس میں اس کے خلاف بہتانوں کی بھرمار کر کے نفرت کا بازار گرم ہونے لگا۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو سلطان کے پاس فریاد لے جا کر عبدالرحمٰن کو عہدہ سے برطرفی کا واویلا کرنے لگے۔ دوسری جانب ایک گروہ عبدالرحمٰن کی رہائش گاہ پر اس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔

''آپ کا یہ طریقہ بالکل درست نہیں ہے ابن خلدون! ان فیصلوں سے آپ یہاں بالکل اکیلے ہو جائیں گے۔'' وفد کے سربراہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں کوئی بھی فیصلہ دنیاوی مفاد کے لیے نہیں کر رہا۔ میرا اجر صرف اللہ کے پاس ہے۔''

''شہر بھر میں رسوا ہو چکے ہو۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو کہ لوگ کیا کہتے پھر رہے ہیں۔'' ایک معمر شخص نے جتایا۔

''وتعز من تشاء...... وتذل من تشاء...... میں دنیا کی باتوں کے خوف سے صراطِ مستقیم ترک نہیں کر سکتا۔''

''کتنی دولت درکار ہے ابن خلدون؟ ہم آپ کو ریاست کا اعلیٰ ترین عہدہ دلوا کر جواہرات میں تول دیں گے۔'' خوف کے بعد ترغیب کا پتا پھینکا گیا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے عہدوں اور مال پر کہ جس کے عوض مجھے خیانت اور نفس سے سودا کرنا پڑے۔ میں انصاف فروخت نہیں کر سکتا۔ میرے نبی کا فرمان ہے کہ میں اگر کسی شخص کے حق میں ایسا فیصلہ دوں جو اس کے بھائی کا حق ہو گا تو میری جانب سے اس کے حق میں یہ آگ کا فیصلہ ہو گا۔ اپنی اصلاح کر و یا لوٹ جاؤ! میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں صرف اپنے عہدہ سے مخلص اور سلطان سے وفادار ہوں۔ اس سے متصادم کوئی بھی بات مجھے قبول نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں کہتا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

حاضرین غصے سے دانت پیس کر رہ گئے۔ اس کے بعد شہر بھر میں عبدالرحمٰن کے خلاف کردار کشی اور ہرزہ سرائی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سلطان تک جب یہ معاملہ پہنچا تو اس نے تمام تر قاضیوں اور مفتیوں کو طلب کر

لیا۔ عبدالرحمٰن نے بھرپور دلائل سے انہیں کاذب ثابت کر دیا۔ سلطان کے لیے یہ بھی یہ بہت کٹھن وقت تھا۔ شہر بھر کے قاضی اور مفتی یکدم معزول بھی نہیں کیے جاسکتے تھے۔ مخالفین کا یہ گروہ پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے میدانِ عمل میں اتر آئے۔ جھوٹ، بہتان، غیبت اور الزامات کا سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ ہر جانب سے زبردست احتجاج شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں ایسے اعلیٰ عہدیدار بھی اس سے بدظن ہو گئے جو قبل ازیں عبدالرحمٰن کے حامی شمار ہوتے تھے۔ حکومتی اراکین کے ساتھ تعلقات بھی کشیدہ ہونے لگے۔ مصائب و مشکلات نے گویا اس کا در ہی دیکھ لیا تھا۔ پیشہ وارانہ پریشانیاں ختم ہی نہ ہوئی تھیں کہ خانگی زندگی بھی ایک ایسے بھونچال کی زد میں آگئی جس نے ماضی کی طرح ایک بار پھر ہر رشتہ سے محروم کردیا۔

اس کی اہلیہ اور بیٹے بذریعہ سمندر تونس سے السفین روانہ ہوئے تھے۔ اسکندریہ کی بندرگاہ پر تندو طوفانی ہواؤں نے ان کا سفینہ غرق کردیا۔ اس پر سوار کوئی بھی فرد یا مال اسباب سلامت نہ رہ سکا۔ آبی قبر میں بے کفن دفن ہوکر سبھی لوگ تا قیامت اپنا نشان کھو بیٹھے۔ عبدالرحمٰن کی کیفیات و صدمہ ناقابل بیان تھا۔ زندگی نے دوسری بار بھی شدید ضرب پہنچائی تھی۔ رشتے ناتے اسے کبھی راس ہی نہ آئے تھے۔ والدین، عزیز و اقارب، احباب اور اساتذہ کے بعد بیوی بچے بھی اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئے اور وہ مصائب میں گھرا تنہا رہ گیا۔ ان دوطرفہ پریشانیوں نے اس کے دل و دماغ سے دنیاداری کے لیے بے رغبتی بڑھادی۔ اس نے عہدہ سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

”یہ کیا کرنے جارہے ہیں ابن خلدون؟ مخالفین کی تو عید ہوجائے گی۔“ اس کے خیر خواہ سمجھانے کی غرض سے چلے آئے۔

”کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کیا سمجھتا ہے؟ یہ دنیا کھیل تماشہ سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ سخت قنوطیت کا شکار ہورہا تھا۔

”آپ کے اس طرح خود میدان چھوڑ دینے سے لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ مخالفین کے الزامات درست تھے۔“ ایک قریبی ساتھی نے دل گرفتگی سے کہا۔

”مخالفین اور ان کی باتوں پر یقین کرنے والے بھی میری ذات اور اس سے وابستہ دکھ نہیں سمجھ سکتے۔ خدانہ کرے کسی پر ایسا کوئی وقت آئے۔ میں نے اپنی زندگی کا ہر رشتہ کھودیا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی خسارہ اہم ہی کہاں ہے؟“

”سلطان اس معاملہ کو بغاوت سمجھیں گے۔ کچھ تو ہوش کے ناخن لیجیے۔“

اس بات پر عبدالرحمٰن بے بسی سے خاموش ہوگیا۔ اس نے زہد کی جانب لو لگالی۔ پروردگار کے دربار میں اپنا معاملہ پیش کرکے وہ قدرے پُرسکون ہوگیا۔ جلد ہی اس کا یہ مسئلہ روبہ حل نظر آنے لگا۔ سلطان نے اس کی ذہنی حالت دیکھتے ہوئے خود ہی اسے عہدہ کے بوجھ سے آزاد کردیا۔ منصب سابق عہدیدار کو واپس کردیا گیا۔ عبدالرحمٰن کی اس علیحدگی اور اس پر پڑنے والی افتاد پر خیر خواہ بہت افسردہ تھے۔ وہ اس کی جدوجہد اور مشکلات سے دلی طور پر متاثر تھے۔ ان سبھی نے ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے اسے رخصت کیا۔ چند ایک افراد تو اس کی واپسی کے لیے بھی پُر اُمید تھے۔ وہ ایک حق گو، بے باک اور نڈر شخص کا دکھ دلی طور پر محسوس کررہے تھے۔ عبدالرحمٰن اب کسی بھی منصب کا طوق اپنی گردن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ کتب بینی، تدریس اور عبادت میں ہی زندگی وقف کردینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

رمضان المبارک 789ھ کے وسط میں عبدالرحمٰن بحرسویز کی مغربی سمت طور کی بندرگاہ چلا گیا۔ سلطان اور امراء نے اسے ذاتی طور پر زادراہ کے لیے بہت اسباب اور مالی مدد فراہم کی تھی۔ بندرگاہ پر چند روزہ قیام کے بعد وہ دس شوال کو سمندری سفر پر روانہ ہوکر ایک ماہ بعد الینبع، پہنچ گیا جہاں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونے والا ایک قافلہ بالکل تیار تھا۔ عبدالرحمٰن بھی ان کے ہمراہ ہولیا۔ دو ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوکر مناسک حج ادا کرتے ہوئے اس کا وجود اشکوں میں ڈھل گیا تھا۔ مرحومین کی یاد اور ان کی مغفرت کے لیے اشکبار ہوکر دعائیں مانگتا رہا۔

اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے بعد وہ تقریباً دو ماہ تک الینبع میں ہی قیام پذیر رہا۔ سمندر قدرے طغیانی پر تھا۔ موسم سفر کے لیے بالکل مناسب نہ تھا۔ طور کی بندرگاہ تک پہنچنے سے قبل ہی انہیں تیز ہواؤں نے لپیٹ میں لے لیا۔ جہاز کی پتوار مشرقی سمت موڑ لینے کے سوا اب ناخدا کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے جوانمردی اور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساحل قیصر تک رسائی حاصل کرلی۔ بذریعہ میں لنگرانداز ہونے کے بعد وہ اس علاقہ کے بدوؤں کے

امراء سعید کے دارالحکومت 'قوص' شہر چلا آیا۔ قوص میں چند روزہ قیام کے بعد وہ دریائے نیل میں سفر کرتا ایک ماہ بعد جمادی الاول 790ھ میں بالآخر مصر پہنچ گیا۔

حجاز مقدس سے واپسی کے بعد اس کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔ واپسی سے کچھ ہی عرصہ بعد 792ھ میں اسے 'مدرسہ غتمش' میں تدریس و تالیف کے امور سونپ دیے گئے۔ چند سال بعد قاہرہ میں مالکی قاضی القضاۃ کا منصب ملا۔ اس دوران عبدالرحمٰن نے بیت القدس اور فلسطین کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ رمضان 802ھ میں واپسی کے بعد سلطان نے اسے ظاہراً مصر کا نگران بنادیا۔ تقدیر نے بھی اپنے سابقہ کھیل کا ایک بار پھر آغاز کردیا۔ رمضان 802ھ میں مصر آمد کے ساتھ ہی سازشوں کا بازار گرم ہوگیا۔ نورالدین ابن الخلال نامی مالکی فقیہ نے اپنے مصاحب کے اکسانے پر قاضی القضاۃ کا عہدہ حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کردی۔ عبدالرحمٰن کے سبھی مخالفین بھی اس کے حامی بن گئے۔ یہ سرد جنگ بالآخر محرم 803ھ میں اس کی معزولی پر منتج ہوئی۔ عبدالرحمٰن نے کسی بھی ساز باز کا حصہ بنے بغیر اپنے مرغوب ترین کام درس و تدریس اور کتب کی تالیف میں مشغول ہوگیا۔ زندگی کے ان دو بڑے سانحات کے بعد اب کسی نقصان، محرومی یا خلش کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

مصر کے حالات بے حد ہموار اور فضا پُرامن تھی۔ اس پُرسکون ماحول میں تلاطم کی پہلی لہر اس وقت پیدا ہوئی جب 'امیر تیمور' کے بلاد روم کو فتح کرنے اور 'سیواس' شہر تباہ و برباد کرکے شام کی جانب واپسی کی اطلاع ملی۔ مصر کے سلطان نے اپنا لشکر تیار کیا اور عبدالرحمٰن کو بھی ساتھ چلنے پر مجبور کردیا۔ یہ سفر ماہ ربیع الاول کے وسط میں شروع ہوا۔ لشکر غزہ سے ہوتے ہوئے دمشق روانہ ہوا تاکہ تاتاریوں کی آمد سے قبل ہی وہاں پڑاؤ ڈال لیا جائے۔ دونوں افواج کا کئی بار ٹکراؤ ہوا لیکن مکمل کامیابی کسی کا مقدر بھی نہ بن سکی۔

اس موقع پر حالات نے ایک اور ستم ظریفی دکھائی۔ مصری لشکر میں موجود کئی امراء شرانگیزی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ وہ مصر لوٹ کر بغاوت کرکے تخت و تاج پر قابض ہونے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔ سلطان اور دیگر امراء کے پاس اب مصر لوٹ کر اس بغاوت کے شعلے سرد کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی روانگی کے بعد قاضی اور فقیہ نے

میواڑ

راجپوت ریاستوں کا اہم شہر 728 میں بپا سراول نے آباد کیا۔ مسلمان فاتح اس پر شدت سے حملہ آور ہوتے رہے۔ ان کے حملوں کو روکنے کے لیے وہاں کے راجوں مہاراجوں نے بھی بندوقوں کا ساتھ دیا۔ بعد میں مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس وقت یہاں سلطان ہمیر کی حکومت تھی۔ اس کے بعد حکومت اس کے خاندان کے دوسرے افراد میں منتقل ہوتی رہی۔ ایک حکمران لکش رانا، دوسرے راجپوتوں کو شکست دیتا ہوا ''گیا'' تک اپنی سلطنت بڑھانے میں کامیاب ہوگیا۔ بعد کے اہم حکمرانوں میں رانا کمیاہ یا کمبھ کرنا 1433-1468ء کا نام آتا ہے۔ جس نے مالوہ اور گجرات کے حکمرانوں کو شکست دی، اور گرفتار کرکے چتوڑ لے آیا۔ اس فتح کی خوشی میں اس مقام پر اس نے ''مینار فتح'' تعمیر کرایا۔ 1527ء تا 1508ء تک اس پر رانا سنگھ کی حکومت رہی۔ جس کی زندگی جنگ وجدل میں گزری۔ بابر اور لودھی کی جنگ میں اس نے بابر کی حمایت کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بابر لودھی سے جنگ جیت کر یہاں سے چلا جائے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ بابر کا ملک چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں، تو اسّی ہزار گھوڑوں، پانچ سو ہاتھیوں اور پٹھان اور میواتی راجپوتوں پر مشتمل کثیر فوج کے ساتھ بابر کو چیلنج کردیا۔ فتح پور سیکری کے قریب ''قاموٴ'' کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ بابر جنگ جیت گیا... اور ان کو فرار ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ جنگ کے بعد وہ جلد ہی چل بسا۔ تاہم یہاں کے راجوں نے شکست تسلیم نہ کی۔ راجا پرتاپ چند 1572-1597ء اور راجا امر سنگھ 1547-1640ء مغلوں کے خلاف رہے لیکن 1615ء میں ان کا جہانگیر سے معاہدہ ہوگیا۔ مالوہ حکومت کے انتشار کے بعد میواڑ کی مصوری بہت مشہور ہوئی جس میں مالوہ مصوری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

مرسلہ: نعیم الدین، سیالکوٹ

عبدالرحمٰن سے ملاقات کی اور باہمی مشاورت سے طے پایا کہ امیر تیمور سے گھروں اور بیوی بچوں کے لیے امان طلب کی جائے۔قاضی برہان الدین ابن ملفح الحنبلی خانقاہ مدرسہ عادلیہ کے دیگر صوفیوں کے ہمراہ امیر تیمور سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔امیر تیمور نے انہیں امان دینے کا وعدہ کر کے شہر کے دیگر معززین اور قاضیوں کو بھی اس کے پاس لانے کا مطالبہ کر دیا۔

اس دوسرے گروہ کا بھی خوشدلی سے استقبال ہوا۔ امیر تیمور نے ان کے لیے امان نامے تحریر کر دیے۔تیمور کا جوابی مطالبہ یہ تھا کہ کوئی امیر شہر کے دروازے کھول کر اندر دارالامارات لگائے گا اور اسی کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت شہر پر حکمرانی کرے گا۔ان امان ناموں اور شرائط کے بعد امیر تیمور نے قاضی برہان الدین کو خصوصی ملاقات کے لیے بلایا۔

''میں نے عبدالرحمٰن ابن خلدون کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔''

''جی ہاں! وہ حقیقتاً ایک قابل اور باعلم شخص ہے۔'' قاضی نے کہا۔

''مجھے اس سے ملاقات کی بڑی تمنا ہے۔وہ مصری افواج کے ساتھ واپس تو نہیں چلا گیا؟''

''نہیں! وہ مدرسہ عادلیہ میں ہی مقیم ہے۔'' قاضی کے جواب پر تیمور نے اسے جلد از جلد حاضر ہونے کی تاکید کر کے رخصت کر دیا۔

قاضی برہان الدین نے عبدالرحمٰن کے گوش معاملہ گذارا اور ملاقات کے لیے اسی رات کا وقت طے کر لیا گیا۔ حالات نے یکدم کروٹ لی اور جامع مسجد میں کچھ لوگوں کے مابین فساد برپا ہو گیا۔وہ افراد امیر تیمور کے امان ناموں اور عبدالرحمٰن کی طلبی میں نیک نیتی پر مشکوک تھے۔معاملات اس قدر تیزی سے بگڑے کہ عبدالرحمٰن پر قاتلانہ حملے کے اندیشے غالب آ گئے۔وہ رات تو جیسے تیسے بیت گئی۔اگلے روز وہ علی الصبح ہی ان قاضیوں کے پاس پہنچ گیا جو شہر کے دروازے پر اکٹھے تھے۔عبدالرحمٰن نے ان کے سامنے سبھی حالات گوش گذارے اور شہر سے باہر جانے یا فصیل سے اترنے کی اجازت طلب کی۔قاضی حضرات اسے بھیجنے میں خاصے متامل تھے،عبدالرحمٰن کے دلائل اور صورتِ حال کی نزاکت دیکھ کر اسے فصیل سے اترنے کی اجازت دے دی۔شہر کے دروازے پر پہنچ کر عبدالرحمٰن نے 'شاہ ملک'

نامی اس امیر کو دیکھا جسے تیمور نے دمشق کی حکومت کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کے ساتھ چند بااعتماد اور جاں نثار غلام بھی تھے۔عبدالرحمٰن سے رسمی گفتگو اور سلام دعا کے بعد اس کا مدعا جان کر شاہ ملک نے اسے ایک سواری دے کر وفادار ساتھی بھی ہمراہ بھیج دیا تاکہ امیر تیمور کے پاس پہنچنے تک کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

تیمور کے خیمے تک رسائی سے پہلے اسے ایک ایسے خیمے میں بٹھایا گیا جسے انتظار گاہ کا درجہ حاصل تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تیمور نے اسے اپنے خیمے میں طلب کر لیا۔وہ کہنی کے بل نیم دراز تھا۔طعام کے برتن اس کے سامنے سے گذار کر اس کے ساتھیوں کی طرف بھیجے جا رہے تھے۔عبدالرحمٰن نے اندر آتے ہی حتی الامکان نیاز مندی سے سلام کیا۔امیر تیمور نے بے نیازی سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔عبدالرحمٰن نے روایت کے مطابق اس کے ہاتھ پر تعظیمی بوسہ دیا۔تیمور نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔عبدالرحمٰن آگے یا پیچھے ہوئے بغیر انہی قدموں پر بیٹھ گیا۔امیر تیمور نے اپنے ایک قریبی ساتھی اور خوارزم کے حنفی فقہاء میں سے نمایاں عالم عبدالجبار بن النعمان کو بھی وہیں بلوا لیا تاکہ وہ ان دونوں کے لیے ترجمان کے فرائض سرانجام دے سکے۔امیر تیمور کی آنکھوں میں گہری دلچسپی اور جوش ہلکورے لیتا نظر آ رہا تھا۔اس نے عبدالرحمٰن سے اس کے حصول علم اور مختلف علاقوں میں سفر کے متعلق سوالات کا آغاز کر دیا۔عبدالرحمٰن صاف گوئی اور سادگی سے ہر ایک سوال کا جواب دیتا رہا۔امیر تیمور اس کے انداز گفتگو سے کافی متاثر ہو رہا تھا۔ابتدائی سوالات کے بعد اس نے موضوع گفتگو تبدیل کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''مغربی دنیا میں الجوانی کا کیا مطلب ہے؟''

''مغرب کی مقامی زبان میں اس لفظ کا مطلب اندرونی اور انتہائی اندر کا کوئی علاقہ ہے امیر!'' اس نے بتایا۔

''ان مغربی علاقوں کی تفصیل جاننی ہے مجھے۔'' وہ متجسس تھا۔

''سارا مغرب بحر روم کے جنوبی ساحل پر ہے۔اس مقام سے قریب ترین علاقے 'برقہ' اور 'افریقا' ہیں۔وسطی مغرب تلمسان اور زبانۃ کے بلاد ہیں۔مغرب اقصیٰ میں فاس اور مراکش کا شمار ہوتا ہے۔یہی علاقے درحقیقت اندرونِ مغرب شمار ہوتے ہیں۔''

’’مغرب میں طنجہ کے علاقہ کی بابت بھی کچھ بتاؤ۔‘‘ اس نے اگلا سوال کیا۔

’’طنجہ آبنائے روم میں ہے امیر!‘‘

’’اور سبتہ؟‘‘

’’اگر آپ آبنائے کے ساحل سے ایک دن کی مسافت طے کریں تو سبتہ پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے اندلس کا سفر تقریباً بیس میل ہے۔‘‘ عبدالرحمٰن اس کے سوالات کی نوعیت پر قدرے الجھنے لگا تھا۔

’’خوب! اور سجلماسہ؟‘‘ امیر تیمور نے اس کی کیفیات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

’’یہ مزروعہ علاقوں میں ہے۔ جنوب میں ریگستان کی سرحد پر واقع سمجھ لیجیے۔‘‘

’’تمہاری معلومات قابلِ رشک ہیں ابن خلدون! لیکن میں ابھی کلی طور پر مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مغرب کے اس پورے علاقہ کو ایک نقشہ کی صورت میں تیار کرو۔ اس کا ہر ایک قریبی یا دور کا علاقہ، درہ، پہاڑ، دیہات، شہروں اور رہائشیوں کے متعلق ایسی تفصیل بیان کرو کہ مجھے محسوس ہو میں یہ سب اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔‘‘ امیر تیمور نے بالآخر بلّی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

عبدالرحمٰن نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد یہ نئی ذمّے داری نبھانے کی ہامی بھرلی اور کچھ ہی عرصہ میں کتابی جسامت کے بارہ اوراق پر اس کی مطلوبہ معلومات مستند طریقہ سے لکھ کر امیر تیمور کے پاس لے آیا۔

’’میں نے آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کی ہے امیر!‘‘ اس نے تعظیم دی۔

’’مجھے بھی یقین ہے کہ اس نقشہ میں کسی قسم کا کوئی جھول یا غلطی نہیں ہوگی۔‘‘ تیمور نے جواب دیا۔ ’’کیا تم مصر جانے کے خواہشمند ہو؟‘‘ اس نے لمحاتی توقف کے بعد دریافت کیا۔

’’اگر یہ سفر آپ کی ملازمت کے لیے ہو تو بہت بہتر ہے۔ بصورت دیگر اس سرزمین کے لیے اب میرے دل میں کوئی کشش نہیں ہے۔‘‘ وہ صاف گوئی سے بولا۔

’’بہتر یہی ہے کہ تم وہیں لوٹ جاؤ۔ وہاں دگرگوں مذہبی اور عدالتی نظام کو تمہی جیسے سرفروش کی ضرورت ہے۔‘‘ اس نے فراخدلی سے کہا اور اپنے ایک قاصد کی معیت میں واپسی کے لیے روانہ کردیا۔

امیر تیمور کے قاصد سے ’صفد‘ میں علیحدگی کے بعد عبدالرحمٰن نے اپنے احباب کے ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ کچھ ہی مسافت طے ہوئی تھی کہ قبائلیوں کی ایک جماعت نے ان کا راستہ روک لیا۔ یہ قبائلی درحقیقت راہزن تھے۔ انہوں نے مال و اسباب ہی نہیں بلکہ تن سے کپڑے اتروا کے بھی اپنے قبضے میں کرلیے۔ زندگیاں بمشکل بچا کر عبدالرحمٰن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اسی عریاں حالت میں پہلے ایک دیہات میں پہنچے اور اس کے تین روز بعد ’الصبیبہ‘ پہنچ کر لباس کا بندوبست کیا۔ مشکلات اور آزمائشوں سے لبریز یہ سفر بالآخر مصر میں منتج ہوا۔ اس سرزمین پر قدم رکھنے سے قبل عبدالرحمٰن کو امید تھی کہ اب زندگی پرسکون ہوجائے گی لیکن آغاز میں ہی ایسی غیر متوقع صورتِ حال درپیش آئی کہ وہ دم بخود رہ گیا۔ مصر میں مقامی افراد اسے دیکھ کر ششدر نظر آتے تھے۔

’’آپ زندہ ہیں ابن خلدون؟‘‘ ایک شخص نے اسے دیکھتے ہی حیرانی سے صدا لگائی۔

’’الحمدللہ میرے بھائی! آپ کو چلتا پھرتا نظر آرہا ہوں تو زندہ ہی ہوا ناں۔ لاشیں کب سے سانس لینے اور چلنے پھرنے لگیں؟‘‘ وہ خوشدلی سے بولا۔

’’یعنی کہ آپ تو واقعی حیات ہیں۔‘‘ دوسرے شخص نے بھی حیرت جتائی۔ عبدالرحمٰن ان کے اس غیر فطری ردِعمل پر الجھ گیا۔

کچھ ہی لمحوں میں اسے اصل صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا۔ مصر سے طویل غیاب اور امیر تیمور کے ساتھ مصروفیت میں اہلِ شہر کو یہ گمان ہونے لگا تھا کہ عبدالرحمٰن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی غیر حاضری میں مالکی مذہب کے ایک فاضل ’جمال الدین الاقفھی‘ کو ترقی دے کر قاضی کے عہدہ پر فائز کردیا گیا۔ جمال الدین ایک مضبوط حافظہ کا مالک، باشعور، دیانت دار اور مخلص انسان تھا۔ وہ اپنے عہدہ کا مکمل حق ادا کرتے ہوئے سفارشات یا رشوت بالکل قبول نہیں کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن کی واپسی پر قضاۃ کے لیے اس سے بہتر اور کوئی انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ماہِ شعبان کے آخر میں اسے قضاۃ کا منصب واپس کردیا گیا۔

عبدالرحمٰن نے اپنے فرائض سنبھالتے ہی سابقہ معمولات پر عمل کرنا شروع کردیا اور ایک بار پھر مخالفتوں کی زد میں آگیا۔ اس پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ ایک زیر زمین گروہ ’رجل ہو ارجل‘ کا رکن بن کر اصلاح پسند

نظریات نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے دولت و مراعات کی کئی بار پیشکش ہوئی لیکن اس کا ایمان ذرا بھی نہ ڈگمگایا۔ سازشوں کی بساط بچھی۔ سلطان کو من گھڑت داستانیں سنا کر عبدالرحمٰن کو معزول کروا دیا گیا۔ اس کے متبادل مالکی فقیہ' جمال الدین بساطی' کو قاضی بنا دیا گیا جس کے بارے میں شنید یہی تھی کہ وہ بھی اس مخالف گروہ کے ساتھ سازش میں شامل تھا اور اپنی تقرری کے لیے حالات ہموار کرنے کی غرض سے خاصی دولت بھی رشوت میں پیش کی تھی۔

مصر کا عدالتی نظام از سر نو انتشار اور اقربا پروری کا شکار ہوگیا۔ برائی بالآخر برائی ہے۔ ازل سے مٹ جانا ہی اس کا مقسوم ہے۔ کچھ عرصہ بعد سلطان کو اپنے غلط فیصلہ کا احساس ہوا تو اس نے رجب 804ھ کے اواخر میں یہ عہدہ دوبارہ عبدالرحمٰن کو سونپ دیا۔ مصر کی سیاست میں 'قضاۃ' ایک رسہ کشی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ چوتھی بار قضاۃ پر تقرری کے کچھ ہی عرصہ بعد البساطی کی سازشیں کامیاب ہو گئیں۔ شعبان 807ھ کو یہ منصب ایک بار پھر عبدالرحمٰن کو مل کر اسی سال ذی القعد میں دوبارہ البساطی سے ہم آغوش ہو گیا۔ اس رسہ کشی کے ذہنی تناؤ' دیمک زدہ نظام میں بہتری پیدا کرنے میں حائل رکاوٹوں اور بڑھتی عمر نے اس کی صحت کو کئی ایک مسائل لاحق کر دیے۔ علالت نے اس کے وجود میں سیندھ لگالی تھی۔ حالات بد سے بدتری کی جانب گامزن ہوتے گئے۔

☆☆☆

اس روز شوال کی تین تاریخ تھی۔

شہر کے معززین ایک نجی محفل میں جمع تھے۔ ہر سو بہترین مرغن کھانوں' رنگا رنگ مشروبات اور صنف نازک کے ریشمی ملبوسات کی خوشبو بکھری تھی۔ ہر ایک چہرہ مسرور و پُر جوش اس محفل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''میرے مقدمہ کے بارے میں کیا سوچا ہے البساطی؟'' ایک معمر تاجر نے بھنا ہوا گوشت بھنبھوڑتے ہوئے استفسار کیا۔

''سوچنا کیا ہے بھئی؟ آپ نے کہہ دیا بس فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوگا۔'' البساطی نے مشروب کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے سروں پر لٹکتی تلوار سے نجات مل گئی ہے۔ اب کسی سر پھرے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البساطی کو بہر صورت قضاۃ کے عہدہ پر فائز رکھنا ہے۔'' ایک عہدیدار نے جھرجھراتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کریں! اگر میں نہ بھی رہا تو عبدالرحمٰن ابن خلدون نامی وہ آسیب دوبارہ نہیں آئے گا۔'' البساطی نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''ہاں! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ موت نے اسے ہماری زندگیوں سے دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال دیا ہے۔'' تاجر نے گہری سانس لی۔

''اس کی موت سے ہمارے تو سارے مصائب ہی حل ہو گئے ہیں۔ جب اس کی علالت کی اطلاع ملی تھی میں نے دن رات اس کے مرنے اور اپنی نجات کی دعائیں کی تھیں۔ ایک اور قاضی نے آسودگی سے کہا۔ وہ سب چھبیس رمضان کو عبدالرحمٰن کے انتقال سے خاصے مسرور تھے۔

''ویسے ایک بات تو تسلیم کرنی پڑے گی کہ بہت جی دار شخص تھا۔ کبھی کسی دباؤ میں آیا ہی نہیں۔ دولت اسے خرید سکی' نہ ہی خوفزدہ ہوا۔'' البساطی نے اعتراف کیا۔

''منفرد تھا اسی لیے تو یوں تنہائی اور گمنامی میں موت کا شکار ہو گیا۔ یار باش اور سمجھدار ہوتا تو ہم سب اس کی علالت' پریشانیوں یا آخری ایام میں بھرپور ساتھ دیتے۔'' قاضی نے منہ بنایا۔

''ویسے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ رمضان میں انتقال کرنے والا بہت نیک اور جنتی بندہ ہوتا ہے۔'' معمر تاجر نے جواب دیا۔

''نیک تو پتا نہیں وہ تھا کہ نہیں۔ میں تو اسے احمق ہی کہوں گا۔ عمر بھر کوئی جائیداد بنائی' نہ ہی گھر بسا سکا۔ بے اولاد اور بے نام و نشان ہی مر گیا۔'' البساطی نے طنز کیا۔

''خیر چھوڑو! ہمیں اس سے کیا؟ ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اب وہ ہماری راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔ اس کے بعد شہر بھر میں کوئی اور اتنا جرأت مند یا سرفروش نہیں ہے کہ ہمارے خلاف کھڑا ہو جائے۔'' قاضی کا سر تن گیا۔

''آج کا یہ جام ہماری فتح اور دشمن کی موت کے نام۔'' البساطی نے جام لہرایا۔ دیگر معززین بھی قہقہے لگاتے ہوئے اس کے ہمنوا بن گئے۔

ماخذات:

1 ابن خلدون، کامران اعظم سوہدروی...... ابن خلدون، رابرٹ سائمن......ابن خلدون، ابوالفتح تیونسی

رقص شمشیر

ببرک کارمل جمالی

ایسا حُسن اللہ کسی کو نہ دے۔ اس حسینہ کے حسن کی خاطر ایک دو نہیں تیس ہزار جوان تہ تیغ ہوئے۔ بلوچستان کا ہر میدان لاشوں سے اٹا، ہر وادی خون سے نہلادی گئی مگر اس حُسن کی دیوی کو پھر بھی محبوب کی خلوت میسر نہ ہوئی۔ اس کے دو چاہنے والے تیس سال تک برہنہ تلوار لیے قتال میں مصروف رہے۔

ایک مشہور حسینہ کا ذکر جس کی خاطر تلواریں ٹکراتی رہیں



دونوں سردار جوانی کے زعم میں مست تھے۔ طاقت کا نشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ دونوں سردار طاقت کے نشے میں چور تھے۔ ایک طرف جذباتی نوجوان سردار گوہرام خان لاشاری تھا تو دوسری جانب طاقتور جنگجو سردار میر چاکر خان رند تھا۔ دونوں اپنے اپنے قبیلے کے سردار مانے جاتے تھے۔ ان کے ایک حکم پر سیکڑوں جان نثار جان دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن یہ دونوں ایک عورت کو دل دے بیٹھے تھے۔ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جسے عرف عام میں ''جتنی'' کہتے ہیں۔ مگر اس کا حسن سرداروں کی بیگمات سے بھی زیادہ تھا۔ سرداروں کی نظر ہمیشہ تیز ہوتی ہے انہی تیز

نظروں نے گوہر جتنی کو نگاہوں کے حصار میں لے لیا۔ رند اور لاشار قبیلے کے سرداروں کی نظر ایک ساتھ گوہر جتنی کے حسن پہ پڑی تو دونوں ہی سردار اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

رند اور لاشار کے سردارزادے گوہر جتنی کے حسن بلا خیز کے آگے سرنگوں ہو گئے تھے۔ ان پر جوانی کا خمار تھا، دونوں ہی گوہر جتنی کو پانے کے لیے بے چین ہو گئے تھے۔ جبکہ گوہر جتنی دونوں سردارزادوں کو کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن سرداری نظام کے سامنے مجبور تھی کیونکہ وہ معمولی سی جتنی تھی۔ حالانکہ عام "جتنی" سے وہ بہت امیر تھی۔ اس کے پاس دوسو سے زائد اونٹوں کا ریوڑ تھا مگر انسانوں کا لشکر تو گہرام اور چاکر کے پاس تھا۔

چاکر اور گہرام کے دل میں گوہر جتنی کا عشق پرورش پانے لگا۔ دونوں سردارزادے یہ کہتے پھرتے تھے کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اندھے نہیں ہیں۔ اگر ہم اندھے ہوتے تو حسین ترین چہرہ گوہر جتنی کا کیسے دیکھ پاتے۔ دنیا میں اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو حسن دیا ہے تو وہ گوہر جتنی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گوہر جتنی انتہائی حسین وجمیل تھی۔ اس کے حسن کے چرچے ایران کے بلوچوں تک پہنچ رہے تھے۔ ہر شخص ایک بار گوہر جتنی کے دیدار کا متمنی تھا۔ گوہر کو اللہ تعالیٰ نے ایسا حسین بنایا تھا کہ کسی کی ایک نظر اس پہ پڑتی تو دور ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گوہر جتنی کا چہرہ اور آنکھیں گول تھیں، چہرے پہ بلا کی خوبصورتی تھی، مگر وہ حسن بے مثال تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ نے فرصت میں اس کا چہرہ بنایا تھا۔ اس کے حسن کے چرچے دور ونزدیک مشہور ہونے لگے۔

یہ قصہ پانچ سو سال پرانا ہے، اس وقت دو سردار بہت مشہور تھے، ایک چاکر خان رند اور دوسرا میر گوہرام لاشاری۔ یہ دونوں بلوچ قبائل لاشاری اور رند کے سردار تھے۔ اس وقت ان کے پاس اسی، اسی ہزار سپاہیوں کا لشکر تھا۔ دونوں ہی سرداروں کو اپنے لشکر پہ فخر تھا۔ دونوں ہی کے پاس جنگجو بڑی تعداد میں تھے۔ ایسے لشکر کی موجودگی میں کس کی مجال تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بلوچ قبائل کا آپس میں ٹکراؤ نہ تھا۔ تمام بلوچ قبائل ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ اس وقت بلوچ قوم کا لشکر اسی ہزار تھا۔ جبکہ مغلوں کے لشکر کی تعداد صرف اٹھارہ ہزار تھی جو برصغیر پر حکومت کرنے میں مصروف تھی۔

گوہر جتنی کے چرچے دیگر بلوچ سرداروں تک پہنچے تو وہ بھی اس کے دیدار کی تیاری کرنے لگے مگر سردار گہرام خان اور سردار چاکر خان بڑے سردار تھے ان کی اس میں دلچسپی کا سنتے ہی چھوٹے سردار پیچھے ہٹ گئے۔ اب میدان عشق میں یہی دونوں تھے۔ دونوں ہی زورآور، فیصلہ کیسے ہو کہ گوہر جتنی کس کی زندگی میں آئے؟

دونوں ہی کے لشکر بڑے تھے، دونوں ہی ماہر جنگجو تھے۔ ان کے درمیان بڑھتی رقابت کو دیکھ کر تمام بلوچ سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے۔

کافی سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ گھڑ دوڑ کا مقابلہ ہو، اس دوڑ میں جو کامیاب ٹھہرے گا گوہر اس کی بیوی بن جائے گی۔

فیصلہ پوری بلوچ قوم کا تھا اس لیے دونوں سردار زادے راضی ہو گئے۔ تیاری کے لیے دو ماہ بعد کی تاریخ طے ہوئی۔

مسلسل دو ماہ تک دونوں سردار زادے گھوڑے دوڑانے کی تیاری میں مصروف رہے۔ سردار گہرام خان اور سردار چاکر خان جیت کے لیے خوب محنت کر رہے تھے۔ بڑے بڑے ماہر گھڑ سواروں سے جیت کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون جیتے گا کون ہارے گا۔ جیت ہار کا فیصلہ تو میدان میں ہوگا۔

گھوڑوں کی دوڑ کے لیے سبی کا میدان سجایا گیا۔ دور دور کے سردار امیر غریب سب مقابلہ دیکھنے پہنچ گئے۔ مقابلہ بھی دو سردار زادوں کا تھا۔ ٹکر کا معرکہ تھا...... تمام بلوچ سرداروں نے بطور مہمان شرکت کی۔ کہتے ہیں کہ غیرت، عزت، ناموس یا ان سے مماثل بعض دیگر فطری وسماجی وصف کسی بھی قوم کی اخلاقی وثقافتی اقدار کا وہ اہم جز ہوتی ہیں جن کا اظہار ہر قوم اپنے مختلف روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے کرتی ہیں۔ اس وقت وہاں بھی یہی ہو رہا تھا۔

سردار چاکر اور سردار گوہرام کے گھوڑے میدان میں آ گئے تالیاں بجنے لگیں۔ گوہر جتنی بھی میدان میں پہنچ گئی۔ وہ ایک اونٹ پر بیٹھی تھی۔ لونڑی (فقیر) نے ڈھول بجا کر مقابلے کا اعلان کیا۔ مقابلہ شروع ہوا...... گھوڑے دوڑنے لگے مٹی اڑنے لگی...... سردار چاکر کا گھوڑا آگے نکل جاتا تو رند قوم تالیاں بجانے لگتی اور جب گوہرام کا گھوڑا آگے نکل جاتا تو لاشاری قوم کے لوگ رقص کرنے لگتے۔ کلومیٹر کا

فاصلہ منٹوں میں طے ہو رہا تھا۔ اس وقت گھوڑوں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ آنکھ کھولنے اور بند کرنے یہ گھوڑا نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ اس میدان میں پانچ بلوچ قبائل کے سردار ریفری کا کردار انجام دے رہے تھے۔

بالآخر مقابلہ ختم ہوا، رند اور لاشار قوم کے لوگ اکھٹے ہو گئے۔ گوہر جتنی اونٹ سے اتر کر ریفری کے قریب بیٹھ گئی۔ پانچوں سردار ایک پہاڑی پر چڑھ کر سب کو بیٹھنے کا حکم دے رہے تھے۔ ہزاروں کا مجموعہ مجمع تھا۔ دونوں قبائل اپنے اپنے سردار زادے کی جیت کا اعلان سننے کو تیار تھے۔

پانچوں سرداروں نے ہار جیت کا اعلان کرنے سے قبل صلاح مشورہ شروع کر دیا۔ راہ میں بٹھائے دیگر سرداروں کو مشورے میں شریک ہونے کے لیے بلایا گیا۔ ان لوگوں سے رائے لی گئی۔ گھڑسواری کے آداب پر بحث ہوئی۔ گھوڑوں کی چال، اچھال اور ایال پر بحث ہوئی۔ تمام سرداروں نے مباحثہ کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ سنا دیا۔ سردار چاکر خان یہ مقابلہ جیت گیا تھا۔ گوہر جتنی سردار چاکر خان رند سے منسوب ہو گئی تھی۔

ڈھول بجنے لگے...... جیت کی خوشی میں بکروں کی بجی بننے لگی۔ تمام مہمانوں کو چاکر رند نے پُرلطف کھانا کھلانے کے انتظامات شروع کر دیئے لیکن گوہرام لاشاری نے کھانا کھانے سے معذرت کر لی اور اپنے لشکر کے ساتھ گھر کی طرف چل دیا۔

جب گہرام گھر پہنچا اور گھوڑے کے زین کھولنے لگا تو چونک گیا۔ زین تنگ نظر آ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ چاکر رند نے گوہرام کی گھوڑی کے زین کو تنگ کروایا تھا۔

اسی رات گہرام کئی شہ سواروں کے ساتھ گوہر جتنی کے گھر پہنچ گیا اور وہاں جتنی بھی اونٹنیوں کے بچے تھے سب کو ذبح کر دیا۔ شور سن کر گوہر باہر نکل آئی، اسے دیکھ کر وہ چیخا۔ ''اے گوہر جتنی آج اونٹنیوں کے بچوں کو ذبح کر رہا ہوں کل تیرے بچوں کو بھی ذبح کروں گا۔ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ میرے گھوڑے کی زین تنگ کر دی گئی تھی۔''

''اے گوہرام تم سے دھوکا چاکر رند نے کیا ہے اور تم مجھ سے بدلہ لے رہے ہو۔'' گوہر جتنی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی چیخ کر بولی۔ ''اے گوہرام سن لے تو میرے اونٹنیوں کے بچوں کو مار رہا ہے۔ یہ اچھا عمل نہیں

ہے......میں بھی تیرے بچے ایسے ہی مرواؤں گی ایک دن......یہ اس جتنی کا وعدہ ہے۔ میں تیری موت تک تیرے لشکر کو مرتا دیکھوں گی۔"

گوہرام لاشاری ہنستا ہوا بولا۔ "اے حسن کی پری، ایسے وعدے وفا نہیں ہوتے۔ تمہارے پاس دو سو اونٹ ہیں تو ہمارے پاس چالیس ہزار کا لشکر ہے۔ یہ لشکر انسانوں کا ہے نا کہ جانوروں کا۔ جو ہم ان اونٹنیوں کے بچوں کی طرح مارے جائیں گے۔" یہ کہتے ہی گوہرام لاشاری کے لشکر نے گوہر جتنی کے گھر کو الوداع کیا۔

گوہر جتنی کے سامنے اونٹنیوں کے بچے مرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس کے پاس لشکر ہوتا تو وہ اسے، کسی طور پر جانے نہ دیتی۔ یہ اونٹنیوں کے بچے......اسے اتنے عزیز تھے جیسے اسی کے بچے ہوں۔ اس نے اونٹنیوں کے مردہ بچے جمع کیے۔ کئی اونٹوں پر لادا اور لے کر چاکر رند کے پاس پہنچ گئی۔

"اے گوہر مجھے تیرے حسن کی قسم اب مقابلہ ٹکر کا ہوگا۔ گوہرام نے تیرے اونٹنیوں کے بچوں کو مارا ہے......میں لاشاری قوم کے بچے بچے کو مار کر تمہارے ان اونٹنیوں کے بچوں کا بدلہ لوں گا۔ گوہرام نے بلوچ روایات کو سبوتاژ کیا ہے اس لیے ہم گہرام کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتے ہیں۔"

اعلانِ جنگ میں گہرام بھی پیچھے نہیں ہٹا لاشاری مقابلے کے لیے پہلے سے تیار تھے۔

دونوں جانب جنگ کی تیاری ہونے لگی۔ تلواریں صیقل ہونے لگیں۔ ترکش بھرنے لگیں۔ ڈھالیں بنائی جانے لگیں۔ گھوڑوں کی زین کسی جانے لگیں۔ جنگ کا اعلان تین چاند بعد کا کیا گیا۔ یہ تین مہینا تیاری کا تھا۔

گوہر جتنی رخصتی سے پہلے چاکر خان کے پاس چلی آئی۔ اسے وہاں خطرہ تھا اسی لیے چاکر خان نے اپنے ہاں بلالیا تھا۔ وہ چاکر کی باہوٹ بن گئی تھی۔

باہوٹ بلوچ اقوام میں خاص الخاص مہمان کو کہا جاتا ہے......سولہویں صدی میں گوہر جتنی سب سے مالدار بلوچ خاتون تھی۔ وہ گوہرام سے بدلہ لینے کے لیے چاکر خان کی باہوٹ بنی تھی۔ حتیٰ کہ گوہر جتنی نے چاکر سے وعدہ لیا تھا کہ جب تک گوہرام کا سر میرے دہلیز پہ نہیں ہوگا، تب تک میں آپ کی باہوٹ ہی رہوں گی۔ شادی تب ہوگی جب گوہرام کی موت ہوگی پھر کیا تھا ایک ایسی جنگ شروع ہوگئی جو تیس سال تک چلتی رہی۔ کبھی لاشار کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا تو کبھی رند کے ہاتھ سے میدان جنگ نکل جاتا۔ اس لڑائی میں بقول مؤرخین تقریباً تیس ہزار بلوچ مارے گئے۔ ہزاروں ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔ ہزاروں بہنیں بیوہ ہوگئیں۔ بلوچ قوم پارہ پارہ ہوگئی۔ وجہ......صرف ایک خوبصورت عورت گوہر جتنی تھی۔ مؤرخین کے بقول ان جنگوں میں گوہرام لاشاری دس جنگیں جیت چکا تھا جبکہ سردار چاکر رند پندرہ جنگوں میں فتح یاب ٹھہرا تھا مگر ان جنگوں میں نہ کبھی گوہرام لاشاری مارا گیا نہ چاکر رند البتہ بلوچ اقوام کے تیس ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔

بقول چاکر

یا غش پہ کہیوی بست انت

بور آن ءِ بےلغام ءِ ماتنکنت

شاوان پ نشانی یکے نیست

تیغ آن چڑ شُغنت ہندی آس

ترجمہ...... جو بلوچ فرزند ایک خاص انداز میں پگڑیاں باندھتے تھے جو گھوڑوں کو بغیر لگام دوڑاتے تھے آج ان میں سے کوئی ایک نہ رہا ان سب کو ہندی تلوار کاٹ چکی ہے۔

رند و لاشار بی سالہ (تیس سالہ) جنگ کا اختتامیہ گوہر جتنی کی طبعی موت پر 15 رجب المرجب 957 ہجری مطابق 1550 عیسوی کو ہوا۔ ایک عہد نامہ فارسی زبان میں قرآن مجید کے سورۃ الناس کے پشت پر تحریر ہوا تھا۔ اس عہد نامہ کے آخر میں چاکر اعظم اور میر گوہرام کے مہر ثبت ہیں۔ سردار گہرام اور سردار چاکر نے گوہر جتنی کو بہت بھولنے کی کوشش کی تھی...مگر اسے ساری زندگی بھول نہیں سکے تھے۔

گوہر جتنی کی موت کے بعد دونوں سرداروں نے سفید ریشی میں اپنے اپنے علاقوں کو الوداع کہا۔ ایک نے سندھ کا رخ کیا تو دوسرے نے پنجاب کا جہاں پر آج بھی ان کے قبرستان کے نشانات موجود ہیں۔ مگر ان تیس سالہ جنگ کی روح رواں گوہر جتنی کی قبر کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں پہ ہے...... اس باہوٹ عورت کو بلوچستان میں یاد کیا جاتا ہے جس نے بلوچ سرداروں کے ہزاروں کے لشکر کو نیست و نابود کرا دیا تھا۔ گوہر جتنی نے پوری زندگی چاکر رند کے مہمان خانے میں گزار دی اور موت کے فرشتے نے بھی اس حسن کی دیوی کی روح کو اسی مہمان خانے میں قبض کیا تھا۔

☆☆☆



دو دل ہارے

منظر امام

محبت کی نہیں جاتی، ہوجاتی ہے۔ مغرب کے مفاد پرست ماحول میں جہاں احساسات و جذبات، عشق و عاشقی ناپید ہوتا جارہا ہے پھر بھی ایک آدھ مثال ایسی سامنے آہی جاتی ہے جو بزبان خموشی بتادیتی ہے کہ محبت جب ہوتی ہے تو دنیا و مافیہا سے جی اچاٹ ہوجاتا ہے۔

مشہور ماڈل گرل کے جوڑے کی داستان

محبت کی ہزار داستانوں کے درمیان یہ بھی محبت کی ایک ایسی کہانی ہے جس نے پوری دنیا کے حساس دلوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں...... یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا۔

پتا نہیں یہ کیسا جذبہ ہے جو ہر سرحد اور ہر مسلک سے بے گانہ کردیتا ہے۔ اونچ نیچ کی تفریق ختم کردیتا ہے۔

اس محبت میں قربانیاں دی جاتی ہیں اور ہنسی خوشی اپنی زندگی کو اپنے دامن سے جھٹک دیا جاتا ہے۔ محبت کرنے والے اس بات سے بے نیاز ہوتے ہیں کہ ان کا محبوب

وی ایس نیپال کا پورا نام ودیادھر سورج پرساد نیپال ہے۔ وہ 17 اگست 1932ء وینزویلا کے وسیع دریا کے جزیرے Trinidad کے قصبے To bogo کے ایک چھوٹے سے گاؤں Chaguanas میں پیدا ہوئے جو Gulf of Paria سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس علاقے میں 1880ء کے بعد ہجرت کر کے آنے والے گورے، پرتگالی، چینی، ہندوستانی ہندو، مسلمان اور دیگر قوموں کے لوگ بستے تھے اور وہ نہایت خستہ حالی کے عالم میں ہونے کے باعث دارالخلافہ پورٹ آف اسپین کی سڑکوں پر شب باشی کیا کرتے تھے۔ بحری جہاز کے ذریعے وی ایس نیپال کے اجداد نے بھی پورٹ آف اسپین ہجرت کی جہاں سے وہ ترینی داد چلے گئے۔ وی ایس نیپال کا بچپن ہر لحاظ سے عسرت میں گزرا۔ نیپال نے ابتدائی تعلیم چاگوآناس گورنمنٹ اسکول اور بعد ازاں ترینی داد کے اسکول میں حاصل کی۔ مابعد آکسفورڈ یونیورسٹی کی جانب سے وظیفہ ملنے پر برطانیہ چلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وی ایس نیپال کا تعلق ادیبوں کے خاندان سے ہے۔ نیپال کا والدسی پرساد نیپال، بڑا بھائی شیوا نیپال، ماموں نیل بسون داس اور عم زاد وہنی کپل دیووہ ادیب ہیں جن کی تخلیقی نگارشات منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ وی ایس نیپال نے پہلی شادی پیٹریشیا ہیل نامی ایک انگریز عورت سے کی۔ ان کا ساتھ 41 برس تک رہا۔ 1996ء میں سرطان کے ہاتھوں پیٹریشیا کی موت ہوگئی۔ پیٹرک فرنچ کی خودنوشت کے مطابق پیٹریشیا اور نیپال میں ادبی کے علاوہ کوئی تعلق مشترک نہیں تھا بلکہ دیگر معاملات میں ان کی زندگی حقیقتاً ناخوشگوار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نیپال کے لندن کی طوائفوں سے روابط تھے اور بالآخر مارگریٹ گڈنگ نامی ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلقات استوار ہوگئے جن سے پیٹریشیا بھی آگاہ تھی۔ پیٹریشیا کی موت کے بعد نیپال نے سابقہ پاکستانی صحافی خاتون نادرہ خانم علوی سے عقد ثانی کیا۔ نیپال سے ملاقات سے قبل نادرہ پاکستانی انگریزی اخبار The Nation کے لیے دس برس سے کام کر رہی تھی۔ وہ پاکستانی فوج کے اسپیشل سروس گروپ کے سابقہ سربراہ میجر

انہیں ملتا ہے یا نہیں۔

ان کے لیے محبوب کی خوشی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔

کسی چمن میں بھی رہو تم بہار بن کے رہو۔

کوئی ضروری نہیں ہے کہ محبت کی عظیم داستانوں کا تعلق ماضی ہی سے ہو۔ ہماری صدی میں بھی ایسی کہانیاں موجود ہیں۔ لوگ ابھی بھی محبت کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے محبوب کے لیے جان کی بازی بھی ہار جاتے ہیں۔ امر ہو جاتے ہیں۔

یہ کہانی کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن ان دونوں کی محبت نے گزرے زمانوں کی یاد تازہ کر دی ہے، جب محبت میں اپنا سر بھی قلم کروا دیا جاتا تھا اور موت کے وقت ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی۔

پیدا کہاں سے ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں تک زندہ رہتے ہیں۔

یہ داستان بھی محبت کی ایسی ہی داستان ہے اور یہ آج کی داستان ہے۔ محبت ہر زمانے کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ اندازہ محبت صرف گئے زمانوں ہی میں ہوں۔ آج بھی ہیں۔ اور ان ہی چراغوں سے سارے چراغ روشن ہیں۔

☆☆☆

کارووینا چیک جمہوریہ کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ یہ کوئی بڑا شہر تو نہیں ہے لیکن بہت خوبصورت ہے۔ اس کے اطراف سبزے کی بہتات ہے۔ پورا ماحول دلکش دکھائی دیتا ہے۔ شہر کے درمیان میں ایک ٹاؤن ہال ہے۔ یہ بہت چہل پہل والی جگہ ہے۔

شام ہوتے ہی یہاں بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ آس پاس کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اپنے پسند کی مشروبات پیتے ہیں اور رات ڈھلنے پر گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہاں کی فضا میں رومانس ہے۔

اس چھوٹے سے علاقے نے کئی نامور لوگ پیدا کیے۔ پیٹرا اسی رومان پرور علاقے میں 24 جون 1979ء میں پیدا ہوئی۔

وہ بلا کی حسین تھی۔ اس کے والدین اسے موم کی گڑیا کہا کرتے تھے۔ اس کے باپ کا نام اولڈ ریچ تھا۔ اس کی ماں روزینا خود بھی ایک خوبصورت عورت تھی لیکن پیٹرا کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوگی۔

جنرل عامر فیصل علوی کی بہن ہیں، جو شمال مغربی پاکستان میں جنگ کے دوران شہید ہوگئے تھے۔ نیپال نے پیٹریشیا کی وفات سے قبل ہی نادرہ کو شادی کی پیشکش کردی تھی لیکن ان کی شادی پیٹریشیا کی موت کے دو ماہ بعد ہوئی۔ نیپال سے قبل بھی نادرہ نے دوبار شادی کی تھی اور ایک شوہر سے اس کے دو بچے ملیحہ اور نادر ہیں۔ وی ایس نیپال نے بہ یک وقت کئی اصناف میں لکھا جن میں افسانہ، ناول، مضامین اور سفرنامہ شامل ہیں۔ اپنی تحریروں کے بارے میں نیپال کا اصرار ہے کہ ان کی تحریریں خاص نظریے سے ماورا ہیں۔ نیپال کا کہنا ہے: ''کسی سیاسی نظریے کا حامل ہونا متعصب کردیتا ہے۔ میں کوئی سیاسی نظریہ نہیں رکھتا۔'' نیپال کے حامی انہیں بائیں بازو کا نقاد قرار دیتے ہیں اور مخالف مثلاً شاعر ڈیرک والکوٹ نے ان کے نیو کالونیل معذرت خواہانہ رویے پر شدید تنقید کی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف نیپال کا شدید ترین متعصبانہ رویہ ان کی غیر عرب مسلمانوں پر اسلام کے اثرات سے متعلق کتاب Beyond Belief میں کھل کر سامنے آیا جس میں انہوں نے اسلام کو ظالم اور بنیاد پرست مذہب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ محض عربوں ہی کو جو نبی کریمؐ کی اولاد اور وارث ہونے کے ناطے غیر عربوں اور دیگر مذاہب سے مسلمان ہونے والوں پر فوقیت حاصل ہے۔ (یقیناً نیپال نبی کریمؐ کے خطبہ حجتہ الوداع سے قطعی طور پر لاعلم لگتے ہیں) اس کتاب سے نیپال کے درج بالا بیان کا تضاد سامنے آگیا کہ سیاسی نظریے کا حامل ہونا متعصب کردیتا ہے اور ان کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہے۔ نیز اس کتاب کی وجہ سے 2002ء میں نیپال شدید تنقید کا نشانہ بنا اور انہیں ہندوستانی متشدد تنظیموں کا حامی قرار دیا گیا جنہوں نے مارچ 2002ء میں حکومتی سرپرستی میں ہندوستان کے شہر گجرات میں مسلم کش فسادات کروائے تھے۔ نیپال کی اس کتاب کو فاشزم قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ انہوں نے نوبیل انعام کی توہین کی ہے۔

از: ڈاکٹر نظر کامرانی

اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''ہمیں چاہیے کہ ہم اس نومولود کے شاندار مستقبل کی خاطر کارو بنا سے کہیں منتقل ہو جائیں۔''

''یہ تم نے دو باتیں کی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ تم اس کا کیا مستقبل دیکھ رہی ہو... اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم کہاں جائیں۔ کارو بنا میں کیا کمی ہے؟''

''میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ یہ ایک خوبصورت لڑکی ہے اور میرے ادھورے خوابوں کو پورا کرسکتی ہے۔''

''تم کن ادھورے خوابوں کی بات کررہی ہو؟'' اولڈ ریچ نے پوچھا۔

''تمہیں یاد ہوگا کہ میں ایک ماڈل بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔'' روزینا نے بتایا۔ ''خود تو نہیں بن سکی، لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ میری یہ بچی بن جائے۔''

''چلو یہ تو ایک بات ہوئی۔ اور دوسری بات کیا ہے؟''

''دوسری بات تم خود اچھی طرح جانتے ہو۔'' روزینا نے کہا۔ ''اس چھوٹے سے شہر میں اتنے زیادہ مواقع نہیں ہیں۔ تم خود بھی اپنے بزنس کو ترقی دینے کی جدوجہد کرتے رہتے ہو لیکن کیا ملا، کچھ نہیں۔''

اولڈ ریچ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بیوی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ''چلو تمہاری بات مان لیتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یوں نہیں کہ اٹھے اور چل دیے۔ حالات دیکھ کر اور مواقع دیکھ کر نکلیں گے۔''

کئی برس اسی میں بیت گئے۔ پیٹرا کے بعد اس گھر میں ایک اور بچی پیدا ہوئی جس کا نام اولگا رکھا گیا۔ اگرچہ وہ بھی ایک خوبصورت بچی تھی لیکن اس کے نقوش پیٹرا جیسے دلکش نہیں تھے۔

پیٹرا کی تو بات ہی اور تھی۔ خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں، گول چہرہ ستواں ناک، اس میں ہر وہ خوبی تھی جو اسے دوسروں سے الگ کررہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ذہین بھی تھی۔ اس نے تعلیمی معیار بھی برقرار رکھا تھا۔

اولڈ ریچ اکثر کہا کرتا۔ ''ہمارے پورے خاندان میں اس سے اچھی لڑکی کوئی نہیں ہے۔''

پیٹرا کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اپنی بہن اولگا سے بہت پیار کرتی تھی۔ ایک بار اولگا بیمار ہوئی تو اس نے رات بھر جاگ کر اولگا کی خدمت کی تھی۔ اس کی اس کیفیت نے اس کے والدین کو نہال کردیا تھا۔

جب پیٹرا پندرہ سولہ برس کی ہوئی تو اس کی ماں کو اور

بھی زیادہ احساس ہونے لگا کہ اس چھوٹے سے شہر میں اس کی بیٹی کا کوئی شاندار مستقبل نہیں۔ اسے اپنے شوہر اولڈ یچ کی بات یاد تھی جس نے کہا تھا کہ ہم حالات کا جائزہ لینے کسی بڑے شہر میں ضرور جائیں گے۔

اتفاق سے ان ہی دنوں اٹلی کے شہر میلان میں اولڈ یچ کا کوئی کام نکل آیا۔

اس نے روزینا سے چلنے کے لیے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گئی اور یہ خاندان میلان چلا آیا۔

میلان کاروینا کی بہ نسبت بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں ترقی کے مواقع بھی بہت تھے۔ اسی شہر میں پیٹرا کو پہلی بار اپنی کارکردگی دکھانے کا چانس ملا تھا۔ یہاں آتے ہی ایک اشتہار نے روزینا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

وہ اشتہار ماڈلنگ کے ایک مقابلے کا تھا۔ روزینا نے پیٹرا کا نام لکھوا دیا۔

مقابلہ ہوا اور پیٹرا نے اس مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ اس کے لیے کامیابی کا پہلا دروازہ کھل چکا تھا۔

اس کے والدین کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ خاص طور پر اس کی ماں روزینا کا جس کے ادھورے خوابوں کی تکمیل اس کی بیٹی کے ذریعے ہونے والی تھی۔

کامیابی کے بعد پیٹرا نے اولگا سے کہا۔ ”اب بتاؤ۔ تمہیں کیا چاہیے؟“

”اوہو۔ تم تو بہت دریادل ہوتی جا رہی ہو۔“

”ہاں میری جان۔ کیوں کہ اب ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں رہے گی۔ میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ بہ حیثیت ماڈل میرا مستقبل بہت شاندار ہے۔“

پیٹرا نے جس وقت میلان میں یہ کامیابی حاصل کی اس وقت وہ صرف پندرہ برس کی تھی۔ اس کے بعد اس پر کامیابیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

☆☆☆

اس کے باپ نے اسے ایک چھوٹا سا کیمرا تحفے میں دیتے ہوئے پوچھا۔ ”اب یہ بتاؤ۔ اس کیمرے سے سب سے پہلی تصویر کس کی اتارو گے؟“

”ظاہر ہے آپ کی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیوں کہ آپ ہی نے مجھے کیمرا گفٹ کیا ہے۔“

اس بچے کا نام سائمن اینٹیلی تھا۔

سائمن کو جب کیمرا ملا اس وقت اس کی عمر دس سال کی تھی۔

اس کے اندر ایک ٹیلنٹ موجود تھا اور وہ تھا حسن کی پہچان اور اس کی تعریف۔

چاہے وہ حسین چہرہ ہو یا کوئی حسین منظر۔ سب ہی اس کو اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔

سائمن کی پیدائش 6 اکتوبر 1971ء میں برطانیہ میں ہوئی تھی۔

عام سا گھرانا تھا۔ پیار کرنے والے والدین تھے۔

وہ بچپن ہی سے حسن پرست تھا۔ اس کو خوبصورت چہروں سے بھی اتنا ہی پیار تھا جتنا وہ فطرت کے مناظر سے کیا کرتا۔ اس نے کم عمری میں پنسل سے اسکیچنگ شروع کر دی تھی۔ وہ مناظر کو بنایا کرتا۔ جیسے پہاڑ، پھول درخت اور کوئی آبشار وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہ خوبصورت چہروں کا بھی دیوانہ تھا۔ فطرت اور ذوق کا اندازہ بچپن ہی سے ہو جاتا ہے۔

اس کے پاس جب کیمرا آیا تو اس نے کیمرے سے تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بنائی ہوئی تصویریں فیشن کی دنیا میں اپنا مقام بنانے لگیں۔ وہ کمال کا فوٹو گرافر ثابت ہوا تھا۔

وہ اگر کسی پودے یا پھول کی تصویر بھی اتارتا تو وہ تصویر جاندار معلوم ہوتی۔ بقول غالب:

حقہ ہے یوں حضورِ معلّی کے ہاتھ میں
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

اس کی آنکھ زاویے یا اینگل تلاش کرلیتی تھی۔ حسن کا ہر انداز اور ہر پہلو اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔

اس نے مشہور ماڈلز کی تصویریں اتارنی شروع کر دیں۔ اس کی مہارت نے بہت جلد اسے اس فیلڈ میں ایک نمایاں مقام دلا دیا۔ وہ چھوٹا سا کیمرا جو اس کے باپ نے گفٹ کے طور پر دیا تھا.... ہمیشہ اس کے کمرے میں رہا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہی کیمرا اس کی کامیابی کی بنیاد ہے۔ یہ اس کے باپ کا تحفہ ہے۔

ایک بار ایک دست شناس نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے اس کے باپ سے کہا۔ ”یہ بچہ حسن اور نیچر کا شیدائی ہے...اور یہی محبت اس کے لیے اس کی زندگی کو نقصان پہنچانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

اس وقت کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ نیچر کی محبت سے نقصان کیسے ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

پیٹرا کے شہر میں ماڈلنگ کا ایک مقابلہ ہو رہا تھا۔

اس مقابلے میں بہترین ماڈل کا انتخاب ہونا تھا۔ پیٹرا اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اٹلی سے واپس آ گئی تھی۔ اس نے اس مقابلے میں حصہ لیا اور یہ مقابلہ جیت گئی۔ اس نے پہلا انعام حاصل کیا تھا۔

اس کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ماڈلنگ سے بے اندازہ دولت حاصل کی۔ اس نے سب سے پہلا کام ہی یہ کیا کہ اپنی بہن اولگا کو ایک سرپرائز دے دیا۔

اس کی مہارت صرف ایک ہی شعبے تک نہیں تھی۔ اس نے فیشن ڈیزائننگ میں بھی اپنا نام پیدا کیا تھا۔ سنہ 2004ء میں اس نے دنیا کے معروف فیشن ڈیزائنر کے ساتھ بھی کام کیا۔ ایک تو وہ خود بہت خوبصورت تھی۔ پھر اس کے انداز اور اخلاق بہت اچھے تھے۔ وہ اپنی ماں کی توقعات پر پوری اتر رہی تھی۔

اس کا ایک اور شعبہ بھی اس وقت سامنے آیا جب ایک معروف برطانوی ٹی وی پروڈیوسر نے اسے ایک سٹ کام میں کام کرنے کی آفر کی۔ یہ ایک بہت بڑا چانس تھا۔ اس نے دوستوں اور والدین سے مشورے کے بعد یہ آفر قبول کر لی تھی۔ اس نے اس سٹ کام میں بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

انگریزی زبان کا ایک بہت مشہور میگزین ہے۔ sports illustrated۔ اس میں کسی کی تصویر شائع ہو جائے تو یہ اس کے لیے ایک اعزاز ہوتا ہے۔ 2002ء میں اس میگزین کے کور پر پیٹرا کی تصویر شائع ہوئی تھی۔

یہ اس کے کیریئر کا ایک سنگ میل تھا۔ وہ اتنی سی عمر میں بہت سوں سے آگے نکل چکی تھی۔

اسی سال ایک اور کامیابی اس کے نام لکھ دی گئی جو بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ ایکواڈور میں اس سال کا مقابلہ حسن منعقد ہوا، اور پیٹرا اس مقابلے کے ججز کی ایک رکن منتخب کر لی گئی۔ مختصر یہ کہ وہ اس شعبے میں آگے ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کی ایک صلاحیت اس وقت سامنے آئی جب اس نے اپنے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی پیدائش چیکوسلاواکیہ میں ہوئی تھی جو اس وقت کمیونزم کے زیر اثر تھا۔ پیٹرا نے اپنے بچپن کے حالات اسی ماحول کو دیکھتے ہوئے لکھے ہیں۔

اس کی یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

جس وقت وہ یہ مراحل طے کر رہی تھی۔ اس وقت اس کی ملاقات سائمن سے ہوئی۔ وہ شخص جس کے ساتھ اس کی زندگی کی ایک کہانی کا وابستہ ہونا لکھا تھا۔

☆☆☆

”میں نے یہ سنا ہے کہ تمہاری تصویریں بولتی ہیں۔“ پیٹرا نے سوال کیا۔

”بالکل ٹھیک سنا ہے تم نے۔“ سائمن نے جواب دیا۔ ”لیکن شرط یہ ہے کہ جس کی تصویر اتاری جا رہی ہے وہ خود بھی میری تصویر کی طرح خوبصورت ہو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں کیسی ہوں؟“ پیٹرا نے پوچھا۔

”یہ تو تم دنیا والوں سے پوچھو جن کو تم نے پاگل بنا رکھا ہے۔“

”دنیا والوں کو چھوڑو۔ تم کیا کہتے ہو؟“

”صرف اتنا کہ تم ایک مکمل اور بھرپور لڑکی ہو۔“ سائمن نے کہا۔

”پھر دیکھتی ہوں کہ تمہارے کیمرے کی آنکھ مجھے کیسے دیکھتی ہے؟“

”کیمرے کی نہیں بلکہ میری آنکھ کہو۔“

اس وقت دونوں ایک مشہور ہوٹل میں موجود تھے۔ اس ہوٹل میں مشہور فیشن ڈیزائنرز کے ملبوسات کی نمائش ہو رہی تھی۔ اس نمائش کی اوپننگ کے لیے پیٹرا کو بلایا گیا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات سائمن سے ہوئی تھی۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ جس سے کوئی تعلق قائم ہونا ہوتا ہے۔ وہ پہلی ہی نظر میں اچھا لگنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی انجانی سی کشش ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

پیٹرا اور سائمن بھی ایک دوسرے سے متاثر ہو گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا کام دیکھ رکھا تھا۔ پیٹرا کی شہرت ایک سپر ماڈل کے طور پر تھی اور سائمن ایک مشہور فیشن فوٹو گرافر تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ اس دوران سائمن نے پیٹرا کی سینکڑوں تصویریں بنا دی تھیں۔ اس کو ہر روپ میں پیش کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس قدر پیٹرا کو خوبصورتی کے ساتھ سائمن نے شوٹ کیا ہے۔ ویسا کوئی اور نہیں کر سکا۔

ایک شام پیٹرا نے سائمن کو بتایا ''میں پرسوں بنکاک جا رہی ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''وہاں ایک فیشن شو ہونے والا ہے۔ مجھے اس شو کی ججمنٹ کرنی ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں بھی پہنچ رہا ہوں۔'' سائمن نے کہا۔

☆☆☆

زندگی بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔

بنکاک کے ساحلوں کا اپنا الگ حسن ہے۔ یہاں کی دھوپ بہت چمکیلی ہوتی ہے۔ یہاں ساحلوں کے ساتھ ناریل کے درختوں سے جب ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں تو ایک نغمگی سی طاری ہو جاتی ہے۔

بنکاک کے نزدیک ہوا ہن کا ساحل، کوہ سامیٹ کا ساحل، پٹایا اور پران بوری کے ساحل اپنی مثال آپ ہیں۔

ان ساحلوں کے ساتھ ساتھ ناریل کے درختوں کے درمیان ریسورٹ بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ریسورٹ کسی بھی عرصے کے لیے کرائے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ضرورت کی ہر چیز ہوتی ہے۔ یہ ریسورٹ ویل فرنشڈ ہوتے ہیں۔

ان میں ہر قسم کی سہولت مہیا ہوتی ہے۔ پیٹرا اور سائمن نے ایک ریسورٹ دس دنوں کے لیے کرائے پر لے لیا تھا۔

دونوں کے کام ختم ہو چکے تھے۔ بنکاک میں ہونے والا فیشن شو مکمل ہو گیا تھا۔ پیٹرا نے اس شو کی ججمنٹ بہت عمدہ طریقے سے کی تھی۔ دوسری طرف سائمن نے بھی اپنا کام بہت اعلیٰ انداز میں کیا تھا۔ اس نے اس شو کے یادگار لمحات اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیے تھے۔ اسے یقین تھا کہ دنیا بھر کے فیشن میگزین ان تصویروں کی اچھی قیمت ادا کریں گے۔

دونوں اس وقت ساحل پر آرام دہ جھولنے والی کرسی پر نیم دراز تھے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوائیں بہت خوش گوار تھیں۔ سائمن نے پیٹرا کو مخاطب کیا۔ ''یہ بتاؤ۔ میرا ساتھ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟''

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟''

''ہاں، پوچھنے ہی کی تو بات ہے اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔''

''تو پھر سن لو کہ بہت اچھا۔''

''اب ایک اور بات سن لو کہ میں نے یہ ساتھ ہمیشہ کے لیے سوچ لیا ہے۔'' سائمن نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں تمہیں پروپوز کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں قبول ہے؟'' سائمن نے پوچھا۔

پیٹرا نے جواب دینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ زندگی کچھ اور بھی حسین ہو گئی تھی۔ اسی وقت آسمان پر کچھ پرندے پرواز کرتے اپنی آوازیں نکالتے ہوئے گزر گئے۔

''سائمن، کیا تم یہ جانتے ہو کہ مجھے پرندوں کی طرح پرواز کرنے کا کتنا شوق ہے۔ یہ کتنے آزاد ہوتے ہیں اور ایک ہم ہیں۔''

''آزاد ہم بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری آزادی چند اصولوں کی پابند بھی ہے۔''

''کن اصولوں کی بات کر رہے ہو؟''

''پیٹرا نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے اندر مشرق کی روح ہے۔ میں نے مشرق کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ پچھلے دنوں ایک مشرقی لڑکے سے میری دوستی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے مشرق کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔''

''لیکن وہ لوگ بیک ورڈ بھی تو ہوتے ہیں۔''

''یہ تو ہمارا پوائنٹ آف ویو ہے... ورنہ وہ جس انداز کی زندگی جی رہے ہیں... وہ ان کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جیسے وہ اپنی محبت میں شدید ہوتے ہیں۔ جس سے محبت کر لی۔ بس اسی کے ہو کر رہ گئے۔''

''کیا یہ پاگل پن نہیں ہے؟''

''نہیں یہ پاگل پن نہیں ایمانداری ہے۔ دونوں کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ جس سے محبت کر رہے ہیں، وہ صرف اسی کا ہے۔ اس تصور میں کتنی اپنائیت ہے۔ اور ہمارے یہاں تو یہ حال ہے کہ نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے۔''

پیٹرا ہنس دی۔ ''چلو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم صرف میرے ہی بن کر رہو گے۔''

''ہاں۔ میں تو بھئی اسی مزاج کا انسان ہوں۔''

''چلو شام ہو رہی ہے۔'' پیٹرا نے کہا۔ ''ہمیں ڈنر پر بھی جانا ہے۔''

"ہاں۔ وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

دونوں اپنے ریسورٹ کی طرف چل دیئے جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ چلتے چلتے اچانک پیٹرا نے سائمن کا ہاتھ تھام لیا۔ "سائمن نہ جانے کیوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"کس بات کا ڈر؟"

"یہ تو خود میں بھی نہیں جانتی۔ بس جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے۔ کیا پرندوں کی پروازیں تمہیں غیر معمولی نہیں لگ رہی ہیں؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ پرندے گھبرا کر پرواز کر رہے ہیں۔"

سائمن نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "ہاں۔ کچھ ایسا تو ہے لیکن تم وہم میں نہ پڑو۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

"سائمن ہم ڈنر پر نہیں جا رہے۔" پیٹرا نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ بس دل چاہ رہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہیں۔"

"او کے، پھر ایسا کرتے ہیں کہ ہم ڈنر اپنے کمرے میں کرتے ہیں۔" سائمن نے کہا۔

ریسورٹ آ گیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جاتے جاتے پیٹرا نے کہا۔ "سائمن میں شاور لے کر آتی ہوں۔ تم جب تک ڈنر کا آرڈر کر دو۔ سالمن ضرور منگوا لینا۔"

"ظاہر ہے اس کے بغیر ڈنر کا کیا لطف ملے گا... اور ہاں ڈرنک کون سا لوگی؟"

"وہی جو تم کو پسند ہو۔"

......لیکن پیٹرا کے اس کے کمرے میں جانے سے پہلے ہی کچھ ہوا۔ ایسا لگا جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے زمین کو جھنجوڑ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ چلی گئی۔ دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے ہلنے اور اپنی جگہ سے اکھڑنے لگیں۔ اندھیرا گھپ اندھیرا۔

زلزلہ۔ سائمن کے ذہن نے بتایا۔ اس نے پیٹرا کو آواز دی۔ "پیٹرا۔ پیٹرا۔"

پیٹرا نے اندھیرے میں اپنا راستہ بنایا اور سائمن کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے سائمن کا ہاتھ زور سے تھام رکھا تھا۔ "سائمن، میں تمہارے پاس ہوں۔"

"چلو باہر کی طرف دوڑو۔" سائمن نے کہا۔

مینار

مخروطی شکل کا بلند ستون یا عمارت، شکل میں مخروطی بلند اور کم چوڑائی کی ہوتی ہے۔ مؤذن کے اذان کہنے کے لیے ہر مسجد کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ کبھی مسجد کے اندر اور کبھی چاروں سمت میں۔ ابتداً مسجد کے ساتھ بلند عمارت یا ستون نہیں ہوا کرتا تھا۔ حضرت بلالؓ جو ابتدائی مؤذنوں میں سے ہیں، مسجد نبویؐ کے قریب سب سے اونچے مکان پر چڑھ کر اذان کہا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن انہوں نے خانہ کعبہ کی چھت سے اذان کہی۔ مینار سازی کا رواج بنوامیہ کے زمانے سے شروع ہوا۔ خلیفہ ولید نے اکثر مقامات پر مینار تعمیر کرائے۔ پہلے ان کی تعداد دو یا تین ہوتی تھی۔ بعد میں مسجد کی حسن و دلکشی کے باعث چاروں کونوں پر میناروں کی روایت پڑ گئی۔ ابتدائی میناروں میں زینہ باہر کی طرف ہوتا تھا۔ مگر اب اندر کی طرف تعمیر ہوتا ہے۔ مسجد کے علاوہ تاریخ میں اور بہت سے قدیم میناروں کی باقیات ملتی ہیں۔ دہلی کا قطب مینار، شیخوپورہ کے قریب ہرن مینار، مقبرہ جہانگیر کے مینار، فن تعمیر اور اسلامی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ لوہاری دروازہ کے باہر مسجد پر ایک بلند مینار تعمیر کیا گیا ہے جو اس نسبت سے "مسجد مینار" کہلواتا ہے۔ یادگاروں اور مقبروں پر میناروں کی تعمیر کو مغل تعمیرات نے بڑی تقویت پہنچائی تھی۔ قرارداد پاکستان کی یاد میں "مینار پاکستان" تعمیر کیا گیا۔ اس طرح سب سے بڑی اسلامی کانفرنس، دوسری اسلامی کانفرنس کے بعد اس کی شان میں اسمبلی ہال کے سامنے ایک بلند مینار تعمیر کیا گیا۔ اس کے ارد گرد قرآنی آیات کندہ ہیں یہ "سمٹ مینار" کہلاتا ہے اور اس کی تعمیر نیم سرکاری کمپنی نے کی۔

مرسلہ: فوزیہ لکھرہ خان پور

دونوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ عمارت میں لرزش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔

ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ فرنیچر سے الجھ الجھ کر گر رہے تھے۔ اچانک ایک قیامت سی آ گئی تھی۔ دونوں الجھتے گرتے پڑتے باہر کی طرف بھاگ رہے تھے کہ اچانک ایک دھماکا ہوا۔ ریسورٹ کا ایک حصہ دھماکے سے زمین پر آ گیا تھا۔ ملبے تلے لوگ دبے ہوئے مدد کے لیے چیخ رہے تھے لیکن اس وقت ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر ایک کو اپنی زندگی کی پڑی ہوئی تھی۔

لیکن اس وقت وہاں صرف یہ دو محبت کرنے والے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اندھیرا ہر طرف گاڑھا اندھیرا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اچانک عمارت روشن ہو گئی۔

عمارت کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کی روشنی نے چاروں طرف روشنی کر دی تھی، لیکن یہ بہت بھیانک روشنی تھی۔ آگ کی روشنی جو اپنی زد میں آنے والی ہر چیز کو جلاتی ہوئی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

ان کی آنکھیں جو کچھ بھی دیکھ رہی تھیں وہ بہت بھیانک اور خوفزدہ کرنے والا تھا۔

ریسورٹ کی عمارت منہدم ہو چکی تھی۔ اس کے ایک حصے میں لگی ہوئی آگ تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ گری ہوئی دیواروں اور چھتوں کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

لیکن اتنا ہی نہیں آگے بھی بہت کچھ تھا۔

مصیبتیں یوں ہی اپنی ایک جھلک دکھلانے کے لیے نہیں آتیں بلکہ وہ اپنے مکمل غصے کے مکمل اظہار کے لیے آتی ہیں۔

اچانک ایک عجیب پُراسرار سی خاموشی طاری ہو گئی۔ جیسے پورے ماحول نے سانس روک لی ہو۔

زمین نے پھر جنبش لینی شروع کر دی۔ اس بار اس کی جنبش پہلے سے زیادہ شدید تھی۔ اس وقت بھی سائمن نے پیٹرا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ”حوصلہ رکھو جان۔ حوصلہ رکھو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

پیٹرا کچھ بول نہیں پا رہی تھی پھر اچانک کچھ اور ہوا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ پانی کا ایک زبردست ریلہ ان دونوں کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

پیٹرا نے سائمن کی آوازیں سنیں۔ وہ اسی کو پکار رہا تھا۔ پیٹرا۔ پیٹرا۔ لیکن پیٹرا کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ وہ پانی کے ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی پھر اچانک اس کا ہاتھ کسی درخت کے مضبوط تنے سے ٹکرایا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔

وہ قیامت کی رات تھی۔ پیٹرا صبح تک اس تنے سے چمٹی رہی۔

صبح تک وہ سیلاب تھم چکا تھا۔ جسے سونامی کا نام دیا گیا تھا۔

وہ 26 دسمبر 2004 کی رات تھی۔ سیلاب تھم چکا تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ عمارتوں کے ملبے پڑے ہوئے تھے۔

پیٹرا پاگلوں کی طرح سائمن کو پکارتی اور تلاش کرتی پھر رہی تھی، لیکن سائمن کا جواب کہیں سے نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ لاشیں اس پانی میں تیر رہی تھیں۔ پیٹرا بے حال ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

پیٹرا ایک ہفتے تک وہیں رہی۔ وہ صبح شام سائمن کو تلاش کرتی رہتی تھی پھر ٹھیک تین دنوں کے بعد سائمن کی لاش بہتی ہوئی اسی جگہ آ گئی جہاں پیٹرا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جگہ وہی ریسورٹ تھا۔

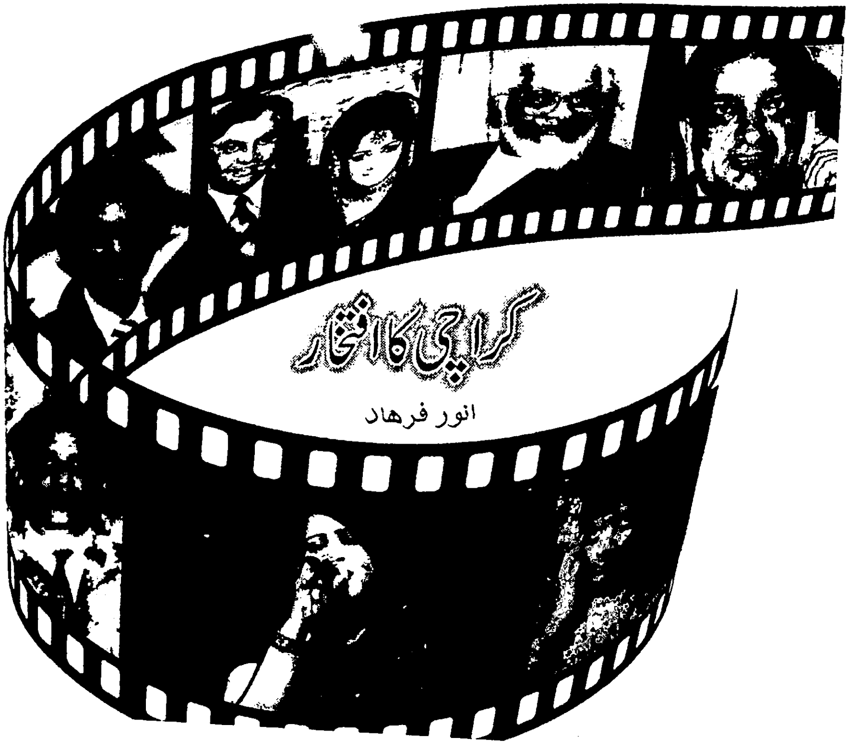
ایسا لگتا تھا جیسے سائمن اپنی موت کے بعد بھی اسی کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے اس طرف آ نکلا ہو۔

اس وقت سائمن کی عمر صرف 33 برس تھی۔ وہ اپنی جوانی ہی میں مر گیا تھا۔ پیٹرا اس کی لاش لے کر واپس آ گئی۔ وہ ابھی بھی سائمن کو یاد کرتی رہتی ہے۔

زندگی میں رہے گی تمہاری کمی...... دن گزرنے کو یوں تو گزر جائیں گے۔

اس جدائی کا نوحہ پیٹرا نے کتابی صورت میں لکھا۔ جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سال کا بیسٹ سیلر ناول کہلایا۔ یوں بھی پیٹرا نے عملی طور پر بھی ایک مثال قائم کر دی ہے۔ کامیاب ترین ماڈل ہوتے ہوئے بھی وہ بس اتنا کام لیتی ہے کہ اس کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ خالی وقت میں وہ صرف اور صرف سائمن کی یادیں تازہ کرتی رہتی ہے۔ وہ ہمہ وقت سیاہ کپڑوں میں رہتی ہے جیسے وہ عمر کی تمام منزلیں اس کے سوگ میں گزارے گی۔

++



کراچی کا افتخار

انور فرہاد

فلم نگری

پاکستان کی فلمی صنعت نے جو معراج حاصل کیا اس میں کراچی کا بہت بڑا حصہ ہے یہاں سے بننے والی یادگار فلموں نے زبردست پذیرائی حاصل کی مگر آج کے نوجوان کی بڑی تعداد اس سے لاعلم ہے، انہی کے لیے یہ تحریر ہے۔ گزشتہ ماہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ کس کس اہم شخصیت نے اپنا اپنا حصّہ ڈالا باقی کی شخصیت کے بارے میں اس حصّے میں آپ پڑھیں گے۔

پاکستانی فلموں کے سنہرے ایام کی روداد

''اللہ خیر کرے۔ یہ سویرے سویرے کس نے کنڈی کھڑکائی.....؟'' کہتے ہوئے میں دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھولا تو سامنے منہ پر ماسک چڑھائے حسن حفیظ نظر آئے۔ میں نے دیوانہ وار انہیں اپنی طرف کھینچا اور ایس او پیز کی تمام پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی جھپی لی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے......ہٹو...... پرے ہٹو۔'' کہتے ہوئے حسن حفیظ نے مجھے اپنے سے دور کیا۔

''یار! تم دو بار مجھ سے ملنے آئے۔ میں نہیں تھا اور تم روٹھ کر چلے گئے۔''

''آنے اور جانے کی بات نہیں۔ تمہارے بچوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا، اس پر مجھے دکھ ہوا۔''

''میرے بچوں نے نہیں۔ میں اور میرے سارے بال بچے جب تم آئے تھے، گھر پر نہیں تھے۔ یہ یقیناً اوپری منزل میں رہائش پذیر مالک مکان کے بچے ہوں گے جنہوں نے تمہیں دور ہی سے کہہ دیا ہوگا کہ گھر پر نہیں ہیں، اور تم ناراض ہوگئے کہ کیسے بدتمیز بچے ہیں۔ بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔''

''ہاں، یہ بات مجھے بری لگی تھی۔ میں تم سے عید ملنے آیا تھا۔ عید کے دوسرے اور پھر تیسرے دن۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ عید کے دوسرے دن میں اپنے پروفیسر دوست سے ملنے گیا تھا اور میرے بچے اپنی ماں کے ساتھ اپنی نانی اماں کے گھر عید ملنے گئے تھے اور تیسرے دن ہم سب کو میرے بڑے بیٹے نے اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس آنے جانے میں تم جیسے دوست کی برسوں کی دوستی متاثر ہوگی۔''

اس دوران میں انہیں ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔ انہیں بڑے احترام سے بٹھایا اور خود خاصے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ماسک اب منہ سے اتار دو اور غصہ تھوک دو۔ شوبز کے حوالے سے کراچی پر ایسا زبردست مضمون لکھا ہے۔''

''اچھا...... کہاں ہے...... دکھاؤ......''

''وہ تو میں نے تمہارے محبوب پرچے ''سرگزشت'' میں بھیج دیا ہے۔''

''کب شائع ہوگا؟''

''اب تک تو چھپ چکا ہوتا اگر کورونا وائرس نے نظام زندگی معطل نہ کیا ہوتا۔''

''ہاں یار! یہ ایسی وبا ہے جس نے دنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' پھر ذرا رک کر بولے۔ ''آخر اس مضمون میں۔ میرا مطلب ہے، کراچی سے متعلق تحریر میں کیا لکھا ہے؟''

''یہ تو جب آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک وقت تھا جب شہر کراچی کی کیا حیثیت تھی...اور یہاں شوبز کے حوالے سے کیا کیا کچھ ہوا۔ کیسے کیسے لوگ شوبز کی دنیا سے وابستہ تھے۔ کتنے سنیما تھے۔ کہاں کہاں تھے۔ جن کا اب نام و نشان بھی نہیں اور ان میں سے کئی میں سربراہان مملکت تک آ کر فلم دیکھتے تھے......''

''گویا تم نے اس سنہری دور کے کراچی کو اپنی تحریر کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ میرے چہرے پر اس وقت کرب کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔

''یہ تم ایک دم اداس کیوں ہوگئے؟''

''یہ سوچ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے کہ وہ شہر جو کبھی روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا، آج اس کی کیا حالت ہے۔'' چائے کی چسکی لیتے ہوئے حسن حفیظ نے پوچھا۔

''اب تم کیا لکھ رہے ہو؟''

''کراچی کے بارے میں جو کچھ لکھ چکا ہوں، اس کی اگلی قسط لکھ رہا ہوں۔ کراچی تو شوبز کے حوالے سے بھی سمندر ہے۔ اس نے ایسے ایسے نابغۂ روزگار فنکار پیدا کیے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو پاکستان فلم انڈسٹری کبھی ترقی نہیں کر سکتی تھی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' حسن حفیظ بولے۔ ''وحید مراد، محمد علی، ندیم، جنہوں نے پاکستانی فلمی صنعت کو ایک نیا رنگ ایک نیا روپ دیا۔ کراچی فلم انڈسٹری ہی سے تو ابھرے۔''

''ہاں......ان کے علاوہ بھی شمیم آرا، رونا لیلیٰ، غلام محی الدین، جاوید شیخ، سرور انور، فیاض ہاشمی، روزینہ، اقبال یوسف، سید کمال، سنگیتا، اخلاق احمد، دکھی پریم نگری، روحی بانو، ناشاد، تسلیم فاضلی، اقبال اختر اور بہت سے مختلف شعبوں سے وابستہ فنکار اور ہنرمندوں نے اپنی فنی صلاحیتوں سے جو دیپ جلائے ہیں ان کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ذکر کے بغیر کراچی کی کہانی کبھی مکمل نہیں ہوگی جیسے احمد رشدی......''

''اس کے بارے میں بھی زیرِ نظر تحریر میں لکھو گے......؟''

''نہیں......اس پر ایک الگ سے مضمون ہوگا جس میں اس جادوئی آواز والے گلوکار کے بے شمار رنگ ہوں گے...... یہ تحریر بہت زیادہ پھیلاؤ، بہت زیادہ وسعت کی متقاضی ہوگی۔''

حسن حفیظ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے اسی مسکراہٹ کے دوران کہا۔ ''وہ جو کسی نے کہا ہے...... میں جو شاعر کبھی ہوتا ترا سہرا لکھتا۔ کاش کہ میں بھی رائٹر ہوتا تو اپنے اس خوابوں کے شہر کے بارے میں لکھتا۔

مگر مجھے خوشی ہے کہ میرا یار اس دیار کے بارے میں لکھ رہا ہے جو شہر بھنبھور کی طرح لٹ گیا ہے۔''

☆☆☆

اللہ کا بڑا احسان ہے کہ کراچی سے شوبز کے حوالے سے ایسے نابغۂ روزگار فن کے شاہکار ابھرے جو فخرِ کراچی ہی نہیں، فخرِ پاکستان ثابت ہوئے۔ ان ہی میں سے ایک موسیقار نثار بزمی بھی ہیں۔ ان کا نام نامی اسم گرامی جب تک شامل نہ ہو پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ جب تک سرسنگیت زندہ رہے گی، نثار بزمی کی موسیقی کی عظمت بھی تابندہ رہے گی۔ کل جب وہ موجود تھے، ان کے بے مثال گیتوں نے موسیقی سے پیار کرنے والوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا اور آج جب وہ موجود نہیں آج بھی ان کے لازوال گیتوں کا حسن اور نکھار اسی طرح قائم ہے۔ آنے والا کل بھی ان کی کمپوز کردہ دھنوں کو گزرتے وقت کی دھند سے دھندلا نہیں سکے گا۔ ذرا سوچیے ایسے گیتوں کو کوئی کبھی بھلا سکے گا؟ فراموش کر سکے گا؟

☆ آپ دل کی انجمن میں حسن بن کر آگئے
☆ کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے
☆ میرا پیار تیرے جیون کے سنگ رہے گا
☆ آج ہے محفل دید کے قابل شمع بھی ہے پروانہ بھی
☆ کل کسی وقت شام سے پہلے
☆ میں ترا شہر چھوڑ جاؤں گا

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کراچی نثار بزمی کی جنم بھومی نہیں۔ وہ خان دیش نامی قصبے میں 1925ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ قصبہ ممبئی میں نصیر آباد کے قریب واقع تھا۔ ان کے والدین نے ان کا نام سید نثار علی رکھا تھا۔ یہ خاندان مکمل مذہبی تھا جس کا پیشہ تجارت تھا۔ سید نثار علی نے ابتدائی تعلیم جل گاؤں میں حاصل کی۔ سید نثار علی کی آواز بہت اچھی تھی۔ وہ نعتیں پڑھتے تو لوگ بڑی توجہ سے سنتے پھر اس کم سن لڑکے کا رجحان قوالی کی طرف ہوگیا۔

قدرت کے کھیل بھی بڑے نیارے ہوتے ہیں۔ ان کے والد کو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا۔ ''سید صاحب! آپ کے بیٹے سید نثار علی کی آواز بہت اچھی ہے۔''

''ہاں، یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے۔''

''آپ اسے موسیقی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے ممبئی بھیج دیجیے۔''

''اگر اس بچے کو گانے کا شوق ہے تو باضابطہ گانے کی تعلیم و تربیت کے بغیر وہ اس میدان میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکے گا۔''

سید صاحب کا گھرانا مذہبی تھا مگر انہوں نے بیٹے کے شوق کے راستے میں کبھی کوئی دیوار کھڑی نہیں کی اور پھر جب جاننے والوں نے موسیقی کی تربیت کا مشورہ دیا تب بھی انہوں نے اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیا اور سید نثار علی کو ممبئی بھیج دیا جہاں اس بچے نے خان صاحب استاد امان علی خان سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔

ابھی سید نثار علی کی عمر محض تیرہ برس تھی کہ اس نے کئی راگ راگنیوں پر عبور حاصل کرلیا۔ گانے کے شوق نے اس کمسن لڑکے کو آل انڈیا ریڈیو ممبئی تک پہنچایا۔ اس کی عمر دیکھ کر ریڈیو کے حکام کو یقین نہیں آیا کہ اتنا سا بچہ کیا گائے گا۔ مگر جب اس نے کہا۔

''میرا آڈیشن لیجیے اور ہر طرح سے مجھے آزمائیے۔ اگر آپ لوگوں کے معیار پر پورا اتروں تو گانے کا موقع دیجیے گا۔''

''آڈیشن تو ہم بہرحال لیں گے۔''

اور انہوں نے واقعی آڈیشن لیا اور وہ حیران و پریشان رہ گئے کہ اتنے سے لڑکے کی نا صرف یہ کہ آواز خوبصورت ہے بلکہ اسے راگ راگنیوں کا بھی ادراک ہے۔ انہوں نے ہر طرح اپنا اطمینان حاصل کیا اور اسے باضابطہ گانے کا پروگرام دینا شروع کردیا۔ اس دوران کمسن سید نثار علی نے اپنی کچھ پوشیدہ صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ کیا۔ سن 1944ء کی بات ہے۔ ریڈیو کے ایک ڈرامے ''نادر شاہ درانی'' نشر کیا۔ اس میں کچھ گیت بھی شامل تھے۔ سید نثار علی کے کمپوز کیے ہوئے گیتوں نے عوامی مقبولیت حاصل کی۔ یہ ان کی بطور موسیقار پہلی کوشش تھی جو توقعات سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔ اگرچہ اس موقع پر ریڈیو کے کئی سینئر کمپوزروں نے بڑا اعتراض بھی کیا تھا۔

''آخر ایک بچے کو اتنی اہم ذمے داری کیوں دی گئی؟ کیا ریڈیو کے پاس تجربہ کار کمپوزر نہیں......؟''

لیکن جب اس بچے کی کارکردگی سامنے آئی تو اعتراض کرنے والوں کے منہ بند ہوگئے۔ اس دور میں ریڈیو ہی پبلسٹی کا واحد ذریعہ تھا۔ نوعمر کمپوزر سید نثار علی کی شہرت فلمی دنیا تک بھی پہنچی۔

''سنا تم نے......ریڈیو کے ایک کمسن کمپوزر نے کیسے

کامیاب گیت کمپوز کیے ہیں۔‘‘
’’اللہ کی شان۔ جسے چاہے اپنی نعمتوں سے نواز دے۔‘‘

اس دور میں فلم والے اچھی صلاحیتوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس بچے سے بھی اس کی صلاحیتوں کا فائدہ اٹھانے کے لیے فلم والوں نے بھی اس کی خدمات حاصل کیں اور اسے بطور موسیقار ایک فلم ’’جمنا کے پار‘‘ مل گئی۔ نوعمر سید نثار علی نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جی لگا کر اس فلم کے گیتوں کے لیے موسیقی ترتیب دی۔ فلم کی نمائش کے بعد اس کی موسیقی اور گیتوں کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ فلمی دنیا میں جو جیت گیا وہی سکندر کہلاتا ہے۔ ہر نئے فنکار اور ہنر مند کی پہلی فلم اس کی کامیابی یا ناکامی کا سبب بنتی ہے۔ سید نثار علی نے اپنی کمسنی کے باوجود اپنی خداداد فنی صلاحیتوں کی بنیاد پر بے حد مقبول اور خوشگوار دھنیں کمپوز کرکے اپنی پہلی فلم کے گیتوں کو کامیاب کرادیا تھا۔ وہ اچھا دور تھا اور اچھی صلاحیتوں کے قدردان بہت تھے۔ نوعمری کے باوجود سید نثار علی کے لیے بولی ووڈ کے سارے دروازے کھل گئے۔

سید نثار علی نے 1944ء سے 1962ء تک بھارتی فلم انڈسٹری سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور اس دوران 40 سے زائد فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ ان میں تقریباً 30 فلموں نے کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے اپنی فلموں میں تمام بڑے گانے والوں سے گیت گوائے جن میں محمد رفیع، لتا منگیشکر، آشا بھوسلے اور منا ڈے قابلِ ذکر ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنا فلمی نام نثار بزمی بولی ووڈ کے قیام کے دوران ہی اختیار کرلیا تھا۔ چونکہ انہیں شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی اور وہ بزمی تخلص کرتے تھے لہٰذا انہوں نے فلمی نام نثار بزمی رکھ لیا تھا۔ بات شعر و شاعری کی چلی ہے تو یہ بتاتا چلوں کہ ان کے شعری مجموعے کا نام ’’پھر ساز صدا خاموش ہوا‘‘ تھا۔

تقسیم ہند کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بولی ووڈ کی فضا میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ ایک متعصب طبقہ مسلمان آرٹسٹوں اور ہنرمندوں سے نفرت کا اظہار کرنے لگا۔ وہ ہر مسلمان فنکار یا تکنیک کار کو پاکستانی سمجھ کر اس سے گریزاں رہنے لگے۔ اسے دشمن سمجھنے لگے۔ واضح رہے کہ تمام لوگ ایسے نہیں تھے۔ اب بھی بہت سے بڑے چھوٹے فلم والے پہلے کی طرح مل جل کر کام کرنے کے حامی تھے اور مسلمانوں کو بھی برابر کا حق دار سمجھتے تھے۔ تعصب اور نفرت کی فضا میں جب مسلمان فلم والوں کے دم گھٹنے لگے تو وہ آہستہ آہستہ ہجرت کرکے پاکستان آنے لگے۔ نثار بزمی صاحب کو بھی آخر کوئی 15 برس بعد وہاں کی فضا میں شدت کے ساتھ گھٹن کا احساس ہونے لگا لہٰذا 21 جون 1962ء میں انہوں نے بھی بالی ووڈ کو الوداع کہا اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ پاکستان آگئے اور روشنیوں کے شہر کراچی کو اپنی سکونت کے لیے پسند کیا۔

ان کے پاکستان آنے کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ ان کا ایک عزیز ترین دوست جوان سے ناراض ہوکر پاکستان چلا آیا تھا، اس کو منا کر اپنے ساتھ واپس لے جانے کے لیے وہ پاکستان آئے تھے۔ دوست کو منا کر وہ واپس تو لے گئے مگر پاکستان سے وہ متاثر ہوکر گئے اور جب ممبئی کی فضائیں مسموم ہوگئیں تو انہوں نے فیصلہ کیا اگر ہم پر پاکستانی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے تو پاکستان ہی میں ہمارا مرنا جینا ہونا چاہیے۔

پاکستان آنے کے بعد جب انہوں نے سکون کا سانس لیا اور اس کے بعد اپنے کام دھندوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو یہ سوچ کر انہیں ایک جھٹکا سا لگا۔

یہاں تو خواجہ خورشید انور، رشید عطرے اور ماسٹر عنایت حسین جیسے بڑے، مستند اور اعلیٰ معیار کے موسیقاروں کا فلم انڈسٹری پر راج ہے۔ ان جیسوں کے ہوتے ہوئے مجھ جیسے کو کون پوچھے گا؟ ان کی شہرت اور مقبولیت تو بھارت میں بھی ہے۔

ان بڑے اور جید موسیقاروں کی موجودگی تو ایک حقیقت تھی۔ ان کے ہوتے ہوئے یہاں کے دوسرے موسیقار بھی تو روزی روٹی کمار ہے ہیں۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ یہاں لایا ہے تو یہاں پیٹ بھرنے کا بندوبست کرے گا۔ یہ اور ایسے ہی خیالات نے انہیں سہارا دیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد فضل احمد فضلی صاحب نے نثار بزمی سے رابطہ کیا۔ فضلی صاحب اپنی پہلی فلم ’’چراغ جلتا رہا‘‘ بنا کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اب اپنی دوسری فلم ’’ایسا بھی ہوتا ہے‘‘ شروع کررہے تھے۔

’’نثار بزمی صاحب! میں آپ کے نام اور کام سے واقف ہوں۔ آپ کی بھارتی فلموں اور ان کے گیتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ آپ ماشاء اللہ اچھے اور باصلاحیت کمپوزر ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری نئی فلم کی

موسیقی آپ ترتیب دیں۔“

”شکریہ فضلی صاحب! اگر آپ نے اپنی فلم کی موسیقی کے لیے مجھے اعزاز بخشا ہے تو انشاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”مجھے بھی آپ سے یہی توقع ہے۔“ فضلی صاحب نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

پاکستان میں نثار بزمی صاحب نے اپنی پہلی فلم کے حوالے سے ”ایسا بھی ہوتا ہے“ سائن کرلیا۔ اس فلم کے لیے پہلے مصلح الدین سے رابطہ ہوا تھا مگر نثار بزمی سے مل کر فضلی صاحب نے اپنی اس فلم کی موسیقی کی ذمّے داری انہیں سونپ دی۔

”ایسا بھی ہوتا ہے“ 1965ء میں نمائش پذیر ہوئی تو اس کے گیتوں اور ان کی کمپوزیشن نے دھوم مچادی۔

☆ محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
☆ مکھڑا وہ چاند سا رخ زیبا کہیں جسے
☆ ہو تمنا اور کیا جانِ تمنا آپ ہیں
☆ آئے آئے بہار کے دن آئے

ان گانوں کی مقبولیت کے بعد نثار بزمی کے سامنے فلمسازوں کی قطار لگ گئی... مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان نثار بزمی کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ”ایسا بھی ہوتا ہے“ نہیں ہے۔ ان کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ہدایت کار نذیر صوفی کی ”ہیڈ کانسٹیبل“ ہے۔

مشہور قول ہے کہ نام یا چام کامیابی کا سبب نہیں بنتا ہے۔ کام اور صرف کام کامیابی کی منزلوں تک پہنچاتا ہے۔ نثار بزمی ایسے موسیقار تھے جنھوں نے راگ راگنیوں کی تعلیم حاصل کی تھی۔ خود اچھے گلوکار تھے اس لیے اچھی آوازوں کی شناخت کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کا کون سا گیت کس گانے والے سے گوانا چاہیے، اس کا درست فیصلہ کرتے تھے پھر شاعر بھی تھے۔ اچھی شاعری کا ذوق رکھتے تھے اس لیے نغمہ نگاروں سے خوبصورت اور اعلیٰ معیار کے گیت لکھواتے تھے۔ اپنی ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ان کے کمپوز کیے ہوئے دھنوں پر تخلیق ہونے والے گیت نا صرف اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے بلکہ دلوں میں اتر جانے والے ہوتے تھے۔

نثار بزمی صاحب نے پاکستان میں 80 سے زیادہ فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ جن کے لیے اندازاً 500 نغمات کی کمپوزیشن کی۔ انہوں نے اپنے کیریئر کے دوران

زندگی نامہ

اصل نام: سید نثار علی
فلمی نام: نثار بزمی
ولادت: دسمبر 1925ء
مقام: قصبہ خان دیش، نصیر آباد (بمبئی)

موسیقی: لوگوں کے مشورے پر والد نے بمبئی بھیج دیا جہاں خان صاحب استاد امان علی خان سے محض تیرہ برس کی عمر میں کئی راگ راگنیوں پر عبور حاصل کرلیا۔

باضابطہ گلوکاری: موسیقی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے وابستہ ہو کر گلوکاری شروع کردی۔

میوزک کمپوزیشن کی ابتداء: ریڈیو کے ایک ڈرامے ”نادر شاہ درانی“ کے گیتوں کی کمپوزیشن سے ابتداء کی اس وقت ان کی عمر صرف 19 برس تھی۔ یہ 1944ء کی بات ہے۔

بطور فلمی موسیقار: بمبئی کی ایک فلم ”جمنا کے پار“ کی موسیقی کیریئر کا آغاز کیا۔

40 سے زیادہ فلموں کی بھارتی فلم انڈسٹری سے وابستگی: 1944ء سے 1962ء تک بولی وڈ سے وابستہ رہے۔

پاکستان آمد: 21 جون 1962ء کو ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔

پاکستانی فلمیں: پاکستان میں بطور موسیقار فضل احمد کریم فضلی کی دوسری فلم ”ایسا بھی ہوتا ہے“ پہلی فلم سائن کی۔ مگر پاکستان میں ان کی پہلی فلم نمائش کے اعتبار سے نذیر صوفی کی فلم ”ہیڈ کانسٹیبل“ ہے۔

آخری فلم: مانڈی والا پکچرز کے بے حد اصرار پر 1991ء میں ”وری گڈ دنیا وری بیڈ لوگ“ کی موسیقی ترتیب دی۔

وفات حسرت آیات: 22 اور 23 مارچ 2007ء کی درمیانی شب اللہ کو پیارے ہوگئے اور کراچی کے محمد شاہ قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

کوالٹی پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ کم فلموں کے لیے کام کرنا پسند کرتے تھے اور ہمیشہ اچھا کام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نثار بزمی صاحب کے پورے کیریئر میں 90 فیصد گانے ایسے ہیں جو اپنی بہترین کمپوزیشن کی وجہ سے سپر ہٹ ہوئے۔ انہیں پاکستان میں ''لاکھوں میں ایک'' سے بہت زیادہ شہرت ملی۔ پاکستان میں ان کی مشہور فلموں میں صاعقہ، عندلیب، شمع اور پروانہ، انجمن، پہچان، تہذیب، امراؤ جان ادا، تلاش، ناگ منی، انمول وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے ترتیب دیے ہوئے دھنوں پر جو گیت وجود میں آئے ان میں بیشتر کو امر سنگیت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کو اپنے بے شمار چاہنے والوں سے بچھڑے 13 برس بیت گئے ہیں مگر ان کے گیتوں کی آب و تاب اور پسندیدگی آج بھی روز اوّل کی طرح برقرار ہے۔ ان کے ان گیتوں کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔

☆ ابھی ڈھونڈ ہی رہی تھی تمہیں یہ نظر ہماری
کہ تم آگئے اچانک بڑی عمر ہے تمہاری
(آواز مادام نور جہاں)

☆ آپ دل کی انجمن میں حسن بن کر آگئے
(آواز رونا لیلیٰ)

☆ کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے
چپ رہ کے بھی نظر میں ہیں پیار کے اشارے
(نور جہاں اور احمد رشدی نے الگ الگ گایا)

☆ بڑی مشکل سے ہوا تیرا میرا ساتھ پیا
☆ میرا پیار تیرے جیون کے سنگ رہے گا
(مہناز اور مہدی حسن نے الگ الگ گایا)

☆ آج ہے محفل دید کے قابل شمع بھی ہے پروانہ بھی
(ڈوئیٹ۔ مالا اور مجیب عالم کی آوازیں)

☆ میں ترے اجنبی شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تجھے
☆ دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں
کہتی ہے میری نظر شکریہ
(آواز رونا لیلیٰ)

☆ اللہ ہی اللہ کیا کرو دکھ نہ کسی کو دیا کرو
جو دنیا کا مالک ہے نام اسی کا لیا کرو
(آواز ناہید اختر)

☆ نیناں ترس کے رہ گئے پیا آئے نہ ساری رات
(آواز رونا لیلیٰ)

☆ بول ری گڑیا بول
چپ رہتے تجھے صدیاں بیتیں
آج تو لب یہ کھول

☆ جو بچا تھا وہ لٹانے کے لیے آئے ہیں
آخری گیت سنانے کے لیے آئے ہیں

☆ اک ستم اور میری جاں
ابھی جاں باقی ہے
(آواز مہدی حسن)

☆ لیے آنکھوں میں غرور
کیسے بیٹھے ہیں حضور
(آواز احمد رشدی)

☆ میرا نام تیرا نام ساتھ ساتھ ہوگا
سیاں کچھ عرصے کے بعد
(آواز مالا)

☆ اک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا
☆ رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
☆ چلو اچھا ہوا تم بھول گئے
اک بھول ہی تھا میرا پیار
☆ یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی
☆ کل کس وقت شام سے پہلے
میں ترا شہر چھوڑ جاؤں گا
☆ تن تو پے واروں من تو پے واروں
بگڑی بنا دے تو ہے رو رو پکاروں
☆ ایسی چال میں چلوں کلیجہ ہل جائے گا
کسی کی جان جائے گی کسی کا دل جائے گا
(آواز تصور خانم)

☆ دل دیا درد لیا آنکھوں میں آنسو آئے
اک خوشی مانگی تھی الفت میں بہت غم پائے
(آواز مہدی حسن)

یہ اور ایسے بے شمار گیت ہیں جو اپنے موسیقار کے اعلیٰ ذوق اور بلند معیار کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نثار بزمی صاحب نے پاکستان میں موجود بڑے، جید اور نامور موسیقاروں کی موجودگی میں اگر ایک ممتاز مقام بنایا تو اس میں ان کی لازوال فنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا عمل دخل تھا۔ انہوں نے عوامی مقبولیت ہی حاصل نہیں کی فن موسیقی کے پنڈتوں اور مبصرین اور ناقدین کو بھی متاثر کیا اور متعدد ایوارڈز اور اعزاز حاصل کیے۔ انہیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا اور ملک

کے سب سے بڑے پبلک ایوارڈ نگار ایوارڈز بھی ملے اور دیگر ایوارڈز بھی دیے گئے۔ ان کی فلموں نے گولڈن پلاٹینم اور ڈائمنڈ جوبلیاں بھی کیں اور ان سپرہٹ کامیابیوں میں ان کے سپرہٹ سرسنگیت کا بھی نمایاں حصہ ہوتا تھا۔ ان کی گولڈن جوبلی فلمیں انتخاب، رشتہ، تلاش، سچائی، صاعقہ، لاکھوں میں ایک، آگ، پلاٹینم جوبلی فلم انجمن جبکہ ڈائمنڈ جوبلی فلموں میں انمول اور پہچان، بیوی ہو تو ایسی قابل ذکر ہیں۔

انہیں مندرجہ ذیل فلموں کے گیتوں پر نگار ایوارڈ ملے۔

فلم صاعقہ 1968ء، فلم انجمن 1970ء، فلم میری زندگی ہے نغمہ 1972ء، فلم خاک اور خون (برائے فہم) 1979ء، فلم ہم ایک ہیں 1968ء، فلم بیوی ہو تو ایسی۔

فلم صاعقہ کے گیت ''اک ستم اور مری جاں ابھی جاں باقی ہے۔'' فلم انجمن کے گیت ''آپ دل کی انجمن میں حسن بن کر آگئے۔''

جس دور میں نثار بزمی نے فلموں کی کامیاب موسیقی ترتیب دی اس دور میں پرویز ملک، شباب کیرانوی، رضا میر اور ایس سلیمان جیسے ذہین ہدایت کار ہوا کرتے تھے۔ بزمی صاحب کہتے ہیں ''یہ لوگ کام کرنا اور کام لینا جانتے ہیں۔ اس دور میں موسیقی پر جس قدر توجہ دی گئی وہ لائق ستائش ہے۔''

نثار بزمی صاحب نے بھی ہمیشہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کیا جو ان کی بات کو اہمیت دیتے تھے۔ جب بھی ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تھی وہ کام کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بزمی صاحب سے پروڈیوسر نے گانا کمپوز کرنے کو کہا۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ گانے کی سچویشن کیا ہے؟ اگر پروڈیوسر انہیں مطمئن نہیں کر سکا تو انہوں نے گانا کمپوز کرنے سے انکار کر دیا۔ نثار بزمی صاحب کا کہنا تھا کہ اچھی سچویشن ہو تو گانا خود بخود اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

نثار بزمی صاحب نے 80ء کی دہائی کے اواخر میں فلموں کی موسیقی سے خود کو علیحدہ کر لیا۔ وہ کہتے تھے۔ ''میں چلتا ہوا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ پروڈیوسر یا ڈائریکٹر اگر اپنی مرضی مجھ پر مسلط کرے تو میرے لیے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' جب فلم انڈسٹری میں ان کے موڈ مزاج کے لوگ نہیں رہے تو انہوں نے مناسب جانا کہ جو عزت اور شہرت ملی ہے وہ برقرار رہے۔ یہ سوچ کر وہ لاہور سے کراچی آگئے۔ جب لاہور کی فلمیں بہت زیادہ انہیں ملنے لگی تھیں تو انہیں کراچی سے لاہور شفٹ ہونا پڑا تھا۔

وہ اکثر نجی محفلوں میں کہتے تھے۔ ''جب تک سنجیدہ لوگ فلم انڈسٹری میں تھے، فلمیں کامیاب ہوتی تھیں جس کے پاس پیسا ہے وہ فلم بناتے وقت بھول جاتا ہے کہ فلم سازی ایک تخلیقی کام ہے اور تخلیق، ذہانت، صلاحیت اور قربانی مانگتی ہے اور اب اس کا فقدان نظر آتا ہے۔''

لاہور سے کراچی واپس آنے کے بعد متعدد فلمسازوں اور ہدایت کاروں نے ان سے اپنی فلموں کی موسیقی ترتیب دینے کی درخواست کی مگر انہوں نے معذرت کر لی لیکن 1991ء میں انہوں نے مانڈی والا پکچرز کے بے حد اصرار پر ایک فلم ''ویری گڈ دنیا ویری بیڈ لوگ'' کی موسیقی دی۔ یہ ان کی آخری فلم تھی جو انہوں نے اپنے مزاج کے برخلاف کی تھی جس پر وہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جدید موسیقی میں جو چیخ پکار ہے، اس میں گانے والے کی آواز تو سنائی ہی نہیں دیتی۔ نئے گانوں میں نہ تو بول سمجھ میں آتے ہیں نہ گلوکار اپنی شناخت قائم کر پاتا ہے۔ نئی موسیقی سکون بخشنے کی بجائے مضطرب کرتی ہے۔

نثار بزمی نے لاہور سے کراچی واپس آنے کے بعد ٹیلی ویژن کے لیے کام کرنا غنیمت سمجھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹے پیمانے پر موسیقی کا ایک تربیتی ادارہ اپنے گھر ہی میں بنایا جہاں وہ موسیقی سے شغف رکھنے والے لڑکے لڑکیوں کو تربیت دیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے شاگردوں میں تنویر آفریدی، فیصل لطیف اور خالد عثمانی قابلِ ذکر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نثار بزمی بہترین موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ارینجر بھی تھے۔ یہ کوالٹی بہت کم موسیقاروں میں ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنی رعایات اور اقدار سے جڑے رہے۔ ان کی بہت سی خوبیاں تھیں جو انہیں دوسرے موسیقاروں سے الگ اور منفرد بناتی تھیں۔ انہوں نے یوں تو تنویر نقوی، کلیم عثمانی اور کئی تجربہ کار نغمہ نگاروں سے اپنی کمپوزیشن میں گیت لکھوائے مگر مسرور انور ان کے پسندیدہ گیت نگار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر فلموں کی نغمہ نگاری مسرور انور نے کی جو سپرہٹ بھی ہوئی۔ جن دنوں میں ہفت روزہ نگار میں سب ایڈیٹر ہوا کرتا تھا ان دنوں مسرور انور سے نگار کے دفتر میں اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران

انہوں نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا تھا۔ ''مجھے فخر ہے کہ اپنے وقت کے لیجنڈ موسیقار نثار بزمی صاحب کی کمپوز کردہ دھنوں میں سب سے زیادہ گیت اور گانے میں نے لکھے ہیں۔ مجھے اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ ان کی موسیقی پر لکھے میرے بیشتر گیت سپرہٹ ہوئے۔''

''آخر کوئی وجہ تو ہوگی۔'' میں نے ان سے کہا۔ ''کہ وہ آپ کو دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ وہ خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور ہمیشہ اچھی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ مجھے ان کے موڈ مزاج کا بخوبی علم تھا اس لیے میں نے کبھی بھی ان کے معیار سے کمتر شاعری نہیں کی۔ وہ فلموں کی سچویشن پر بہت زور دیتے تھے اور میں کہانی کی سچویشن کے مطابق ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر خوبصورت، نکھرے اور ستھرے بول لکھتا تھا۔''

مسرور انور نے اللہ انہیں غریق رحمت کرے، اسی ملاقات میں یہ بھی کہا۔ ''میں نے اور بھی موسیقاروں کے لیے نغمہ نگاری کی ہے مگر کسی کو بھی موسیقی سے متعلق ایک ایک بات پر اس قدر سختی سے عمل درآمد کرتے نہیں دیکھا جس طرح بزمی صاحب کسی بھی بات پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی روایات کے آخری دم تک امین رہے۔''

اپنے فن میں یکتا اور منفرد انداز کے سنگیت کار نثار بزمی 22 اور 23 مارچ 2007ء کی درمیانی شب کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی کے محمد شاہ قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے لیکن ان کی لازوال موسیقی آج بھی زندہ ہے اور جب تک موسیقی کے دلدادہ لوگ اس دنیا میں رہیں گے، ان کی موسیقی سے آراستہ گیت ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔

☆☆☆

اللہ نے کراچی اور اس کی فلم انڈسٹری کو جو عزت اور شہرت عطا فرمائی، اس کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ کراچی کی فلم انڈسٹری کی ناموری میں جن فلمی شخصیات نے اپنا احسن کردار ادا کیا ہے ان میں زیبا کا نام نامی بھی سرفہرست ہے۔ اداکاری کے شعبے میں اس خاتون فنکارہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، انہیں پاکستانی فلمی تاریخ نویس کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اس اداکارہ نے اپنی فطری لازوال پرفارمنس سے جو ممتاز مقام حاصل کیا بہت کم فنکاراؤں کو حاصل ہوتا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی زیبا بیگم کو ان کی اعلیٰ کارکردگی اور شخصیت کی وجہ سے نا صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ انہیں جو عزت و احترام دیا جاتا ہے وہ برصغیر کی کسی فلمی خاتون کو حاصل نہیں ہوا۔

زیبا نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا اس وقت صبیحہ بیگم، مسرت نذیر، نیر سلطانہ اور شمیم آرا جیسی فنکارائیں بام عروج پر تھیں۔ ان نامور فنکاراؤں کی موجودگی میں کسی نووارد اداکارہ کے لیے اپنا مقام بنانا حقیقتاً ایک بہت مشکل کام تھا لیکن اس باصلاحیت نئی پرفارمر نے اپنی محنت اور لگن سے نا صرف ان فنکاراؤں کی موجودگی میں خود کو منوایا بلکہ مقبولیت کے اس مقام کو حاصل کیا جہاں آج وہ بلاشرکت غیر ''ملکۂ اسکرین'' کہلانے کی حقدار ہیں۔ کراچی میں بننے والی فلم ''چراغ جلتا رہا'' سے فن اداکاری کا یہ چراغ روشن ہوا اور پھر اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ اس نے پوری پاکستانی فلمی صنعت کو جگمگا دیا۔

ہندوستان کے شہر انبالہ میں اس نابغۂ روزگار اداکارہ نے جنم لیا۔ ان کے والدین نے اس نومولود چاند سی بچی کا نام شاہین رکھا مگر نامور ادیب و شاعر اور فلمساز و ہدایت کار فضل احمد کریم فضلی نے اس کے رخ زیبا کو دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر اس کا فلمی نام زیبا رکھ دیا اور شاید اسی بات سے انہیں یہ فلمی گیت لکھنے کا اشارہ ملا۔ ''چہرہ وہ چاند سا رخِ زیبا کہیں جسے۔''

''چراغ جلتا رہا'' میں فضلی صاحب نے زیبا کے علاوہ کئی دیگر نئے چہروں کو بھی متعارف کرایا تھا جن میں محمد علی بھی شامل تھے۔ ابتدائی فلم میں شریک ہونے والے ان دو آرٹسٹوں کو قدرت نے آگے چل کر شریکِ حیات بنا دیا۔

''چراغ جلتا رہا'' کی خاص بات یہ تھی کہ اس فلم کا افتتاح مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا جو کراچی کے نشاط سنیما میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ فلم تکنیکی طور پر زیادہ مستحکم نہیں تھی پھر بھی اپنی دیگر خوبیوں کی بنا پر اس نے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔

اس نئی نویلی اداکارہ کو اس کے خداداد حسن کی وجہ سے ان دنوں اکثر لوگ اسے چینی گڑیا کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ یہ حسن و جمال کا پیکر فنِ اداکاری کی دولت سے بھی مالا مال تھی۔ یہ مولا کریم کی اس پر خاص مہربانی تھی۔ اس کی ان دو خوبیوں نے فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو بہت متاثر کیا۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی ہر نئی فلم میں اس نئی نویلی حسن کی دیوی کو اپنی فلم کی زینت بنائے۔

زیبا کی دوسری فلم ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' تھی جو کراچی میں 1963ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ یہ فلمساز وحید مراد کی دوسری فلم تھی جس میں اداکار درپن کو انہوں نے اداکارہ زیبا کے مقابل ہیرو پیش کیا تھا۔ اس کے موسیقار سہیل رعنا تھے۔ ان کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ فلم اپنی جملہ خوبیوں کی وجہ سے بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ دوستو! یہ وہ وقت تھا جب آپ کے چاکلیٹی ہیرو وحید مراد اداکار کے روپ میں ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ وہ بطور فلمساز فلمی دنیا میں موجود تھے۔

اسی سال یعنی 1963ء میں زیبا کی تیسری فلم ''دل نے تجھے مان لیا'' بھی ریلیز ہوئی جس میں ان کے ہیرو سید کمال تھے۔ یہ ہدایت کار جاوید ہاشمی کی فلم تھی۔ اس کی موسیقی مصلح الدین نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم بھی کراچی میں بنائی گئی تھی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔

اگلے برس 1964ء میں زیبا کی چار فلمیں نمائش پذیر ہوئیں اور چاروں نے زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ فلمیں تھیں ''توبہ''، ''ہیڈ کانسٹیبل''، ''آشیانہ''، ''ہیرا اور پتھر''۔

''توبہ'' ہدایت کار ایس اے حافظ کی فلم تھی۔ اس میں زیبا کے مقابل کمال ہیرو تھے۔ ''ہیڈ کانسٹیبل'' ہدایت کار نذیر صوفی کی فلم تھی۔ اس میں زیبا کے ہیرو محمد علی تھے۔ ''آشیانہ'' فلمساز و ہدایت کار ایس ایم یوسف کی طرح یہ فلم تھی۔ اس کے ہیرو بھی کمال تھے جبکہ ''ہیرا اور پتھر'' وحید مراد کی ذاتی فلم تھی جس کے ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ یہ بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم تھی اور اس فلم میں زیبا کے ہیرو وحید مراد تھے۔ اس فلم نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔ زیبا کی بھی پہلی گولڈن جوبلی فلم تھی۔ دوسرے ہیروز کے مقابلے میں ''ہیرا اور پتھر'' میں وحید مراد کے ساتھ زیبا کی جوڑی کو تماشائیوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔

کسی بھی آرٹسٹ کے لیے چار فلموں کی ایک ہی سال نمائش اور چاروں کی بمپر کامیابی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ زیبا نووارد اداکاراؤں کی صف سے نکل کر ایک دم صف اوّل کی فنکاراؤں میں شمار کی جانے لگیں اور ان کی شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگ گئے۔ یہاں سے ان کی کامیابی کا ایسا دور شروع ہوا جہاں پہنچنا ہر اداکارہ کا خواب ہوتا ہے۔ 1965ء میں زیبا کی کامیاب فلم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' ریلیز ہوئی۔ یہ فضل احمد کریم فضلی

زندگی نامہ

اصل نام: شاہین۔ فلمی نام: زیبا
مقام پیدائش: بھارتی شہر انبالہ
پہلی فلم: چراغ جلتا رہا۔

نمائش کے اعتبار سے ان کی پہلی فلم ''ہیڈ کانسٹیبل'' تھی جو ہدایت کار نذیر صوفی کی فلم تھی۔

ہیروز: یوں تو انہیں درپن، کمال اور محمد علی کے مقابلے میں بھی بطور ہیروئن پسند کیا گیا مگر وحید مراد کے ساتھ ان کی جوڑی سب سے زیادہ پسند کی گئی۔

شادی خانہ آبادی: وحید مراد کے ساتھ ان کی جوڑی سپر ہٹ ہوئی تو دونوں نجی زندگی میں بھی قریب سے قریب تر ہوتے گئے مگر وحید مراد کے والد نثار مراد نے اپنے بیٹے کی شادی ایک بڑے کاروباری خاندان کی بیٹی سلمٰی کے ساتھ کردی۔ وحید مراد کی شادی کے بعد زیبا ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہوئیں۔ اس موقع پر لالہ سدھیر نے ان سے شادی کر کے انہیں سہارا دیا۔ مگر یہ شادی تھوڑے ہی دنوں بعد علیحدگی کی صورت میں ختم ہوگئی اور انہوں نے محمد علی کے ساتھ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کر کے شادی کرلی۔

اعزاز: ان کی فلمیں سلور، گولڈن اور پلاٹینم جوبلیاں ہوئیں۔ انہیں تین نگار ایوارڈ ملے اور دیگر اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

☆☆☆

صاحب کی دوسری فلم تھی۔ اس کے ہیرو کمال تھے۔ اس کی موسیقی نثار بزمی صاحب کی تھی۔ اس فلم کے کئی گیت سپر ہٹ ہوئے جو سارے کے سارے فضلی صاحب کے تحریر کردہ تھے۔ خاص طور پر یہ گیت تو بے حد مقبول ہوا جسے ملکہ ترنم نور جہاں نے گایا تھا۔ ''ہو تمنا اور کیا جان تمنا آپ ہیں۔''

فضلی صاحب کی یہ دوسری فلم ان کی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' کے مقابلے میں کاروباری اعتبار سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

ایس ایم یوسف صاحب کی فلم ''عید مبارک'' میں زیبا کے ہیرو ایک بار پھر وحید مراد تھے۔ اس فلم میں بھی دونوں کی جوڑی کو بے حد پسند کیا گیا۔ اس فلم کی دیگر خوبیوں کے علاوہ اس خوبی نے بھی اس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا کہ زیبا کے ساتھ وحید مراد کو تمام تماشائیوں نے بے

حد پسند کیا۔
اسی سال اداکار فلمساز و ہدایت کار دلجیت مرزا کی فلم ''رواج'' بھی نمائش پذیر ہوئی جس میں زیبا نے ہیروئن اور محمد علی نے ہیرو کے کردار پرفارم کیے۔ دونوں نے اپنی فطری اداکاری سے فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ ماسٹر عنایت حسین کی مدھر موسیقی نے اس کامیابی میں تڑکا کے طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ دلجیت مرزا ایک اچھے کامیڈین ہی نہیں ایک باصلاحیت ہدایت کار بھی تھے۔ ان کی اس فلم میں بھی ان کی ہدایت کاری بہت معیاری اور عمدہ تھی۔ اس لیے عوام نے ''رواج'' کو پسندیدگی کی سند عطا کی۔ ان تینوں فلموں کی کامیابی نے اداکارہ زیبا کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ کیا اور یہ سال بھی ان کے کامیاب دور کا حصہ بنا۔ اس موقع پر یہ بات بھی بتانا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس دوران زیبا کی کچھ فلمیں ناکام بھی ثابت ہوئیں کیونکہ یہ اتنی کمزور فلمیں تھیں جنہیں زیبا کی اداکاری بھی سہارا نہ دے سکی۔

1966ء اداکارہ زیبا کے لیے ایک گولڈن سال ثابت ہوا کیونکہ اس برس انہیں ایک ایسی فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے کا موقع ملا جو ان کے کیریئر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فلم کا نام سن کر ہی آپ میری بات کی صداقت کو تسلیم کرلیں گے۔ یہ فلم تھی اداکار و فلمساز وحید مراد کی ''ارمان''۔ یہ ایک ایسی فلم تھی جس نے زیبا کی اداکاری اور وحید مراد کے ساتھ ان کی جوڑی نے شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگادیے۔ اس پر پرویز ملک کی سپر کلاس ہدایت کاری اور سہیل رعنا کی سماعت میں شہد ٹپکانے والی موسیقی نے سونے پر سہاگے کا کردار ادا کیا۔ ہر زبان پر اس فلم کا ذکر۔ یوں تو اس فلم کے سارے ہی گیت اچھے تھے مگر اس گیت نے تو دھوم مچادی تھی جس کے بول مسرور انور نے لکھے تھے اور اسے مالا اور احمد رشدی نے گایا تھا۔

اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم
تمہارے بنا ہم بھلا کیا جئیں گے

اس گیت کی پکچرائزیشن میں زیبا نے جو اداکاری کی تھی، اس پر انہیں نگار ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس گیت کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ 54 برس گزرنے کے باوجود آج بھی روزِ اوّل کی طرح تر و تازہ ہے۔ اس کی شہرت اور پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ کراچی میں بننے والی اس فلم نے نا صرف کراچی کی فلم انڈسٹری کی عظمت میں اضافہ کیا بلکہ یہ فلم پاکستانی فلمی صنعت کے لیے بھی ایک مثالی فلم ثابت ہوئی۔

اس فلم کی لازوال کامیابی سے ایک بات جو نمایاں طور پر محسوس کی گئی وہ یہ تھی کہ تماشائیوں نے وحید مراد کے ساتھ ان کی جوڑی کو سب سے زیادہ پسند کیا۔ یہ دونوں بھی اپنی کامیابی کے لیے ایک دوجے کی سنگت کو لازمی سمجھنے لگے اور غیر محسوس طور پر نجی زندگی میں بھی قریب سے قریب تر ہونے لگے۔ میڈیا نے بھی اس بات کو محسوس کر کے اس امکان کی قیاس آرائیاں شروع کردیں کہ یہ دونوں شاید آنے والے دنوں میں حقیقی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ہیرو ہیروئن بن جائیں گے۔ وحید مراد کے والد محترم نثار مراد کو جب یہ خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے اپنے اکلوتے فرزند ارجمند کی شادی اپنے اسٹیٹس کے خاندان کی لڑکی سلمیٰ سے جھٹ پٹ کرادی۔ وحید مراد کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ کسی عام لڑکی کو شریکِ حیات بنائیں مگر وہ ایک فرمانبردار بیٹے تھے اور اپنے پاپا سے بے پناہ پیار کرتے تھے اس لیے ان کی خواہش اور حکم کے آگے چوں نہ کرسکے اور اپنی کامیاب ترین فلمی ہیروئن کو اپنی حقیقی زندگی کی ہیروئن نہ بناسکے۔ اس بات کا صدمہ زیبا بیگم کو بھی ہوا کہ وحید مراد ان کا حقیقی ہیرو نہ بن سکا۔

اسی سال زیبا بیگم کی دو فلمیں ''جوش'' اور ''جاگ اٹھا انسان'' بھی ریلیز ہوئیں۔ دونوں ہی معیار اور کاروبار کے اعتبار سے کامیاب فلمیں ثابت ہوئیں۔ ''جوش'' ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی۔ مصلح الدین نے جس کے لیے بڑی خوبصورت موسیقی ترتیب دی تھی جب کہ ''جاگ اٹھا انسان'' کہنہ مشق ہدایت کار شیخ حسن کی فلم تھی جس کی موسیقی لعل محمد اقبال کی تھی۔ اس فلم میں زیبا کے ہیرو وحید مراد تھے جبکہ محمد علی نے بھی ایک کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ تینوں کی اداکاری عروج پر تھی۔ اس فلم کی خاص بات اس کی سحر انگیز موسیقی تھی۔ اس فلم کے اس گیت نے جو شہرت حاصل کی وہ آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔ یہ گیت ہے۔

دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں
اک دل ربا ہے دل میں جو حوروں سے کم نہیں

اس گیت کے گیت نگار دکھی پریم نگری تھے۔ مہدی حسن کی آواز نے اس گیت کو مزید اثر انگیز بنادیا ہے۔
1967ء میں زیبا بیگم کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔

فلمیں تھیں سہاگن، انسانیت، وقت کی پکار، ماں باپ اور ''رشتہ ہے پیار کا۔'' ان فلموں میں ''وقت کی پکار'' جو فضلی صاحب کی فلم تھی جس کے ہدایت کار ان کے فرزند ارجمند تھے اور اس کی ناکامی کی وجہ بھی وہی تھے۔ فضلی صاحب نے اس فلم میں ایک نیا ہیرو متعارف کرایا تھا جس کا نام طاہر تھا۔ یہ بے چارہ بھی اس فلم کے ساتھ فلاپ ہوگیا۔

''سہاگن'' ایس ایم یوسف کی فلم تھی جس میں زیبا کے ہیرو کمال تھے۔ ''انسانیت'' کے تخلیق کار شباب کیرانوی تھے اور انہوں نے زیبا کے ساتھ وحید مراد کو پیش کیا تھا۔ اس فلم کی نمائش کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بھارتی فلم ''دل ایک مندر'' کا چربہ ہے۔ مگر ''انسانیت'' عمدہ ٹریٹمنٹ کی وجہ سے کامیاب رہی۔ اس کے کئی گیت ہٹ ہوئے جو شباب صاحب نے تحریر کیے تھے۔

ہدایت کار خلیل قیصر کی فلم ''ماں باپ'' میں بھی وحید مراد زیبا کے ہیرو تھے۔ ''رشتہ ہے پیار کا'' ایک نغماتی شاہکار فلم تھی۔ اس کی شوٹنگ لندن میں کی گئی تھی اور اس میں زیبا اور وحید مراد کی پسندیدہ جوڑی نے مرکزی رومانوی کردار ادا کیے تھے۔ موسیقار ناشاد کی دلکش دھنوں میں اس فلم کے کئی گیت بھی بڑے لاجواب تھے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود ''رشتہ ہے پیار کا'' متوقع کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ اس کے مقابل ندیم کی پہلی فلم ''چکوری'' نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھی خاصی فلم مقابلہ بازی کی وجہ سے پٹ جاتی ہے۔ اگلا برس 1968ء کو زیبا کی ایک ساتھ 8 فلمیں سلور اسکرین کی زینت بنیں۔ اداکار و فلمساز درپن کی ذاتی فلم ''بالم'' جس میں زیبا نے درپن کے مقابل ہیروئن کا کردار کیا تھا بری طرح ناکام ہوگئی۔ ''مفرور'' ایک عمدہ فلم تھی۔ سدھیر اس میں ہیرو تھے۔ ان کے ساتھ طالش نے بھی لاجواب اداکاری کی تھی۔ اس کے باوجود یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کی ناکامی کا سبب آج تک معلوم نہ ہوسکا۔ اس سال کی دو فلمیں ''محل'' اور ''تاج محل'' کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ ان دونوں فلموں میں محمد علی زیبا کے ہیرو تھے۔ ''تاج محل'' کثیر بجٹ کے ساتھ بنائی جانے والی فلم تھی۔ اس یادگار فلم کی ہدایات ایس ٹی زیدی نے دی تھی۔ واضح رہے کہ ایس ٹی زیدی انڈین فلم ''مغل اعظم'' میں ہدایت کار کے آصف کے اسسٹنٹ تھے۔ ''محل'' ہدایت کار لقمان کی فلم تھی۔ اس کی کہانی ایک انگریزی ناول سے لی گئی تھی۔ اس کی کامیابی میں جہاں اور باتوں کا دخل تھا وہیں رشید عطرے کی موسیقی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ''محل'' کے کئی گانے ہٹ ہوئے۔ دیگر فلموں میں عدالت، پاکیزہ، دل دیا درد لیا، مجھے جینے دو ناکام ثابت ہوئیں۔ ''عدالت'' میں زیبا کے ہیرو وحید مراد جبکہ باقی تینوں فلموں میں محمد علی نے زیبا کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا۔

1969ء میں زیبا کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان میں ''تم ملے پیار ملا، جیسے جانتے نہیں، بہو رانی، زندگی کتنی حسین ہے اور بہاریں پھر بھی آئیں گی'' شامل تھیں۔ یہ سال زیبا کے لیے ایک اہم سال تھا اس لیے کہ انہوں نے اس برس فلم ''تم ملے پیار ملا'' کے سیٹ پر محمد علی سے جو فلم کے ہیرو تھے، اپنی زندگی کا حقیقی ہیرو بنانے کا فیصلہ کیا۔

دوستو! یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وحید مراد اور زیبا کی محبت کے درمیان وحید مراد کے والد نثار مراد آگئے تھے اور ان کی محبت شادی کے بندھن میں بندھنے سے محروم ہوگئی تھی۔ اس ''سانحہ'' نے زیبا کو ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ کردیا تھا۔ وہ بڑی شدت سے کسی سہارے کی تلاش میں تھیں کہ انہیں لالہ سدھیر نے سہارا دیا اور انہیں دو بولوں کے بندھن میں باندھ کر زندگی کی دوڑ میں رواں دواں کردیا مگر یہ سمبندھ زیادہ دنوں برقرار نہ رہ سکا۔ سدھیر پہلے سے شادی شدہ تھے لہٰذا تھوڑے ہی دنوں بعد علیحدگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس دوران زیبا ایک بچی کو جنم دے چکی تھیں۔ ایک بار پھر انہیں ایک مضبوط سہارے کی ضرورت نے مجبور کیا۔ اس بار ان کی نظر انتخاب محمد علی پر پڑی۔ وہ ''چراغ جلتا رہا'' سے علی کے ساتھ کام کررہی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ علی کو ایک مہذب، شائستہ اور ذمے دار شخصیت کے روپ میں پایا تھا لہٰذا ''تم ملے پیار ملا'' کے سیٹ پر ایک رومانوی منظر فلماتے ہوئے فیصلہ کرلیا کہ بس یہی شخص میرا شریک حیات بن کر زندگی بھر میرا ساتھ دے سکے گا، اس منظر میں کچھ اس طرح کے مکالمے تھے......

''مجھے تم ملے تمہارا پیار ملا...... کیا تم میری زندگی میں بہار بن کر ہمیشہ اس پیار کو برقرار رکھو گے......؟''

''تم اگر مجھ پر اعتبار کروگی تو میں ہمیشہ تمہارے معیار پر پورا اتروں گا۔''

سین فلمبند ہونے کے بعد زیبا نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کیا حقیقی زندگی میں بھی تم اسی طرح میرا ساتھ دے سکتے ہو؟''

''ہاں ...... کیوں نہیں۔ یہ تو میرے لیے بہت بڑی بات ہوگی۔''
اس ایجاب و قبول کے بعد محمد علی نے کہا۔''میں شادی کا بندوبست کرتا ہوں۔''
''مگر......'' زیبا نے محتاط لہجے میں کہا۔''فی الحال اس شادی کی بھنک کسی کو نہیں لگنی چاہیے۔''
علی نے اپنے دیرینہ بزرگ ہمدرد کریکٹر ایکٹر آزاد سے کہا۔''بزرگ محترم! مجھے محبت ہوگئی ہے......''
''یہ تو اچھی خبر ہے......کون ہے وہ خوش نصیب؟''
''میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
''ارے بھئی میں نے پوچھا ہے......کون ہے وہ؟ کس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''
''مگر یہ شادی ابھی خفیہ رہے گی۔ زیبا نہیں چاہتی کہ اس شادی کی وجہ سے اس کے کیریئر پر کوئی منفی اثر پڑے۔''
آزاد نے زور سے قہقہہ لگایا۔''مجھے یقین آگیا۔ صد فیصد یقین آگیا کہ تمہیں سچ مچ محبت ہوگئی ہے۔ جواب عشق کی سرحدوں میں داخل ہوگیا ہے......تم بتاؤ، تم نے یہ راز کی بات کیوں بتائی؟''
''آپ ہماری مدد کیجیے۔ ہماری خفیہ شادی کرادیجیے۔''
قصہ مختصر یہ کہ اداکار آزاد نے اپنے گھر میں بڑے رازدارانہ انداز میں نکاح پڑھوا کر محمد علی اور زیبا کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کردیا۔
کچھ دنوں تک تو یہ شادی صیغۂ راز میں رہی پھر خوشبو کی طرح دوسروں تک پہنچ گئی۔ یہ شادی واقعی خانہ آبادی ثابت ہوئی۔ زیبا نے بہترین بیوی بن کر محمد علی کا ساتھ دیا اور علی نے 38 برسوں تک ایک مثالی شوہر کا کردار ادا کیا۔ محمد علی کی بیماری کے دوران زیبا نے ایک وفا شعار بیوی کی حیثیت سے علی کے آخری دم تک ان کی خدمت کی۔
یہ شادی جب طشت از بام ہوگئی اس کے بعد انہوں نے علی زیب پروڈکشن کے نام سے ایک فلمساز ادارہ بنایا اور اس کے بینر تلے دو فلمیں بنائیں۔''آگ'' اور ''جیسے جانتے نہیں''۔''آگ'' نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ ''جیسے جانتے نہیں'' نرم رہی۔
1970ء میں محمد علی اور زیبا نے اکٹھے انجان، انسان اور آدمی، بے قصور، محبت رنگ لائے گی، نجمہ اور ایک پھول ایک پتھر میں کام کیا۔ ان میں انجان، انسان اور آدمی اور نجمہ بہت کامیاب ہوئیں۔ انسان اور آدمی ایک بڑی فلم تھی جو شباب کیرانوی نے ایک انگریزی ناول کی کہانی پر بنائی تھی جس پر انہیں بہترین فلمساز کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔ ایم اشرف نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کا یہ گیت جو میڈم نور جہاں کی آواز میں صدابند ہوا تھا اور ان کا ساتھ مہدی حسن نے دیا تھا، بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بول تھے۔''تو جہاں کہیں بھی جائے میرا پیار یاد رکھنا۔''
1971ء میں دونوں نے فلم دنیا نہ مانے، یادیں، تیری صورت میری آنکھیں، انصاف اور قانون، سلام محبت، آنسو بہائے پتھروں نے اور افسانہ زندگی کا، میں مرکزی رومانوی کردار کیے۔ ان میں اکثر فلمیں کامیاب رہیں۔ انصاف اور قانون اور افسانہ زندگی کا شباب کیرانوی کی فلمیں تھیں۔ ان فلموں میں دونوں کی اداکاری ناقابلِ فراموش تھی۔
1972ء میں زیبا اور محمد علی نے الزام، بدلے گی دنیا ساتھی اور محبت، میں مرکزی رومانوی کردار کیے تھے۔ محبت میں زیبا کو نگار ایوارڈ ملا تھا۔ یہ ان کا تیسرا اور آخری نگار ایوارڈ تھا۔ اس برس ان کی صرف تین فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔
1973ء، 1974ء اور 1975ء میں ان کی فلمیں دامن اور چنگاری، ٹائیگر گینگ، بن بادل برسات، آرزو، شیریں فرہاد، محبت زندگی ہے، ندیا کے پار، ہمراہ، ایثار اور نوکر میں محمد علی کے ساتھ زیبا نے اداکاری کی۔ ان برسوں میں اگرچہ ان کی فلموں کی تعداد کم ہے مگر ان میں کامیاب فلمیں زیادہ ہیں۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور اپنے ساتھ حالات اور واقعات کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ زیبا کی عمر بھی اب فلموں کی ہیروئن والی نہیں رہی تھی۔ اب ان کی جگہ نئی اور تر و تازہ اداکارائیں آگئی تھیں جن میں شبنم سب سے زیادہ اہم تھیں۔ ان ہی کو اب فلمسازوں کی اکثریت کاسٹ کرنے لگی تھی اس لیے زیبا آہستہ آہستہ فلموں سے فیڈ آؤٹ ہوگئیں۔ شادی کے بعد زیبا نے دوسرے ہیروز کے ساتھ کام کرنا بند کردیا تھا۔ شاید کسی ایک فلم میں ندیم کے ساتھ کام کیا تھا۔
محمد علی، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی دیگر خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی ان کی مہمان نوازی تھی۔ وہ اپنے محل نما بنگلے میں اکثر دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے جن میں نا صرف فلم انڈسٹری کی اہم

شخصیات کو مدعو کیا جاتا تھا بلکہ ادیبوں، شاعروں اور معززین شہر شریک ہوتے تھے۔ اکثر بیرونِ ملک سے آنے والی اہم شخصیتوں کے اعزاز میں بھی دعوت شیراز کا اہتمام کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر بھارت سے اداکار، فلمساز اور ہدایت کار منوج کمار پاکستان آئے تو محمد علی نے اپنی عادت اور روایت کے مطابق منوج کمار کے اعزاز میں بھی ایک نہایت پُرتکلف تقریب کا اہتمام کیا جس میں اکابرین شہر کے علاوہ فلمی صنعت کی تمام نمایاں شخصیتوں کو مدعو کیا۔ منوج کمار نے محمد علی کی جانب سے اس عزت افزائی سے متاثر ہو کر کہا۔ ''علی بھائی! میری خواہش ہے کہ آپ اور زیبا بھابی میری ایک فلم میں میرے ساتھ کام کریں۔''

زیبا بولیں۔ ''ہم یہیں اپنی فلموں میں بہت مصروف ہیں۔ ہمارے لیے ممبئی جا کر اداکاری کرنا مشکل ہوگا۔''

مگر منوج کمار ضد کرتے رہے۔ اس پر علی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم آپ کی فلم کے لیے وقت نکال لیں گے۔''

''منوج بھائی! آپ کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔'' زیبا نے کہا۔ ''کہ ہم اپنی انڈسٹری کے سپر اسٹارز ہیں۔ آپ کی فلم میں ہمارے کردار ہمارے شایانِ شان ہونا چاہیے۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ آپ لوگ پہلے اسکرپٹ کا بغور مطالعہ کر لیجیے گا اس کے بعد پر فارم کیجیے گا۔''

منوج کمار ممبئی واپس چلے گئے اور کچھ دنوں کے بعد وہاں سے پیغام بھیجا کہ ہماری نئی فلم ''کلرک'' کی تمام تیاریاں مکمل ہوگئی ہیں۔ آپ لوگ اپنی سہولت کے مطابق جب آنا چاہیں، مجھے اطلاع دے کر آجائیں۔''

یہ دونوں وقت نکال کر ممبئی چلے گئے۔ منوج کمار نے انہیں بڑی عزت کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ''کلرک'' کے اسکرپٹ کا مطالعہ کیا۔ دونوں کے کردار کلیدی تھے اور خاصے پاور فل تھے۔ دونوں مطمئن ہوگئے۔ فلم بندی شروع ہوئی اور آخر کار ایک دن ختم ہوگئی۔ دونوں نے اپنے کردار کے مطابق زبردست اداکاری کی تھی۔ اداکاری مکمل کروا کر دونوں واپس لاہور آگئے۔

کئی مہینوں کے بعد ''کلرک'' ممبئی میں ریلیز کر دی گئی، مگر جو فلم ریلیز کی گئی تھی اس میں علی زیب کے فلمائے ہوئے مناظر نہ ہونے کے برابر تھے۔ لگتا تھا ایڈیٹنگ کے دوران جان بوجھ کر ان دونوں کے جاندار مناظر پر بے دردی سے قینچی چلائی گئی ہے۔ ایسی شاکنگ خبریں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ علی زیب کو بھی یہ جان کر دکھ ہوا۔ پاکستانی میڈیا نے بھی بڑا شور مچایا اور یہ بھی لکھا کہ محمد علی کا کسی بھارتی فلم میں کام کرنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔

اس دکھ بھری داستان کے بارے میں زیبا بیگم کی زبانی ہی ان کے تاثرات سنیے۔ انہوں نے 2018ء کو ایک اخباری انٹرویو کے دوران جو کچھ کہا، ان کی زبانی ہی سنیے۔

''منوج کمار نے محمد علی صاحب اور میری اتنی منتیں کی تھیں کہ ہم اس فلم میں کام کریں۔ فلم کی شوٹنگ اسی اسکرپٹ کے مطابق ہوئی تھی جو ہم نے پہلے پڑھا تھا لیکن ایڈیٹنگ کے دوران ہمارے سارے اہم مناظر فلم سے نکال دیے گئے۔ اس کے بعد فلم کا جو حال ہونا تھا وہ آپ کے سامنے ہے۔''

''آپ لوگوں نے اس پر منوج کمار سے جواب طلب نہیں کیا؟ احتجاج نہیں کیا؟''

''کیسے نہیں کرتے۔ میں نے اور محمد علی صاحب نے اس غیر اخلاقی حرکت پر منوج کمار سے شدید احتجاج کیا اور اس سے تعلقات ختم کر دیے۔''

''اس احتجاج پر منوج کمار کا کیا ری ایکشن تھا؟''

''اُس نے درجنوں بار محمد علی صاحب کو فون کیے اور ان سے اپنی حرکت کی معذرت کی۔''

''محمد علی صاحب نے کیا کہا؟''

''محمد علی صاحب بڑے دل کے آدمی تھے۔ انہوں نے اُسے معاف کر دیا۔ اس کی اس حرکت کو درگزر کر دیا۔''

''اور آپ نے؟''

''وہ بار بار علی صاحب سے اصرار کرتا رہا کہ ایک بار میری بھابی سے بات کروا دیں۔ میں ان سے بھی معذرت کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو آپ نے بھی معاف کر دیا؟''

''نہیں...... میں نے اس سے بات نہیں کی۔ وہ دس سال تک مجھ سے بات کر کے معذرت کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے منوج کمار سے بات نہیں کی۔ محمد علی صاحب بڑے دل گردے کے شخص تھے لیکن میں اتنے بڑے دل کی مالک نہیں ہوں۔ مگر محمد علی صاحب کے کہنے پر بالآخر دس سال کے بعد اس سے بات کی۔''

''آپ نے اس کی معذرت پر کیا کہا......؟''

''میں نے کہا کہ پہلی بار کلرک دیکھتے ہوئے میں نے کہہ دیا تھا کہ منوج نے یہ حرکت کر کے خود کو برباد کر لیا ہے۔

اب یہ فلم ایک ہفتہ نہیں چلے گی اور لوگ یہ بھی بھول جائیں گے کہ کوئی منوج کمار بھی تھا...... اور ایسا ہی ہوا۔"

"کیا واقعی ایسا ہی ہوا؟"

"جی ہاں سائیڈ کے سینما گھروں سے کلرک تین دن بعد ہی اتار لی گئی۔ ممبئی کے مین سینما میں یہ فلم بڑی مشکل سے ایک ہفتہ گزار سکی۔ اس کے بعد منوج کمار کا کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔"

یہ بات قابل غور وفکر ہے کہ جو فلمساز و ہدایت کار ایک معقول سرمایہ لگا کر فلم بنائے اور پھر خود ہی اسے کاٹ چھانٹ کر اس قابل کر دے کہ ایک ہفتہ بھی اس کا چلنا ممکن نہ ہو!! اس سلسلے میں جہاں اور لوگ حیران پریشان ہوئے وہاں زیبا بیگم سے انٹرویو کرنے والے صحافی کے لیے بھی یہ بات حیران کن تھی۔ اس نے زیبا بیگم سے پوچھ ہی لیا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منوج کمار نے خود اپنے پیر میں کلہاڑی کیوں ماری؟"

"ہاں، یہ بات میرے لیے بھی پریشان کن تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ایک دن محمد علی صاحب سے بھی پوچھا تھا۔ "آخر منوج کمار کی مت کیوں ماری گئی تھی کہ اس نے ایک سپر ہٹ فلم کو سپر فلاپ کرا دیا......؟ اس پر محمد علی صاحب نے جواب دیا تھا۔ "میرا خیال ہے یہ سب کچھ اس نے خود نہیں کیا ہے۔ اس نے کسی دباؤ کے تحت کیا ہوگا۔"

"دباؤ سے کیا مطلب ہے آپ کا......؟"

"ارے بھئی! بولی ووڈ کا متعصب طبقہ یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ کسی پاکستانی فلمی جوڑے کی فلم بھارتی تماشائیوں کو متاثر کرے لہٰذا انہوں نے منوج کو دھمکی دی ہوگی کہ دونوں پاکستانی فنکاروں کے تمام اچھے مناظر فلم سے نکال دو ورنہ ہم تمہیں بالی ووڈ سے نکال کر باہر پھینک دیں گے۔"

"ہاں۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔"

زیبا بیگم نے 38 برس تک محمد علی کے ساتھ نہایت کامیاب ازدواجی زندگی بسر کی۔ ان دونوں کی جوڑی ایک مثالی جوڑی تھی۔ محمد علی جب انہیں چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے تو یہ سانحہ ان کے لیے بہت عظیم تھا لیکن انہوں نے بڑی ہمت اور جرأت سے مرحوم کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا۔ علی بھائی کے بارے میں ایک عالم کو معلوم ہے کہ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ دکھی انسانوں کے دکھ دور کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ انہوں نے کئی فلاحی ادارے بھی قائم کر رکھے تھے۔ زیبا بیگم نے ان اداروں کو مرحوم کے بعد ختم نہیں کیا بلکہ انہیں اسی طرح جاری وساری رکھا جیسے وہ علی بھائی کی زندگی میں فعال تھے۔

زیبا بیگم اپنے بے مثال شریک حیات محمد علی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ "میں بہت خوش نصیب ہوں کہ 38 برس میرا اور محمد علی صاحب کا ساتھ رہا۔ ان کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ ان کی شخصیت کھلی کتاب کی طرح عوام کے سامنے ہے۔ وہ ایک رول ماڈل تھے۔ ایک سچے مسلمان اور محب وطن پاکستانی تھے۔ کبھی کسی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کبھی کسی کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انکار کا لفظ تو ان کی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں۔ آج بھی ان کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ ان کی یادیں، ان کی باتیں میرے لیے زندگی گزارنے کا ذریعہ ہیں۔"

زیبا بیگم کی باتیں، سننے اور غور وفکر کرنے کی ہیں۔ ایک وفا شعار بیوی کس طرح اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں بھی ان کی محبت کا دم بھرتی ہے۔ ان کے جذبات کا انداز لگائیے۔ وہ کہتی ہیں۔ "محمد علی صاحب کے جانے کے بعد میرے ہم وطنوں نے مجھے جو عزت واحترام دیا ہے، میں اس کے لیے پورے ملک کے عوام کی بے حد مشکور ہوں۔ آج بھی عید پر، ہماری شادی کی سالگرہ پر، محمد علی صاحب کی سالگرہ پر، مجھے اتنے پیغامات ملتے ہیں کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔"

وہ کہتی ہیں۔ "کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ میں محمد علی صاحب کی قبر پر گئی ہوں تو مجھے وہاں پہلے سے لوگ فاتح پڑھتے اور ان کی قبر پر پھول چڑھاتے نہ ملے ہوں۔ لوگوں کی یہ محبت میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔"

انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ محمد علی نے شادی کے بعد زیبا بیگم کو جو عزت اور محبت دی تھی اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زیبا جب ان کے نکاح میں آئی تھیں ایک بچی کی ماں تھیں۔ علی بھائی نے اس بچی کو نا صرف اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھا بلکہ ایک باپ کی بھرپور محبت او شفقت بھی دی، اور جب وہ بڑی ہوگئی تو بڑی دھوم دھا کے ساتھ اس کی شادی کی۔ زیبا سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی مگر نا صرف یہ کہ انہوں نے اولاد کے لیے دوسر شادی نہیں کی بلکہ زیبا کو کبھی اس کا احساس بھی ہونے نہیں دیا۔

زیبا بیگم نے بھی محمد علی کے بعد... دوبارہ گھر بسا

کی کوشش نہیں کی۔ بس مرحوم کی یادوں کے سہارے وقت گزارتی رہیں۔ زیبا بیگم نے آج سے دو برس پہلے اپنے انٹرویو میں کہا تھا۔ ''جب میں فلمی صنعت کا حصہ تھی، اس وقت بھی بہت کم فلمیں دیکھا کرتی تھی اور فلمی صنعت چھوڑنے کے بعد تو میں نے ایک عرصے تک کوئی فلم نہیں دیکھی۔ مگر آج کل پنجاب فلم سنسر بورڈ کی چیئر پرسن ہونے کے ناتے مجھے فلمیں دیکھنا پڑتی ہیں۔ یہ ایک بڑی ذمّے داری ہے کہ ہم عوام تک کیا پہنچا رہے ہیں۔''

وہ کہتی ہیں۔ ''میں نے ہمیشہ صاف ستھرا کام کیا ہے اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ فلم میں کوئی لغو اور فحش منظر ہو اور لوگ یہ دیکھیں کہ یہ فلم زیبا نے سنسر کی ہے۔ یہ ذمّے داری میرے کاندھوں پر ہے تو میں اس کو احسن طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں تاکہ میرا اور محمد علی صاحب کا نام خراب نہ ہو۔''

☆☆☆

اس موقع پر زیبا بیگم نے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔ ''ایک بار ہمارے سامنے ایک فلم سنسر کے لیے پیش کی گئی۔ جسے دیکھ کر میں نے سنسر سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا۔ پروڈیوسر نے بڑی منت سماجت کی کہ میرا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ بھابی! آپ اس فلم کی نمائش کی اجازت دے دیں، میں نے فلمساز سے کہا آپ ایسا کریں کل اس فلم کا شو رکھتے ہیں۔ آپ اپنے گھر کی تمام خواتین کو لے آنا۔ میں یہ فلم ان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنا چاہوں گی۔ تو پروڈیوسر میرے پیروں میں گر گیا اور کہنے لگا۔ ''آپ کی یہ شرط پوری کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔'' بہرحال میں نے اس فلم کو نمائش کی اجازت نہیں دی... کیونکہ میں اپنی قوم کے فلم بینوں کو کوئی لغو اور فحش فلم دیکھنے کی اجازت اپنے دستخط سے نہیں دینا چاہتی۔''

صحافی کے ایک سوال کے جواب پر زیبا بیگم بولیں۔ ''میں پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہوں کہ صرف تفریح کی غرض سے فلم بنانے والے فلمسازوں نے پاکستانی فلمی صنعت کا جنازہ نکال دیا۔ جب تک سنجیدہ فلمساز کام کرتے رہے ہمارے ملک میں ایسی ایسی فلمیں بنیں جس کی مثال آج چالیس پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی دی جاتی ہے۔''

پنجابی فلم ''مولا جٹ'' پاکستانی فلمی صنعت کی ایک تاریخ ساز فلم ہے۔ اس نے پاکستانی فلموں کو ایک نیا اور کامیاب ٹرینڈ دیا۔ اس فلم نے عوامی مقبولیت میں بھی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ بزنس... اور کامیابی کے لحاظ سے بھی اس نے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ مصنف ناصر ادیب اور فلمساز محمد سرور بھٹی کو بھی اس فلم کی فقید المثال کامیابی سے فلم انڈسٹری میں زبردست شہرت اور استقامت حاصل ہوئی۔ اس فلم ''مولا جٹ'' کے بارے میں زیبا بیگم کہتی ہیں۔

''میں کسی زبان کے خلاف نہیں ہوں لیکن فلم مولا جٹ کے بارے میں کہے بغیر نہیں رہوں گی کہ اس کی کامیابی نے ہماری فلمی صنعت کو برباد کر دیا۔ اتنا تشدد اور خون خرابہ اس فلم میں دکھایا گیا ہے اور پھر اس کے کامیاب ہو جانے کی وجہ سے اسی طرز پر لاتعداد فلمیں بنا دی گئیں۔ اس طرح اچھی معاشرتی فلموں کا باب بند ہو گیا۔'' انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''پنجاب کی ثقافت کو جس طرح مسخ کر کے پیش کیا جا تا رہا ہے۔ ایسا پنجاب مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا۔''

ایک سوال کے جواب میں زیبا بیگم بولیں۔ ''سید نور نے اپنی پنجابی فلموں ''چوڑیاں'' اور ''مجاجن'' میں پنجاب کی ثقافت کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جو مولا جٹ ٹائپ فلموں سے یکسر مختلف ہے۔''

فلموں پر بات کرتے ہوئے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''فحش رقص اور آئٹم سانگ بھی فلم کو کامیاب نہیں کر سکتے بلکہ اس سے فیملیز فلموں سے دور ہو جاتی ہیں۔ اگر فلموں کو کامیاب کرانا مقصود ہو تو اسکرپٹ پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمارے زمانے میں فلم کی کہانی پر توجہ دی جاتی تھی لیکن اب ساری توجہ فلم میں گلیمر اور واڈروب پر دی جانے لگی ہے لیکن کیا کیجیے گا کہ ہر دور کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔''

زیبا بیگم کا کہنا ہے۔ ''ہمارے زمانے میں کبھی نمبر ون کی دوڑ نہیں تھی۔ نہ ہی فنکارائیں ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی کرتی تھیں اور دلوں میں کسی کے خلاف کدورت رکھتی تھیں۔ سب اپنا اپنا کام اچھا کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور ایک دوسرے کے کام کو سراہتی تھیں۔ سب کی دوستیاں تھیں جبکہ آج ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی سے فرصت ملے تو اپنے کام پر توجہ دیں۔''

صحافی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ ''میرے تعلقات تمام ساتھی فنکاروں سے اچھے تھے۔ خاص کر رانی اور شبنم کے ساتھ میری بہت اچھی دوستی تھی۔ اکثر ہم ایک دوسرے کے گھر جایا آیا کرتے تھے اور فرصت کے لمحات ایک ساتھ گزارتے تھے۔''

زیبا بھابی نے صحافی کے سوال پر بتایا۔ ''میں اکثر فلموں میں ذاتی ملبوسات پہنا کرتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ میں نے پروڈکشن کے ملبوسات پہنے ہوں۔''

''ہاں، یہ سچ ہے کہ میں نے ایک طویل عرصے تک صرف دودھ اور پھلوں پر گزارا کیا تاکہ خود کو فٹ رکھ سکوں۔'' یہ بات صحافی کے سوال پر انہوں نے بتائی۔ کھانوں کے بارے میں وہ کہتی ہیں۔ ''میں کھانے پینے کے معاملے میں بے انتہا سادہ ہوں۔ گوشت کا استعمال انتہائی کم کرتی ہوں۔ مچھلی بالکل نہیں کھاسکتی کیونکہ مچھلی سے مجھے الرجی ہے۔ میں زیادہ تر سبزیاں کھانا پسند کرتی ہوں۔ دودھ کے ساتھ پراٹھا میرا پسندیدہ کھانا ہے۔''

دوستو! یہ ہیں آپ کی اور ہم سب کی ہردلعزیز فنکارہ بھابی زیبا علی۔ ان کے ماضی اور حال کی کتاب زندگی کے اوراق کا آپ نے مطالعہ کیا۔ میں ان کے بارے میں یہی عرض کروں گا کہ یہ وہی زیبا ہیں جنہوں نے کراچی کی فلم انڈسٹری سے اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا تھا اور جو اپنی لازوال فنکارانہ صلاحیتوں سے پاکستانی فلمی صنعت کے لیے قابل افتخار شخصیت کی مالک بنیں۔

☆☆☆

اللہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ آج کراچی چاہے جس حال میں ہو، کل اس کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ مولا کریم نے اسے قابلِ رشک شہرت اور ممتاز مقام عطا کیا تھا۔ شوبز کے حوالے سے بھی اس کا ایک مقام تھا۔ فلمی صنعت اور تجارت کو استحکام حاصل تھا اور اس سے وابستہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے اسے عزت اور عظمت کے قابل بنایا تھا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک جگدیش چند آنند بھی تھے۔ یہ بنیادی طور پر فلم تقسیم کار تھے مگر انہوں نے تقسیم کاری سے جو کمایا اسے اسی انڈسٹری پر خرچ بھی کیا۔ یعنی فلمیں بھی پروڈیوس کیں اور مختلف فلمسازوں کو فنانس بھی کیا۔ یہ پاکستانی فلم انڈسٹری اور ٹریڈ کا ابتدائی دور تھا اور ابھرتی ہوئی فلمی صنعت کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور جے سی آنند صاحب نے دل کھول کر فلمی صنعت کی مالی معاونت کی۔

اس سے پہلے کہ میں ان کی فلمی خدمات کا ذکر خیر کروں۔ ان کی غیر معمولی صفات کا ذکر کروں گا۔ جے سی آنند صاحب تقسیم ہند سے پہلے متحدہ ہندوستان کے زمانے سے کراچی کے باسی تھے اور یہاں فلم تقسیم کاری کا کام کرتے تھے۔ لاہور، کلکتہ اور بمبئی کی فلمیں لاکر کراچی اور سندھ سرکٹ میں ریلیز کرتے تھے۔ اس طرح ان کی بمبئی کی فلم انڈسٹری سے بہت اچھے مراسم تھے۔ وہاں کے کئی فلمی لوگ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، کیونکہ وہ کاروباری معاملات میں بڑے کھرے، وعدے کے پابند اور اپنے وضع کردہ اصولوں پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ 1947ء میں جب بٹوارہ ہوا اور کراچی پاکستان کے حصے میں آیا تو کراچی میں کاروبار کرنے والے متعدد ہندو کاروباری لوگ نقل مکانی کرکے بھارت چلے گئے۔ ان میں فلموں میں کام کرنے والے اداکار اور مختلف شعبوں سے وابستہ ہنرمند اور کراچی کے بہت سے سینما مالکان اور کئی ڈسٹری بیوٹرز شامل تھے۔ مگر جے سی آنند صاحب نے جانے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔ کراچی ہی میں رہے اور اپنی فلم تقسیم کاری کا دھندا جاری رکھا۔ ان کے تقسیم کار ادارے کا نام ایور ریڈی پکچرز تھا جس کا دفتر لائٹ ہاؤس سینما کے قریب تھا۔ جو آج بھی ماشاءاللہ اسی جگہ قائم و دائم ہے اور اس ادارے کو ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند ستیش چند آنند بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

جگدیش چند آنند جو جے سی آنند کے نام سے مشہور تھے، ایک مثالی اور اچھے کاروباری شخص تو تھے ہی، مگر اس سے کہیں زیادہ اچھے انسان تھے۔ ان کی کچھ باتیں تو حیران کن تھیں۔ وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کے دفتر میں سارے لوگ مسلمان تھے۔ ان کے منیجر منظور احمد صاحب پانچوں نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ انہیں اور دیگر مسلمان ملازمین کو مکمل آزادی تھی کہ وہ دفتر کے قریب واقع مسجد میں جاکر نماز پڑھیں یا دفتر کے کسی حصے میں نماز ادا کرلیں۔ دفتر کھلنے کے بعد ایک قاری صاحب آتے تھے اور دفتر میں رکھے ہوئے قرآن شریف لے کر تھوڑی دیر تک تلاوت کرتے تھے اور پھر قرآن پاک کو اسی احترام کے ساتھ اس کی محترم جگہ پر رکھ دیتے تھے۔ یہ سلسلہ ابتدا ہی سے جاری تھا۔ جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔

ان کے دفتر کے اندر کی یہ باتیں، بہت بعد میں مجھے جناب منیر حسین کی زبانی معلوم ہوئیں۔ جب میں ان کے جریدوں ''فلم ایشیاء'' اور ''اخبار وطن'' کے لیے کام کرتا تھا۔ منیر حسین صاحب کا دفتر بھی لائٹ ہاؤس سینما کے قریب سائیکلوں کی مارکیٹ میں تھا۔ منیر حسین صاحب کا ایک پبلسٹی ادارہ بھی تھا جس کے تحت وہ ریلیز ہونے والی فلموں کے

اشتہارات اخباروں میں شائع کرواتے تھے۔ یہ ان کا بہت پرانا دھندا تھا۔ ایور ریڈی پکچرز سے ریلیز ہونے والی ساری فلموں کی پبلسٹی وہی کیا کرتے تھے اس لیے جے سی آنند صاحب کو وہ بہت قریب سے جانتے تھے۔ منیر حسین صاحب ان کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اکثر کہا کرتے تھے۔ ''جے سی آنند صاحب ہمارے دیر سے سو کر اٹھنے اور صبح سویرے نماز فجر ادا نہ کرنے پر سرزنش کیا کرتے تھے اور کہتے تھے ''کیسے مسلمان ہو تو لوگ صبح سویرے اٹھ کر نہ اللہ کی عبادت کرتے ہو نہ صبح کے سہانے وقت کا لطف اٹھاتے ہو۔''

ان کی ایسی ہی اور بھی کئی غیر معمولی باتوں کا علم مجھے منیر حسین صاحب مرحوم مغفور کی زبانی ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد لٹی پٹی فلمی صنعت کی بحالی کے لیے جب جدوجہد شروع کی گئی تو اس وقت کسی بڑے اور مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ جو اپنی اعلیٰ کارکردگی سے فلم انڈسٹری کو مزید استحکام بخشے۔ ایسے کڑے وقت میں ایور ریڈی پکچرز نے میدان عمل میں آکر بھرپور طور پر فلمی صنعت کی خدمت کی۔ جس سے پاکستانی فلم انڈسٹری کو مستحکم ہونے کے لیے خاصہ سہارا ملا۔ ایور ریڈی پکچرز ایک بہت بڑا ادارہ تھا جس کی خدمات ناقابل فراموش اور مثالی ہیں۔

اس ادارے نے کئی فلمیں بنائیں اور فلمی صنعت کو کامیابی کی راہ پر گامزن کیا۔ ایور ریڈی پکچرز کے بانی اور مالک جے سی آنند جو بنیادی طور پر ایک فلم ڈسٹری بیوٹر تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں اپنے بنیادی کام سے آگے بڑھ کر فلمسازی کے میدان میں بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ وہ اپنے عزم و ارادے کے بڑے پکے انسان تھے۔ لہٰذا انہوں نے 1954ء میں اپنے ادارے کے بینر تلے اپنی پہلی فلم ''سسی'' پیش کی۔ یہ کلاسیکی رومانوی داستان سسی پنوں کی کہانی پر مبنی فلم تھی۔ اس کے فلمساز جے سی آنند، ہدایت کار داؤد چاند، کہانی نویس اور نغمہ نگار عزیز میرٹھی، موسیقار جی اے چشتی، مکالمہ نگار شاطر غزنوی اور عکاس ریاض بخاری تھے۔ یہ ایک کاسٹیوم فلم تھی۔ سدھیر اور صبیحہ خانم نے پنوں اور سسی کے رومانوی کردار کیے تھے۔ آشا پوسلے، سلیم رضا اور نذر نے دیگر اہم کردار کیے تھے۔ نیک نیتی سے بنائی گئی اس فلم نے اللہ کے فضل و کرم سے توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی۔ اس فلم کا ایک نغمہ بے حد مقبول ہوا۔

نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے
مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے

پکھراج پپو اور کوثر پروین نے الگ الگ اسے گایا تھا۔ اس فلم کو پاکستان کی پہلی گولڈن جوبلی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس فلم کی کامیابی سے اس کے فلمساز جے سی آنند کو بھی خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا اور انہوں نے مزید فلمیں بنانے کا ارادہ کیا۔

''سسی'' کی کامیابی کے بعد جے سی آنند نے دو فلمیں بیک وقت شروع کیں۔ یہ دونوں فلمیں بھی روایتی رومانی داستانوں پر مبنی تھیں۔ ان میں ایک ''سوہنی'' تھی اور دوسری ''ہیر''۔ ''سوہنی'' سوہنی مہینوال اور ''ہیر'' ہیر رانجھا کی رومانی داستان پر بنائی گئی تھی۔ ''سوہنی'' کے فلمساز کے طور پر ایم اے خان کا نام دیا گیا تھا جبکہ اس کے ڈائریکٹر ایم جے رانا تھے۔ یہ اردو زبان میں بنائی گئی تھی۔ اس کے موسیقار فیروز نظامی تھے۔ کہانی نویس منشی دل، مکالمہ نگار شاطر غزنوی، نغمہ نگار بھی شاطر غزنوی تھے۔ عکاس ریاض بخاری تھے۔ کاسٹ میں سدھیر، صبیحہ، شمی، ببو، نذر، سلطان کھوسٹ، ہمالیہ والا اور زینت شامل تھے۔

''ہیر'' پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی۔ جے سی آنند نے یہ فلم نذیر کے فلمساز ادارہ انیس پکچرز کے بینر تلے بنائی تھی۔ اس کے فلمساز جے سی آنند تھے۔ یہ فلم کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو میں بنائی گئی تھی۔ اسے نذیر نے ڈائریکٹ کیا تھا اس کے موسیقار صفدر حسین تھے۔ اس کی کاسٹ میں عنایت حسین بھٹی، سورن لتا، نذر، ریکھا، زینت، اور اجمل شامل تھے۔ اس فلم کے بیشتر نغمات مقبول ہوئے تھے۔

جے سی آنند صاحب کی سرمایہ کاری سے بننے والی یہ دونوں فلمیں بھی باکس آفس پر کامیاب ہوئی تھیں اور ان کی کامیابی سے ابھرتی ہوئی فلمی صنعت کو بھی تقویت حاصل ہوئی تھی۔ ایور ریڈی پکچرز کی بڑھتی ہوئی کارکردگی کے پیش نظر جے سی آنند نے کراچی کے علاوہ لاہور میں بھی اس کا دفتر قائم کر دیا اور اس دفتر کی ساری ذمے داری نسیم الثقلین کو سونپ دی جو ان کی تقسیم کاری اور فلمسازی کے مختلف شعبوں میں فعال کردار ادا کرتے تھے۔

1956ء میں بھی ایور ریڈی پکچرز کے بینر سے دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان کے فلمساز جے سی آنند تھے۔ ایک فلم ''حاتم'' تھی دوسری ''مس 56'' تھی۔

اپنی سخاوت کے حوالے سے عالمگیر شہرت کے مالک حاتم طائی کی کلاسیکی کہانی پر مبنی ''حاتم'' ایک کاسٹیوم فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار داؤد چاند، موسیقار صفدر حسین، مصنف

شاطر غزنوی اور عکاس ریاض بخاری تھے۔ صبیحہ خانم، سدھیر، آشا پوسلے، الیاس کاشمیری، سلیم رضا، اجمل، دلجیت مرزا اور نذر کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کو پاکستان کی پہلی طلسماتی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ایور ریڈی پکچرز کے ادارے سے بننے والی یہ چوتھی فلم تھی۔ جو کلاسیکی کہانیوں پر بنائی گئی تھیں اور چاروں کامیاب ہوئی تھیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے فلم بینوں میں ایسی فلمیں دیکھنے کی خواہش تھی جو روایتی اور کلاسیکی کہانیوں پر بنائی جاتی تھیں۔ عوام کی اس پسندیدگی کے نتیجے میں آگے چل کر بھی ایسی ہی فلمیں بنائی گئیں۔

''حاتم'' کے دو نغمات بہت مقبول ہوئے۔

☆ سنو عرض میری سرکار مدینے والے
(آواز۔ زبیدہ خانم)

☆ آج کی رات بڑی سہانی
موسم پیارا پیارا ہے
(آوازیں۔ زبیدہ خانم اور ساتھی)

اس سال کی دوسری فلم ''مس 56'' ایک تفریحی مووی تھی۔ اس کے ڈائریکٹر روپ کے شوری تھے۔ موسیقی جی اے چشتی نے کمپوز کی تھی۔ اداکارہ زیبا کی یہ پہلی فلم تھی۔ انہوں نے اس فلم میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ان پر ایک نغمہ بھی پکچرائز ہوا تھا۔ جس کے بول تھے۔

او ننھے راہی، معصوم سپاہی
دنیا کا میلہ، مت دیکھ اکیلا

کاسٹ کے دیگر آرٹسٹ تھے سنتوش کمار، مینا شوری، شمیم آرا، اسلم پرویز، چارلی، ظریف، ریحانہ اور شاہنواز۔ اس فلم میں بھارت کی مقبول سنگر گیتادت نے بھی نغمہ سرائی کی تھی۔ یہ فلم بھی اب تک کی فلموں سے ذرا ہٹ کر ہونے کے باوجود کامیاب ہوئی تھی۔ یہ فلم بھی کراچی میں بنائی گئی تھی۔

آج کی نوجوان نسل کو یہ بات بتانا ضروری ہے کہ روپ کے شوری اپنی اداکارہ بیگم مینا شوری کے ساتھ بھارت سے آئے تھے۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران دونوں میاں بیوی میں کچھ ایسی ناچاقی ہوئی کہ روپ کے شوری نے بیوی کو طلاق دے دی اور بھارت واپس چلے گئے جبکہ مینا شوری یہیں پاکستان میں رہ گئیں اور پاکستانی فلموں میں کام کرتی رہیں۔

ایور ریڈی پکچرز کی عمدہ فلم میکنگ اور جے سی آنند جیسی شخصیت کی بھرپور سرپرستی کی وجہ سے پاکستانی فلمی صنعت کو اس کے ابتدائی دور میں بہت مضبوط سہارا ملا اور اس نے خاطر خواہ ترقی کی۔ کامیابیوں کا یہ سفر بڑھتے بڑھتے تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ پھر پاکستانی فلم انڈسٹری نے اپنا تاریخی بلند ترین مقام پالیا جو یادگار اور سنہری دور ثابت ہوا۔

اگلے سال یعنی 1957ء میں ایور ریڈی پکچرز کی تین فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ یہ عشق لیلیٰ، نوراں (پنجابی) اور نور اسلام تھیں۔ ''عشق لیلیٰ'' کلاسک رومانوی کہانی لیلیٰ مجنوں پر مبنی کامیاب ترین فلم تھی جو سدا بہار گیتوں سے آراستہ تھی۔ اس کے فلمساز جے سی آنند، ہدایت کار منشی دل اور موسیقار صفدر حسین تھے۔ سنتوش کمار، صبیحہ خانم، آشا پوسلے، علاؤ الدین اور اجمل نمایاں ستارے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم میں 14 گیت تھے جو تقریباً سب ہی مقبول ہوئے تھے۔

☆ لیلیٰ لیلیٰ، افسر خوبانِ لیلیٰ، (آواز۔ زبیدہ خانم)۔ ☆ چاند تکے چھپ چھپ کے اونچے کھجور سے (آوازیں۔ زبیدہ خانم، سلیم رضا)۔ ☆ پریشان رات ساری ہے ستارو تم تو سوجاؤ، (آواز۔ اقبال بانو) ☆ نکل کر تیری محفل سے یہ دیوانے کدھر جائیں (آواز۔ عنایت حسین بھٹی)۔ ☆ بتا اے آسماں والے میرے نالوں پہ کیا گزری (آواز۔ زبیدہ خانم)۔ ☆ کسے معلوم نہیں چاند سی اس کی جبیں (آواز۔ زبیدہ خانم)۔ ☆ اداس ہے دل نظر پریشاں، قرار بنکر چلے بھی آؤ (آواز۔ سلیم رضا)۔ ☆ اک یہ ہلکی ہلکی آہٹ ہے، اک ہلکا ہلکا سایہ ہے (آواز۔ اقبال بانو)۔ ☆ سخی کچھ دے دے راہِ خدا، لیا دیا تیرے کام آئے گا (آوازیں۔ عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم)۔ ☆ بادِ صبا اے بادِ صبا، میرا درد بھرا پیغام لے جا (آواز۔ زبیدہ خانم)۔ ☆ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے، محبت کا جنازہ جا رہا ہے (آواز۔ عنایت حسین بھٹی)۔ ☆ کون کہتا ہے تیرا یہ جہاں قائل نہیں (آوازیں۔ عنایت حسین بھٹی، سائیں اختر)۔ کس کو سناؤں غم کی کہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی (آواز۔ زبیدہ خانم)۔

• یہ بھی اس فلم کا کریڈٹ ہے کہ اس قدر زیادہ گیتوں نے اس فلم کی پسندیدگی میں اضافہ کیا ورنہ عام طور پر پانچ یا سات نغمات سے زیادہ والی فلمیں ہٹ جاتی ہیں۔ ''عشق لیلیٰ'' کے ان گیتوں میں چند ایک تو آج بھی شوق سے سنے جاتے ہیں۔

پنجابی فلم ''نوراں'' کے فلمساز بھی جے سی آنند تھے۔ ڈائریکشن ایم اے خان کی تھی۔ موسیقار صفدر حسین تھے۔ اس کی کاسٹ میں سدھیر، نور جہاں، اجمل اور زینت شامل تھے۔ اس فلم نے بھی کامیابی حاصل کی تھی۔

اس سال کی تیسری فلم ''نور اسلام'' تھی جو تاتاریت کے خلاف بنائی گئی ایک خوبصورت کاسٹیوم فلم تھی۔ جے سی آنند نے یہ فلم لبرٹی فلمز کے بینر تلے بنائی تھی۔ یہ بھی کراچی میں بنائی گئی تھی۔ اس کے ڈائریکٹر نذیر، مصنف عشق لکھنوی، موسیقار حسن لطیف تھے۔ اس کی کاسٹ میں درپن، سورن لتا، نذیر، نعیم ہاشمی، نذر، مجید اور آشا پوسلے شامل تھے۔ اس فلم میں ایک بہت خوبصورت نعت بھی شامل تھی جس کے بول فیاض ہاشمی نے تحریر کیے تھے۔

شاہِ مدینہ یثرب کے والی
سارے نبی تیرے درد کے سوالی
(آوازیں۔ سلیم رضا اور ساتھی)

فلمساز جے سی آنند کی اگلی فلم ''حسرت'' تھی جو 1958ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ یہ فلم ایور ریڈی پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی جس کے مصنف اور ہدایت کار شی دل تھے۔ موسیقی صفدر حسین نے کمپوز کی تھی۔ سنتوش کمار، صبیحہ خانم، یوسف خان، علاؤ الدین، بابا دیوی، غلام محمد، زینت، الیاس کاشمیری پر مشتمل کاسٹ تھی۔ یہ فلم اپنی عمدہ کہانی اور معیاری ہدایت کاری کی وجہ سے بہت پسند کی گئی تھی۔ فلمی پنڈتوں کا کہنا ہے اس فلم کا چربہ بھارت اور پاکستان دونوں ممالک میں ہوا۔ بھارت میں اس فلم کا چربہ، دل ایک مندر، کے نام سے بنایا گیا تھا۔ جس میں سنتوش کمار، صبیحہ خانم اور یوسف خان کے کردار بالترتیب راجندر کمار، مینا کماری اور راج کمار نے پلے کیے تھے، جبکہ شباب کیرانوی نے پاکستان میں اسی فلم کا چربہ ''انسانیت'' کے نام سے بنایا تھا جو 1967ء میں ریلیز ہوئی تھی جس میں مرکزی تین کردار وحید مراد، زیبا اور طارق عزیز نے ادا کیے تھے۔ فلم ''حسرت'' کا یہ نغمہ مقبول ہوا تھا۔

باغوں میں بہار آئی
مہکی ہوئی رت میں
دل لیتا ہے انگڑائی
(آوازیں۔ زبیدہ خانم، سلیم رضا)

فلمساز جے سی آنند نے اگلے برس 1959ء میں فلم ''عالم آرا'' بنائی۔ اسے انہوں نے چاند فلمز کے بینر سے بنائی تھی۔ اس کے مصنف اور نغمہ نگار شباب کیرانوی تھے۔ ڈائریکٹر داؤد چاند، موسیقار رحمان ورما تھے اور اس کے ستارے شمیم آرا، اکمل، الیاس کاشمیری، غلام محمد اور جی این بٹ تھے۔

دو سال بعد 1963ء میں ایور ریڈی پکچرز کے بینر تلے فلم ''دلہن'' بنائی گئی تھی۔ جس کے فلمساز جے سی آنندن، ہدایت کار ایس ایم یوسف تھے۔ فلمساز کی حیثیت سے جے سی آنند نے آخری بار اس فلم میں اپنا نام دیا تھا۔ یہ فلم ''ناؤ'' نامی ایک ناول کی کہانی سے ماخوذ تھی۔ اس کہانی پر بھارت میں بھی ''گھونگھٹ'' کے نام سے ایک فلم بنائی گئی تھی۔ جس میں اشوک کمار نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا ''دلہن'' کے ستاروں میں نیر سلطانہ، حبیب، درپن، شمیم آرا، نیلیہ اور لہری شامل تھے۔ رشید عطرے نے ''دلہن'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ انہوں نے بھارتی شاعر نخشب جارچوی سے بھی ایک گیت لکھوا کر ''دلہن'' میں شامل کیا تھا۔ اس فلم کا یہ نغمہ

زندگی نامہ

نام: جگدیش چند آنند

گھرانا: متوسط ہندو گھرانے میں 1922ء میں پیدا ہوئے۔

کاروباری سرگرمیاں: نوجوانی کی عمر سے ہی فلم تقسیم کاری کا کام شروع کر دیا اور اپنی دیانتداری، محنت لگن، اصول پسندی کی وجہ سے اس فیلڈ میں بہت ترقی کی۔

پاکستان بننے کے بعد: انہوں نے نقل مکانی نہیں کی۔ فلمسازی شروع کردی اور کامیاب فلمیں بنا کر پاکستانی فلمی صنعت کو استحکام بخشا، نا صرف خود متعدد فلمیں پروڈیوس کیں بلکہ بہت سے فلمسازوں کو سرمایہ بھی فراہم کیا۔ ساتھ ہی اپنی تقسیم کاری بھی جاری رکھی۔

انتقال: 55 سال کی عمر میں ہارٹ اٹیک سے ہوا۔

ان کے بعد: ان کے بیٹے ستیش چند آنند نے ان کا کاروبار سنبھال لیا۔ ستیش 1951ء میں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ باپ کے کاروبار کو نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے جاری رکھا۔

☆☆☆

بہت مقبول ہوا تھا۔

سزا کے قابل ہیں اس لیے ہم کہ اپنی کوئی خطا نہیں ہے
کچھ اس طرح جی رہے ہیں اب ہم کہ جیسے اپنا خدا نہیں ہے
(آواز۔نور جہاں)

1964ء میں جی سی آنند نے بننے والی فلم ''عشرت'' کو فنانس کیا تھا یعنی اس کے لیے سرمایہ کاری کی تھی۔ یہ فلم ایم ڈی پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے فلمساز ہدایت کار اور مصنف منشی دل تھے۔ موسیقی صفدر حسین کی تھی۔ صبیحہ خانم، سنتوس کمار، علاؤالدین، زمرد، نذر، اجمل اور الیاس کاشمیری کاسٹ میں شامل تھے۔ واضح رہے کہ منشی دل جے سی آنند کے پرانے ساتھی تھے۔ انہوں نے مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے جی سی آنند کی بہت خدمت کی تھی۔ لہٰذا جب منشی دل صاحب نے اپنی ذاتی فلم بنانے کا ارادہ کیا تو جے سی آنند صاحب نے مالی طور پر ان کی معاونت کی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے ابتدائی دور کے ساتھی ہدایت کار داؤد چاند کو بھی ان کی ذاتی فلم ''مراد'' میں سرمایہ فراہم کر کے اپنی دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ کمال اور یاسمین نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

کئی سال کے وقفے کے بعد 1967ء میں ایور ریڈی پکچرز کے بینر تلے ایک کاسٹیوم طلسماتی اور نغمہ بار فلم ''حاتم طائی'' بنائی گئی۔ اس کے فلمساز کے طور پر لاہور آفس کے نگران اعلیٰ نسیم الثقلین کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے ہدایت کار اکبر علی تھے۔ پاکستان میں ان کی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ نثار بزمی اس کے موسیقار تھے۔ محمد علی سلونی، رخسانہ، یوسف خان، سلطان راہی، رنگیلا، طالش، زمرد، ادیب، ننھا، اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔

یاد رہے کہ ایور ریڈی پکچرز کے بینر تلے 1956ء میں بھی ''حاتم'' کے نام سے ایک فلم بنائی گئی تھی... جو حاتم طائی کی کہانی پر مبنی تھی۔ اس کے ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ اسی سال 1967ء ہی میں ایور ریڈی پکچرز کی ایک اور فلم ''شعلہ و شبنم'' بھی نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے ہدایت کار خالد خورشید تھے جن کی یہ پہلی فلم تھی۔ منظور اشرف نے اس فلم کی موسیقی کمپوز کی تھی۔ کاسٹ میں شمیم آرا، سدھیر، درپن، رخسانہ، طالش، سلطان راہی، الیاس کاشمیری، زمرد اور تانی شامل تھے۔ اس فلم کا ایک گانا بے حد مقبول ہوا تھا جسے مسعود رانا نے گایا تھا۔

عجیب ہے یہ زندگی کبھی ہے غم کبھی خوشی
وہاں ہیں تباہیاں، جہاں تھیں رونقیں کبھی

ایور ریڈی پکچرز کے جھنڈے تلے 1968ء میں ایک پنجابی فلم ''لال بجھکڑ'' پیش کی گئی۔ اس کے مصنف اور ہدایت کار منشی دل اور موسیقار صفدر حسین تھے۔ شیریں، اکمل، رنگیلا، منور ظریف اور زلفی اس فلم کے نمایاں ستارے تھے۔

اسی سال 1968ء میں ایور ریڈی پکچرز کی ایک کامیاب ترین فلم ''تاج محل'' نمائش پذیر ہوئی جو کثیر سرمائے سے بنائی گئی کلاسک کہانی پر مبنی کاسٹیوم رومانی فلم تھی۔ اس کے لیے محل اور قلعے کے انتہائی خوبصورت اور بڑے بڑے سیٹ اسٹوڈیو میں لگائے گئے تھے۔ اس فلم کی خوبصورت اور قابل دید عکاسی مسعودالرحمٰن نے کی تھی جس کی آج تک مثال دی جاتی ہے۔ ''تاج محل'' کے ہدایت کار ایس ٹی زیدی تھے۔ یہ وہی ایس ٹی زیدی تھے جو بھارتی فلم ''مغل اعظم'' میں ڈائریکٹر کے آصف کے نائب ہدایت کار تھے۔ اس فلم کی مسحور کن موسیقی نثار بزمی نے کمپوز کی تھی۔ محمد علی، زیبا، حبیب، یوسف خان، راگنی، صابرہ سلطانہ، عالیہ، ریحان اور طالش جیسے ستارے اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کے کچھ گیت مقبول ہوئے تھے۔

☆ محبت جرم ہے تو جرم کا اقرار کرتے ہیں
(آوازیں۔مالا، رونا لیلیٰ)

☆ حسن کو عشق کا سلام
ہو گیا آج فیض عام
(آوازیں۔نور جہاں اور ساتھی)

☆ اے دل تیری آہوں میں اثر ہے کہ نہیں ہے
(آواز۔مہدی حسن)

☆ مٹ گئے سارے غم
مل گئے جب حضور ٹوٹ کر
تو کیا فاصلے کا عزور
(آوازیں۔مسعود رانا، مالا)

ایور ریڈی پکچرز کی دو فلمیں 1969ء میں نمائش پذیر ہوئیں۔ ایک تھی پنجابی فلم ''یملا جٹ'' دوسری تھی ''نازنین'' دونوں کے ہدایت کار خالد خورشید تھے۔ دونوں کے موسیقار ایم اشرف تھے۔ ''یملا جٹ'' کی کاسٹ میں علاؤالدین،

حسنہ، عالیہ، رنگیلا نمایاں تھے۔ جبکہ نغمہ بار رومانوی اردو فلم ''نازنین'' کے ستارے ندیم، شبنم، مصطفیٰ قریشی، رنگیلا اور قوی خان تھے۔ اس فلم کے یہ نغمے مقبول ہوئے تھے۔

☆مستی میں جھومے فضا
گیت سنائے ہوا
اپنی ہی دھن میں البیلا راہی
(آواز۔احمد رشدی)

☆میرا خیال ہو تم میری آرزو تم ہو
میری نگاہِ تمنا کی جستجو تم ہو
(آواز۔مسعود رانا)

☆نہ جھٹکو ہاتھ کو کچھ بات
کہ ہم کو نیند آئی
میری جان آؤ بیٹھو پاس
(آوازیں۔مسعود رانا، رونا لیلیٰ)

ایور ریڈی پکچرز کے بینر پر پنجابی فلم ''بھولے شاہ'' 1970ء میں ریلیز ہوئی۔ جبکہ 1971ء میں دوسری پنجابی فلم ''دو پتر اناراں دے'' نمائش پذیر ہوئی۔ دونوں فلموں کو ہدایت کار حیدر چوہدری نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ بھولے شاہ کے موسیقار جی اے چشتی تھے اور اس کے ستارے نغمہ یوسف خان، حبیب، رضیہ، ننھا، سلطان راہی تھے۔ ''دو پتر اناراں دے'' کے موسیقار ایم اشرف تھے اور کاسٹ میں حبیب، یوسف خان، روزینہ، عالیہ اور اعجاز شامل تھے۔

دوستو! آپ نے دیکھا کہ کراچی کے سپوت جگدیش چند آنند نے کس عزم و ہمت کے ساتھ 1954ء سے اپنا جو سفر پاکستانی فلمی صنعت و تجارت کی ترویج و ترقی کے لیے شروع کیا تھا تین دہائیوں تک کامیابی کے ساتھ فلمیں پروڈیوس کرکے اور فلموں کے لیے سرمایہ کاری کرکے اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ فلم تقسیم کاری کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس پر جب فلمسازی کی ذمے داری بھی انہوں نے اپنے ذمہ لیا تو یہ تقسیم کاری سے بھی زیادہ مشکل کام تھا.. مگر بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود جواں مردی کے ساتھ وہ فلم انڈسٹری کی خدمت کرتے رہے لیکن ایک دن اچانک ان پر ہارٹ اٹیک ہوا اور ان کا دیہانت ہوگیا اور وہ سورگ باشی ہوگئے۔ پاکستانی فلمی صنعت و تجارت پر یہ سانحہ 1977ء کو پیش آیا۔

ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند ستیش چند آنند نے ایور ریڈی پکچرز کے سارے کاروبار اور سلسلوں کو نہایت خوبی اور دانش مندی سے جاری رکھا۔

ستیش چند آنند لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے تھے۔ والد کے انتقال پر ملال کی افسوسناک خبر ملی تو واپس آگئے اور پتاجی کی کرسی سنبھال لی۔ کاروباری لوگ جن کے آنجہانی جے سی آنند سے لین دین تھے۔ ان میں سے کئی ایک اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ آنجہانی کو جو کچھ دینا دلانا تھا اس سے جان بچ گئی۔ ان کے بیٹے کو کیا معلوم کہ ہم ان کے باپ کے مقروض ہیں۔ مگر جب ان کا سامنا ستیش چند آنند سے ہوا تو اس نے خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد کہا۔ ''انکل فلاں سلسلے کی ادائیگی آپ کب کررہے ہیں؟ یہ رقم آپ کو پتاجی کی زندگی میں ادا کرنی تھی مگر آپ نے نہیں کی۔''

اگلے نے حیران و پریشان ہوکر جواں سال ستیش چند آنند کو دیکھا۔ ستیش نے دن تاریخ اور دیگر معلومات فر فر بیان کردی۔ اس طرح باپ کی زندگی کے سارے کاروباری بقایاجات ستیش چند آنند نے حاصل کرلیے۔

مگر یہ چمتکار کیسے ہوا؟ یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس دور اندیش، جگدیش چند آنند کی دور اندیشی کا۔ آنجہانی اپنی زندگی میں ہر روز رات دفتر سے گھر جانے کے بعد، دن بھر کی ساری کاروباری روداد لکھ کر ایک خط کی صورت میں اگلے دن بیٹے کو پوسٹ کردیتے تھے۔ یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ عقلمند باپ کے دانشمند بیٹے نے باپ کے ان خطوط کو سنبھال کر رکھا۔ یہ سوچ کر کہ میرے پتاجی اپنی ساری کاروباری مصروفیت سے مجھے اس لیے آگاہ رکھتے ہیں کہ کبھی یہ میرے کام آئیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ستیش چند آنند نے ایور ریڈی پکچرز کے حوالے سے سارے بقایاجات وصول کرلیے۔

ستیش چند آنند کو چند ایک سال فلم ڈسٹری بیوشن اور فلمسازی کے کام کو سمجھنے میں لگے.. مگر وہ برطانیہ جانے سے پہلے تک اپنے پتاجی کو کام کرتے دیکھ چکے تھے اس لیے ان کو ان کاموں کی سمجھ بوجھ تو تھی۔ بہر حال 1980ء میں انہوں نے پروڈکشن کی طرف توجہ دی اور اس کے لیے واہ واہ پروڈکشن کے نام سے ایک فلمساز ادارے کی بنیاد رکھی اور اس کے بینر تلے ایک فلم ''رشتہ'' کا آغاز کردیا۔ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ اس رنگین فلم کے فلمساز کے طور پر انہوں نے اپنے قریبی عزیز جی آر بگستانی کا نام دیا۔ ان کے شریک

فلمساز پرویز ملک تھے۔ انہوں نے ہی یہ فلم ڈائریکٹ کی تھی۔ اس کی موسیقی نثار بزمی نے کمپوز کی تھی۔ ندیم، شبنم، محبوب عالم، فردوس جمال، ساقی اور صبیحہ خانم کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کا ایک گیت بہت پسند کیا گیا تھا۔

جب بندہ کام بگاڑے
سونہا رب ہی سنوارے
جند میریئے
(آواز۔ ناہید اختر)

دوستو! ایک بات آپ نے ضرور سوچی ہوگی کہ جب ستیش چند آنند ایورریڈی پکچرز کے مالک و مختار تھے تو انہیں اپنی فلم کے لیے نیا فلمساز ادارہ قائم کرنے کی ضرورت کیوں ہوئی؟ یہی نہیں، انہوں نے فلمساز کے طور پر بھی اپنا نام نہیں دیا۔ اپنے کسی قریبی عزیز کا نام دیا۔ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

دوسری فلم ''قربانی'' بھی واہ واپروڈکشن کے بینر پر بنائی۔ اس کلاسک اور شاہکار فلم کے فلمساز کا نام انہوں نے نسیم الثقلین کا دیا جو لاہور آفس کے نگراں تھے۔ اس فلم کے بھی شریک فلمساز اور ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ اس فلم کی مسحور کن موسیقی ایم اشرف کی تھی۔ اس کی کہانی انگریزی ناول ''دی چمپ'' سے ماخوذ تھی۔ ندیم، شبنم، نمو، اورنگزیب، دیبا، افضال احمد، ماسٹر خرم اور خیام سرحدی ''قربانی'' کے ستارے تھے۔ اس فلم نے اپنی بہترین کہانی، عمدہ ہدایت کاری اور مقبول گیتوں کی وجہ سے ڈائمنڈ جوبلی کامیابی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس فلم کے یہ نغمے بہت مقبول ہوئے۔

میرا تجھ سے ایسا بندھن ہے
جیسے دل سے رشتہ دھڑکن کا
(یہ گانا غلام عباس، ناہید اختر اور مہناز نے الگ الگ گایا تھا)

تکلف برطرف جاناں میں تم سے پیار کرتی ہوں
(آواز، ناہید اختر)

یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے
تیرے بغیر ہر خوشی اجنبی سی لگتی ہے
(آواز مہناز)

اس دل میں پھول کھلے ہیں تیرے آجانے سے
(آواز، مہناز)

اس فلم کے بعد بھی ستیش چند آنند نے کئی سال تک ایورریڈی پکچرز کے بینر سے کوئی فلم نہیں بنائی بلکہ دوسرے اداروں کی فلموں کے لیے سرمایہ کاری کی۔ ایسی فلموں میں ہمت والا، ہنگامہ، نادانی، بینکاک کے چور، ہانگ کانگ کے شعلے، ہلچل، منیلا کے جانباز اور جنگجو گوریلے شامل ہیں۔

ستیش نے خود تو کبھی کھل کر اس کا جواب نہیں دیا کہ انہوں نے اپنے ذاتی فلمساز ادارہ ایورریڈی پکچرز کا نام کیوں استعمال نہیں کیا۔ البتہ ان کے بہت قریبی حلقوں کی اس سلسلے میں رائے یہ ہے کہ ستیش چونکہ اس فیلڈ میں ناتجربہ کار تھے اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے آنجہانی جے سی آنند نے جس ادارے کو اپنی انتھک محنت سے یہ مقام عطا کیا ہے، اس پر ان کی وجہ سے بدنامی کا کوئی دھبا لگے۔

آفریں ہے اس بیٹے پر جس نے باپ کی عزت پر آنچ نہ آنے کی وجہ سے کوئی 20 برس تک اپنے آپ کو پس پردہ رکھا۔ جب ہر طرح سے وہ مطمئن ہو گئے کہ اب وہ فلمسازی کے میدان میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتے۔ باپ کے ادارے کی بدنامی کا سبب نہیں بن سکتے تب انہوں نے ایورریڈی کے بینر پر فلمیں بنانے کی ابتدا کر دی۔ 1991ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''عالمی جاسوس'' انہوں نے ایورریڈی پکچرز کے بینر پر بنائی۔ یہ ڈبل ورژن فلم تھی۔ اردو اور پنجابی میں بنائی گئی تھی اور فلمساز کے طور پر انہوں نے کراچی آفس کے جنرل منیجر شمیم خورشید کا نام دیا تھا۔ اس فلم کو جان محمد نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ موسیقار امجد بوبی تھے۔ کاسٹ میں کویتا، اظہار قاضی، غلام محی الدین، عجب گل اور ندا ممتاز شامل تھے۔

1992ء میں ایورریڈی پکچرز نے پھر ایک اردو پنجابی ڈبل ورژن میں ''محبت کے سوداگر'' کے نام سے فلم بنائی۔ اس فلم میں پہلی بار ستیش چند آنند کا نام بطور فلمساز دیا گیا جبکہ پیش کار کی حیثیت سے شمیم خورشید کا نام شامل کیا گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی جان محمد اور موسیقار امجد بوبی تھے۔ صاحبہ، صائمہ، نیلی، جاوید شیخ کاسٹ میں شامل تھے۔

ایورریڈی پکچرز کی سپرہٹ فلم ''ہاتھی میرے ساتھی'' 1993ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے فلمساز شمیم خورشید اور ہدایت کار شمیم آرا تھیں۔ موسیقی واجد علی ناشاد نے ترتیب دی تھی۔ اس دور کے لحاظ سے یہ لاجواب فلم تھی۔ کیونکہ ان دنوں ڈبل ورژن کی بھونڈی فلموں کی وبا پھیلی

ہوئی تھی۔ ایسی فلموں کی وجہ سے فلم بینوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایسے دور میں ''ہاتھی میرے ساتھی'' نے روٹھے ہوئے شائقین فلم کو سینما گھروں تک لانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سپرہٹ فلم کی کاسٹ میں ریما، محسن خان، صاحبہ، جان ریمبو، شفقت چیمہ نمایاں ستارے تھے۔ اس فلم کے کچھ گیتوں نے مقبولیت حاصل کی تھی۔

کسی کے کہنے میں نہ آنا
میں ہوں تیرا دیوانہ
(آواز، سجاد علی)
نی کڑیئے پنجاب دیے
نی پشئے گلاب دیے
(آواز، علی رضا)
مہندی لگانے کی رات آگئی
گیت گاؤ
(آوازیں، شمسہ کنول، حمیرا چنا، امیر علی، علی رضا)

ایورریڈی پکچرز کے بینر تلے 1996ء میں بھی ایک صاف ستھری تفریحی فلم ''راجو بن گیا جنٹلمین'' پیش کی گئی۔ اس کے فلمساز شمیم خورشید اور مصنف و ہدایت کار سید نور تھے۔ موسیقی امجد بوبی نے کمپوز کی تھی۔ جان ریمبو، میرا، لیلیٰ، عندلیب، محسن خان، زیبا شہناز، اسماعیل تارا، آصف خان، ادیب اور شفقت چیمہ کاسٹ میں شامل تھے۔ یہ فلم بھی صاف ستھری اور تفریحی ہونے کی وجہ سے پسند کی گئی تھی۔

ایک سال بعد 1998ء میں ایورریڈی پکچرز سے ایک اور اچھی اور خوب صورت فلم ''کہیں پیار نہ ہو جائے'' پیش کی گئی۔ اس کی مصنفہ حسینہ معین، ہدایت کار جاوید شیخ اور فلمساز ستیش چند آنند تھے۔ موسیقار امجد بوبی اور عکاس ریاض بخاری تھے۔ کاسٹ میں ریشم، میرا، شان، سلیم شیخ، آصف خان، اسماعیل تارا اور عابد علی شامل تھے۔

اس فلم کے بعد ایورریڈی پکچرز کی جانب سے فلم میکنگ کا سلسلہ بند کر دیا گیا پھر اس ادارے نے ٹی وی چینلز کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ جس میں اسے کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ماڈلنگ کے حوالے سے بھی کام کیا اور اس میں بھی کامیابی سے ہمکنار رہا۔

ستیش چند آنند، اپنے باپ کی طرح ایک زیرک اور دوراندیش کاروباری شخصیت ہیں۔ وہ حالات کے بدلتے ہوئے تیور کو دیکھ کر سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ نامناسب حالات میں وہ اپنا ہاتھ روک لیتے ہیں اور فلم ڈسٹری بیوشن پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب پاکستانی فلمی صنعت نے ایک نئے انداز سے نئے سفر کا آغاز کیا ہے تو ستیش چند نے بھی اپنے ادارے کی جانب سے اس نئے فلمی سفر کو کامیاب بنانے میں اپنا تعمیری کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔

ایورریڈی پکچرز پاکستانی فلمی صنعت وتجارت کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ اس کے بانی اور مالک جناب جگدیش چند آنند تھے جو 1922ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی نوجوانی کے دور میں فلم تقسیم کاری سے اپنے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ وہ ایک شریف النفس، اصول پسند اور ایماندار انسان تھے۔

ان کے بعد ان کے ہونہار بیٹے نے بھی ان کے کام کو جاری رکھا۔ ستیش چند آنند 1951ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم پاکستان میں حاصل کی بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ بھیج دیے گئے۔ وہ ایک ذہین ، اسمارٹ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ باپ کی طرح شریف، پیار کرنے والے انسان اور دوراندیش بزنس مین ہیں۔ بھارت سے جے سی آنند کا محض کاروباری رشتہ نہیں تھا وہاں ان کے عزیز و اقارب بھی رہتے تھے۔ نامور بھارتی اداکارہ جوہی چاؤلہ کا ننھیال جے سی آنند کا گھرانا تھا۔ جوہی چاؤلہ کئی بار اپنے ننھیالی عزیزوں سے ملنے اور ان کی تقریبات میں شرکت کے لیے کراچی آچکی ہیں۔

نسیم الثقلین جو جے سی آنند کے دست راست اور لاہور میں ایورریڈی پکچرز کے نگران اعلیٰ تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، نرم مزاج کے، مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ فلمی حلقوں میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ خاصے عرصہ تک اس ادارے کو انتہائی خوبی سے چلاتے رہے۔ انہیں فلم تقسیم کاری اور فلم پروڈکشن کے حوالے سے خاصی مہارت تھی۔ ایورریڈی پکچرز کی کئی فلموں میں ان کا نام بطور فلمساز استعمال کیا گیا۔ 1980ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

☆☆☆

اللہ کے فضل و کرم سے کراچی تقسیم کاری کے لحاظ سے ہمیشہ سرخرو رہی۔ ایورریڈی پکچرز کے علاوہ بھی کئی تقسیم کار ادارے اپنی بہترین کارکردگی، اصول پسندی اور دیانت داری کی وجہ سے فلمسازوں کی ترجیح رہے۔ ان میں پاکستان

فلمز کا نام بھی صف اوّل میں شامل ہے جس کے روح رواں نثار مراد تھے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ آج کے بہت سے فلمی شائقین انہیں ان کے صاحب زادے وحید مراد کے حوالے سے جانتے ہیں۔ کہتے ہیں ''کون نثار مراد......؟ وہی تونہیں جو وحید مراد کے والد ہیں؟''

اگر چہ وحید مراد کو وحید مراد بنانے والے نثار مراد تھے۔ وہ بنیادی طور پر فلم تقسیم کار تھے اور ان کے تقسیم کار ادارے کا نام پاکستان فلمز تھا۔ انہوں نے اپنے ڈسٹری بیوشن کے ادارے سے متعدد پاکستانی فلمیں ریلیز کیں۔ وہ بھی بڑے کھرے اور دیانت دار ڈسٹری بیوٹر تھے اور فلمساز ان کے ادارے سے کراچی اور سندھ سرکٹ میں اپنی فلموں کی نمائش کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔

نثار مراد نے اپنا کاروباری کیریئر قیام پاکستان سے قبل کراچی کے ایک تقسیم کار ادارے ہند پکچرز میں منیجر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنا تقسیم کار ادارہ ''پاکستان فلمز'' کے نام سے قائم کیا اور کراچی کا ''ناز'' اور حیدر آباد کا ایلائٹ سینما 20 سال کے لیے بطور کنٹریکٹ حاصل کیا۔ کئی مشہور بھارتی اور پاکستانی فلمیں ریلیز کیں۔ اس دور میں کراچی میں دو درجن کے قریب فلم تقسیم کار ادارے موجود تھے۔ مگر نثار مراد نے اعلیٰ معیاری فلمیں حاصل کر کے جلد ہی صف اوّل میں جگہ حاصل کرلی۔

نثار مراد کے سنتوش فیملی سے گھریلو تعلقات تھے... اس لیے انہوں نے زیادہ تر فلمیں سنتوش کمار اور درپن کی ریلیز کیں۔ ان میں اکثر کامیاب ہوئیں۔ نثار مراد کا گھر کراچی کے پوش علاقے میں تھا۔ لہٰذا جب بھی کوئی اہم شخصیت لاہور سے آتی۔ وہ ان کے گھر ہی قیام کرتی۔

وحید مراد کو انہوں نے 1960ء میں بطور فلمساز پیش کیا۔ یہ وحید مراد کی نوجوانی کا دور تھا۔ بطور فلمساز وحید مراد کی پہلی فلم ''انسان بدلتا ہے'' تھی۔ درپن اس فلم کے ہیرو تھے۔ مزید ایک دو فلموں کی فلمسازی کے بعد وحید مراد نے اپنی ذاتی فلم ''ہیرا اور پتھر'' سے اداکاری شروع کر دی اور بطور ہیرو پیش ہوئے۔ یہ ہدایت کار پرویز ملک کی بھی پہلی فلم تھی۔ اس کے بعد ان دونوں کی مشترکہ فلم ''ارمان'' نے وحید مراد کو ہیرو اور پرویز ملک کو ہدایت کار کے طور پر زبردست شہرت اور مقبولیت عطا کی۔

1971ء تک پاکستان فلمز کی ترقی کا سفر جاری رہا۔ لاہور کے اکثر فلمسازوں کی یہ خواہش ہوتی کہ ان کی فلمیں پاکستان فلمز کے ادارے سے ریلیز ہوں۔ اس ادارے کی آخری فلم ''نیند ہماری خواب تمہارے'' تھی۔ اس کے بعد چند اور فلمیں جیسے تیسے ریلیز ہوئیں اور یہ ادارہ بند ہوگیا۔

نثار مراد کی بطور تقسیم کار یادگار فلمیں درج ذیل ہیں۔

''انتظار'' (1956ء) ''سردار'' اور ''وعدہ'' (1957ء) ''راز'' اور ''ساتھی'' (1959ء) ''نوکری'' اور ''سلطنت'' (1960ء) ''انسان بدلتا ہے''، ''غالب'' اور ''گلفام'' (1961ء) ''موسیقار''، ''بنجارن''، ''آنچل'' (1962ء) ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' (1962ء) ''انسپکٹر''، ''حویلی''، ''ہیرا اور پتھر (1964ء) ''کنیز'' (1965ء) ''ارمان'' (1966ء) ''احسان'' (1967ء) ''دل میرا دھڑکن تیری''، ''جہاں تم وہاں ہم'' (1968ء) ''اک نگینہ'' (1969ء) ''نصیب اپنا اپنا'' (1970ء) ''نیند ہماری خواب تمہارے'' (1971ء) اس سپرہٹ فلم کے بعد اس ادارے کا زوال شروع ہوا۔ ناز کراچی اور ایلائٹ سینما حیدر آباد سے بھی لیز ختم ہوگئی۔ اس کے بعد پاکستان فلمز کی یہ فلمیں ریلیز ہوئیں مگر سب کی سب ناکام ثابت ہوئیں۔ فرہاد شیریں (پشتو)، سوہنا مکھڑا اور موت کھیڈ جمیں زنانیاں دی، یہ فلم 1976ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس ادارے کی ریلیز ہونے والی آخری فلم تھی۔

☆☆☆

اللہ کے کس کس احسان کا ذکر کروں کہ اس ذات باری تعالیٰ نے کراچی کو اپنی کن کن نعمتوں سے نوازا۔ فن کے حوالے سے اسے ایسے ایسے انمول موتی دیے کہ ایک عالم اس کی قسمت پر رشک کرتا ہے۔ ایک بلبل ہزارداستان کی صورت میں مہناز جو اسی سرزمین سے جنم لے کر فن موسیقی کے آسمان پر چاند سورج بن کر جگمگائی۔ جس نے کراچی کی ثقافتی زندگی کو ایک نیا رنگ ایک نیا انگ دیا۔ جو پاکستانی فلمی صنعت کے لیے بڑی بھاگوان ثابت ہوئی۔ جس کی بلبل کی طرح چہکتی ہوئی آواز نے پاکستانی فلمی گیتوں کی پیشانی پر کامیابی اور مقبولیت کا جھومر سجایا۔ اس کے گائے ہوئے غزلوں، گیتوں اور نغموں کی چاندنی سے کون انکاری ہوسکتا ہے۔ کسی بھی دور میں موسیقی سے پیار کرنے والے کیا ان گیتوں کے جادوئی اثر سے الگ رہ سکتے ہیں؟

☆ چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں

ملائی کے

☆ تیرا پیار میرے جیون کے سنگ رہے گا

☆ عشق سچا ہے تو پھر وعدہ نبھانا ہوگا

☆ تیرا میرا کوئی نہ کوئی ایسا ناطہ ہے
ورنہ کون کسی کے پیچھے آتا ہے

☆ میں جس دن بھلا دوں ترا پیار دل سے
وہ دن آخری ہو میری زندگی کا

یہ اور ایسے بے شمار نغمے ہیں جن کو سنتے ہی مہناز کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ آج وہ چہکتی ہوئی مینا ہمارے درمیان نہیں۔ آج سے سات برس پہلے اپنے لاکھوں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر افق کے اس پار چلی گئی تھی۔

آیئے! کراچی کی پہچان اس بلبل ہزار داستان کی جیون کتھا کے اوراق پارینہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ موسیقی کے دو فنکاروں اختر وصی علی اور کجن بیگم کے آنگن میں ان کے پیار کی ایک کلی کھلی جس کا ان دونوں نے کنیز فاطمہ نام رکھا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ کراچی کی مٹی سے جنم لینے والی یہ پیاری سی بچی ایک دن اپنی طلسمی آواز سے کراچی کا نام دنیا بھر میں روشن کرے گی۔ اس بچی کو ایک دن پھول کی طرح اپنی آواز کی خوشبو پھیلانے کا موقع ملے گا اس لیے پیار سے اس کے بڑے اور بزرگ اسے مہناز کہہ کر بھی پکارنے لگے... اور یہ عرفیت ہی اس کی پہچان بن گئی۔ اس کی امی کجن بیگم اور ابو اختر وصی علی دونوں ریڈیو پاکستان کے سینئر اسٹاف آرٹسٹ تھے۔ کجن بیگم سوز وسلام اور نوحہ پڑھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ مہناز کی خالہ عشرت جہاں بھی معروف گلوکارہ تھیں۔ اکثر محرم الحرام کی مجالس میں کمسن مہناز بھی اپنی والدہ اور خالہ کے ہمراہ سوز وسلام اور نوحہ خوانی میں شریک ہوتی تھیں۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن سے بھی ان کے نوحے، مرثیے اور سوز وسلام باقاعدگی سے نشر اور ٹیلی کاسٹ ہوا کرتے تھے۔ کجن بیگم راجا صاحب آف محمود آباد (انڈیا) کی ریاست محمود آباد اودھ میں اپنے دور میں ایک معروف مرثیہ اور نوحہ خواں تھیں۔

کجن بیگم کا تو ریڈیو سے تعلق قیام پاکستان سے قبل ہی سے تھا۔ لہٰذا ان کی بیٹی مہناز کو قدرتی طور پر گلوکاری کا فن وراثت میں ملا، مگر بقول رضا علی وحشت

فروغ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا میں نے کسب فن کے لیے

مہناز نے بھی مسلسل ریاضت، محنت اور لگن سے اس میدان میں اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور کامیابی اور بل... اصل کی۔

ریڈیو پاکستان کراچی کے معروف پروگرام پروڈیوسر سید تراب علی نقوی مہناز کے خالو تھے۔ ان کے پروگرامز میں مہناز نغمہ سرائی کر کے اپنے فن کو نکھارتی رہیں۔ ریڈیو کے اکثر پروگرامز میں انہوں نے دلکش اور دل موہ لینے والی دھنوں کو اپنی سحر انگیز آواز سے سجا کر ریڈیو کے سامعین کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس دور کے بعض مشہور غیر فلمی گیت یہ ہیں۔

☆ کجراری انکھیوں میں نندیا نہ آئے
جیا گھبرائے نندیا نہ آئے

☆ اک صورت دل میں سمائی ہے
اک شکل ہمیں پھر بھائی ہے

☆ دے کے ہمیں فریب وفا آپ خوش رہیں
برباد ہم ہوئے بھی تو کیا آپ خوش رہیں

ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نشر اور ٹیلی کاسٹ ہونے والے گیتوں اور نغموں نے فلمی موسیقاروں کو بھی اس طلسمی آواز نے اپنے جادو سے مسخر کیا اور موسیقار اے حمید نے مہناز کو اپنی فلم میں گانے کی دعوت دی۔ یہ فلم ''حقیقت'' تھی۔ جس کے ہدایت کار نذرالاسلام تھے۔ اے حمید نے اس فلم کے لیے احمد رشدی کے ساتھ دو گیت ریکارڈ کرائے۔ یہ گیت خواجہ پرویز نے لکھے تھے اور وحید مراد اور بابرہ شریف پر فلمائے گئے تھے۔ گیت کے بول تھے۔

☆ میں نے تمہیں بلایا تھا کاہے کو گھبرائی ہو
عاشق نہیں، منگیتر ہوں کیوں اتنی دیر سے آئی ہو
ان سے ملنا بری بات ہے جن کے ساتھ سگائی ہو

☆ ناگوار خاطر نہ ہو تو اک عرض کروں
مجھے اپنے دل میں جگہ دے دیں

یہ دوگانے (ڈوئٹ سانگ) مہناز کے پہلے فلمی گیت ہے، جن کو گا کر انہوں نے فلمی گلوکاراؤں کی صف میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ یہ فلم 1974ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ فلم ''حقیقت'' کے ساتھ، نئی گلوکارہ مہناز کے گائے ہوئے گیتوں کو بھی عوامی پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی تھی۔ بطور پلے بیک سنگر مہناز نے اپنی گائیکی کی یہ نئی بازی بھی جیت لی تھی۔ فلم والوں، خصوصی طور پر موسیقاروں نے اس آواز کو فلموں کے گیتوں کے لیے پسندیدہ قرار دے دیا، اور پھر مہناز پر فلمی گیتوں کی برسات

ہونے لگی۔ ہر فلمساز اپنے موسیقار سے کہنے لگا۔ ''ارے بھئی! ایک دو گیت اس نئی بلبل کی آواز میں بھی ریکارڈ کرانا۔''

''سر جی! نئی فلم میں اس نئی گلوکارہ کے گیت نہ ہوں۔ بھلا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟''

دوستو! آپ کے لیے یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ مہناز کو کن موسیقاروں نے کب کب اپنی فلم میں گانے کا چانس دیا۔ ان کی پہلی فلم کون سی تھی جس میں مہناز نے پہلی بار نغمہ سرائی کی۔

فلم ''پیسہ'' کے لیے موسیقار ناشاد نے پہلی بار مہناز سے سولو گیت گوایا۔ جس کے بول تھے۔

ایک بار تو پیار سے دیکھ مجھے
سو بار تجھ کو چاہوں گی

یہ ہدایت کار ایم اے علی کی فلم تھی۔ جو 1975ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کے بعد ناشاد نے اپنی دیگر فلموں میں بھی مہناز کو باضابطگی سے گوانا شروع کر دیا۔

موسیقار نثار بزمی نے بھی اسی سال (1975ء) ریلیز ہونے والی فلم ''جاگیر'' میں مہناز کو اپنی آواز کا جادو جگانے کا موقع دیا۔ یہ ہدایت کار اور مصنف علی سفیان آفاقی کی فلم تھی۔ اس فلم کے لیے مہناز نے جو گیت گائے تھے اس کے بول تھے۔

لپٹ جاؤں پھولوں کا ہار بن کے
سانسوں میں بس جاؤں مہکار بن کے

اس گیت کے نغمہ نگار مسرور انور تھے، اور اسے فلم کی ہیروئن شبنم پر پکچرائز کیا گیا تھا۔

اس فلم کا دوسرا نغمہ جو مہناز سے ریکارڈ کرایا گیا یہ تھا۔

چاہت کی مہندی مرادوں کے پھول
گھومیاں گڈے کہ گڑیا قبول

اس کے علاوہ اس فلم کے لیے بیک گراؤنڈ میں ایک دوگانا جو مہناز نے احمد رشدی کے ساتھ بڑی دلکشی اور بھرپور طور پر گایا۔ یہ تھا۔

آنکھیں ہی کرتی ہیں سوال
آنکھیں ہی دیتی ہیں جواب
پیار ہو جائے تو چہرہ بن جاتا ہے گلاب

نثار بزمی عام فلمی موسیقاروں سے ہٹ کر تھے۔ سُر سنگیت کو جانتے اور سمجھنے والے موسیقار تھے۔ آوازوں کی پرکھ اور شاعری کے ایک ایک لفظ پر ان کی گہری نگاہ تھی۔

مہناز کی آواز کی دلکشی، سحر انگیزی اور فنی نزاکتوں پر پورا اترنے کی صلاحیتوں کا انہیں ایک ہی فلم میں گوا کر ہوگیا اور پھر وہ بھی دیگر فلموں میں اس کی آواز کو اپنے گیتوں کے لیے منتخب کرتے رہے۔

ان کی ایک فلم ''نغمات کی رات'' جو ریلیز نہ ہوسکی۔ اس میں مہناز سے لیجنڈ موسیقار نثار بزمی نے یہ گیت ریکارڈ کرایا تھا۔

اس مطلبی دنیا کو کوئی پیار سکھا دے
یا پیار کا ہی نام زمانے سے مٹا دے

معروف موسیقار ایم اشرف بھلا مہناز کی جادوئی آواز کا فائدہ کیوں نہ اٹھاتے۔ انہوں نے ہدایت کار اقبال اختر کی فلم ''دلنشیں'' کے لیے مہناز سے ایک سولو گانا صدابند کرایا جسے مسرور انور نے تحریر کیا تھا.... جو اداکارہ شبنم پر پکچرائز ہوا تھا۔

یہ گھر میرے ارمانوں کا سپنا ہے
جیسا بھی ہے میرا اپنا ہے

فلم ''دلنشیں'' کے اس گیت نے ایم اشرف کو بھی مہناز کی دل نشیں آواز کا گرویدہ کر دیا اور پھر وہ بھی اپنی ہر فلم میں مہناز کی شمولیت کو فراموش نہیں کرتے تھے۔

موسیقار ماسٹر عنایت حسین نے مہناز کو سب سے پہلے اپنی فلم ''بکھرے موتی'' میں گوایا۔ یہ اداکار و ہدایت کار رنگیلا کی فلم تھی جو 1975ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ گیت اداکارہ نشو پر فلمبند ہوا تھا۔ نغمہ نگار قتیل شفائی تھے۔

دنیا ہزار ظلم کرے اس کا غم نہیں
مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں

اور ماسٹر عنایت حسین نے بھی مہناز کو فراموش نہیں کیا۔ جب بھی موقع ملا مہناز کی جادوئی آواز سے فیض اٹھایا۔

باکمال موسیقار کمال احمد بھلا اس دوڑ میں پیچھے کیوں رہتے۔ مہناز جیسی چہکتی ہوئی آواز سے اپنی فلم کو سرفراز کیوں نہ کرتے۔ انہوں نے بھی اپنی فلم ''روشنی'' کے لیے اس بلبل کا انتخاب کیا۔..اور ایک ایسے گیت کو اسے گانے کا موقع دیا جو حضرت امیر خسرو کا تحریر کردہ تھا۔ اس گیت کو مہناز نے گایا بھی اس رچاؤ کے ساتھ کہ یہ ان کی گویا پہچان بن گیا۔

چھاپ تلک سب چھین لی رے
موسے نیناں ملائی کے

امجد بوبی جو سریلی دھنوں کی کمپوزیشن میں اپنا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں، انہوں نے بھی مہناز کی آواز سے اپنی فلم کو سرفراز کیا۔ یہ فلم تھی۔ ’’آنسو اور شعلے‘‘ اس کے بول جسے مہناز سے گوایا گیا یہ تھے۔

باز آتے نہیں وہ اس سلوک سے
بات کرتے ہیں جو بندوق سے

یہ گیت بابرہ شریف پر فلمایا گیا تھا۔ پھر مہناز، امجد بوبی کی فلموں میں بھی باضابطگی سے گانے لگیں۔

واجد علی ناشاد کو بھی ایک دن مہناز کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنی تازہ فلم ’’پرستش‘‘ کے لیے گانے کی درخواست کی۔ تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ گیت تھا کہ اس سے کہا ذرا ان بولوں کو بھی اپنی آواز سے جادو اثر کر دو۔

ایسی تصویر بنائی ہے میرے ساجن نے
ایسی تقدیر بھی بن جائے تو مزا آجائے

آواز کی جادوگری نے اس گیت کی تصویر میں ایسا رنگ بھرا کہ واجد علی ناشاد کا دل شاد ہو گیا اور پھر مہناز کا ان کے ساتھ اشتراک ایسا ہوا کہ ہر فلم میں وہ اسے ضرور شریک کرنے لگے۔

لیجنڈ موسیقار رشید عطرے کے ہونہار فرزند ارجمند وجاہت عطرے نے پہلی بار اپنی فلم ’’بلیک کیٹ‘‘ میں مہناز سے گائیگی کا رشتہ استوار کیا۔ جس اعتماد سے وجاہت عطرے نے مہناز کو اپنی آواز کا جادو جگانے کی دعوت دی تھی مہناز نے بھی اس خوبی سے گایا کہ ان کے اعتماد پر پوری اتریں اور وجاہت اور ان کا فنی رشتہ ہمیشہ کے لیے پختہ ہو گیا۔ بول تھے۔

لے کے خدا کا نام ذرا پی کے دیکھ لے
یہ زہر ہے کہ جام ذرا پی کے دیکھ لے

خلیل احمد اور مہناز کا پہلا سنگم فلم ’’معصوم‘‘ کے حوالے سے ہوا۔ یہ فلم ہدایت کار وزیر علی کی تھی۔ مہناز نے یہ گیت مالا کے ہمراہ انتہائی اثر انگیز انداز میں گایا۔ ڈوئٹ کے بول تھے۔

بھابی میں تجھ پر قربان
تجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں
جان سے پیاری کیا ہو گی

اور پھر دلکش دھنوں کے خالق موسیقار خلیل احمد بھی مہناز کی آواز کے گرویدہ ہو گئے۔

مہناز کی آواز سے متاثر ہونے والے موسیقاروں

زندگی نامہ

اصل نام: کنیز فاطمہ

مشہور ہوئیں: مہناز

پیدائش: 1958ء

مقام: کراچی

والد: اختر وصی علی

والدہ: بجن بیگم

ابتدائی سرگرمیاں: پانچ چھ برس سے والدہ بجن بیگم اور خالہ عشرت جہاں کے ساتھ محرم کی مجالس میں سوز وسلام اور نوحہ خوانی میں حصہ لینے لگیں۔ کچھ دنوں بعد جب ذرا بڑی ہوئیں تو ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں شریک ہونے لگیں۔ ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن تک رسائی ہوگئی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے ان کی آواز نے فلم والوں کو بھی متاثر کیا اور انہیں پلے بیک سنگر کی حیثیت سے گانے کی دعوت دی گئی۔

پہلی فلم: حقیقت، اس کے موسیقار اے حمید اور ہدایت کار نذرالاسلام تھے۔

بطور پلے بیک سنگر: ’’حقیقت‘‘ پہلی پنجابی فلم ’میرا ناں پاٹے خاں‘‘ تھی۔ ان سے کچھ سندھی گانے بھی گوائے گئے۔

آخری فلم: ’’سنگرام‘‘ تھی جو 8 مارچ 2002ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں مہناز نے اپنا آخری سولو گیت گایا تھا۔

ایوارڈز: مہناز نے گیارہ نگار ایوارڈ کے علاوہ گریجویٹ ایوارڈز، فنکار ایوارڈز، مصور ایوارڈز اور اسکرین ایوارڈز بھی حاصل کیے۔

انتقال پُرملال: 19 جنوری 2013ء میں ہوا۔ اپنی سانس کی بیماری کے علاج کے لیے امریکا جارہی تھیں کہ بحرین ایئرپورٹ پر انتقال ہو گیا۔

میں چندر موہن بیلی رام بھی تھے۔ موسیقاروں کی اس جوڑی نے پہلی بار اپنی فلم ’’یادوں کی بارات‘‘ میں مہناز کی آواز میں یہ گیت گوایا۔

جانے دے جانے دے جانے دے صنم
میں نہیں کروں گی شادی میں نہیں کروں گی شادی
شادی سے تو ہو جاتی ہے بربادی

روبن گھوش جو اپنی اس بات سے بھی پہچانے جاتے

ہیں کہ وہ اچھی آواز کے رسیا ہیں۔ جہاں بھی انہیں کوئی اچھی آواز سنائی دیتی اسے اپنی فلموں میں گوا کر اس کی پذیرائی ضرور کرتے تھے۔ انہیں جب مہناز کی آواز کئی گیتوں کی صورت میں سنائی دی تو انہوں نے بھی اسے اپنی فلم ''امنگ'' میں گانے کی دعوت دی۔ جو گیت مہناز سے گوایا گیا۔ اسے تسلیم فاضلی نے لکھا تھا۔ بڑے مزے کا تھا۔

لادے رے جھمکا

لادے رے لادے رے موہے جھمکا سانوریا

پہن کے جھمکا ماروں گی ٹھمکا

لادے رے جھمکا

مہناز نے گایا بھی اس انداز میں کہ روبن گھوش خوش ہو گئے۔ ''ویل ڈن مہناز!'' انہوں نے مہناز کی تعریف کی۔ ''تم بہت اچھی سنگر ہو۔''

جب کوئی اچھی آواز کی پلے بیک سنگر موجود ہو تو موسیقار اس سے ضرور فیض اٹھاتے ہیں۔ موسیقار ماسٹر رفیق علی نے بھی مہناز سے اپنی فلم ''سیاں اناڑی'' کا یہ گیت گوایا۔ جسے فیاض ہاشمی نے تحریر کیا تھا اور یہ فلم اداکارہ صاعقہ پر فلمایا گیا تھا۔ بول تھے۔

اوسیاں تیرے پیار کی خاطر

اردو اور پنجابی فلموں کے مقبول موسیقار نذیر علی نے پہلی بار مہناز کو اپنی اردو فلم ''دو آنسو'' میں گانے کی دعوت دی۔ قتیل شفائی نے گیت لکھا تھا جسے مہناز نے بڑی خوبی کے ساتھ گایا۔

آج مجھ کو ملا من کا میت رے

ڈھاکے کی فلموں سے ابھر کر فلمی افق پر جگمگانے والے آغا خانی موسیقار کریم شہاب الدین نے پہلی بار اپنی فلم ''انتقام کے شعلے'' میں مہناز سے مسرور انور کا گیت پلے کروا کر مہناز کی گائیگی کا فائدہ اٹھایا۔

مجھے تیری قسم ہے ساجنا

تیرا پیار کبھی نہ بھلاؤں گی

مہناز نے کچھ اس ادا سے یہ گیت گایا کہ جس نے بھی سنا داد دیے بغیر نہ رہا۔

موسیقار سہیل رعنا نے پہلی بار فلمساز و ہدایت کار جاوید جبار کی فلم ''مسافر'' کے لیے مہناز کی آواز میں یہ گیت ریکارڈ کیا۔ جسے عبیداللہ علیم نے تحریر کیا تھا۔ یہ ایک کورس گیت تھا جس میں مہناز کا ساتھ ساتھی گلوکاراؤں نے دیا تھا اور یہ فلم میں اداکارہ شمیم ہلالی پر پکچرائز ہوا تھا۔ بول تھے۔

ہری ہری مہندی کے نیچے سرخ گلاب

موسیقار مصدق حسین نے مہناز کو اپنی فلم ''اپریل فول'' میں گوا کر مہناز سے فنی رشتہ استوار کیا۔ یہ اداکارہ آسیہ کی ذاتی فلم تھی۔ دو گیتوں کے بول نغمہ نگار ایم اکرم نے تحریر کیے تھے جو مہناز نے اے نیر کے ساتھ مل کر دوگانے کی شکل میں گائے۔

پیار کریں گے پیار کریں گے

ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے

(آسیہ اور محمود خان پر پکچرائز ہوا)

سپنوں کی رانی آجا

آجا رت ہے سہانی آجا

(آسیہ اور اورنگ زیب پر فلمایا گیا)

واضح رہے کہ محمود خان اصل میں اداکار طارق شاہ تھے جو اس فلم میں محمود خان کے نام سے متعارف ہوئے تھے۔

پشتو فلموں کے معروف موسیقار ایس یونس نے بھی اپنی اردو فلم ''شعلے پہ شعلہ'' میں مہناز سے گوا کر ان کی آواز سے اس فلم کو سجایا۔ بول تھے۔

شعلے پہ شعلہ بھڑکے گا

دل محفل کا دھڑکے گا

موسیقار بخشی وزیر کو بھی مہناز کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے اداکار و ہدایت کار کیفی کی فلم ''بکھرے موتی'' میں اس چہکتی ہوئی آواز سے قتیل شفائی کا گیت ریکارڈ کرایا۔ بول تھے۔

ناچے میری بانہوں میں رسوائی

تجھ کو آئینہ دکھانے آئی

فلم میں یہ گیت اداکارہ غزل پر پکچرائز ہوا۔

موسیقار ظفر حسین نے فلم ''باپ کا گناہ'' میں مہناز سے ایک سولو اور ایک دوگانا گوایا۔ یہ فلم پہلے ''گناہ ایک رات کا'' کے نام سے بن رہی تھی۔ گیت کے بول شاعر سعید گیلانی نے لکھے تھے۔

پیار کیا ہے پیار کریں گے

کسی سے کبھی ہم نہ ڈریں گے

یہ ڈوئٹ مہناز نے احمد رشدی کے ساتھ گایا تھا جبکہ آصف خان اور شہناز پر اسے فلمایا گیا تھا۔ سولو گیت کے بول تھے۔

یہ سماں گزر نہ جائے پھر نہ آئے

آ گلے لگ جا

ماسٹر عبداللہ نے بھی مہناز کی آواز سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی فلم تھی ''شیشے کا گھر'' جس کے ہدایت کار تھے دادا نذر الاسلام۔ ماسٹر صاحب نے اس فلم کے لیے مہناز سے تین سولو اور ایک دلکش ڈوئٹ سانگ گوایا۔

یہ سفر تیرے میرے پیار کا میری جان کبھی نہ ختم ہو
تیرے ساتھ ہی میری صبح ہو، تیرے ساتھ ہی میری شام ہو

قتیل شفائی کے اس خوب صورت گیت کو مہناز نے مہدی حسن کے ساتھ گایا تھا اور ایسا گایا تھا کہ اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ اس سولو گانے نے بھی بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔

ہر طرف پتھروں کا سایہ ہے
میں نے شیشے کا گھر بنایا ہے

مہناز کا گایا ہوا حزن و ملال کی کیفیت سے آراستہ یہ گیت فلم کی ہیروئن ممتاز پر فلمایا گیا تھا۔ یہ گیت بھی بہت پسند کیا گیا تھا۔

موسیقار طافو اور مہناز کا ٹکراؤ، ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم ''ٹکراؤ'' میں ہوا۔ خواجہ پرویز کا لکھا ہوا گیت مہناز نے بے حد رچاؤ سے گایا۔ اس سولو گیت کے بول تھے۔

بدلی سے نکلی چکوری تے جھڑیاں دے دل دھڑکے

برصغیر کے لیجنڈ موسیقار خواجہ خورشید اور جو سر تال ہی کے نبض شناس نہیں تھے اچھی آوازوں کی پہچان بھی انہیں آتی تھی۔ مہناز کو کئی فلموں کے گیتوں کے حوالے سے سنا تو اس کی آواز سے اپنی تاریخی فلم ''حیدر علی'' کو سرفراز کرنے کے لیے چھ گیت اس سے گوائے۔ یہ گیت کلاسک انداز لیے ہوئے تھے۔ مہناز نے بھی انہیں اس طرح گایا کہ خواجہ صاحب خوش ہو گئے۔

☆ تو ہے راجا میرا تیری داسی جوڑتی ہوں میں ہاتھ
☆ جا جا رے کوئلیا جا جا
مت گا رے یہ بیرنیا مت گا
☆ کیوں روئے یہ شہنائی
دل تو میرا ٹوٹا چوٹ تو میں نے کھائی
☆ اے سب کے رکھوالے
میرا ساجن تیرے حوالے
☆ بول سکھی ری
اپنے پیا کو کیسے آج رجھاؤں
☆ میرے لعل میری دعا ہے یہی
تو بڑا ہو کر بنے مرد غازی

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ماضی کے گلوکار رجب علی نے ایک فلم بطور موسیقار بھی کی تھی۔ ان کی یہ واحد فلم ''مسٹر رانجھا'' تھی۔ انہوں نے اپنی بنائی ہوئی دھن میں ایک گیت مہناز سے بھی گوایا تھا جس کے بول تھے۔

نیند نہیں آنکھوں میں
آگ لگی سانسوں میں

دوستو! ماضی میں ہمارے فلم میکروں نے بڑی اچھی، بہت معیاری، اور خوب صورت فلمیں بنائی ہیں۔ ہمارے فلمسازوں، ہدایت کاروں، مصنفوں اور نغمہ نگاروں نے اپنی صلاحیتوں کا ایسا اظہار کیا تھا کہ ہمارے ہاں یادگار اور شاہکار فلمیں بنائی گئیں۔ ایسی ہی ایک فلم کا ذکر اس وقت ہم کریں گے جو ہمارے رجحان ساز ممتاز ہدایت کار مسعود پرویز نے بنائی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے ایک انوکھا تجربہ کیا تھا۔ عام طور پر فلموں میں ایک ہی موسیقار ہوتے اور گیت بھی ایک یا دو گیت نگاروں سے لکھوائے جاتے ہیں مگر مسعود پرویز نے اپنی اس فلم میں 9 موسیقاروں اور 5 نغمہ نگاروں سے ایک نئی بات پیدا کی۔ اس فلم کا نام ''انسان'' تھا۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انسان ہر طرح کے ہوتے ہیں اچھے بھی اور برے بھی۔ ایسے ہی مختلف موڈ، مزاج کے سات انسانوں کی کہانی پر ہمارے اس لیجنڈ ہدایت کار نے یہ فلم بنائی تھی۔ ''انسان'' کے فلمساز چودھری اسلم تھے جبکہ مسعود پرویز ہی نے اس کی منفرد کہانی تحریر کی تھی۔ فلمساز نے انہیں فری ہینڈ دے دی تھی کہ وہ اپنی سوچ اپنی ویژن اور خداداد صلاحیتوں کو جس طرح بھی چاہیں سلور اسکرین پر پیش کریں۔ جن موسیقاروں کی خدمات حاصل کی گئیں ان میں وزیر افضل، وجاہت عطرے، صفدر حسین، اے حمید، کمال احمد، نذیر علی، خواجہ خورشید انور، ماسٹر عنایت حسین اور ناشاد تھے۔ وزیر افضل سے اس فلم کا بیک گراؤنڈ میوزک کمپوز کرایا گیا تھا جبکہ وجاہت عطرے نے ٹائٹل میوزک ترتیب دی تھی۔ باقی سات موسیقاروں کو فلم کے ساتھ سچویشن کے لیے ایک ایک گیت کی دھن بنانے اور اس پر اپنی پسند کے نغمہ نگار سے گیت لکھوانے اور سنگر سے گوانے کی آزادی دے دی تھی۔ جن پانچ گیت نگاروں

نے نغمہ نگاری کی تھی۔ ان میں مسرور انور، سعید گیلانی، فیاض ہاشمی، قتیل شفائی اور تسلیم فاضلی شامل تھے۔ یہ سات گیت جو سات سچویشن پر بنائے گئے تھے یہ تھے۔

☆ رات کو برف پگھلتی ہے
دل کے آنگن میں آگ سی جلتی ہے
(آواز مہناز، پکچرائزیشن نازلی)

☆ نہ کوئی وعدہ ہوا نہ اقرار ہوا
آنکھ سے آنکھ ملی پیار ہوا
(آواز مہناز، بابرہ پر فلمایا گیا)

☆ لالالا ای ای ہو ہو ہو
سانس میں پھول کھلے رشک بہار ملا
(آواز مہناز، ہمی پر پکچرائز ہوا)

☆ بے ہوشی کے عالم میں مدہوشی کے عالم میں
(آواز مہناز، نازلی پر عکس بند ہوا)

☆ او ستمگر محبت سزا ہوگئی
پیار کرنا ہی میری خطا ہوگئی
(آواز مہناز، پکچرائزیشن بابرہ شریف)

☆ میں نہ رکوں گی کہیں
میری منزل ہے وہیں
(آواز مہناز، نازلی پر فلمایا گیا)

☆ جھوم اٹھی ہے دل کی دھڑکن
جان من تیرے آنے سے
(آواز، مہناز، پکچرائزیشن نازلی)

ساتوں موسیقاروں نے سنگر کی حیثیت سے مہناز کا ہی انتخاب کیا۔ یہ مہناز کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ساتوں موسیقاروں نے اپنے اپنے سچویشن پر خاتون سنگر کو ہی گوایا اور ان کی اوّلین پسند مہناز بیگم ہی تھیں۔

موسیقار ایم اے شاد نے ہدایت کار جاوید سجاد کی فلم ''اسمگلر'' میں مہناز کو اپنی دو دھنوں پر گوایا۔

☆ آج کی رات تو منسوب میرے نام سے ہے
☆ باغوں میں کوئل بولے
دل میں طوفان اٹھے کیا کروں

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غیر معروف یا بالکل نئے موسیقاروں نے بھی مہناز سے گوا کر اپنی کامیابی یقینی بنائی۔

موسیقار غلام حسین اکرم نے مہناز سے اپنی فلم ''ریشم'' کے لیے یہ گیت صدا بند کیے۔ یہ ہدایت کار ایم۔ ایچ یوسف کی فلم تھی۔ انہوں نے پہلی بار اپنی فلم میں غلام حسین اکرم کو بطور موسیقار متعارف کیا تھا۔

☆ میری نیند ہوگئی پرائی
جاتے ہو کہاں ساجن ہرجائی

موسیقار وگلوکار محبوب پرویز جو ہدایت کار جاوید سجاد کی فلم ''کالا دھندا گورے لوگ'' سے متعارف ہوئے تھے انہوں نے مہناز سے ایک ڈوئٹ اور ایک سولو گیت گوایا۔

☆ جوانی تیری کیا ہے، نشہ ہے
کہوں گا میں یہ برملا
(آواز مہناز اور محبوب پرویز)

☆ دلبر روٹھا سپنا ٹوٹا
(آواز، مہناز)

فلمساز و ہدایت کار لقمان کی فلم ''وفا'' میں جہاں ان کے صاحب زادے فیصل نعمان متعارف ہوئے وہاں اسی فلم سے گلوکار خالد وحید بطور موسیقار متعارف ہوئے۔ مہناز نے خالد وحید کی کمپوز کردہ موسیقی میں انہی کے ساتھ دو ڈوئٹ سانگز گائے۔

☆ کبھی میں بھولوں کبھی تو بھولے
کبھی میں کہہ دوں کبھی تو کہہ دے

☆ تیری بانہوں میں تیری راہوں میں چین ملتا ہے

5 فروری 1982ء کو ریلیز ہونے والی ہدایت کار سلیم بٹ کی فلم ''بڑا بھائی'' سے متعارف ہونے والے موسیقار صابر علی نے مہناز سے اس فلم کے لیے تین سولو گیت گوائے۔

☆ سجناں نے آج مجھے دیکھا ہے پیار سے
☆ شادی کروں گی تیرے ساتھ سجناں
☆ اڑتی پتنگ کو لوٹ لانا بڑی بات ہے

ہدایت کار وزیر علی کی فلم ''سہارے'' جو ''بیداری'' کا ری میک تھی، اس کے موسیقار نیاز احمد نے سہارے کے لیے یہ سولو گیت مہناز سے گوایا۔

☆ میری جان مسکرا دے
تیرے بعد اس جہان مین کون ہے میرا

ہدایت کار اقبال اختر کی فلم ''آج کی رات'' جو 2 مئی 1983ء ریلیز ہوئی تھی اس فلم کے دو موسیقار تھے دلشاد اور لال محمد اقبال۔ موسیقاروں کی اس جوڑی لال محمد اقبال نے اس فلم کے لیے مہناز سے یہ دو گیت صدا بند کرائے۔ ان گیتوں کے گیت نگار مسرور انور تھے۔

☆ آنکھوں سے یہ تو نے کیسی پلا دی صندل سی خوشبو
☆ تیری گلیوں میں آتے جاتے

اسی فلم سے مہناز اور لال محمد اقبال یکجا ہوئے اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔

موسیقار امیر سلطان حیدر جو ریڈیو کے معروف موسیقار تھے۔ ہدایت کار گوہر علی نے اپنی فلم ''مانگ میری بھر دو'' سے انہیں فلمی موسیقار کے طور پر متعارف کرایا۔ امیر سلطان حیدر نے اس فلم کے لیے مہناز سے چار سولو گیت گوائے۔ یہ گیت موج لکھنوی نے لکھے تھے۔

☆ تمہیں پاکہ مجھے یوں لگ رہا ہے
کہ جیسے بہاروں کو خدا مل گیا ہو
☆ محفل ابھی ہے پیار کی
جو دیوانے چاہے شمع پہ جل مرے
☆ دل میرا توڑ کر تم کو کیا ملے گا آخر
☆ میں شمع محبت کی ناکام تمنا ہوں
تم مانگ میری بھر دو

''مانگ میری بھر دو'' 27 مئی 1983ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

موسیقار منظور علی شکور ہدایت کار گلزار احمد کی فلم ''آج کا انسان'' سے متعارف ہوئے۔ ان کی بنائی ہوئی دھن پر مہناز نے نغمہ نگار محمود کنول کا لکھا ہوا گیت گایا۔

شوخ ہوا آنچل نہ اڑا میرا مکھڑا بالم دیکھے گا

یہ فلم 19 اکتوبر 1984ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

فلم ''مستی خان'' سے متعارف ہونے والے موسیقار ستار حسین نے مہناز سے یہ دو گیت صدا بند کرائے۔

یہ فلم 1987ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اسی سال یعنی 1987ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''روکی دادا'' سے متعارف ہونے والے موسیقار سونی نے مہناز سے دو سولو اور ایک ڈوئٹ سانگ اے نیر کے ہمراہ گوائے۔ گیت کے بول نغمہ نگار شاہد ادیب کے تحریر کردہ تھے۔

☆ ہوگا نہ جانے کیا ہوگا
دل میرا صنم آج کھو گیا تو برا ہوگا
☆ پیار کیا ہے تجھ سے
چاہے لے لے قسم تو مجھ سے
☆ جانی میں دیوانی تیرے پیار کی
رت آئی موسم بہار کی

بابا جی اے چشتی کا مہناز سے نئی اشتراک اردو فلموں میں تو نہ ہو سکا۔ ہاں انہوں نے اپنی کچھ پنجابی فلموں میں مہناز کی آواز سے استفادہ ضرور کیا۔ دونوں کی پہلی مشترکہ فلم ''وکی تکی'' 21 مئی 1976ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ مہناز نے افشاں کے ہمراہ چار ڈوئٹ سانگ گائے تھے۔

موسیقار ایم ارشد نے مہناز سے فلم ''کرائے کے قاتل'' کے لیے یہ گیت گوایا۔

اتنے دن تیرے بن تڑپا ہے من
سلگا ہے تن تب کہیں آیا ہے یہ دن

یہ گیت سعید گیلانی کا تحریر کردہ تھا۔ فلم میں ممتاز پر عکس بند ہوا تھا۔ یہ فلم 1989ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسی فلم سے ایم ارشد اور مہناز یکجا ہوئے تھے۔

موسیقار ذوالفقار علی 1993ء کی فلم ''انہونی'' سے مہناز سے جڑے۔ یہ ہدایت کار رضا میر کی فلم تھی۔ اس فلم کے لیے موسیقار ذوالفقار علی نے مہناز سے دو گیت گوائے۔ جنہیں حبیب جالب نے لکھے تھے۔

☆ چھوڑ سیاں۔ ہے تو بڑا بے ایمان
یہ زورا زوری جانے دے
☆ ایسے نہ دیکھو مجھے سجنا رے
میں اک لہر ہوں تو اک ساگر

اسی سال فلمساز معین الرحمان کی فلم ''خواہش'' میں موسیقار جاوید اللہ دتہ نے مہناز سے چار گیت، جن میں دو تو اپنی مثال آپ تھے۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی ہدایت کار نذر الاسلام کا انتقال ہو گیا تھا۔ جاوید اللہ دتہ جو اب تک ٹی وی کے لیے موسیقی ترتیب دیتے رہے تھے۔ ''خواہش'' سے بطور فلمی موسیقار متعارف ہوئے۔ مہناز کی آواز میں یہ گیت دیکھیے۔

☆ موجوں کی روانی ہے
یہ زندگی کتنی سہانی ہے
یہ زندگی رنگ ہے روپ ہے
ساحلوں کی دھوپ ہے
چاندنی جیسا پانی ہے یہ زندگی کتنی سہانی ہے

یہ گیت ثمینہ پیرزادہ اور بابرہ شریف پر ساحل سمندر پر فلمایا گیا تھا۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

☆ یوں بھی ہم پیار کا سامان بنا لیتے ہیں
جو ہو قاتل اسے مہمان بنا لیتے ہیں

یہ غزل اداکارہ نیلی پر پکچرائز کی گئی تھی۔

ہدایت کار، گلوکار اور اداکار سجاد علی کی فلم ''ایک اور

لواسٹوری'' میں سجاد علی کے بھائی وقار علی موسیقار تھے۔ انہوں نے مہناز سے یہ خوب صورت گیت گوایا جس کی عمدہ گائیکی پر انہیں بہترین گلوکارہ کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔

☆ بھیگے بھیگے موسم میں بھیگی بھیگی وادیاں

ایوارڈ کی بات چلی ہے تو اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ خواتین گلوکاراؤں میں مہناز ایسی گلوکارہ تھیں جنہوں نے سب سے زیادہ، گیارہ نگار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ جن میں ابتدائی سات ایوارڈ 1977ء سے 1983ء تک انہوں نے مسلسل حاصل کیے تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

مایہ ناز گلوکارہ مہناز کا فلمی گائیکی کا سفر جو یکم نومبر 1974ء سے فلم ''حقیقت'' سے شروع ہوا تھا 8 مارچ 2002ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''سنگرام'' پر اختتام پذیر ہوا۔ یہ فلم عیدالفطر کے موقع پر ریلیز ہوئی تھی۔ جس کے ہدایت کار اقبال کاشمیری تھے۔ اس فلم میں مہناز نے اپنا آخری سولو گیت موسیقار وجاہت عطرے کی بنائی دھن پر گایا تھا۔ گیت کے بول وحید گیلانی کے تحریر کردہ تھے۔

ساتھیا! آ آج کھو جائیں دنیا ہم کو ڈھونڈیں
لیکن ہم کسی کے ہاتھ نہ آئیں

دوستوں! مہناز کی طلسمی آواز کا فائدہ پنجابی فلموں میں بھی اٹھایا گیا۔ ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پنجابی فلموں کے موسیقاروں نے بھی ان سے اپنی فلموں کے گیت گوائے۔ مہناز کی پہلی پنجابی فلم ''میراناں پاٹے خاں'' ہے جس کے موسیقار بخشی وزیر تھے اور ہدایت کار مسعود پرویز۔ گیت کے بول حزیں قادری کے تحریر کردہ تھے۔

رانجھن یار روے رانجھن یار میں تے تیرے سنگ

مہناز نے اس گیت کو بڑے رچاؤ سے گایا تھا۔ یہ فلم 21 مارچ 1975ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

مہناز کی دیگر پنجابی فلمیں یہ ہیں۔

اتھرا۔ اج دی گل۔ جوڑ توڑ دا بادشاہ۔ رجو۔ اج دی تازہ خبر۔ استاد شاگرد۔ انجام۔ بدتمیز۔ پنڈی وال۔ دو غلام۔ ٹھگاں دے ٹھگ۔ جٹ کڑیاں توں ڈردا۔ جوڑ برابر دا۔ چورنوں مور۔ دارا۔ وکی تکی۔ شیرا تے میرا۔ طوفان۔ غیرت۔ کون شریف کون بدمعاش۔ مغرور۔ وارنٹ۔ آخری گولی۔ اج دیاں کڑیاں۔ باغی تے قنون۔ بے گناہ۔ تن بادشاہ۔ جبرو۔ حاجی کھر کھر۔ خاموش دوستی تے دشمنی۔ دھرتی لہو منگدی اے۔ صدقے تیری موت توں۔ فراڈ۔ قانون ... رے بادشاہ۔ ارادہ۔ اکبر امر انتھونی۔ باڈی گارڈ۔ حیدر دلیر۔ جانی دوست۔ خون تے قنون۔ سب دشمن۔ شریف ضدی۔ شعلہ۔ علی جاہ۔ عمر قید۔ غازی علم دین شہید۔ قاتل تے اسمگلر۔ کرفیو آرڈر۔ کل دے منڈے۔ گوگا۔ لاٹھی چارج۔ بدلہ۔ پرمٹ۔ عداوت۔ چھانگا تے مانگ۔ مرزا جٹ۔ میدان۔ ووہٹی دا سوال اے۔ سالا صاحب۔ قسمت اور امانت۔ کئی سندھی فلموں کے لیے بھی مہناز نے گیت گائے۔

مہناز نے ایک بار اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔

''میں نے تو کبھی گلوکارہ بننے کا سوچا بھی نہیں تھا۔''

''پھر آپ گلوکارہ کیسے بن گئیں؟'' صحافی نے پوچھا تھا۔

''وہ...... بات کچھ یوں ہوئی.....'' مہناز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ''جب میں اسکول میں پڑھتی تھی۔ انہی دنوں ایک مرتبہ اسکول میں ایک فنکشن ہوا تو اس میں ایک لڑکی جو ہماری کلاس فیلو تھی۔ اس نے گانا گانا تھا۔ وہ لڑکی عین پروگرام کے وقت اپنی طبیعت خراب ہونے کی بنا پر نہ آسکی تو مجھے ہماری کچھ ٹیچرز نے کہا۔ ''مہناز! اس کی جگہ تم گادو۔''

تو میں نے پہلی بار اسکول کے اس پروگرام میں میڈم نور جہاں کا ایک ملی نغمہ

اے وطن کے سجیلے جوانو گایا تو خوب داد ملی اور سہیلیوں ہم جماعتوں نے مجھ سے کہنا شروع کر دیا۔

''ارے یار! تو تو بہت اچھا گاتی ہے۔''

''تو گانا شروع کر دے۔ ایک دن بڑی گلوکارہ بن جائے گی۔''

''ہائے اللہ! تیری آواز اتنی اچھی ہے۔ تو بس گانا شروع کر دے۔''

ایسی باتوں کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے گانا شروع کر دیا۔ شروع میں، میں نے میڈم نور جہاں کے مشہور اور مقبول گیت اور نغمات گائے۔ جس نے سنا پسند کیا اور یہی کہا۔ ''تمہیں تو باضابطہ گلوکاری شروع کر دینی چاہیے۔''

''یوں، میں پہلے ریڈیو پاکستان تک پہنچی پھر فلموں کی گائیکی کے لیے مجھے چنا جانے لگا۔''

مہناز کے بارے میں، میں نے یہ تو آپ کو بتا دیا کہ اس نے گیارہ نگار ایوارڈز حاصل کیے جبکہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ انہیں گریجویٹ ایوارڈ، فنکار ایوارڈ، مصور

ایوارڈ اور اسکرین ایوارڈ بھی ملے۔

مہناز نثار بزمی اور موسیقار روبن گھوش کی پسندیدہ گلوکارہ تھیں۔ اس دور کے سب ہی موسیقاروں نے اپنی فلموں میں مہناز کی آواز شامل کی۔

نثار بزمی نے اپنی سات فلموں میں مہناز کے 9 گیت شامل کیے۔ جن میں ☆ سچا تیرا نام سچا تیرا نام ☆ آنکھیں ہی کرتی ہیں سوال ☆ باہر ہے برسات بلا کی سردی ہے ☆ مجھ کو تم میری منزل بتا دو۔ جیسے مقبول گیت بھی شامل ہیں۔

روبن گھوش نے اپنی چار فلموں میں نو گیت گوائے۔ جن میں ☆ مجھے دل سے نہ بھلانا چاہے روکے یہ زمانہ ☆ وعدہ کرو ساجناں ☆ تجھے دل سے لگا لوں نینوں میں چھپا لوں ☆ لادے رے لادے رے جھمکا۔ بہت مقبول ہوئے۔

موسیقار کمال احمد نے اپنی بارہ فلموں میں 18 نغمات مہناز کے شامل کیے۔ جن میں ☆ نیلے گگن کے تلے ☆ دوستی تم سے دشمنی تم سے ☆ دو ساتھی جیون کے ☆ آ گلے سے لگا لوں۔ جیسے گیت بھی شامل ہیں۔

موسیقار ایم اشرف نے اپنی 16 فلموں کے لیے شہناز سے 26 گیتوں کی ریکارڈنگ کروائی جن میں ☆ جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے ☆ تیرے سنگ دوستی، ہم نہ توڑیں گے کبھی ☆ میرا تجھ سے ایسا بندھن ہے ☆ آنکھیں بڑی پاگل ہیں ☆ جب جب مجھ کو یاد کرو گے ایسے مقبول گیت بھی شامل ہیں۔

موسیقار نذیر علی نے اپنی چار فلموں میں مہناز سے 8 گیت گوائے۔ موسیقار وجاہت عطرے نے اپنی دو فلموں میں 3 گیت ریکارڈ کرائے۔ موسیقار واجد علی ناشاد نے اپنی دو فلموں میں مہناز سے 5 گیت گوائے۔ موسیقار کریم شہاب الدین نے اپنی دو فلموں کے تین گانے مہناز سے صدابند کرائے۔ موسیقار خلیل احمد نے اپنی تین فلموں کے چار گیت گوائے۔ موسیقار ناشاد نے اپنی 5 فلموں کے 5 گیت صدابند کیے۔

موسیقار کمال احمد، ماسٹر عبداللہ، نذیر علی، ایم اشرف، وجاہت عطرے، خواجہ خورشید انور، طافو، ذوالفقار علی نے اپنی اردو فلموں کے علاوہ اپنی پنجابی فلموں کے گیت بھی مہناز سے گوائے۔

تقریباً تمام ہی ہیروئنز پر مہناز کے گائے ہوئے گیت پکچرائز کیے گئے مگر بابرہ شریف پر ان کے گیت بہت ہی جچتے تھے۔

مہناز نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا اس وقت مادام نور جہاں، مالا، رونا لیلیٰ، تصور خانم اور نیرہ نور کا طوطی بول رہا تھا۔ ان بڑی، مستند اور مقبول گلوکاراؤں کی موجودگی میں مہناز کا اپنے آپ کو منوانا، اس کی خداداد صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔

مہناز نے اپنے دور کے سارے ہی سنگرز کے ساتھ ڈوئٹ سانگز گائے ؟ جن میں مہدی حسن، احمد رشدی، ناہید اختر، رجب علی، اخلاق احمد، غلام عباس، اے نیر، عالمگیر، سلمیٰ آغا، خالد وحید، شاہدہ منی، ترنم ناز، غلام علی، انور رفیع اور نور جہاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مہناز نے اپنا آخری فلمی گیت فلم ''سنگرام'' کے لیے گایا ہدایت کار اقبال کاشمیری کی فلم تھی جو 2001ء میں انہوں نے ریکارڈ کرایا تھا جس کے موسیقار وجاہت عطرے تھے۔ ان کی کمپوز کی ہوئی دھن پر سعید گیلانی نے گیت لکھا تھا یہ گیت اداکارہ نور پر فلمایا گیا تھا۔

اس سولو گیت کے بعد مہناز نے پھر گلوکاری نہیں کی۔ اس طرح یکم نومبر 1974ء میں فلم ''حقیقت'' سے فلمی گائیکی کا ان کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ 2001ء میں ختم ہو گیا۔

مہناز نے اس کے بعد جو زندگی گزاری اس میں ان کی سانس کی بیماری نے انہیں بہت پریشان کیا۔ اسی سانس کی بیماری کے علاج کے لیے انہوں نے امریکا جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر امریکا جاتے ہوئے بحرین ائرپورٹ پر سانس کی تکلیف اتنی بڑھی کہ وہیں دم توڑ گئیں۔ یہ 19 جنوری 2013ء کا..... دن تھا جس نے انہیں امریکا جانے کی مہلت نہیں دی اور انہیں ان کے آخری سفر پر روانہ کر دیا۔

اس خوب صورت آواز کی گلوکارہ کو ہم سب سے بچھڑے ہوئے سات برس بیت گئے ہیں مگر ان کی آواز، ان کے گیتوں کی صورت میں آج بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھی۔ وہ اپنی میٹھی اور سریلی آواز کے سہارے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔

اے کراچی! تو نے کیسے کیسے چاند سورج کو جنم نہیں دیا مگر آج تو جس حال میں ہے اسے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔



گھروندا ریت کا

سمی اعوان

زندگی کیسی پُرپیچ ہوتی ہے، کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے، کبھی شعلہ تو کبھی شبنم، زندگی کے انہی بدلتے رنگوں سے سجی ایک جداگانہ انداز میں ناستیلجیا۔

ایک دلچسپ انداز کی سرگزشت

”غلط بات! کہاں ٹپکتی ہے نحوست؟ میں تو ہر وقت دیکھتی ہوں ایسے ہیج چہرے اسمارٹ تازہ دم خوبصورت وجود اور حسین شکلیں۔ جن کے نقش ونگار کا مول نہیں۔ جن کی ملاحت اور رعنائیوں کا جواب نہیں۔

پھر ایک خاموش آواز تلخی سے بھری ہوئی اندر سے اٹھتی۔ ایک ہم جیسے بھی ہیں جو موٹے دوپٹے گیان دھیان سے اوڑھتے ہیں۔ اپنا آپ چھپا کر رکھتے ہیں پر چہرے ہیں کہ نہ ان پر رونق ہے اور نہ تازگی۔“

اور جب وہ ڈھاکا جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کا اٹیچی نئے اور خوش رنگ کپڑوں سے بھر گیا۔ استعمال اور ضرورت کی ہر شے اس نے اچھی اور عمدہ خرید لی۔ جوتیوں کے کئی جوڑے بھی بیگ میں ٹھونس لیے۔ دن وقت اور تاریخ کا تعین بھی ہوگیا اور جہاز میں پرواز کا ٹکٹ بھی اسے مل گیا۔

تب اس نے ایک خوفناک فیصلہ کر ڈالا۔

وہ شانوں پر ہلکورے کھاتے بالوں کے ساتھ ڈھاکا ائرپورٹ پر اترے گی۔

یہ خوفناک خیال جب پہلی مرتبہ اس کے دماغ میں آیا تو وہ ساری جان سے ایک پل کے لیے لرزی تھی۔ کسی نے دیکھ لیا۔ کسی کو پتا چل گیا؟ تب باتوں کی توپوں کے منہ کھل جائیں گے اور اس کا تیاپانچہ ہوجائے گا۔

جب ذرا خوف وہراس کی فضا سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لیا۔ راز کو راز رہنے کے امکانات کو کسوٹی پر پرکھا تب یہ کام اتنا کٹھن نظر نہ آیا۔

ہاں ڈھاکا جا کر بالوں کو سیٹ کروانے کی بھی ایک تجویز ذہن میں پیدا ہوئی پر اس تجویز سے وابستہ کچھ خدشات بھی ابھر کر سامنے آئے جن پر غور کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”نہیں یہ مناسب نہیں رہے گا۔“

اور پھر جس روز اسے سفر کرنا تھا۔ اس صبح وہ ایک دوست کی مدد سے اپنے اچھے خاصے لمبے بال تھوڑے سے کٹوا آئی۔ چوٹی موٹے جارجٹ کے ڈوپٹے میں چھپ گئی تھی۔

طیارے میں بیٹھ کر موٹی سی چوٹی کو اس نے ہاتھوں سے چھوا۔ شانتی اور سکھ سے لمبا لب بھرا سانس لیا۔ تین چار گھنٹوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ افشائے راز کا خوف اس سے الٹی پلٹی حرکتیں کروانے لگا تھا۔ وہ اپنی سیدھی سادی اور بڑ بولی ماں سے تو ذرا بھی نہ ڈرتی تھی۔ خوف تھا تو رشتے داروں کا جو بغیر بنیاد کے فضول اور بے تکی باتوں کی عمارت آناً فاناً کھڑی کر دیتے تھے۔

☆☆☆

اس وقت جب تیزی سے مغرب کو جاتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں کنٹین کی دیواروں کے لمبے لمبے شیشوں لگے دریچوں سے چھن چھن کر اندر قطار در قطار رکھے فارمیکا کی چکنی شفاف میزوں کی سطح پر بکھرتے ہوئے ایک بے نام سی اداسی کا گہرا احساس پیدا کر رہی تھیں۔ وہ گرم گرم سنگھاڑے (سموسے) کھانے اور کنٹین کے نئے ملازم لڑکے سے باتیں کرنے میں منہمک تھی۔ یہ کمزور سا لڑکا جس کے موٹے موٹے نقوش یہ بتاتے تھے کہ اگر وہ صحت مند ہوتا تو یقیناً وجیہہ لوگوں میں شمار ہو سکتا تھا۔ اس وقت اسے اپنی غربت کی داستان سنا رہا تھا۔ وہ داستان جو تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ اس کی اپنی داستان تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس نے محبت سے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر شفقت کھلی آواز میں اسے کہا تھا۔

”دیکھو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا سیکھو۔ جب جدوجہد تعمیری انداز میں آگے بڑھے گی تو تبدیلی ضرور پیدا ہوگی۔“

وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے اب اس کے چھ نکات پر تفصیلی بحث کرنے لگا تھا۔

تبھی ایک اجنبی چہرے نے اس کے بالکل قریب آکر کہا کہ اگر وہ ویسٹ پاکستانی ہے اور اس کا نام نجمہ شمشیر علی ہے تو گیٹ پر صبیحہ نامی ایک خاتون اس کا انتظار کر رہی ہے۔

اس نے پیغام دینے والی اس لڑکی کو دیکھا جس نے اسکرٹ کے نیچے اونچی ہیل کے سلیپر پہن رکھے تھے۔ وہ بنگالی نہیں تھی اس کی انگریزی شستہ اور خاصی رواں تھی۔ لب ولہجہ اور نقش ونگار افریقا کے جنوبی علاقوں جیسے تھے۔ شاید یہی وہ لڑکی تھی جس کے بارے میں دو دن پہلے باتیں ہو رہی تھیں جو تنزانیہ سے آئی تھی۔

اس وقت گرم چائے کا کپ اس نے اٹھا کر لبوں سے لگایا تھا چند گھونٹ بھرے تھے اور اب وہ سوچتی تھی کہ چائے ادھوری چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگے یا اس لذیذ چائے کو پوری پی کر جائے۔ اس نے دونوں کے بین بین کام کیا اور آدھا کپ چائے کا میز پر رکھ کر تیزی سے مشرقی دروازے سے نکل گئی۔ آدھے راستے میں جا کر یاد آیا کہ نہ تو پیسوں کا حساب کیا اور نہ ہی ادائیگی کی۔ پیسے تو ہاتھ میں ہی پکڑے رہ گئے۔ جی میں آیا کہ واپس جائے پر پھر یہ کہتے ہوئے کہ ابھی واپس آکر ادائیگی کرتی ہوں۔ قدم گیٹ کی طرف اٹھا دیئے۔

صبیحہ مقامی تاتاش گیس کمپنی میں ملازم تھی۔ گزشتہ دنوں اس سے ڈھاکا ٹی وی اسٹیشن کے اوڈیشن روم میں ملاقات ہوئی تھی جب وہ یونیورسٹی میگزین پروگرام کے سلسلے میں وہاں گئی تھی۔ چھبیس 26 ستائیس 27 کے ہیر پھیر میں یہ عورت نما لڑکی خاصی ملنسار تھی۔ جب اس کا ٹی وی اسٹیشن جانا ختم ہو گیا تب بھی وہ کبھی کبھی اس سے ملنے ہال چلی آتی۔

اس کی دوسری ٹرم ختم ہونے کو تھی جب ایک دن اس کی ساتھی لڑکیاں چٹا گانگ اور کاکس بازار کا پروگرام بنا بیٹھیں۔ نائیلہ نے ساڑھی کا آنچل درست کرتے اور کتابیں اٹھا کر کلاس روم کی طرف بڑھتے بڑھتے رک کر کہا۔

”بھئی ملک کی سیاسی فضا خاصی کشیدہ ہے تنہا چار پانچ لڑکیوں کا ٹرپ پر جانا کچھ ٹھیک نہیں۔ کسی قابل اعتماد آدمی کو ساتھ لو۔“

باقی لڑکیوں نے بھی نائیلہ کی اس بات سے اتفاق کیا۔

ایک دن جب صبیحہ اس سے ملنے یونیورسٹی آئی تو یونہی برسبیل تذکرہ اس سے بھی بات ہوگئی۔ صبیحہ نے اپنے چند ملنے والوں کے حوالے دیے کہ وہ ان سے بات کرے گی کہ اگر ان میں سے کسی کا آفس ٹور چٹا گانگ سائیڈ کا ہو تو وہ انہیں کمپنی دے دے۔ خرچا پول کر لیں گے۔ چلتے چلتے بھی اس نے صبیحہ

کو تاکید کرتے ہوئے کہا۔
''دیکھو اپنی مصروفیت میں اس اہم کام کو بھولنا نہیں۔ ہمارے لیے موسم اور وقت دونوں ہی بہترین ہیں۔ تھرڈ ٹرم شروع ہونے پر پھر سر اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔''
اور صبیحہ نے جواباً کہا تھا۔
''بھئی مجھے خود احساس ہے کہ یہاں کی خوبصورت اور قابلِ دید جگہیں تم دیکھ لو۔ بار بار کوئی آیا جاتا ہے اور پھر سیاسی حالات جس نہج پر جا رہے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ کب بوریا بستر گول کرنا پڑ جائے۔''
لمبے چوڑے آڈیٹوریم کو تیزی سے پار کرتے کرتے وہ اپنے آپ سے بولی تھی۔
''یقیناً صبیحہ نے کسی سے بات کی ہوگی اور اب اسے اطلاع دینے آئی ہے۔''
آہنی گیٹ کی چھوٹی کھڑکی میں سے جھک کر وہ باہر نکلی نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ پبلک لائبریری کی دیوار کے پاس ڈاٹسن میں بیٹھی صبیحہ ہاتھ ہلا رہی تھی۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر اس نے بھاگ کر سڑک پار کی۔ وہ اس وقت سفید نیلی بانم چیک شرٹ اور اس پر سیاہ چنا ہوا دوپٹا پہنے ہوئے تھی۔ گھنے سرخی مائل بال اس کے کندھوں پر لہراتے بل کھاتے بہت خوبصورت نظر آتے تھے۔ اس کے دلکش نقش ونگار، اندرونی سکون، اور بے فکری نے چنبیلی کے پھولوں جیسی رنگت والے چہرے کو رعنائی بخشی ہوئی تھی۔ خوشنما لباس اور انداز واطوار نے اس کی شخصیت کو من موہنا سا بنا رکھا تھا۔
اس کا اندازہ درست نکلا۔ صبیحہ حقیقتاً اس سے چٹا گانگ کے پروگرام کی تفصیل جاننے آئی تھی وہ اس سے اسی بابت باتیں کرنے لگی۔۔ اور کار میں بیٹھے کسی دوسرے شخص کا نوٹس نہیں لے سکی تھی، پھر دفعتاً جب اس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی اس نے دیکھا تھا اسٹیئرنگ کو بازوؤں کے ہالے میں لیے سیاہ گھنے بالوں اور خوبصورت آنکھوں والا مرد اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور جو بات وہ کر رہی تھی وہ بیچ میں ہی چھوٹ گئی۔
فوراً پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا۔ بھاری اور رعب دار آواز میں اسے بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ وہ تھوڑا سا جھجکی۔ صبیحہ نے اسے محسوس کرتے ہوئے کہا۔
''بیٹھو پروگرام سڑک پر کھڑے کھڑے تو طے نہیں ہوگا۔''

میمون بن مهران

117-40ھ

کوفہ کی ایک ازدی عورت کے غلام تھے۔ بعد میں اس نے آپ کو آزاد کر دیا۔ عرصہ تک کوفہ میں رہے مگر 180ھ میں عبدالرحمن بن اشعث کی شورشوں سے تنگ آکر جزیرہ چلے گئے اور وہیں رہائش اختیار کی۔ محمد بن مروان کے زمانے میں خراسان کے بیت المال کے نگران تھے۔ بعد میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں جزیرہ کے خراج کا عامل بنا دیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات پر انہوں نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ حدیث کے حافظ تھے، فقہ اور عمل وفعل میں بھی بہت ممتاز تھے۔
مرسلہ: ارشد عزیز، ساہیوال

اب حیل وحجت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ بیٹھ گئی۔ گاڑی نے خفیف سا جھٹکا کھایا اور چل پڑی۔ نیل کھیت کی سڑکوں کے موڑ تیزی سے کٹ رہے تھے۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

•

اور جب سیکنڈ کیپٹل کی ارغوانی عمارات نظر آنے لگیں تو اس سے پوچھا گیا کہ چٹا گانگ جانے والی لڑکیاں تعداد میں کتنی ہیں؟
اس کا لہجہ بڑا مدھم تھا جب وہ بولی۔
''اس سمیت چار۔''
''کوئی بنگالی بھی ہے؟'' ایک بار پھر پوچھا گیا۔
''نہیں۔ دو پنجابی ہیں اور دو آغا خانی۔''
''خیال رکھیں کہ آپ کے ساتھ کوئی بنگالی لڑکی نہیں ہونی چاہیے۔''
''اس کا مطلب۔''
اس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر سر سے لے کر پاؤں تک اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ابھی چند لمحے قبل صبیحہ نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے جس خاندان سے اس کے تعلق کو ظاہر کیا تھا اس کے متعلق وہ سن چکی تھی کہ وہ بنگال کا اونچا اور معزز گھرانا ہے اور خود وہ صوبائی حکومت میں اکیسویں گریڈ کا ایک اعلیٰ افسر۔

باپ رے باپ۔ اس نے خود سے کہا۔ پھر اپنے آپ سے پہلے بولی۔ ''کہیں یہ سیاحت کا شوق لے کر نہ بیٹھ جائے۔''

اس نے سوچا اور پھر چاہا کہ وہ اپنے اس خوف کا اظہار کسی نہ کسی انداز میں صبیحہ سے کر دے لیکن کیسے کرے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر جانے وہ کس خیال اور سوچ کے تحت خاموش رہی۔ پر اضطراب کے ہلکے ہلکے غبار میں ضرور لپٹی رہی۔ چینگوا کے سامنے گاڑی رکی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور بولا۔

''آیئے ایک کپ چائے پی لیں۔''

چائے اور وہ بھی ہوٹل میں۔ اس کا تعلق سوسائٹی کی جس کلاس سے تھا وہ ہوٹلوں میں جانے اور وہاں کھانے پینے کو سخت معیوب خیال کرتی تھی۔

اس نے صبیحہ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور قدرے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بکری کے بچے کے مانند ممنائی۔

''پلیز صبیحہ میں کبھی کسی ہوٹل میں نہیں گئی۔ مجھے معاف کردو۔''

''ارے مفت میں گھبرا رہی ہو۔ یہ کوئی ایسے ویسے ہوٹل نہیں ہیں۔ چلو آؤ۔''

اس نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''اور وہ جو دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے کھڑا ان دونوں کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ اب آگے بڑھا، اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''یہ اعلیٰ درجے کا ریستوران ہے۔ تھرڈ کلاس ہوٹل نہیں۔ گھبرائیں مت۔ آیئے۔''

وہ سخت شرمندہ ہوئی۔ شرمندگی کا یہ عکس اس کے چہرے پر بھی پھیل گیا اور یہی وجہ تھی کہ جب دروازہ کھولا گیا، وہ فوراً باہر نکلی۔ اس نے ان کے ساتھ قدم اٹھائے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدآدم آئینوں میں اس کی نظر اپنے سراپے پر پڑی۔ حیرت زدہ ہو کر اس نے سوچا۔

''یہ میں ہوں۔ ایسی شاندار اور گلیمرس لڑکی۔''

حقیقتاً اسے اپنا آپ اجنبی محسوس ہوا تھا۔

اردگرد کی بے شمار چیزیں اس کے تعجب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چپٹی ناکوں اور تکونی آنکھوں والے چینی دیکھ کر اسے پاکستان اور چین کے تعلقات پر بہت سی باتیں یاد آئیں۔ مسکراتے چہروں والے ویٹرز کو اس نے دلچسپی سے دیکھا۔

چائے آئی۔ صبیحہ نے بنانے کے لیے چائے دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا جب وہ بولا۔

''ٹھہرو اسے بنانے دو۔ دیکھتے ہیں جتنی شاندار یہ خود ہیں چائے بھی ویسی ہی بناتی ہیں۔''

اور سچ تو یہ تھا کہ اس کا سانس اس وقت گلے میں اٹک گیا۔

''میں۔''

گھبرائے ہوئے لہجے میں جب اس نے یہ کہا تو سرخ کیوٹکس میں ڈوبے ناخنوں والا ہاتھ خود بخود اس کے سینے پر آ گیا تھا۔

''ہاں ہاں آپ۔ میں نے یہ بات خالصتاً آپ کے لیے کہی ہے ہال میں بیٹھے کسی دوسرے انسان کے لیے نہیں۔''

وہ جو دونوں بازو میز پر رکھے اپنے چوڑے شانوں کو قدرے آگے جھکائے اسے نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اب کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ خفیف سی ہو گئی۔ ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچتے ہوئے اس نے ایک نظر گود میں پڑے اپنے دونوں ہاتھوں پر ڈالی اور دوسری میز پر رکھے برتنوں پر۔

سچی بات ہے سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات ہو گئی کہ اگلے بنے اور نہ نگلے۔

تب اس نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا۔

میں خود کو کبھی ان کلچرڈ نہیں کہلواؤں گی۔ اب یہ کس قدر سبکی والی بات ہے کہ میں اگر یہ کہوں کہ مجھے چائے بنانے اور پیش کرنے کے ایٹی کیٹس کا علم نہیں۔ اب اس میں میرا بھی بھلا کیا قصور ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں کبھی ایسے چائے بنی ہی نہیں۔ ہم لوگ تو کھولتے پانی میں چینی پتی اور دودھ سبھی کچھ ڈال دیتے ہیں۔ جب تینوں چیزیں پکتے پکتے بے حال ہو جاتی ہیں تب دیگچی کو چولہے سے اتار کر پیالیوں میں ڈالتے ہیں اور وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر سڑپ سڑپ کرتے ہوئے پی لیتے ہیں۔ کسی گھر میں جو بطور مہمان پی بھی تو مجھے یہ قطعی یاد نہیں کہ پہلے کون سی چیز کپوں میں ڈالی گئی۔

اور یہ شخص جو اس خوبصورت ماحول میں بہت اونچی شے لگ رہا ہے میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ میں کتنے بیک ورڈ گھرانے سے ہوں۔

''سو میں چائے ہرگز نہیں بناؤں گی۔''

اس کا اندر اس کے چہرے پر رقم ہو رہا تھا اور وہ جہاں دیدہ شخصیت اسے پڑھ رہی تھی۔

پھر اس نے مسکراتے ہوئے برتن اپنی طرف کھینچے اور

دھیمے سے بولا۔
''تو آپ چائے نہیں بنائیں گی۔''
اس نے صبیحہ کو دیکھا اس کی نظروں میں ایک التجا تھی۔
''بتایئے چینی کتنی؟''
دو خوبصورت کشش سے لبالب بھری آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔
''جتنی آپ کا جی چاہے۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے قدرے شوخی سے کہا۔
''بہت خوب۔''
اس کا مسکراتا چہرہ یہ بتاتا تھا کہ اس نے اس جواب کو پسند کیا ہے اور جب اس نے دودھ دان اٹھایا تو ایک بار پھر اسے دیکھا اور اسی شگفتہ انداز میں بولا۔
''میرا خیال ہے دودھ بھی مجھے اپنی مرضی سے ڈالنا ہوگا۔''
''جی۔ ہاں۔ آخر آپ کی پسند کی چائے پینے میں ہرج ہی کیا ہے؟''
اس بار جواب صبیحہ نے دیا تھا۔
اور جب اس نے کپ لبوں سے لگایا اس سے پوچھا گیا کہ اس کے والد کیا کام کرتے ہیں۔
''فوج میں میجر ہیں۔''
اس نے اعتماد سے گردن اوپر اٹھائی اور جواب دیا۔
اور عین اسی وقت ضمیر نے بھی لعن طعن کا سلسلہ شروع کر دیا۔
''کمال ہے۔ اب بھلا میں اس آدمی کو جو ایک بہت بڑا افسر ہے بتاتی ہوئی کیا اچھی لگوں گی کہ میرا باپ محض صوبیدار ہے۔ سچی بات کتنی ہلکی اور کم مایہ ہے۔ اس کا اظہار بندے کی بے وقعتی کو ظاہر کرتا ہے۔''
احساس کمتری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بار بار یہ سوچا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
اور پھر وہ پہلے کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھی انہوں نے اگلی نشستیں سنبھالیں اور ڈاٹسن سبک خرامی سے چل پڑی۔
جناح ایونیو کے پاس گاڑی رک گئی۔ صبیحہ کا گھر یہاں سے نزدیک تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔
وہ سٹپٹا اٹھی۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں اس سے صرف یہی کہا گیا۔
''آپ لوگ پہلے مجھے ڈراپ کر دیتے۔''
صبیحہ کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ بول اٹھا۔
''آپ چاہتی ہیں میں پھیرے لگانے میں جتا رہوں۔ آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد میرے لیے گھر جانا آسان ہوگا۔ ہاں گھبرایئے نہیں میں سندر بن کا چیتا نہیں جو آپ کو پھاڑ کھاؤں گا اور آپ یقیناً محسوس نہیں کریں گی اگر میں آپ سے اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہوں اس لیے کہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ لوگ مجھے آپ کا شوفر سمجھیں۔''
وہ خاموشی سے آگے آ کر بیٹھ گئی لیکن اسے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ بے چین بھی ہے اور خوف زدہ بھی۔
لڑکی بڑی معصوم اور بھولی بھالی سی ہے۔
تب نرم اور شفیق لہجے میں اس نے اس کے ساتھ باتیں کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بہن بھائیوں کی تعداد۔ وہ کیا کرتے ہیں اور کہاں کہاں مقیم ہیں؟ ملکی حالات، پوربو پاکستان کے مسائل اور اس کے خیال میں ان کا حل۔ اس نے ان سبھوں پر اسے بولنے کا موقع دیا اور اس کا مطمع نظر جانا۔
اور جب وہ اسے رقیہ ہال ڈراپ کرنے کے بعد گھر واپس جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت تھی اور آنکھوں میں شوخی۔ ایک طویل عرصے بعد اس نے Forget Me Not کی شوخ دھن بجائی۔
اور ہال کی لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے اس لڑکی نے جس کا نام نجمہ شمشیر علی تھا اپنے آپ سے کہا تھا۔
''میں تو یونہی خوف زدہ ہو گئی تھی۔''
☆☆☆
علی الصبح جاگنے کے بعد اس کا سب سے پہلا کام چٹا گانگ اپنی فرم کے منیجر شمس الدین عرف گورا کو فون پر اطلاع دینا تھا کہ وہ آج تقریباً دو بجے چٹا گانگ پہنچ رہا ہے اور یہ کہ وہ اس کے لیے واپڈا ہاؤس ریزرو کرا دے۔
''پر کیوں؟''
فون پر اسے گورا کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔
''فرم کا گیسٹ ہاؤس خالی ہے ایسے میں واپڈا ہاؤس کی ریزرویشن کی کیا ضرورت ہے؟''
''ضرورت ہے۔ آنے پر بتاؤں گا۔''
دریچے کا پردہ ذرا سرکا کر اس نے باہر جھانکا۔ ملگجا سا اجالا بکھرا پڑا تھا۔ غسل سے فارغ ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آیا۔ گھر سکون میں ڈوبا ہوا تھا۔ ملازم کے قدموں کی چاپ اور برتنوں کی کھنکھناہٹ کبھی کبھی اس سکون کو توڑتی تھی۔
☆☆☆

طاہرہ اور بچے ہفتہ بھر ہوا کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ طاہرہ کا چھوٹا بھائی انور پی کینیڈا سے کوئی آٹھ سال بعد آرہا تھا۔ سب بہن بھائی برسوں بعد اکٹھے ہو رہے تھے۔ بلایا تو اسے بھی شدومد سے تھا اس کی ساس کا دو دن مسلسل فون آتا رہا کہ انور پی تمہیں بہت یاد کرتا ہے اور تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔

خود انور پی کا بھی فون تھا کہ یار مانتا ہوں تم بہت بڑی ذمّے دار پوسٹ پر بیٹھے ہو۔ معروف بندے ہو۔ دیکھو ملنے کے لیے آجانا۔

اس کے پیشِ نظر بھی تھوڑی سی آؤٹنگ تھی کہ چلو اسی بہانے کام کے بوجھ سے تو بندہ نکل آتا ہے۔

دو دن قبل ہی میاں بیوی کے درمیان زبردست قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس نے سخت پیچ وتاب کھایا اور تفریح کے خیال پر دو حرف لعنت کے بھیجے۔ یہی وجہ تھی کہ جب طاہرہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ کلکتہ جانے کے لیے تیار ہوئی۔ جہاں آرا آپا اور دلدو آپا کا فون اسے ملا کہ تم بھی چلے چلو نا۔ بہت سال ہوگئے ہیں تمہیں گئے ہوئے۔

اس نے اپنے اندر کی تلخی کو دبا کر نرمی سے کہا۔

"آپا! طاہرہ تو جا رہی ہے۔ میرے لیے مشکل ہے۔ سویڈن سے ایک ڈیلیگیشن آرہا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ میٹنگ کے لیے ویسٹ پاکستان جانا ہے۔"

نوکر نے چائے دانی کو ٹی کوزی سے ڈھانپ دیا اور خود کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔

"دن بدن دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے۔" ٹوسٹ پر مارملیڈ لگاتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ "کھوٹے کھرے میں تمیز ہی نہیں رہی۔ سلیم احمد گھوندوکار کر کے تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی ہے۔"

زمین کی خریداری میں اس کی اس درجہ دلچسپی کہ میں کنال پر مصر اور اس کا کہنا کہ گھر کوئی روز روز بنایا جاتا ہے۔ دو کنال سے تو ہرگز کم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر "بنانی" (ڈھاکا کا پوش ایریا) میں ایسا پلاٹ جو انی جائے وقوع کے اعتبار سے بہت سے لوگوں کے لیے کشش کا باعث تھا۔ اسے خالصتاً میرے لیے حاصل کرنے کی جدوجہد میں اس کا ہلکان ہونا کچھ کہنے، کچھ بتانے، کچھ واضح کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ محبت اور خلوص کے بغیر ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ خیر سے یہ ہیں کہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے اژدہام میں ہی الجھی رہتی ہیں۔ اس کی کسی بھی کاوش کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔ سمجھتی ہیں سلیم احمد کھوندوکار ان کے سیدھے سادھے بھولے بھالے شوہر کو بیوقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہے۔ شوہر بھی چوچہ بچہ۔ ہے جسے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ سارے زمانے کا خرانٹ اور زمانہ ساز آدمی جسے کھوندوکار۔ لوٹ لینا چاہتا ہے۔ لاکھ سمجھاؤ پر مجال ہے جو اس کے خانے میں کچھ بیٹھ جائے۔ جب دیکھو زبان زہر ہی اگلتی ہے۔ سمجھ نہیں آتا اس کی اچھی بھلی عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے ہیں؟

انور پی سے اس کی ملاقات اپنی منگنی پر ہوئی تھی۔ بڑا ذہین اور انقلابی سالڑکا دکھتا تھا۔ ایم ایس سی فزکس سے فارغ ہوا تھا۔ نوکری کی تلاش میں تھا اور اچھی جگہ نہ ملنے پر بڑا جزبز بھی تھا۔ اجتباء الرحمٰن نے کہیں پوربو پاکستان آنے کا کہہ دیا۔ تڑ سے بولا تھا۔

"لو ڈھاکا میں کیا دھرا ہے؟ بالکل پنڈ۔ کلکتے جیسے بڑے شہر میں مجھے اپنے ڈھنگ اور مزاج کی نوکری نہیں مل رہی ہے۔ وہاں جا کر تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکا والی بات ہو جائے گی۔ نہ بابا نہ۔ مجھے تو ہر صورت باہر نکلنا ہے۔"

اپنے چار روزہ قیام میں انور پی نے ناصرف اسے کمپنی دی بلکہ ہر طرح اس کا خیال بھی رکھا۔ انگلینڈ سے امریکا اور امریکا سے کینیڈا اپنی ہجرتوں کی کہانیوں سے وہ اسے ہمیشہ باخبر رکھتا تھا۔

ملازم نے اس کے کہنے کے مطابق اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اٹیچی کیس میں بند کیں اور اسے ڈکی میں رکھ دیا۔ نوکر کو ضروری ہدایات دے کر وہ کار میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کیا۔

یہ بائیس فروری کی صبح تھی۔ اکیس فروری کا اہم دن گزر چکا تھا۔ خلاف معمول اس سال اردو اور بنگلہ پر جھگڑا نہیں ہوا۔ سابقہ سالوں کی طرح توڑ پھوڑ تو ہوئی پر نسبتاً کم پیمانے پر۔

کار چلاتے چلاتے اس نے ریڈیو آن کیا اور مختلف اسٹیشن ٹیون کرنے لگا۔ اس وقت وہ خاصا مسرور نظر آرہا تھا۔ نکھری اور خوشگوار صبح کا حسن اس کے چہرے اور آنکھوں میں بھی نظر آرہا تھا۔

رقیہ ہال کے سامنے اس نے گاڑی روکی اور اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ سب سے پہلے وہ اس لڑکی کو پک کرنا چاہتا تھا۔

اور بیک کوریڈور کی بیرونی دیوار پر کہنیاں ٹکائے، ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی کو تھامے وہ لڑکی جس کا نام نجمہ شمشیر علی تھا خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی

چاہتا تھا وہ بیڈ پر گرے اور آنکھیں بند کرلے... کیونکہ پپوٹے اتنے بوجھل سے تھے کہ آنکھوں کو کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔

اصل میں چٹا گانگ جانے کی امنگ اور ترنگ اتنی شدید تھی کہ جس نے رات بھر خاصا مضطرب رکھا تھا۔ ساری رات ہی کچھ سوتے اور کچھ جاگتے گزری۔ ذرا آنکھ لگتی تو دیکھتی کہ وہ سب لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہ حیران پریشان اپنا سامان اٹھائے ان کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔

چٹا گانگ ہل ٹریکس کے بارے میں کہانیوں کی فینٹسی نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ کاکسس بازار کی خوبصورتی کے جتنے چرچے تھے جی چاہتا تھا کہ اللہ کہیں پر لگ جائیں، اڑ کر وہاں پہنچ جائے اور دلکش نظاروں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ روح کو سیراب کرے۔

اسے تو اس وہم نے بھی گھیرے میں لے رکھا تھا کہ انسان جس چیز کے لیے زیادہ بے چین ہو، زیادہ خواہش مند ہو، زیادہ مضطرب ہو۔ بالعموم ایسی خواہش کی تکمیل میں کوئی نہ کوئی پھڈا پڑ جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ آڑے آجاتا ہے۔

"ارے بھئی اب جو پروگرام بنا ہے تو اللہ اسے پروان چڑھا ہی دے بیچ میں کوئی روڑا نہ اٹکے۔"

رات کے تاریک لمحوں میں اس نے کتنی بار یہ اپنے آپ سے کہا تھا۔

اب یہ بھی تو شوق کی انتہا ہی تھی کہ اس اجنبی مرد کے اجنبی بیوی بچوں کی خیریت کی دعائیں بھی مانگی گئی تھیں... کیونکہ کسی کی بھی بیماری اور ناسازی طبع ان کے پروگرام کا بیڑا غرق کر سکتی تھی۔

میز پر رکھی گھڑی دیکھی۔ سوئیاں سات اور بارہ کے ہندسوں پر رقصاں تھیں۔

وقت تو سات بجے کا ہی تھا۔

وہ خود سے مخاطب ہوئی لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ وقت کا خیال رکھے۔ بڑے لوگ بالعموم بے پروا ہوتے ہیں۔ وقت طے ہونے کے باوجود دیر سے پہنچنا فخر سمجھتے ہیں۔

اور ٹھیک اسی وقت نوکر نے اسے کارڈ دیا۔ خوشی کی ایک لہر اس کے انگ انگ سے اٹھی اور اسے مسرور و شادمان کر گئی۔

تو گویا بڑے لوگوں کی بے پروائی والا قیاس تو میرا غلط ثابت ہوا۔ پروگرام کے یقینی تکمیل پا جانے کی سرشاری کی کیفیت والی لہر جو اس کے اندر سے اٹھی تھی وہ فوراً اتر بھی گئی کیونکہ اس نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی تھی۔ اس نگاہ نے اسے شرمندگی کے پاتال میں پھینک دیا تھا۔

الجھی الجھی پریشان وہ کوریڈور سے کمرے میں آئی۔ دروازے میں اک ذرا رک کر اس نے نوکر سے کہا کہ وہ اس کے مہمان سے کہے کہ وہ بس ابھی آتی ہے۔

اس نے اپنے سراپے کو دیکھا۔ برش کرنا تھا۔ باتھ لینا تھا۔ چلو ناشتا اتنا اہم نہیں تھا۔ اس کا وقت بچایا جا سکتا تھا پر تیار بھی تو ہونا تھا۔ مائی گاڈ سارے کام کرنے والے تھے۔

وہ فوراً باتھ روم میں گھسی۔ نہانے کا ارادہ چھوڑ کر الٹا سیدھا منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور خالی پیٹ چیزیں اٹھا کر باہر بھاگی۔ کاموں کو برقی رفتار سے نمٹانے کے باوجود اس نے پندرہ منٹ لے لیے تھے۔

اس دوران صبیحہ ہال پہنچ چکی تھی۔

اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اس نے صبیحہ کو دیکھا اور کسی قدر تلخی سے بولا۔ "تم اگر میرے بارے میں زیادہ نہیں پر تھوڑا سا تو جانتی ہی ہو۔ خاص طور پر کہ مجھے انتظار کرنے سے چڑ نہیں نفرت ہے۔ خصوصاً وہ بھی لڑکیوں کا۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ سب کو ضروری امور پر بریفنگ دے دو کہ انہیں کن کن باتوں کا خاص خیال رکھنا ہے اور وقت کی پابندی تو سب سے اہم ہے کہ اسی پر روزمرہ پروگرام کا انحصار ہوتا ہے۔ اب ان کل کی چھوکریوں کے حضور خود اور گاڑی کو یوں کھڑا رکھنا میرے لیے تو ناقابل برداشت ہے۔"

اگر آئندہ اس امر کا خیال نہ رکھا گیا تو یہ طے ہے کہ میں آپ سب لوگوں کو وہیں چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔

صبیحہ سے اس کے گہرے مراسم تو نہیں تھے پر کبھی کبھار کی لانگ ڈرائیو دوستی میں وہ اس کی چند مخصوص عادتوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی اسی لیے گھبرا کر فوراً بولی۔ "میں نے انہیں تاکید کی تھی......"

صبیحہ کے مزید کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ آگئی۔ معذرت کا ایک لفظ بھی اس سے بولا نہ گیا۔ یوں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ سرتاپا معذرت بنی ہوئی تھی۔ شرمسار سا چہرہ، ہاتھوں میں پکڑا بے ترتیب سا سامان، خاموش اور جھکی جھکی نگاہیں۔

اس نے ایک گہری اور تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی۔ دروازہ کھولا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

اس کے چہرے پر چھائے خجالت کے بادلوں نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ گاڑی جب بیت المنیرہ جانے کے لیے اس نے ائرپورٹ روڈ کی طرف موڑی تب اس نے رخ پھیر کر پوچھا۔ "میرا خیال ہے آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا

ہوگا۔ پر آپ کرتی کیا رہیں۔''

وہ چپ گم صم سر جھکائے ہاتھ میں پکڑی اشیاء سے کھیلتی رہی۔ جواب کیا دیتی کہ سوچوں کی کن گھمن گھیریوں میں پھنسی ہوئی تھی اور رات کیسے کٹی تھی؟

اور جب اس نے ہاتھ میں پکڑی اشیاء کو بیگ میں ڈال کر سمیٹنا چاہا۔ اسے محسوس ہوا کہ کلائی کی وہ گھڑی جسے وہ جلدی میں باندھ نہیں سکی تھی وہ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ چار سو روپے کی گھڑی جسے وہ یہاں آنے سے پہلے خرید کر لائی تھی۔ کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس نے جلدی جلدی بیگ کو ٹٹولا۔ دوسری چیزیں دیکھیں صبیحہ نے اس کی یہ پھرولا پھرولی دیکھی تو پوچھا۔

اس نے کہا۔ ''معلوم نہیں گھڑی کہاں گر گئی ہے؟''

اس نے بھی یہ بات سنی۔ گاڑی کی ایک طرف کھڑی کر کے گردن پیچھے موڑی اور نرم سی آواز میں کہا۔ ''چیزیں اچھی طرح دیکھیے۔''

''اچھی طرح دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ کوئی تھی وہاں جو ملتی۔''

صرف ایک پل کے لیے اس کا جی اپنی اس خوبصورت اور مہنگی گھڑی کے یوں گم ہونے پر یہ درخواست کرنے کو چاہا کہ اگر وہ تھوڑی سی دیر کے لیے گاڑی کا رخ ہال کی طرف موڑ دے تو وہ وہیں کہیں کوریڈور، کسی فٹ پاتھ یا گیٹ کے پاس راستے پر پڑی ہوگی۔

پر لمحہ بھر کے لیے ایسا صرف سوچا ہی جا سکتا تھا۔ کہنا تو ناممکن سی بات تھی۔ اس نے تو پہلے ہی خاصی دیر کروادی تھی۔

بیت المنیرہ میں ثریا اور نازلی کا گھر تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ تیار اور گاڑی کے انتظار میں مین سڑک پر موجود تھیں۔

سرکٹ ہاؤس کے یوٹیرا فلیٹز سے صفیہ شامل ہوئی۔

صفیہ کے والدین کا تعلق پنجاب کے ضلع سیالکوٹ سے تھا۔ اس کا باپ علی گڑھ کالج سے گریجویشن کے بعد کلکتہ میں سیٹ ہوگیا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ پوربو پاکستان آگیا اور پھر یہیں کے ماحول میں رچ بس گیا۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں بنگالی گھروں میں بیاہی گئی تھیں۔

گاڑی کومیلا روڈ پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

پتا نہیں کون سا اسٹیشن تھا۔ بہت اچھے گیت آ رہے تھے۔ سبھی خوش و خرم تھے اور خوب خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ جب اس نے پیچھے رخ پھیر کر اس سے کہا۔ ''لڑکی تم اتنا چہک رہی ہو۔ تمہیں گھڑی گم ہونے کا ذرا افسوس نہیں۔''

''اب کیا افسوس کروں؟ چیزیں گمانا تو میری پرانی عادت ہے۔ واپس آ کر ابو کو لکھوں گی نئی بھیج دیں گے۔''

اس نے اپنی خوبصورت لانبی گردن اونچی کی۔ نتھنوں کو پھلایا اور اپنے آپ سے کہا۔ ''اب جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ بار بار اظہار سے چھوٹے پن کو ظاہر کروں۔ یہ تو مناسب نہیں اور ایسا کرنے سے اگر کھوئی ہوئی چیز واپس مل جائے تب بھی ایک بات ہے۔ جب یہ سب ممکن نہیں تو فائدہ؟''

یوں یہ اور بات تھی کہ ہر پندرہ بیس منٹ بعد اس کے دل سے ایک درد بھری ہوک سی اٹھتی اور اسے بے کل کر جاتی۔ ''ارے ابھی تو پہننے کا چاؤ بھی پورا نہیں ہوا اور گم بھی ہوگئی۔ جانے کس کے جوگے لگی۔''

☆☆☆

چٹاگانگ کے اس اعلیٰ درجے کے چینی ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے اسے شدید خفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ایسے کھانے اور کھانوں کے یہ ایٹی کیٹس بھلا اس نے کب دیکھے اور کہاں سیکھے تھے؟ وہ تو اپنے گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے میں کالج جانے سے پہلے اور واپس آ کر چھوٹی سی چوبی چوکی پر جا کر بیٹھتی۔ اماں گرم گرم پھلکے اتارتی جاتی اور وہ سب بہن بھائی باری باری کھاتے جاتے۔ کبھی کبھی جب اتفاق سے وہ اکٹھے ہو جاتے تب ان کے درمیان لڑائی ہوتی پہلا پھلکا میرا۔ وہ زور سے چلاتی۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ پہلا میں کھاؤں گا۔''

اس کا چھوٹا بھائی یونیفارم اتارے بغیر ہی بھاگ کر آجاتا اور اسے پیچھے دھکیلنے لگتا۔

کبھی کبھی ماں چہرے پر محبت و پیار کی مسکراہٹیں سجائے انہیں دیکھتی اور پیار بھری خفگی سے کہتی۔

''لڑتے کیوں ہو میں نے تو آنکھ جھپکتے پھلکوں کا ڈھیر لگا دینا ہے تم کھانے والے بنو۔''

اور واقعی ایک کے بعد ایک روٹی توے سے اتر کر چنگیر میں آتی جاتی اور وہ سب کھاتے جاتے۔

کبھی کبھی ماں کھانا ختم ہونے کے بعد ان سبھوں سے کہتی۔

''شکر ادا کرو اللہ کا۔''

باقی سب تو خاموش ہی رہتے پر وہ ضرور کہتی۔ ''ماں تم بھی کمال کرتی ہو۔ کیوں شکر ادا کریں؟ اس نے کون سا ہمیں انڈے مرغے کھانے کو دیئے ہیں۔ ہر روز مسور کی پتلی

دال۔ یہ بھی نہ دے گا تو کیا خاک دے گا کھانے کو۔"
ماں توبہ توبہ استغفار۔۔۔ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتی اور ساتھ ہی اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتی۔ اس کے بھائی بہن ہنستے۔ منجھلا والا ماں کو مزید چڑانے کے لیے کہتا۔
"ماں بھی ٹھیک کہتی ہے۔ دیکھو نا مسور کی دال کھا کر شکر ادا کرنا شروع کر دیا تو اللہ کو اتراہٹ آجائے گی۔ اور وہ ہمیں کبھی اچھے کھانے نہیں دے گا۔"
اس سے پیشتر کہ ماں جوتا اٹھا کر اسے مارتی وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔ بڑا بھائی ماں کے گھٹنے پکڑ لیتا اور ہنستے ہوئے کہتا۔ "واہ ماں تم تو یونہی خفا ہونے لگ جاتی ہو۔ ارے یہ تو ہمارا اس نیلی چھتری والے سے ہنسی مخول ہے۔" ماں اس پر اور بھی تلملاتیں۔
"لو وہ ان کے ہنسی مخول کے لیے ہی تو ہے۔ میں کہوں تمہاری عقلوں پر کیوں جھاڑو پھر گیا ہے یہ یا زیادہ پڑھنے سے تمہارے دماغ خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"
"میں تو حیران ہوں۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی "تمہیں کالجوں میں یہی تمیز سکھاتے ہیں۔ یہی بتاتے ہیں کہ اس دوجہاں کے بادشاہ کی شان میں ایسے گستاخی کے کلمات نکالو۔"
"ارے ماں۔" بڑا بھائی دبلی پتلی ماں کو اپنے کلاوے میں بھر کر چکریاں دیتا اور کہتا۔
"تم کڑھا مت کرو۔ وہ انسانوں کی طرح تھڑدلا نہیں۔ بڑا جگرے والا ہے۔ غصہ نہیں کرتا ہم بچوں کی باتوں کا۔"
ایسی ہی ٹھٹھول بازی میں وہ ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے بکھر جاتے۔
ہلکی نیلی دیواروں والے اس بے حد خوبصورت کمرے میں جس کی چھت سے لٹکتے فانوسوں سے چھنتی روشنی بڑا لطیف سا احساس پیدا کر رہی تھی۔ آرکسٹرا بہت دھیمے سروں میں بج رہا تھا۔ چکنی شفاف میزوں پر گلاسوں میں ٹھنسے سفید نیپکن اچھے لگ رہے تھے۔ چھری کانٹوں کی کھنک، خوش ذائقہ کھانوں کی مہک، ساتھی لڑکیوں کی کانٹوں چمچوں سے کھیلتی انگلیاں، داہنے ہاتھ بیٹھے ہائی جینٹری سے تعلق رکھنے والے مرد جو کھانے کے ساتھ ساتھ بڑی انٹیلیکچوئل قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ سبھی ٹھیک تھے۔
اور اگر ٹھیک نہیں تھی تو وہ لڑکی جو بھوک سے بے حال ہو رہی تھی۔ جس کا جی چاہ رہا تھا کہ میز پر پڑے ان خوشنما کھانوں پر ٹوٹ پڑے اور بغیر ڈکار لیے سب کچھ ہضم کر جائے۔
پر یہ کہیں ممکن تھا؟
اور وہ وجیہہ اور پُر وقار چہرے والا مرد جو اپنے ساتھی مرد کے ساتھ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کی بھی ایک ایک حرکت کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔
اس کی خوبصورت پیشانی اور ہونٹوں کے بالائی حصے پر پسینے کے ننھے منے قطروں نے گویا ہیرے سے سجا دیئے تھے۔ ایسا من موہ لینے والا حسن جسے باہر کی دنیا کی ہوا ہی نہ لگی ہو کہ دیکھتے ہوئے محظوظ بھی ہو رہا تھا۔
کھانے کے بعد جب وہ دونوں تھوڑا سا آرام کرنے کی غرض سے ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں آئے۔ شمس الدین عرف گورا نے اسے تعجب آمیز حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"یار میں حیران ہوں۔ ان اچھی بھلی معزز اور شریف گھروں کی لڑکیوں کو تم کیسے لے آئے؟"
وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ گورا کی اس بات پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ جلایا اور گہرا کش لیتے ہوئے خفیف سا مسکرایا بھی۔
"خیال رہے میں بھی کم معزز نہیں۔ دوسرا رہا سوال لانے کا تو بھئی اس کا کریڈٹ مجھے نہیں اس ویسٹ پاکستانی لڑکی کو جاتا ہے جس کا نام نجمہ ہے۔ تھوڑا سا کردار صبیحہ کا بھی ہے۔"
"تم کچھ زیادہ چوڑے نہیں ہو گئے ہو۔ بھابی کو پتا چل گیا تو تمہاری کھنچائی تو جو ہو گی سو ہو گی۔ میری بھی خیر نہیں۔"
"کھلی چھٹیاں۔ طاہرہ آج کل کلکتے میں ہے۔"
"اوہو۔ تبھی۔" گورا نے قہقہہ لگایا۔
اور اس نے اس بات پر کچھ کہنے کی بجائے یہ پوچھا۔
"کھورانگاماٹی چلتے ہو؟"
"نہیں یار بہت کام ہے۔ پرسوں کاکسس بازار کے لیے ساتھ دوں گا۔"
کوئی دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد لڑکیاں نہانے، لباس تبدیل کرنے کے بعد تازہ دم چٹاگانگ شہر کی سیر کے لیے تیار تھیں۔ ہنستے مسکراتے چہروں اور رنگا رنگ ملبوسات سے اٹھتی ہوئی مختلف پرفیومز کی بھینی بھینی خوشبوئیں اڑاتی، چہکتی، گنگناتی لڑکیاں جب اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اسے محسوس ہوا تھا جیسے بہار رقص کرتی جھومر ڈالتی اس کے آنگن میں اتر آئی ہے۔
وہ اس وقت اپنی ذاتی کمپنی کے ڈرائیور کو گاڑی کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا کہ صبح رانگاماٹی کے لیے اسے

کون سی لگاڑی چاہیے ہوگی۔

بس یہ اس کا کمال تھا کہ لڑکیوں کے گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اس نے اس خوبی سے ہیر پھیر کیا کہ نجمہ اس کے پاس اگلی نشست پر بیٹھی۔

رانگا ماٹی کا راستہ بہت خوبصورت تھا۔ ریڈیو پر نشر ہونے والے گیت بھی اتفاقاً ایک تسلسل سے کمال کے تھے۔ امنگیں بیدار کرنے اور ہلچل مچانے والے۔ پاس بیٹھی لڑکی نا صرف حد درجہ حسین تھی بلکہ معصوم اور بھولی بھالی عین اس کی دیرینہ تمنا اور آرزو کے مطابق۔ وہ شگفتہ پھول کی طرح کھلا گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ ان سب کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

ثریا، نازلی، صفیہ اور صبیحہ بھی زور و شور سے باتوں میں جتی ہوئی تھیں۔ وہ البتہ خاموش تھی۔ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے معلوم نہیں اسے کیا ہوا۔ دل شدت سے دھڑکا۔ سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے یہ سب دیکھا اور گاڑی سڑک سے نیچے اتار کر روک دی۔

''باہر نکلو۔ تازہ ہوا میں تھوڑی سی چہل قدمی کرو۔''

میناؤں کی طرح چہکتی وہ سب بھی چونکیں۔ چاروں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

اس نے اصرار سے اسے باہر نکالا۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے وجود سے بغل گیر ہوئی۔ اسے سکون سا محسوس ہوا۔ جب وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو اس کا جی چاہا وہ صبیحہ سے کہے کہ وہ آگے بیٹھے لیکن وہ ایسا نہ کہہ سکی۔

رانگا ماٹی پہنچے تو جنگل میں منگل کا سا سماں تھا۔ مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدیداران آئے ہوئے تھے۔ سارے سرکٹ ہاؤس پر تھے۔

وہ تھوڑا سا گھبرایا اور اپنے آپ سے بولا۔ ''کمال ہے مجھے تو یاد نہیں رہا۔ پر اس کمبخت گورا نے بھی بات نہیں کی۔ اب کسی نہ کسی واقف کار کا ملنا ناگزیر ہے۔''

اس نے کوفت اور بیزارگی سے سوچا۔ اونچی اور اہم پوسٹوں پر کام کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ بندے کی نجی زندگی فوراً نگاہوں میں آ کر زبان زد عام ہو جاتی ہے۔ بہتر ہے لڑکیوں کو اکیلے ہی گھومنے پھرنے دیا جائے۔

کسی محفوظ سے ہوٹل میں کمرا ڈھونڈنے کی ساری کوشش اس نے اکیلے کی۔ کمرے ملے تو ضرور پر صرف دو۔

وہ تذبذب میں ڈوبا دیر تک سوچتا رہا اور پھر ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''بھئی فیصلہ کر لو لڑکیو۔ کیا ہونا چاہیے؟ کمرا چھوٹا ہے اور تمہیں اس میں تنگی تو ضرور ہوگی۔ پر مجبوری ہے۔''

صورت حال کی سنگینی ان کے سامنے بھی تھی۔ وہ سب بھی اس سے آگاہ تھیں۔

وہ تو خاموش ہی تھی۔ ثریا اور صبیحہ نے کہا۔ ''خیر ہے۔ رات ہی تو گزارنی ہے۔''

لہٰذا ''خیر ہے'' کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''ہر طرف سے جواب سن سن کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہ رات رانگا ماٹی کی سڑکوں پر ہی گزرے گی۔'' صبیحہ نے سامان کو کمرے میں سلیقے سے رکھتے ہوئے کہا۔

چیختے چلاتے اور شور مچاتے انسانوں سے پر وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں غربی کونے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسے احساس تک نہ ہوا کہ وہ اس کے داہنے ہاتھ بیٹھا ہوا ہے اور مینو کارڈ پر جھکا مختلف آئٹمز پر نشان لگانے میں مصروف ہے۔

وہ ایک بار پھر اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر ساری جان سے لرزی تھی۔

''ستیاناس وہ پہر بھی بھوکی ہی رہی تھی اور اب بھی لگتا ہے خالی پیٹ ہی اٹھوں گی۔ بیٹھ گیا ہے میرے کلیجے پر چڑھ کر۔'' اس نے غصے اور بے چارگی سے اپنے آپ سے یہ کہا اور نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ساس کا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''سوپ میں اسے ڈالو۔ اچھی طرح ملاؤ اور پھر کھاؤ۔ لذیذ لگے گا۔''

کھانے کے دوران اس نے یوں تو ساری لڑکیوں کی طرف ہی توجہ دی مگر اس کا خصوصی خیال رکھا اور وہ تھی کہ خجالت کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔

''ارے یہ لوگ کیا سوچتی ہوں گی؟'' اس نے بار بار چور آنکھوں سے انہیں دیکھا اور اپنے آپ سے کہا۔

ثریا یا نازلی اور صفیہ کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ روشن اور آزاد خیال گھرانوں کی پروردہ وہ الٹرا موڈرن لڑکیاں جو اس کی دوست بھی تھیں اور اس کے ساتھ مخلص بھی۔ اس وقت تو یوں بھی و

باتیں کرنے اور کھانا کھانے میں جتی ہوئی تھیں۔
ہاں البتہ صبیحہ کی آنکھوں میں اس نے عجیب نفرت بھرے جذبات محسوس کیے تھے۔
''لعنت ہے اس پر۔'' اس نے اپنے دل میں اسے کوسا۔
''بھلا سنپولیے جیسا زہر اس نے کیوں اپنی آنکھوں میں بھرلیا ہے؟ اس کا اپنا کوئی چکر ہوگا۔''
کھانا کھانے کے بعد وہ سب باہر آگئے۔ فضا تاریک تھی۔ سارے میں سناٹا تھا۔ دکنی ہواؤں میں تیزی تھی۔ یہ تیزی بالوں کو اڑائے دیتی تھی۔ بار بار منیہ کی طرف دوڑتے بھاگتے بالوں کو روکتے روکتے وہ عاجز آگئی تھی۔
دائیں طرف ندی تھی۔ ندی کے موڑ کے پاس ہی پہاڑی پر پاور ہاؤس تھا۔ اس سناٹے میں مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ بڑی واضح تھی۔
وہ چاروں سڑکوں پر ٹہلتی رہیں۔ صبیحہ کمرے میں چلی گئی تھی اور وہ لاؤنج میں بیٹھا سگار پیتا اور اگلے دن کی پلاننگ کرتا رہا۔
صبح وہ بہت سویرے جاگی تھی۔ سب ابھی سوتے تھے۔ پنجوں کے بل چلتی وہ باہر آگئی۔
صبح کا پُرنور اجالا سارے میں بکھرا ہوا تھا۔ اسوک کے پھولوں نے، سبزے کی طراوت نے اور سرکٹ ہاؤس کی دیواروں پر کاسنی پھولوں کی بیلوں نے فضا کو حسین بنایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک وہاں بیٹھی فطرت کے حسن کو دیکھتی رہی اور اس وقت چونکی جب ثریا اسے تلاش کرتی وہاں آئی۔
''عجیب تھرل سیکر ہو تم بھی۔''
''ارے میں تو تم لوگوں پر کھول رہی تھی۔ اتنی خوبصورت جگہ پر دن چڑھے تک سونا اور صبح کے حسن کی دید سے محروم ہونا تو نری بدذوقی ہے۔''
''اچھا ورڈز ورتھ کی بھتیجی۔ چلو اٹھو۔ ناشتے کے لیے جانا ہے۔''
ناشتے پر ہی اس نے انہیں بتایا کہ ان کے سیر سپاٹے کا اس نے انتظام کردیا ہے وہ انہیں آج کمپنی نہیں دے گا۔ اسے یہاں آئے ہوئے کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔
چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے کپ کے کناروں سے جھانک کر اس لڑکی کو دیکھا تھا جس کا چہرہ سرخ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا۔ وہ سب سمجھا اور مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا گیا۔

ڈرائیور بمعہ گاڑی حاضر تھا۔ وہ اس میں بیٹھیں اور گاڑی کولتار کی سڑکوں پر چکر کاٹنے لگی۔ کرنا فلی دریا نیچے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اس نے دیکھا لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے پانیوں پر بہتے جارہے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا۔ ''یہ گھٹے چندر گونا پیپر مل کے لیے جارہے ہیں۔''
ٹرانسپورٹ کے اخراجات سے بچنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ ثریا معاشیات کی طالبہ ہونے کی وجہ سے معاشی بچت کے پہلوؤں کا جائزہ لے رہی تھی۔ سرکاری جیپ گاڑیاں سڑکوں پر دندناتی پھر رہی تھیں۔
ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ وہ سب نیچے اتر آئیں۔
وہ لمبی چوڑی جھیل کے کنارے پر کھڑی تھیں۔ جس میں موٹر کشتیاں چلتی تھیں۔ بانسوں سے بنے ریسٹ ہاؤس نظروں کو بھلے لگتے تھے۔ کرنا فلی کا ڈیم جہاں ہائیڈرو الیکٹرک پاور کا بہت بڑا اسٹیشن جو سارے صوبے کے کارخانوں کو بجلی سپلائی کرتا تھا۔
کشتیوں میں بیٹھ کر انہوں نے جھیل کی سیر کی۔ کنارے پر پہنچ کر اس داستان کو سنا جو اس جھیل کے بننے سے یہاں دفن ہوگئی تھی۔
چکمہ راج کی راجباڑی، دارجلنگ کے کونونٹ کی پڑھی ہوئی اس کی حسین رانی ان کا محل اور ان کی محبت کی کہانی۔
دھوپ بہت چڑھ آئی تھی جب وہ رانگامانی کے بازار میں پہنچیں۔ ہاٹ (بازار) میں مختلف جگہوں کے سوتی کپڑے، مونگے، موتیوں کے ہار اور بندے، قیمتی پتھر۔ دکانوں میں چپٹی ناکوں اور تکونی آنکھوں والی چکمہ عورتیں جو مہارت سے بھاؤ تاؤ کرتی تھیں۔
انہوں نے اپنے جسموں پر جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ ویسے ہی تھے جیسے وہ بچپن میں اپنی گڑیوں کو پہنایا کرتی تھی۔ پاؤں سے اونچے تنگ اسکرٹ اور بلاؤز نما۔
ثریا اور نازلی نے کافی چیزیں خریدیں۔ صفیہ نے لمبے لمبے پائپ پیتی پہاڑی عورتوں سے کھل کر باتیں کیں۔ انہیں غصہ آرہا تھا ان پر۔ کمبخت خود محنت کرتی ہیں اور مردوں کو تاڑی چرس پینے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔
''نہیں بھئی اب اتنے بھی ہڈ حرام نہیں جتنے آپ سمجھ رہی ہیں۔'' ڈرائیور نے وضاحت کی۔
''اناناس اگاتے ہیں۔ چاول بوتے ہیں۔ خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لاتے ہیں۔ آپ لوگوں کی اطلاع کے لیے ریڈ چائنا یہاں سے بہت قریب ہے۔ ان

پہاڑوں سے ذرا سا آگے بڑھ کر۔"
ساری لڑکیوں نے تجسس سے بھری آنکھوں سے نیلے دھوئیں کے غبار میں لپٹی پہاڑیوں کو دیکھا ان کا بس نہ چلتا تھا کہ کیسے جست لگا کر ریڈ چائنا کے دامن میں پہنچ جائیں۔
کپتائی جھیل کی سیر سے لطف اندوز ہوئیں۔ ہریالی، تازہ جھینگوں کا شوربہ، روسٹ اور سلاد۔ کھانے کا مزہ آیا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا۔ اگلی پچھلی کسر نکالی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کی۔
"پروردگار کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے اس گارجین کو روز کوئی نہ کوئی کام پڑ جائے اور وہ ہمیں اکیلے سیر سپاٹے کے لیے بھیج دیا کرے۔"
اور جب چٹا گانگ واپسی کے لیے روانہ ہونے کے لیے گاڑی میں بیٹھے وہ انہیں بتا رہا تھا کہ اگر اس کے پاس وقت ہوتا تو وہ انہیں بندر بن کا علاقہ دکھاتا۔ بندر بن کے جنگلوں میں چکمہ اور مونگ قبیلوں کے لوگ بانسوں کے جھونپڑوں میں زندگی گذارتے ہیں۔ خوبصورت اور خونخوار جانور ان کے ساتھی بھی ہیں اور دشمن بھی۔ ان جنگلوں میں دلکش پہاڑی لڑکیاں جب سیرونگ باندھے گزرتی ہیں۔ تب جنگل اتنے خوفناک نظر نہیں آتے۔ یہاں بدھ بھکشو بھی ملتے ہیں۔ دفعتاً اس نے رخ پھیر کر پیچھے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "نجمہ آپ نے کبھی بدھ بھکشو دیکھے ہیں۔"
اس نے سادگی سے اپنی لانبی پلکیں جھپکائیں اور سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہ میں نے دیکھے ہیں اور نہ مجھے ان کے متعلق کچھ علم ہے۔"
شام یقیناً بہت خوبصورت ہوگی۔ شفق ضرور خلیج بنگالہ پر اپنا حسن بکھیر رہی ہوگی۔ مگر چٹا گانگ کی نیو مارکیٹ کی Escalators پر بار بار اترتے اور چڑھتے ہوئے ان لڑکیوں کو سلونی شام کے حسن سے لطف اندوز ہونے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ البتہ ضرور چاہ رہا تھا کہ اس وقت انہیں ساحل پر ہونا چاہیے۔ رانگا ماٹی سے واپسی پر آرام کرنے کے بعد وہ نیو مارکیٹ میں آگئے اور اب لڑکیاں مارکیٹ سے نکلنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔
ایک دکان سے اس نے چند ویو کارڈ خریدے۔ بیرون ملک اپنے تینوں بہن بھائیوں کے نام پتے ان پر لکھے۔ پہلی بار اس نے ان کے ناموں کے ساتھ اپنے باپ کا نام لکھا اور اپنے نام کے ساتھ بھی۔
اگلے دن وہ کاکس بازار میں تھے۔ دوپہر کو چلے تھے اور مغرب کے وقت وہاں پہنچے۔ کھانے سے فارغ ہو کر دو منزلہ ریسٹ ہاؤس میں آئے۔ بستر پر نیم دراز ہوئی تو غنودگی کے بوجھ سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کانوں میں ملحقہ کمرے سے آتا شور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح لگ رہا تھا۔
نازلی "بابل تیرا نیر اچھوٹو جا ہے ہے" اونچے اونچے گا رہی تھی۔ ساحل سے موجوں کی مہیب آوازیں فضا کو بہت پُراسرار بنا رہی تھیں۔ کھڑکی کے شیشوں سے وی۔ آئی۔ پی ریسٹ ہاؤس کی سفید عمارت لقمہ کبوتری کی طرح نظر آ رہی تھی۔
وہ نیند کے غبار میں ہولے ہولے ڈوبے جا رہی تھی۔ سب لوگوں نے اسے کہا بھی کہ وہ بیٹھے اور تاش کھیلے۔ پر اسے تاش کھیلنا آتا ہی نہ تھا اور اپنے آپ کو اس محفل میں اجنبی محسوس کرنا اسے عجیب سا لگتا تھا۔ خجالت اور شرمندگی کے احساسات سارے جسم میں دوڑنے لگتے تھے۔ تھکاوٹ اور نیند کی آڑلی۔ یوں بھی وہ کچھ نڈھال سی ہو رہی تھی۔
صبح جب اس کی آنکھ کھلی۔ باتھ روم سے شل شل پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ صفیہ دوسرے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں دیکھ کر بولی۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم بیدار ہوئیں۔ لگتا تو یوں تھا جیسے اب کوئی صور اسرافیل ہی بجائے گا تو تمہاری نیند ٹوٹے گی۔ رحمان بھائی کب سے چلا رہے ہیں کہ تم لوگوں کو بہت سویرے ساحل پر جانا چاہیے۔ دن چڑھے لہروں کا اتار چڑھاؤ کم ہو جاتا ہے۔"
صفیہ بڑی لا ابالی قسم کی لڑکی تھی۔ من موجی سی۔ اس نے اسے ٹام بوائے کا نام دے رکھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس ٹام بوائے کا یہ بور سا لیکچر اسے ناگوار گذرا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی پر اپنے اوپر ایک خوش رنگ قیمتی کمبل دیکھ کر حیرت زدہ سی ہو گئی۔
"ارے یہ کس کا کمبل ہے اور میرے اوپر اسے کس نے ڈالا؟"
"بھئی رحمان بھائی اپنا کمبل ڈال کر گئے تھے۔ رات بہت ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ تم تو دھت سو رہی تھیں۔"
صفیہ نے یہ سب بتانے کے ساتھ ساتھ تکیہ اٹھا کر دھپ سے بیڈ کی پائنتی پر مارا اور اس پر سر رکھتے ہوئے غسل خانے کی طرف رخ کرتے ہوئے چلائی۔
"بھئی صبیحہ بیگم اگر آپ باتھ روم سے جلدی نکل آئیں تو یہ بندی آپ کی ممنون ہوگی۔ پلیز اپنے اشنان کو ذرا مختصر کر دیجیے نا۔"

وہ گم صم بیٹھی تھی۔ صفیہ نے کمبل ڈالنے کا ذکر عمومی انداز میں کیا تھا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔

کسی کے لیے خاص بات ہو یا نہ ہو پر وہ تو جی جان سے دہل گئی تھی۔ اس کا دل سینے میں اس شدت سے دھڑکا تھا جیسے وہ گوشت پوست کے سارے پردے چیر کر ابھی باہر نکل جائے گا۔

وہ کبھی اتنی اہم بھی ہوسکتی ہے کہ ایک اعلیٰ افسر اس پر رات کو کمبل ڈالتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں اسے سردی نہ لگ جائے۔ اتنا خیال تو جننے والی ماں نے بھی کبھی نہ کیا تھا۔ وہ انہیں پیدا کرنے کی ذمے دار ضرور تھی پر ماؤں والے لاڈ نخرے کبھی نہ کیے۔ اوّل تو وہ سب بھائی بہن بڑے سخت جان تھے۔ سخت سردیوں میں ایک قمیص میں ہی گھومتے پھرتے۔ بیمار ہونا تو درکنار نزلہ زکام بھی قریب نہ پھٹکتا۔ اگر خدانخواستہ کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا تو بھی خاص پرواہ نہ ہوتی۔ پانچ چھ دن بیماری کے تھپیڑے سہہ کر وہ خود ہی ٹھیک ہو جاتے۔ نہ کبھی کوئی فکر مند ہوتا۔ نہ کوئی مہنگی دواؤں کے چکر میں پڑتا۔ بس معمولی سا دوا دارو ہوتا۔ اسی میں آرام آ جاتا۔

کاکسس بازار کے ستّر میل لمبے سنہری ساحل پر بیٹھے خلیج بنگال کی اونچی اونچی لہروں سے وہ ذرا بھی لطف نہ اٹھا رہی تھی۔ رحمان بھائی اور گورا دونوں ریسٹ ہاؤس میں ہی تھے۔ لڑکیاں اکیلی ساحل پر آئی تھیں۔

نازلی اور ثریا دونوں پانی میں بہت دور تک چلی جاتیں۔ لہریں آتیں اور انہیں گردن گردن تک بھگو جاتیں۔ صفیہ ریت سے گھروندے بنا رہی تھی اور صبیحہ تصویریں اتارنے میں مصروف تھی۔

پریشانی سے اس نے سر جھٹکا اور الٹی سیدھی سوچوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ وہ دراصل ان معاملوں میں بالکل کوری تھی۔ یوں ہر انسان کی طرح اسے بھی چاہے جانے کی شدید تمنا تھی۔ لڑکیوں سے جب ان کے فسٹ اور سیکنڈ کزنوں کے قصے سنتی تو مارے رشک و حسد کے جل جل جاتی۔ خیر سے خالہ زادوں اور پھوپی زادوں کی تو اس کے گھر میں بھی کمی نہ تھی پر وہ سب کم بخت جوتیاں مارنے کے قابل تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر چغد اور کاؤبوائے کہ انہیں دیکھنے کو بھی جی نہ چاہے کجا کہ ان پر محبت کی نظر ڈالی جائے۔ گھر میں کچھ دور نزدیک کے رشتہ داروں کے بیٹے بھی پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی اسے پسند نہ تھے۔ ان کے طور طریقوں پر دیہاتی پن کی گہری چھاپ تھی۔

کالج سے آتے جاتے وقت دوسرے کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکوں سے مستقل قسم کا واسطہ رہتا تھا کیونکہ آمدورفت کے اوقات تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ پر گھر کے سخت اور کڑے ماحول نے ذہن کی طنابیں یوں کس کر رکھیں کہ ان میں ذرا سی بھی ڈھیل نہ پیدا ہونے دی۔

☆☆☆

''تف ہے اس لتری پر۔ اتنی لگائی بجھائی کی اس نے رحمان بھائی سے کہ خود چیزیں پہنچانے کی بجائے اس نے انہیں اس چھمک چھلو کے ہاتھ بھیج دیں اور وعدہ کرنے کے باوجود خود نہیں آئے۔'' ٹام بوائے سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی طرح بولے جا رہی تھی۔

''مائی گاڈ! انتہائی جیلس اور لو مینٹیلٹی کی عورت۔ اگر معلوم ہوتا تو کبھی اس کے ساتھ قدم نہ اٹھاتے۔'' حمیدہ پاپیا کے لہجے کی تلخی نے اس کے خوبصورت چہرے کو بھی اچھا خاصا برہم کر دیا تھا۔

''ہاں ذرا اندر تو دیکھنا تھا۔ مہریوں کی طرح کیسے ہانک لگائی۔ اپنا اپنا سامان لے لو۔ گنوار کہیں کی۔ ایڈیٹ۔'' نازلی بھی غصے سے مشتعل ہوگئی۔

صبیحہ بہت فضول انسان ثابت ہوئی تھی۔ سفر کے آخری دنوں میں اس کا رویہ اتنا خراب ہوگیا تھا کہ ان چاروں نے کڑھ کر بار بار سوچا کہ اسے تو کہیں راستے کی کسی فیری میں ڈبو دیں تو یہ اتنا ہی اچھا ہوگا جس کے لیے کہتے ہیں۔ ''خس کم جہاں پاک۔''

وہ چاروں ابھی تھوڑی دیر پہلے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں چائے پینے اور مغلئی پراٹھا کھانے آئی تھیں۔ جب صبیحہ کینٹین کے دروازے پر کسی بدروح کی مانند ظاہر ہوئی۔ طنزیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے کھردرے انداز میں بولی۔ ''اپنا اپنا سامان لے لو۔ گھنٹا بھر سے تم لوگوں کی تلاش میں ٹانگیں توڑ رہی ہوں۔''

چائے میز پر آ چکی تھی۔ ثریا گرم گرم مغلئی پراٹھوں کی پلیٹ بھی لے آئی تھی۔ ان کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں اڑ رہی تھی۔ ان کا بھوک سے بھی برا حال تھا پر یہ ایسی تھی کہ وہ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ چھاڑ کر بھاگیں۔ بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا رحمان بھائی آئے ہیں۔

باہر سڑک پر سائیکل رکشا کھڑا تھا جو صبیحہ کے اشارہ کرنے پر ان کے قریب آ گیا۔ صبیحہ نے آگے بڑھ کر ان کا سامان اتروایا اور وہیں کوریڈور میں ڈھیر کروا دیا۔ سارا سامان

اتروانے کے بعد وہ اسی سائیکل رکشے میں اچک کر بیٹھی اور بغیر سلام دعا یہ جا وہ جا۔

وہ چاروں ہونقوں کی طرح کھڑی کبھی سامان کو دیکھتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو۔

اس رات جب وہ ڈھاکا واپس آرہے تھے۔ان کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ وہ ان کا خریدا ہوا سامان لے کر خود یونیورسٹی آئے گا کیونکہ ساری خریداری ان چاروں نے اکٹھے مل کر کی تھی اور سیر سپاٹوں میں علیحدہ کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ ان سبھوں کو اس نے باری باری ان کے گھروں پر اتارا۔اچھے الفاظ میں خدا حافظ کہا۔جب ثریا اور نازلی اتریں وہیں اسے بھی اترنا تھا۔ہال جانے کا تو وقت نہ تھا۔

تب رس ملائی کا وہ دونا جسے اس نے کومیلا سے خریدا تھا۔ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"ثریا یہ آپ لوگوں کے لیے ہے۔"

نازلی اور ثریا دونوں باہر کھڑی تھیں اور وہ تھوڑا سا دروازہ کھولے باہر نکلنے کی کوشش میں تھی جب اس نے فرنٹ سیٹ سے رخ پھیرا اس کی طرف دیکھا اور بہت دھیمے سے سرگوشی کے انداز میں بولا۔"کبھی میرا جی چاہتا ہے تمہیں تو اپنے گھر لے جاؤں۔"

اس کا دل دھڑ دھڑ کرتا تھا۔ثریا اور نازلی کی ماں گیٹ پر آگئی تھی اور اب دونوں لڑکیوں سے گلے مل رہی تھی۔

دونا کس نے پکڑا؟ ثریا کی ماں نے اس کی پیشانی پر پیار کرنے کے بعد اس سے کیا پوچھا؟ وہ گاڑی سے کیسے اتری؟ اور گیٹ تک کیسے پہنچی؟ ان کی ماں نے رحمان کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کیا اور رحمان بھائی نے ان سے کیا باتیں کیں؟

اسے کسی بات کا کچھ ہوش نہ تھا۔بس وہ ایسے چلی جیسے یہ خواب ہو۔

ساری رات گڑبڑ ہوتی رہی۔کوئی دھیرے دھیرے اسے کہتا رہا۔"جی چاہتا ہے تمہیں تو اپنے گھر لے جاؤں۔"

دو تین دن بہت عجیب سے گزرے۔ دھوپ اور پیڑوں کے پتوں کا رنگ بدلا بدلا سا نظر آیا۔شناسا چیزیں بیگانی اور اجنبی سی لگیں۔

نازلی نے پوچھا۔"رحمان بھائی نہیں آئے۔"

"نہیں۔"

گہرے براؤن شیشوں والی سن گلاسز کے عقب سے اس نے لانبی پلکوں کے سایوں میں جھلملاتی آنکھوں سے اس پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے مختصراً کہا تھا۔

اور اس بات کو بھی تین دن گزر گئے۔

اس وقت وہ عجیب سی صورت سے دوچار تھیں۔سامان اٹھا کر کینٹین میں لائیں۔

ثریا نے کھچھی اپنی زبان میں شاید صبیحہ کو گالی دی تھی۔ نازلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔صفیہ اور اس نے پوچھا تھا۔نازلی نے کہا۔"ارے تپی بیٹھی ہے۔غصہ نکال رہی ہے۔"

چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ مغلئی پراٹھے اکڑے پڑے تھے۔کرسیوں پر بیٹھتے ہی انہوں نے قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔

"یوں لگتا ہے جیسے اس نے وہ سب باتیں ان سے کہہ دی ہوں۔" ثریا نے کہا۔

"لگتا ہے کیوں کہتی ہوں؟ شک و شبہ والی بات تو رہی نہیں۔یقیناً کہو۔" صفیہ نے چائے کا کپ اٹھایا۔واقعہ یہ تھا۔

کپتائی کے ریسٹ ہاؤس میں ان چاروں نے گورا کے متعلق خوب باتیں کی تھیں۔اچھے خاصے اس کے بخیے ادھیڑ ڈالے تھے۔چٹاگانگ کلب میں جس شب اس نے ڈنر دیا۔اس کی سب باتیں اور حرکتیں زیر بحث آئیں۔رحمان پر بھی تنقید ہوئی البتہ رحمان کے حسن سلوک اور شریفانہ برتاؤ کی وجہ سے اسے رعایتی نمبروں سے بھی نواز دیا گیا۔وہ تو سمجھی تھیں کہ آخری بیڈ پر لیٹی ہوئی صبیحہ گہری نیند سو رہی ہے...کیونکہ اس کے خراٹے خاصے جاندار تھے۔پر کچھ ہی دیر بعد جب اس نے کروٹ بدل کر وقت پوچھا تو وہ سب دھک سے رہ گئیں نازلی نے ثریا اور صفیہ کو ڈانٹا۔پر ثریا نے بے اعتنائی سے کہا۔"مائی فٹ۔"

چائے پی چکنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رحمان بھائی کو فون کریں اور صورت حال کی وضاحت کریں۔

سامان انہوں نے کینٹین والے کے سپرد کیا اور خود قریبی جناح ہال گئیں جہاں آٹومیٹک فون پر ثریا نے رحمان بھائی سے بات کی۔دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ثریا اپنی پوزیشن واضح کرتی رہی۔یہ نہیں کہا۔وہ نہیں کیا وغیرہ قسم کے وضاحتی جملے بار بار دہرائے گئے۔معلوم نہیں انہوں نے کیا پوچھا؟ ثریا نے ہنس کر اسے دیکھا اور کہا۔"ہاں میرے پاس ہی کھڑی ہے۔"

ریسیور اس کے کانوں سے لگا دیا۔وہ سٹپٹا سی گئی۔ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔گھور کر اس نے ثریا کو دیکھا جیسے کہتی ہو۔"یہ کیا بیہودگی ہے؟"

یوں یہ اور بات تھی کہ اس کا دل اس سے بات کرنے کو

چاہتا تھا۔ ثریا نے ذرا غصے سے کہا۔ ''ارے بات کرو نا۔''

اس نے کبھی کسی کو فون کیا ہوتا تو جانتی کہ اسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟ سخت نروس ہو رہی تھی۔ جی بھی چاہ رہا تھا کہ سنے وہ کیا کہہ رہا ہے پر یہ خیال بھی کسی آسیب کی طرح اس پر سوار ہو گیا تھا کہ کہیں اس کا اناڑی پن نہ ظاہر ہو جائے۔

اس نے ریسیور فوراً ثریا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ''مجھے نہیں کرنی بات وات۔''

''اف اللہ یہ صبیحہ ہے کیا چیز؟ اتنی ولگر عورت۔'' پھر اس نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے اور رحمان کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو انہیں سنائی۔

''معلوم ہوتا ہے اسے بہت پسند کرتے ہیں۔'' ثریا اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

''کہتے تھے بھئی سارا پروگرام تو اس ویسٹ پاکستانی لڑکی کے لیے بنایا گیا تھا۔ مہمان جو ہوئی ہماری۔''

''بند کرو یہ بکواس۔'' اس نے کتابیں سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند نہیں۔'' صفیہ نے قہقہہ لگایا۔ بھئی تمہارے طفیل ہم نے مفت میں سیر سپاٹا کیا۔

چٹاگانگ میں جب ان لوگوں نے پیسے دینے چاہے تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ ''صفیہ تم مجھ سے پٹو گی۔''

اس کا چہرہ سرخ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ نازلی نے پیار سے اس کے رخسار پر بوسہ دیا اور کہا۔ ''یار تم خوامخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ ہم لوگ تو مذاق کے موڈ میں ہیں۔''

پھر بہت سارے دن گذر گئے۔ یہ بڑے عجیب اور ویران سے دن تھے۔ یوں جیسے اداسیوں میں گھرے ہوئے ہوں۔

اس شام جب دھوپ پتا بہار کے بوٹوں اور سبز گھاس کے قطعوں پر پھیلی اداسی کا گمبھیر تاثر ہر سو بکھیر رہی تھی۔ وہ بیلا ملکہ اور آصفہ کے ساتھ میر پور جانے کے لیے نیچے آئی تھی۔ فاخرہ کی بہن کی شادی تھی۔ بیلا، ملکہ اور آصفہ تینوں اس کی روم میٹ تھیں۔ فاخرہ ان کی دوست تھی۔ اس کا آدھا دن اس کمرے میں گذرتا تھا۔ شادی میں شرکت کا دعوت نامہ اسے خصوصی طور پر دیا گیا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ میک اپ کیا تھا۔ گو یہ ہلکا ہلکا تھا۔ پہلی مرتبہ ساڑی پہنی تھی۔ خوبصورت لڑکی کو اس ذرا سے بناؤ سنگھار اور لباس نے قاتل بنا دیا تھا۔ ساڑی اس نے بیلا اور ملکہ کے پرزور اصرار پر پہنی تھی۔ بلکہ ساڑی بھی بیلا کی تھی۔ اس نے بہت کہا۔ ''بیلا مجھے عادت نہیں۔ کہیں کھل کھلا گئی تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

بیلا نے اس کے سر پر چپت لگائی اور تنک کر بولی۔ ''کیوں کھل کھلا جائے گی تو کیا کھوکھی (بچی) ہے؟ ہاں دیکھو تو ذرا کیسی سندر لگ رہی ہو۔ اگر میں کہیں لڑکا ہوتی تو تجھے اڑا کر لے جاتی۔''

آصفہ نے بھی بہت سراہا۔

''نجمی تم بہت حسین ہو۔ شاید تمہیں اپنے حسن کا احساس نہیں۔ معمولی سے میک اپ، اس لباس اور بالوں کے اس اسٹائل نے تمہیں کتنا جاذبِ نظر بنا دیا ہے کہ آنکھ کا تم پر سے اٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔''

اس کے شانوں پر جھولنے والے بالوں کا آصفہ نے بڑا خوبصورت جوڑا بنا دیا تھا۔

میر پور جانے کے لیے جب وہ نیچے آئیں۔ آڈیٹوریم میں سے گذرتے ہوئے اسے دربان ملا جس نے کہا۔ ''آپا آپ سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں۔''

''مجھ سے۔'' اس نے قدرے حیرت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں ہاں آپ سے۔''

دربان نے اس کے سامنے اس کا نام دہرا کر اس کی تسلی کر دی تھی۔ وہ رک گئی۔ اس وقت لڑکیاں آڈیٹوریم کے چکنے فرش پر اسکیٹنگ کر رہی تھیں۔ بظاہر انہیں دیکھتے ہوئے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کے جتن میں مصروف ہوئی۔

''پلیز ذرا ٹھہرو میں دیکھ کر آتی ہوں کون آئے ہیں؟'' کہتے ہوئے وہ گیٹ کی طرف بڑھی۔

اس وقت وہ عجیب سی کیفیت سے گذر رہی تھی۔ دل جیسے ڈوبا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ٹانگیں بے جان جیسے گوشت کا ایک ایسا لوتھڑا جسے بمشکل گھسیٹا جا رہا ہو۔ ''کون ہو سکتا ہے؟''

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس نے کوئی دس بار یہ سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔ حالانکہ یہ سوال فضول تھا۔

اس کا دل جو جواب دے رہا تھا وہ اپنے اندر ٹھوس یقین لیے ہوئے تھا۔

گیٹ سے نکلی تو ساری جان سے کانپی تھی۔ آنکھوں میں خوف سا ابھرا تھا یہ اور بات ہے کہ خوف کے ساتھ ساتھ وہاں ... چمک بھی پیدا ہوئی تھی۔

نیلی مزدہ میں وہ بیٹھا گیٹ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ آگے بڑھی۔ جھکی۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے

اس نے سلام کیا۔ اس نے دیکھا تھا وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں حیرت، شوق اور استعجاب کا ایک جہان لیے۔ گھبراہٹ۔ اور سوار ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد خیریت دریافت کی گئی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور جیسے کنوئیں کے پاتال سے کہا ہو۔

''ٹھیک ہوں۔''

وہ ہنسا اور اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کہاں ٹھیک ہو؟ گاڑی میں بیٹھو اور شیشے میں اپنا آپ دیکھو۔ پھر مجھے بتاؤ کہ ٹھیک ہو یا نہیں۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔''

وہ پھر ہنسا۔ یہ ہنسی بڑی مدھم اور شفقت سے لبریز تھی کیونکہ اس نے جس انداز میں رحمان کو دیکھا تھا اس میں عجیب سی بے بسی کا اظہار تھا۔

''کہیں جا رہی ہو؟''

''جی۔ میر پور ایک دوست کی بہن کی شادی ہے۔''

''تو آؤ! تمہیں ڈراپ کر آؤں۔''

''میرے ساتھ میری چند دوست بھی ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ جاؤ انہیں بلا لاؤ۔''

وہ مڑی اور تیز چال چلتی چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

اس کا ذہن ابھی کچا تھا۔ نہ اس نے دنیا دیکھی تھی اور نہ اس کے چھلوں سے واقف تھی۔ انیس سالہ لڑکی اس سے بہت متاثر ہو چکی تھی۔ اس کے اونچے عہدے، لمبی گاڑی، امیر خاندان سے تعلق، وجاہت اور شائستہ اطوار سبھوں نے اسے اپیل کیا تھا۔

بیلا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کون ہے؟ ملاقاتی گاڑی واڑی والا ہے یا یونہی سائیکل سوار۔ لفٹ ملنے کا امکان ہے یا نہیں؟''

''تم بھی کیا یاد کروگی بیلا۔ چلو خوش ہو جاؤ۔ گاڑی سے میر پور چلیں گے۔''

ایک دوسری کے آگے پیچھے چلتی وہ گیٹ سے باہر آئیں۔

گاڑی میں پچھلی نشست پر جب وہ ان کے ساتھ ہی پھنس پھنسا کر بیٹھنے لگی تو اس نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اسٹوپڈ۔ آگے آؤ۔ آرام سے بیٹھنے دو انہیں۔''

لہجے کے اس تحکمانہ انداز میں ایک اپنائیت بھی تھی جو اس سے چھپی نہ رہی تھی۔ پیچھے سے اگلی سیٹ تک جانے کے وقفے میں اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کی باریک بین نگاہوں نے اس کی دلی کیفیات کو سمجھا۔ اس کے لباس سے اٹھتی چارلی کی خوشبو کو سونگھا۔ سگریٹ جلایا۔ لمبا کش لے کر دھواں باہر پھینکا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''تم اتنی نروس کیوں ہو رہی ہو؟''

فاخرہ کے گھر وہ صرف ایک بار ہی آئی تھی۔ میر پور کے انجانے راستے ایک بار میں کہاں پہچانے جاتے۔ بیلا دو تین بار آ چکی تھی۔ وہ بھی بھول بیٹھی تھی۔ گاڑی سڑکوں کے موڑ کاٹتی پھر رہی تھی۔ ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی۔

ملکہ نے کچھ سنی سنائی نشانیاں دہی کی۔ کچھ اس نے دماغ لڑایا اور یوں شادی والے گھر پہنچ گئیں۔

اور قناتوں والے گھر کے سامنے کھڑے ان سب لڑکیوں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ تینوں آگے بڑھ گئیں۔ اس نے قدم اٹھانے سے پہلے رخ پھیر کر دیکھا۔ جب وہ بولا۔ ''میں پیر کی شام کو آؤں گا۔ کہیں جانا مت۔''

کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ شادی والے گھر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

☆☆☆

''ٹھیک سے بیٹھو۔ گھبرا کیوں رہی ہو؟ اور ہاں شیشہ نیچے کرو۔ تمہیں ٹھنڈی ہوا لگے۔''

اس نے شیشہ آہستہ آہستہ نیچے کیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سختی سے بھینچے ہونٹ یوں بند تھے جیسے کبھی نہیں کھلیں گے۔

شاندار گاڑی میں یوں تمکنت سے بیٹھنا بلاشبہ بہت دل خوش کن تھا۔ ہمیشہ ہی حسرت سے ان عورتوں کو دیکھا کرتی تھی۔ جو کاروں میں بیٹھی بے نیازی سے فٹ پاتھوں پر چلتی پھرتی عورتوں پر اک نگاہ غلط انداز ڈالتیں یوں جیسے وہ دھرتی کے کیڑے مکوڑے ہوں، اور پھر شان بے نیازی سے اسکرین سے پرے دیکھنے لگتیں۔

آج وہ بھی ایک خوبصورت گاڑی میں بیٹھی تھی۔ پر دل جیسے من من بھر کے پتھروں کے نیچے آیا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کار کا دروازہ کھلے اور وہ نکل بھاگے۔ خود کھول کر باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ کبھی اکیلی کسی اجنبی مرد کے ساتھ نہیں بیٹھی تھی۔ یوں یہ وجیہہ سا آدمی جو اپنے اندر اپنائیت لیے ہوئے تھا اب اتنا اجنبی بھی نہ رہا تھا۔ انہوں نے ان کے ساتھ پانچ دن گزارے تھے۔ اس نے ایک اچھے دوست کی طرح حق

رفاقت ادا کیا تھا۔ ایک اچھے محافظ کی طرح ان کی حفاظت کی تھی اور ایک اچھے انسان کی طرح پسندیدہ عادات کا مظاہرہ کیا تھا۔

جانے یہ کون سی سڑکیں تھیں۔ گاڑی بڑی تیزی سے ان پر دوڑ رہی تھی۔ یہاں اتنی گہما گہمی تو نہیں تھی۔ پر ویرانی بھی نہ تھی۔ اکا دکا راہگیروں کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔

وہ سکون سے گاڑی چلا رہا تھا۔ گردن موڑ کر ایک بار بھی اس نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا جو خوفزدہ اور ہراساں سی گم صم اپنے آپ میں کھوئی کھوئی تھی۔

یوں یہ اور بات تھی کہ وہ دیکھے بنا ہی اس کے دل کا حال رتی رتی جانتا تھا۔

تاریکی چھا گئی تھی۔ سڑکوں کی ٹمٹماتی روشنیوں میں رات کچھ زیادہ ہی اندھیری لگ رہی تھی۔ ایک بڑی دکان کے سامنے گاڑی رکی۔ یہ کوئی سپر اسٹور تھا۔ اندر ایک خوبصورت سا ریسٹورنٹ تھا۔ ایک میز پر بیٹھتے ہی اس نے اشارہ کیا۔ ویٹر فوراً آ گیا۔

اس نے ہارن دیا۔ ویٹر آیا۔

اس نے رخ پھیرا اور پوچھا۔ ''کیا کھاؤ گی؟''

''کچھ نہیں۔''

کچھ نہیں جب اس کی زبان سے نکلا تھا یہ آواز اس جان بلب مریض کی سی تھی جو وقت نزع بمشکل ایک دو لفظ منہ سے نکالتا ہے۔

اس کے ہونٹوں پر ہنسی دوڑ گئی۔ ویٹر کو آئس کریم کا آرڈر دے کر اپنا بازو اس نے بیک پر پھیلایا۔ دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے بائیں ٹانگ سیدھی کی۔ اندر کی روشنی بجھی ہوئی تھی پر باہر سے آتی مدھم سی روشنی میں وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ سہمی سہمی سی اس لڑکی کو اپنے سینے سے لگا کر پوچھے کہ وہ اتنی خوف زدہ کیوں ہے؟

''میں سگریٹ جلا سکتا ہوں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بے بسی تھی جسے محسوس کرتے ہی اسے تھوڑی سی کوفت کا احساس ہوا۔ سگریٹ جلا کر وہ نرمی سے بولا۔ ''مجھی میں حیران ہوں۔ آخر تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمہیں جبراً اغوا کر کے لایا ہوں۔ جب سے گاڑی میں بیٹھی ہو جیسے قسم کھائی ہے کہ بولنا نہیں، بات نہیں کرنی۔ دیکھو مجھ سے گھبرانے، ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تم مجھے اپنا ایک مخلص اور اچھا دوست پاؤ گی۔ تمہاری حفاظت میرا فرض ہے اس لیے کہ میں بھی ایک عدد بیٹی کا باپ ہوں۔ میری ازدواجی زندگی پُرسکون ہے۔ ہر لحاظ سے بھی میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ ہاں پلیز اس طرح سکڑ سکڑ کر مت بیٹھو۔ مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں نے تمہیں یہاں لا کر کوئی غلطی کی ہے۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو، مجھے پسند آئی ہو...... میری خواہش ہے کہ تم اپنا وقت میرے ساتھ اچھی اچھی باتیں کرنے، قہقہے لگانے اور خوش گپیوں میں گزارو۔ ہاں میری دوست بنو گی؟ بولو کیا کہتی ہو؟''

تبھی آئس کریم آ گئی۔ اس نے کپ پکڑے۔ ایک اس کی طرف بڑھایا، دوسرا خود پکڑا اور بولا۔ ''چلو ان باتوں کو فی الحال چھوڑو۔ اسے کھاؤ۔''

ہچکچاتے ہوئے اس نے کپ پکڑا۔ عجیب سے احساس اور ناقابل فہم دکھ نے جکڑا ہوا تھا۔

لذیذ آئس کریم کھاتے ہوئے وہ اپنے دل میں بولا تھا۔

من اوبھ گیا تھا سوسائٹی گرلز سے۔ اب پہلو میں بیٹھی یہ گھبرائی گھبرائی اور خوفزدہ سی لڑکی کس قدر اچھی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے کہ مصور نے جیسے ایک ہراساں سی دوشیزہ کا شاہکار بنا

میمن جماعت

اہلِ سنت کی تبلیغی جماعت، جس نے زیادہ تر کاٹھیاواڑ میں کام کیا۔ اہلِ میمن کا بیان ہے کہ حضرت عبدالقادر شاہ جیلانی نے اپنے بیٹے تاج الدین کو سندھ جا کر تبلیغ کرنے کو کہا۔ وہ خود ایسا نہ کر سکے۔ ان کی نسلوں نے یہ فرائض پورے کیے۔ اور ایک بزرگ سید یوسف الدین قادری 1421ء میں عراق سے سندھ آئے...اور ٹھٹھہ کو، جو ان دنوں صدر مقام تھا۔ اپنا مسکن بنایا۔ جلد ہی لوہانہ خاندان کو اسلام کی جانب مائل کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کو آج بھی لوہانہ ذاتوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سندھ کے ہندو تجارت پیشہ افراد بھی اسلام پر ایمان لائے۔ میمن انہی کی نسلوں سے ہے۔ سید یوسف الدین کے واپس عراق چلے جانے پر ان کے جانشینوں نے مندرہ کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ پیش کش انہیں کاٹھیاواڑ کے راجا نے کی تھی۔

مرسلہ: نعیم الدین، سیالکوٹ

کر سیٹ پر بٹھا دیا ہے۔ زندگی لاکھ دکھوں اور تلخیوں سے بھری ہوئی ہو پر اس کے کچھ لمحات اتنے سندر ہیں کہ انسان بے اختیار جینے کی تمنا کرتا ہے۔

اپنی آئس کریم کھا چکنے کے بعد اس نے دیکھا وہ ایسے ہی کپ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہے۔

''ارے ارے کھاؤ نا۔ کیا اچھی نہیں؟''

وہ بمشکل بولی۔ ''میں کھا رہی ہوں۔ تھوڑا آہستہ کھاتی ہوں۔''

''اچھا چلو مجھے یہ بتاؤ تمہیں ڈھاکا اور اس کے لوگ کیسے لگے؟'' اس نے ریسٹورنٹ سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ وہ گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔

اندر بیٹھتے ہی اس نے دوسرا سگریٹ جلایا۔ ماچس کی تیلی باہر پھینکی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی اور گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ ''کھل کر بتاؤ۔''

اور اس نے سنجیدگی سے باہر تاریکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جگہیں تو اچھی ہوتی ہیں پر بات تو مکینوں کی ہے۔ ڈھاکا سبزے میں لپٹا ہوا طراوت اور تازگی کا احساس بخشتا ہوا اچھا لگتا ہے۔ لوگ انفرادی سطح پر اچھے ہیں مخلص اور محبت کرنے والے ہیں۔ اجتماعی حیثیت میں متعصب ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زہریلے پروپیگنڈے کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں۔ سیاسی سرگرمیاں صحت مند نہیں۔ وہ اتنی خطرناک ہیں کہ وطن کا یہ حصہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اپنے طور پر میں کہہ سکتی ہوں کہ یہاں آ کر میں' وطن کیا ہوتا ہے؟ اس کی محبت کیسی ہوتی ہے؟ جیسے خوبصورت اور لطیف احساسات سے دوچار ہوئی ہوں۔ ویسٹ پاکستان میں رہتے ہوئے ایسے جذبات کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ یہاں وطنیت کی محبت والے سوتے ابل پڑے ہیں۔''

وہ گاڑی چلاتا رہا۔ اسے سنتا رہا۔ گاڑی ڈھاکا کی ویران سڑکوں پر گھومتی رہی۔ جب وہ خاموش ہوئی اس نے کہا۔

''تم بہت اچھا بولتی ہو۔ کالج میں مباحثوں میں حصہ لیتی رہی ہو شاید۔''

کچھ دیر بعد اس نے وقت پوچھا اور آٹھ بج رہے ہیں جان کر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ساڑھے آٹھ بجے گیٹ بند ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے اب ڈراپ کر دیجیے۔''

مہندی کی باڑ کے پاس رک کر اس نے خوف زدہ نظروں سے پہلے پرووسٹ کے گھر کو دیکھا۔ لائٹس جل رہی تھیں۔ پر کوئی تھا نہیں۔ آڈیٹوریم بھی تقریباً خالی ہی تھا۔ ساری لڑکیاں ڈائننگ ہال میں جمع تھیں۔ بس کوئی اِکا دُکا گھومتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔

''کیا سوچتی ہوں گی میری روم میٹز کہ میں کہاں چلی گئی ہوں؟''

اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ ٹیبل ٹینس کی میز پر نیم دراز ہو گئی۔ دودھیا روشنی وسیع و عریض آڈیٹوریم میں اداسی کا گہرا تاثر پھیلا رہی تھی۔ دل بڑا بوجھل بوجھل سا تھا۔ کھانے کو بھی ذرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''میں کل پھر آؤں گا۔'' جب وہ گاڑی سے اتر رہی تھی اس کا ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا گاڑی میں تھا۔ ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا اور ادھ کھلے دروازے سے بس وہ باہر نکلنا چاہتی تھی جب اس نے یہ بات سن کر زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

اور پھر بغیر کوئی جواب دیئے وہ گیٹ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ آئی تھی۔ اور یہاں میز پر نیم دراز اس کے اندر اور باہر زور و شور کی جنگ ہوئی۔ اندر والے نے خوب خوب طعنے مارے۔ پڑھے ہوئے ناولوں، افسانوں اور قصے کہانیوں نے مرد کی رنگینیٔ طبع کو خوب خوب اچھالا۔

''کیا واسطہ ہے اس کا تمہارے ساتھ جو وہ اس مہنگے سے یوں تم پر پیٹرول اور پیسا ضائع کرتا ہے۔''

اس نے اس کی شرافت اور حسن اخلاق پر دلائل دیئے۔ چٹاگانگ کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے اعلیٰ کردار اور ملنساری پر کچھ کہنا چاہا پر زناٹے کا ایک وار پڑا۔ ''جال پھینک رہا ہے پھنس جاؤ گی تو ڈوری یوں کھینچے گا کہ گلا گھٹ جائے گا اور آنکھیں ابل پڑیں گی۔''

ایسی ایسی خوفناک تصویریں اس کے سامنے آئیں کہ وہ تڑپ اٹھی۔

آگ سے جو بھی کھیلا اس نے سدا ہاتھ ہی جلائے۔ وہ بلبلیں جو بازوؤں کے ساتھ اونچی اڑان لینے کی کوشش کرتی ہیں ہمیشہ زمین پر گر کر مرتی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ دریا میں چھلانگ ماری جائے اور جسم سوکھا رہے۔

پتا نہیں دل کے کن کونے کھدروں سے یہ آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ طعن و تشنیع کا ایسا کھر پہ چلا جس نے سب کچھ لہولہان کر ڈالا۔ ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھی اس پر ستم یہ چرکے۔ وہ بلبلا اٹھی یوں لگا جیسے سارا اندر بوٹیوں میں کٹ گیا

ہو۔

"بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ مجھے اپنا ذہنی سکون نہیں تباہ کرنا۔"

اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"ہائے اللہ کہیں سے ٹھنڈا یخ پانی مل جائے۔ کیسی آگ لگ گئی ہے اندر۔"

پر ٹھنڈا پانی کہاں سے ملتا۔ اس حال میں فریج جیسی قیمتی اشیاء کی عیاشی ممکن نہ تھی۔

☆☆☆

کیسی طوفانی بارش تھی۔ لگتا تھا جیسے آسمان کے سینے میں چھید ہو گئے ہوں۔ کھلے ہوئے بادلوں میں سارا ماحول دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ ہوا کے تیز تھپیڑے کسی پاگل جنونی کی طرح جو بپھرا ہوا اپنے شکار کا تیا پانچہ کرنے پر تلا ہو گاڑی پر وار پر وار کر رہے تھے۔ وائپرز ونڈ اسکرین کی صفائی میں دیوانوں کی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔

دل میں ہلچل مچانے والا خوبصورت موسم، رائل بلیو ٹیوٹا اور اسے ڈرائیو کرتا ڈیشنگ قسم کا مرد۔

"میں اگر یہ کہوں کہ تم اس دن قصداً نہیں آئیں تو یقیناً غلط نہ ہوگا۔"

سا بھر جانے والی اس سڑک پر گاڑی اس نے ایک طرف روکی۔ اسٹیئرنگ پر جھکے جھکے سگریٹ جلائی۔ لمبا سا کش لیا اور سکون سے اسے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ "میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔"

"اپنی ان سوچوں کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ گی؟ جنہوں نے تمہاری طبیعت ٹھیک نہ رہنے دی۔"

"آپ قیاس آرائیوں میں بہت ماہر معلوم ہوتے ہیں۔"

وہ مسکرایا۔ سگریٹ کا لمبا کش کھینچتے ہوئے بولا۔ "غلط بات کرتی ہو اور وہ بھی مجھ سے۔"

وہ تھوڑا اجز بز ضرور ہوئی پر خاموش رہی۔ سمجھ گئی تھی کہ تردید کے لیے جو کچھ بھی کہے گی اس میں جان نہیں ہوگی اور وہ اسے یقین کی چھری سے کاٹ پھینکے گا۔ گاڑی میں خاموشی تھی۔ باہر بارش برسنے کی نغمگی تھی۔ سگریٹ کا دھواں تھا جسے وہ تھوڑا سا شیشہ کھول کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر نکال دیتا۔

دیر بعد اس نے نگاہیں اس کے ملیح چہرے پر جمائیں اور خفیف سا مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر میں تمہیں وہ سارے خدشات بتا دوں جو تمہارے دل و دماغ پر یورش کرتے رہے ہیں تب کیا کہو گی؟"

اسے تو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی مدافعت میں بولے تو کیا بولے؟ وہاں تو قیاسوں اور اندازوں کی بات نہیں تھی۔ دعوے تھے اور ہر دعوے کے تعاقب میں پختہ یقین کا اعلان تھا اس لیے وہ سر جھکائے گلابی دوپٹے کے پلو کو انگلیوں پر لپیٹتی اور کھولتی رہی۔ فضول بہانہ تراشیوں کا قطعی کوئی فائدہ نہ تھا۔

اس نے اندر کی لائٹ جلائی۔ اس کے سرخی مائل سیاہ بال گلابی پھولدار قمیص پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ کسی حد تک ان کے سائے میں چھپا ہوا تھا۔ سفید نازک لابنی انگلیوں والے ہاتھ جن کے ناخن قمیص کے ہمرنگ پالش میں ڈوبے ہوئے دوپٹے کے کونے سے کھیل رہے تھے۔

فوراً اس نے بتی بجھا دی تھی۔ "مجھے بلند بانگ دعوؤں سے سخت نفرت ہے۔ دو بار پہلے کہہ چکا ہوں تیسری بار پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے اندر دوڑتے نیک اور شریف خون کا پورا احساس ہے۔ تمہیں میرے اوپر اعتماد کرنا چاہیے۔"

اس کے لب و لہجے میں جو یقین اور اعتماد تھا۔ اس کا ڈوبتا ابھرتا دل لحہ بھر کے لیے سکون پا گیا۔

لیکن شک نے پھر سر اٹھایا۔ وہ جو کتابوں میں اتنا کچھ لکھا ہوا ہے ایسی لمبی چوڑی کہانیاں، مرد کی ذات نا قابل اعتماد اور دغا دینے والی۔ کیا سب غلط ہے؟

"ہاں غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری تھوڑی ہے کہ لکھنے والوں کے تاثرات پرکھ اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں۔ دنیا رنگا رنگ انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ نیک بد۔ اچھے برے ہر طرح کے لوگ۔ طبیعتوں، مزاجوں، عادات و خصائل میں مختلف۔ سب کو ایک لاٹھی سے کیسے ہانکا جا سکتا ہے؟"

یہ جوابی اعتراض اس کے دل نے دیا تھا اور یہ اتنا قوی تھا کہ اس بار دماغ خاموش رہا۔

اس نے باہر دیکھا۔ بارش رک گئی تھی۔

نمی میں ڈوبی بوجھل ہوائیں سارے میں دوڑتی پھر رہی تھیں جہاں لطیف سی ٹھنڈک کا احساس رگ و پے میں اتر کر لمحات کو بہت خوشگوار بنا رہا تھا۔ وہیں سڑک کے اطراف میں اگی گھنی جھاڑیاں، درخت، اندھیرا، سب نے مل جل کر فضا کو بہت پُراسرار اور ڈراؤنا سا بنا دیا تھا۔

دفعتاً اس نے اسکرین پر جمی نگاہیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ وہ اسموکنگ میں یوں مگن تھا جیسے دنیا میں اس سے بڑا کوئی اور کام ہی نہ ہو۔

پل بھر وہ اسے غور سے دیکھتی رہی پھر اس نے رخ پھیرا۔ اپنے سر کو بیک سے ٹکاتے ہوئے لمبی سانس بھری اور اپنے آپ سے یوں گویا ہوئی جیسے اپنے اوپر بیتی پتا اپنے آپ کو سنا کر خود کو ہلکا کرنا چاہتی ہو۔ ''اللہ یہ دن تو یوں لگتے تھے جیسے میں نے پھانسی کے تختے پر گزارے ہوں۔''

دماغ جیسے پھوڑا بن گیا تھا کہ جس میں سے اٹھتی ٹیسیں بے کل کرتی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ یہ شاندار سی کار، اس میں بیٹھا باوقار سا مرد جس کا تعلق ہائی جنریٹری سے ہے، اسے بہت اچھے لگے تھے۔ چاہے جانے کی تمنا کسے نہیں ہوتی۔ اسے بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی اسے پسند کرے۔ چاہے۔ پر اب وہ اتنی بھی احمق نہ تھی۔ مانا کہ اس نے دنیا نہیں دیکھی تھی۔ ایک قدیم اور دقیانوسی روایات والے گھر میں پرورش پائی تھی۔ جہاں فلمیں دیکھنی معیوب تھیں۔ گانے سننے برے تھے۔ بے محابانہ پھرنا ناپسندیدہ تھا۔ پر پھر بھی وہ کالج پڑھنے جاتی تھی۔ چوٹی کے کالج میں جہاں ہر دن وہ ایک نیا اسکینڈل سنتی۔ فلاں کا افیئر فلاں سے چل رہا ہے۔ فلاں فلاں سے فلرٹ کر رہی ہے۔ لمبی لمبی گاڑیاں آتیں اور لڑکیوں کو پک کر کے چلی جاتیں عین اسی طرح جیسی آج اور دو دن پہلے اسے کسی نے پک کیا تھا۔ کالج بس اسٹاپ پر کھڑی لڑکیاں ان کے بخیئے ادھیڑنے پر ہی اکتفا نہ کرتیں بلکہ کھال تک نوچ ڈالتیں۔ اگلی پچھلی سات پشتوں تک تبصرہ آرائی ہوتی۔

ایسے میں یہ سوال بار بار سامنے آتا۔ ''کیا یہ شخص بھی فلرٹ کرنا چاہتا ہے؟''

ان اضطرابی دنوں میں اس سوال کے بار بار سامنے آنے پر اندر باہر جنگ وجدل کا بازار گرم رہا۔ سوچوں کی گھمسن گھیریوں اور کھولاؤ نے دماغ کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ لگتا تھا اس کا سارا وجود آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہے کہ بس ایک ہی لمحے میں سب کچھ پھٹ پھٹا جائے گا۔ مختلف اوقات میں متضاد کیفیات کے رخ سامنے آتے۔ کبھی وہ اسے اپنا سا لگتا۔ اس کے بارے میں ذرا سی گھٹیا سوچ یا خیال اسے بے چین کر دیتا۔

رات کو سوتی تو جیسے کوئی کہتا۔ ''ارے تم دھت سو رہی تھیں۔ رحمان بھائی تم پر اپنا کمبل ڈال گئے۔ موسم اتنا ٹھنڈا ہو گیا تھا نا۔''

''میں تو اس لڑکی کے لیے چٹا گانگ گیا تھا۔ مہمان جو ہوئی ہماری۔''

''جی چاہتا ہے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں۔''

ایک آدھ بار اس نے یہ بھی سوچا کہ آخر اتنی لڑکیوں کے درمیان اس نے اسے ہی دوست بنانے کے لیے کیوں پسند کیا؟ پر اس سوال کا جواب بھی مشکل نہ لگتا۔ آئینے کی طرح ہر چیز سامنے تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ قیمتی کپڑے پہنتی تھی۔ اپنے آپ کو اونچے گھر کی لڑکی ثابت کرتی تھی۔

شانوں پر جھولتے بالوں، خوش رنگ لباس اور ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ جب وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو میٹھی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود بکھر جاتی اور وہ اپنے آپ سے کہتی۔ ''تو یہ میں ہوں۔ اللہ۔ میں تو خود اپنی پہچان میں نہیں آ رہی ہوں۔''

ایسے لمحوں میں وہ یکسر بھول جاتی کہ اس کا باپ تین سو روپلی کے لیے گزشتہ دو سالوں سے آزاد کشمیر کی سنگلاخ چٹانوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی ماں ملگجے کپڑوں میں لپٹی لکڑیوں کے کڑوے کسیلے دھوئیں سے الجھ رہی ہوگی۔ اس کے چھوٹے بھائی پیسوں کے لیے ماں سے جھگڑتے ہوں گے۔

آئینے میں جو عکس اسے نظر آتا یہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔

یوں ذہن کو الجھانے میں ایک اور بات بھی بڑی نمایاں تھی اور وہ اس کا شادی شدہ ہونا تھا۔ جب وہ یہ سوچتی کہ گھر میں اس کی بیوی ہے جو یقیناً خوبصورت بھی ہوگی۔ اسی کی طرح بنگال کے امیر کبیر خاندان سے ناطہ ہوگا۔ خود اس کی باتوں سے ظاہر ہے کہ ان کے درمیان اچھے خوشگوار تعلقات ہیں۔ بچے بھی ہیں۔ تو پھر اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ پرائی لڑکیوں سے دوستیاں کرتا پھرے؟ اسے ہوس کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔

یہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ معصوم سی لڑکی پھر پٹڑی سے اتر کر سوچوں کے گرداب میں پھنس گئی۔ احمق اور جذباتی لڑکی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

اور وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پڑھنے میں مصروف تھا۔ نگاہوں کا ٹکراؤ۔ شربتی چمکدار آنکھیں اور ذہین روشن کالی آنکھوں کا تصادم۔

سٹپٹا کر اس نے سر جھکا لیا۔

تب اس گمبھیر سناٹے میں اس کی نرمی اور محبت کی پھوار میں بھیگی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ذہن کو اتنا

مت الجھاؤ۔ آؤ واپس چلیں۔“

”اللہ یہ کس قدر زیرک ہے۔ میرے دل کا حال کیسے جان لیتا ہے؟ میرے دماغ کو کیسے پڑھ لیتا ہے؟ کیا اس کے پاس کوئی آلہ ہے۔ ایک میں پاگل بیوقوف کہ تین دنوں سے بلکہ اگر یہ کہوں کہ جب سے چٹا گانگ سے آئی ہوں ذہنی طور پر بیمار ہوگئی ہوں۔ ہر گاڑی رائل بلیو ٹیوٹا نظر آتی ہے اور اندر بیٹھے ہر مرد پر اسی کا گمان پڑتا ہے۔“

☆☆☆

ایسا ٹائٹ شیڈول تھا کہ جس نے دو دنوں کے گھنٹوں اور منٹوں کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ ذرا دم لینے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ بہتیرا چاہا کہ تھوڑی سی گنجائش کسی نہ کسی طرح نکل آئے۔ مصروفیت کے اژدہام میں سے چند لمحے ہی میسر آ جائیں۔ وقت کی تنی طنابیں ذرا سی ڈھیلی ہو کر اسے راہ فرار دے دیں۔ وہ بھاگم بھاگ رقیہ ہال کا ایک چکر لگا آئے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نہ وقت مرضی کے تابع رہتا ہے اور نہ صورت حال۔ وہ ایسی ہی گھمن گھیریوں میں پھنس گیا تھا۔ یہ خیال اس کے لیے پریشان کن تھا کہ پاگل احمق لڑکی سوچوں کے بھنور میں پھنسی ان سے لڑتی الجھتی ہلکان ہوگئی ہوگی۔ پر وہ اپنی بہترین کوشش کے باوجود کچھ نہیں کر پا رہا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ کام یوں پیر پسارے بیٹھا تھا کہ کسی طرح سمٹنے میں نہ آ رہا تھا۔

مغربی پاکستان سے دس انجینئرز اور برطانیہ سے دو آرکی ٹیکٹ آئے ہوئے تھے۔ ہیڈ آفس کی نئی عمارت کا پروجیکٹ موتی جھیل کمرشل ایریا میں تعمیر کے لیے زیر غور تھا۔ کل سے اب تک کوئی دس میٹنگز Meetings ہو چکی تھیں۔ ابھی گھنٹا بعد پھر منسٹر کے پاس حاضری تھی۔ رات کوئی دو بجے تک ان میں مصروف رہا اور آج بھی فراغت کی اُمید نہ تھی۔

خیال آیا کہ اس کے ڈپارٹمنٹ فون کر کے ہی اسے کچھ کہے۔ چلو تھوڑی سی دل جوئی تو ہوگی۔ فزکس ڈپارٹمنٹ کا نمبر ملانے کے لیے اس نے آپریٹر سے بات کی۔ ابھی بات جاری تھی جب بادل کمرے میں داخل ہوا۔ بادل سے دوستی ضرور تھی پر اتنی گہری بھی نہ تھی۔

”بھئی ایک ضروری پیغام دینا ہے جیسے بھی ہو اس لڑکی سے بات کرواؤ۔“

”کوئی نیا شکار پھانسا ہے؟“ بادل نے ہنستے ہوئے پیپر ویٹ ہاتھوں میں پکڑا۔

”تمہیں میں شکاری نظر آتا ہوں؟“ اس کا انداز طنز سے کہیں زیادہ افسوسناک تاثر کا حامل تھا۔

”کچھ کچھ تو ہو۔“ بادل کی مسکراہٹ بھی گہری تھی۔

”تو پھر سمجھ لو کچھ ایسی ہی بات ہے؟“

”تعارف نہیں کراؤ گے؟“ بادل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہرگز نہیں۔“

”کیوں کیا اڑا لوں گا؟“ بادل کے لب و لہجے میں شوخی کے ساتھ ساتھ جو اعتماد کی جھلک تھی وہ اسے اس سے بہت ناگوار گذری۔ اس نے بھی دل جلانے والے انداز میں کہا۔

”اتنا زعم ہے تمہیں خود پر۔ پر بات یہ ہے کہ وہ مال اڑنے والا نہیں یہ مسٹر ای۔ آر۔ خان کا انتخاب ہے۔“

اور بادل نے زور دار ہنکارا بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہوں تو یہ بات ہے۔“

منسٹرز کی میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ نیچے آیا اور سیدھا یونیورسٹی کی طرف بھاگا۔ ڈیپارٹمنٹ میں وہ نہیں تھی۔ دو تین لڑکیوں سے پوچھا تو پتا چلا کہ ہال چلی گئی ہے۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شام کو بہر حال وقت نکالے گا۔ اس نے گاڑی موڑ دی۔ پر جب وہ ریس کورس روڈ کی طرف ٹرن لے رہا تھا۔ اسے دفعتاً وہ نظر آئی تھی۔ قرمزی ساڑی میں لپٹی ہوئی اداس سی۔ وہ ٹی۔ ایس۔ سی سینٹر سے نکل رہی تھی۔

اسے دکھ ہوا۔ اس کا اداس چہرہ سرما کی چاندنی رات جیسا لگ رہا تھا۔

”لیکن یہ ساڑی اس پر کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔“ اس نے خود سے کہا۔

اس کے قریب جا کر بریکیں لگائیں۔ وہ یکدم خوف سے اچھلی۔ اس پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ جم سی گئی۔ وقت کے اس ایک لمحے میں اس کی آنکھوں میں کتنے رنگ کتنے جذبے ابھرے۔ آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا اور بولا۔ ”آؤ بیٹھو۔“

”نہیں۔“ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

”اسٹوپڈ۔ سڑک پر کھڑے ہو کر ضد مت کرو۔ تمہارے اردگرد لوگ ہیں۔ کیا سوچیں گے؟ آؤ۔“

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی کلائی پکڑتا۔ اس نے فوراً بیٹھ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

”بھاڑ میں جائے آفس اور جہنم میں جائے میٹنگ۔“

اس نے اپنے آپ سے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔
"میں نے تمہیں دوسری بار ساڑی میں دیکھا ہے۔ ساڑی بہت بجتی ہے تم پر۔ یہ کہاں سے خریدی ہے؟"
"نیو مارکیٹ سے۔"
"اچھی چوائس ہے تمہاری۔" اس کے لہجے میں چھلکتا اشتیاق نمایاں تھا۔
وہ چپ چاپ گم صم سی بیٹھی تھی۔ آنکھیں جو اسے دیکھتے ہی گیلی ہوگئی تھیں اب سوکھ گئیں۔ دل جیسے ٹھہر سا گیا۔
ایک دکان سے اس نے کھانے کی چند چیزیں خریدیں۔ اور پھر جلد ہی وہ شہر سے باہر تھے۔
ایک پُرفضا سی جگہ پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ ٹیک لگائی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔
"ہاں تو اب بتاؤ مجھے۔ کیا ناراض ہو؟"
پتا نہیں اس کے انداز استفسار میں شفقت اور اپنائیت تھی یا پھر سوچوں نے یکدم مطلع ذہن کو ابر آلود کر ڈالا تھا کہ بس جیسے اپنے آپ پر اختیار ہی ختم ہو گیا ہو۔ ٹپ ٹپ بارش سی شروع ہوگئی۔
وہ گھبرا کر بولا۔ "روتی ہو نگی۔ مجھے خود بھی افسوس ہے نجمی۔ بخدا میں شرمندہ بھی ہوں اور معذرت خواہ بھی۔ معاف کر دو مجھے۔ میری بہت پیاری سی دوست ہو نا۔"
واقعہ یہ تھا۔
کوئی تین دن قبل وہ فزکس ڈپارٹمنٹ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ آیا تھا۔ وہ پریکٹیکل ختم کر کے جب مونا اور ملکہ کے ساتھ باہر آئی۔ مونا ہیڈ سر کے پاس جانا چاہ رہی تھی۔ کاپی پر سائن کروانا تھے۔
"چلو نا تم بھی۔" اس نے ملکہ کے ساتھ اسے بھی گھسیٹنا چاہا۔
اس نے بہتیرا نہ نہ کی۔ بھوک کی شدت اور پیٹ میں چوہے بلیاں کودنے کے بارے میں اسے بتایا۔ پر مونا چیخی۔
"کمبخت تجھے کیا زیادہ ہا بڑا پڑ گیا ہے۔ تیرے ساتھ ہی ہم بھی فارغ ہوئے ہیں۔ چل سیدھی طرح۔ فارغ ہو کر اکٹھے ہال چلتے ہیں۔"
"مونا بائی گاڈ صبح میں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ اب وقت دیکھو چار بجنے کو ہیں۔ سچی بات ہے میں نڈھال ہوئی پڑی ہوں۔"
پر مونا نے اس کی ایک نہ سنی۔

ٹکراؤ ہیڈ سر کے کمرے کے عین دروازے میں ہوا۔
وہ تو اسے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ چہرے کا رنگ فق ہوا۔ ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ غالباً کوئی دوست تھا۔ ملکہ نے جھٹ پٹ نا صرف سلام دے مارا بلکہ اس دن میر پور پہنچانے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔
"میں باسی چیزیں اور باسی شکریئے قبول کرنے کا عادی نہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔
وہ پردہ تھامے کھڑی تھی۔ اپنے ساتھی سے تعارف کا سلسلہ اس نے خود ہی حل کر دیا۔
"یہ نجمہ ہے میرے دوست کی چھوٹی بہن۔ ایکس چینج پروگرام کے تحت لاہور سے آئی ہے۔"
ساتھی نے سر خم کیا اور بولا۔ "موسم خوبصورت ہے۔ آیئے آپ اور آپ کی سہیلیوں کو تھوڑا سا گھما لائیں۔"
اس نے چہرے سے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ مگر دل میں خوش ہوئی وہ ہوم سکنس کا شکار ہو رہی تھی۔ دل صبح سے اچاٹ اچاٹ سا تھا۔
"چلو تھوڑی سی تفریح رہے گی۔" وہ خود سے بولی۔ ملکہ اور مونا بھی تیار ہو گئیں۔
مونا کو کاپی چیک کروانا تھی۔ یہ ان دونوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ ہیڈ سر اندر نہیں ہیں۔
وہیں سے واپسی ہوگئی۔ بڑ تلے کے نیچے کھڑی بیلا کو بھی انہوں نے گھسیٹ لیا۔
راستے میں اسے محسن ملا۔ وہ ویسٹ پاکستانی طلبہ کی ایسوسی ایشن کے ماہانہ اجلاس میں اسے شرکت کا دعوت نامہ دینے آیا تھا جو منگل کے دن سر سلیم اللہ ہال میں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کافی آگے جا چکے تھے۔ ملکہ درمیان میں چل رہی تھی اس کے ساتھ منصور باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ اور مونا پیچھے رہ گئیں۔ بیلا بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔
اس نے آنے کی ہامی بھری اور جان چھڑائی۔ جب وہ کچھ آگے بڑھ آئیں بیلا نے کہا۔ "بہت باتونی لگتا ہے یہ لڑکا۔ کب سے اٹنڈ کر رہی ہو ان کے اجلاس؟"
"دو بار پہلے گئی تھی یا اب یہ دعوت نامہ ملا ہے۔"
وہ تینوں جب کار کے پاس آئیں ملکہ پیچھے بیٹھ چکی تھی۔ وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس کے ساتھی نے سنبھالی ہوئی تھی۔
"تم آگے آ جاؤ میرے پاس۔ دھان پان سی تو ہو۔" عام سے انداز میں کہا گیا تھا۔

وہ آگے بیٹھنا نہیں چاہتی تھی پر صورتِ حال ایسی تھی کہ انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ چپکے سے اس کے پہلو میں دبک گئی بالکل بلی کے بچے کی طرح۔

چینگوا میں جب وہ داخل ہوئے وہ کنی کترا گئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے اپنے پاس بٹھائے گا اور کھانے کے دوران اس پر خصوصی توجہ دے گا۔ مونا اور ملکہ، ثریا اور نازلی جیسی کھلے دل کی لڑکیاں نہ تھیں۔ دونوں خرانٹ تھیں اور اڑتی چڑیا کے پر گننے والوں میں شمار ہوتی تھیں۔ انہوں نے تو فوراً صورتِ حال کو بھانپ لینا تھا۔ اس کی روم میٹ تھیں۔ سارا دن وہ ان کی زبانوں سے ایسے ہی قصے کہانیاں سنتی رہتی تھی۔

وہ ملکہ کے ساتھ چپک گئی۔ اس نے بس ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہا۔

جب شام کا دھندلکا باہر پھیلنے لگا وہ اٹھے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی تیزی سے چلتی پل بھر میں ریس کورس روڈ پر ڈھاکا کلب کے کمپاؤنڈ میں آکر رک گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے معذرت کرتے وہ دونوں اندر چلے گئے اور وہ وہیں گاڑی میں بیٹھی گپیں لگانے اور اِدھر اُدھر دیکھنے میں محو ہوگئیں۔

کلب کیسے ہوتے ہیں؟ اس نے پڑھا تھا یا سن رکھا تھا اور یہ پڑھا اور سنا ہوا یقیناً اس کے طبقے کا نمائندہ تھا اور کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی اس انوکھی دنیا کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ چاند کافی اوپر آیا ہوا تھا۔ پر ٹیوبوں کی دودھیا روشنی میں بھولی بھالی سادہ سی چاندنی کے لیے کہاں گنجائش تھی؟ بیچاری ماند ہوئی پڑی تھی۔

ویٹر چار سیون اپ لے کر آیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا مشروب، پُرسحر ماحول اور یہ احساس کہ یہ لڑکیاں صرف اس کی وجہ سے اس خواب ناک ماحول کا حصہ بنی بیٹھی ہیں اسے احساس بلندی دینے کے لیے کافی تھا۔

لاؤنج میں صاحبِ ثروت لوگ پینے پلانے اور خوش گپیوں میں مگن تھے۔ اکیسٹرا دھیمے دھیمے سروں میں بج رہا تھا۔ خوش پوش بیرے سروس کے لیے مستعد تھے۔

جلد ہی وہ آگئے۔ اس کا ساتھی بولا۔ ''چلو آپ کو سیکنڈ کیپٹیل کے اوپر سے گھماتے ہوئے ہال چھوڑ آتے ہیں۔''

پتا نہیں اسے کیا ہوگیا تھا؟ وہ اس پر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ سرگوشیوں کے انداز میں کیا کہہ رہا تھا؟ یہ سننے کا اسے ہوش نہ تھا۔

''اسے کیا ہوگیا ہے؟''

اس کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

خوف زدہ آنکھوں سے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ عجیب سے تاثرات وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے منہ سے بھی ناگوار سی بُو آرہی تھی۔

اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کرے اور جب کچھ نہ بن پڑا اس نے گھبرائے لہجے میں سرگوشی کی۔

''خدا کے لیے ٹھیک سے بیٹھئے نا۔ وہ لوگ دیکھ رہی ہوں گی۔ باتیں بنائیں گی۔'' اور پھر اس نے ہلکے سے اس کا ہاتھ بھی دبایا۔

اس کی سرگوشی پُر اثر تھی یا ہاتھ دبانے کا عمل شوکنگ ثابت ہوا کہ اس نے فی الفور اپنی نشست درست کرلی۔

اور جب وہ چاروں گاڑی سے اتر کر ہال میں داخل ہوئیں۔ ملکہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے رحمان بھائی نے ڈرنک کی ہوئی تھی۔''

''ارے نہیں۔'' وہ یونہی دفاع پر اتر آئی۔

''بائی گاڈ۔''

اور وہ سن سے ہوئی۔ کچھ مزید کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔ چپ چاپ آڈیٹوریم میں آگئی۔

پر دو دن کیسے گذرے جیسے بندہ جیتے جی پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لے۔ نہ مرے اور نہ جیے بس درمیان میں لٹک جائے۔

پر اس سوچ نے مرے کو مارے شاہ مدار والا کام کیا تھا۔ ایک شراب پینے والے انسان کا کیا اعتبار؟ نشے میں کسی وقت بھی بہک سکتا ہے۔ وہ جس پٹڑی پر بدقت چڑھی تھی یہ تلخ سوچ بار بار اسے اس سے اتار دیتی۔

وہ دوبارہ انہی سوچوں اور الجھنوں میں گھر گئی تھی جن سے تھوڑا سا نکلی تھی۔

☆☆☆

''میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ ایک پوری رات گزارو۔''

اس وقت وہ باہر نظاروں میں گم تھی۔ تاحد نظر دھان کے سرسبز کھیتوں کے پھیلاؤ نے دھرتی پر گہرے سبزے کے جیسے قالین بچھا رکھے تھے۔ ان میں ناریل تاڑ اور کیلوں کے جھنڈ ایک نیا رنگ سجاتے تھے۔ اور ان جھنڈوں میں گھاس پھونس کی باشاہیں کانسی اور سرخ پھولوں سے ڈھکی کسی مصور کا کینوس پر بکھرے شاہکار نظر آتے تھے۔

ایسے من موہ لینے والے منظروں سے لطف اندوزی

میں اس نے کس قدر خوفناک قسم کی بات سنی تھی۔ دہل کر رہ گئی تھی۔
''رات۔''
اس کی آنکھیں پھٹیں۔ اس پھٹاؤ میں خوف کا عنصر غالب تھا۔
''ہاں ہاں بھئی گھبرا کیوں گئی ہو؟'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔
''دیکھو بھئی کومیلا چلیں گے۔ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ بدھا کی بہت سے یادگار عمارات ہیں۔ بہت بڑا زراعتی فارم بھی ہے اور ہاں سنو کومیلا کی رس ملائی بہت مشہور ہے۔ کھاؤ گی تو لطف آجائے گا۔
اس کا لہجہ بشاشت سے بھرپور تھا چہرے پر صبح جیسی تازگی اور کسی انجانی سی مسرت کی لو دمکتی تھی۔ باتیں کرنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اپنے گھر میں کھانے کی میز پر بیٹھا ہو اور اسے کسی پروگرام یا کہیں ٹرپ پر جانے کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا ہو۔
اس نے اپنی بے چینی اور اضطراب پر قابو پایا اور آہستگی سے بولی۔
''چٹا گانگ سے واپسی پر کومیلا میں سے گذرے تھے نا۔ اس کی جھلک تو دیکھ لی ہے، بدھا کی بہت سی یادگاریں میں نے خود تو نہیں دیکھیں پر میری بڑی ڈاکٹر بہن کالج کی طرف سے سوات گئی تھی اس نے واپسی پر تفصیلاً ہمیں ان کے بارے میں اس طرح بتایا کہ ہم نے تصویروں اور ان کے بیان سے ان سبھوں کو دیکھ لیا تھا۔ اب مزید کیا دیکھنی ہیں۔ ہاں زراعتی فارموں سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں۔ رس ملائی میں کھا بیٹھی ہوں۔ آپ نے ہمارے لیے پورا دونا خریدا تو تھا۔''
اور یہ سب سن کر اس کا قہقہہ شام کی خاموشی کے سینے کو چیر گیا۔ ''بہت تیز ہو گئی ہو۔''
وہ بھی ہنسی۔ یہ ہنسی اپنے اندر متانت لیے ہوئے تھی۔
بات اس کے حسابوں آئی گئی ہو گئی۔ پر دو تین دن بعد جب اس نے پھر وہی بات دہرائی تو وہ بس گنگ سی ہو گئی۔ اوپر کا سانس اوپر تلے کا تلے۔ چپ چاپ بیٹھی سوچتی تھی کہ اس کی سوئی تو وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ سانپ کے منہ میں چھچھوندر والا معاملہ ہو گیا تھا جسے نہ اگلے بنتی ہے اور نہ نگلے۔
''تو گویا احسانات اور خلوص کا بدلہ اب یوں لینا چاہتا ہے۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔
بات تو ساری یہ تھی کہ وہ اسے شدت سے پسند کرنے لگی تھی۔ ہال سے یونیورسٹی جاتے ہوئے یونیورسٹی روڈ پر جو کہیں اسے رائل بلیو ٹیوٹا نظر پڑ جاتی تو بس دل قابو میں ہی نہ رہتا۔ ہمہ وقت ذہن کے پردوں پر وہ تھرکتا رہتا۔ آنکھوں میں اس کے عکس جھلملاتے رہتے۔ ہر مرد پر اسی کا گمان گذرتا۔ دماغ خراب ہو گیا تھا۔ یوں اسے خراب بھی ہو جانا چاہیے تھا کہ ہائی جنریٹری کا ایک بہت بڑا افسر جس کی شخصیت میں خاصا گلیمر تھا۔ جس کے نیچے قیمتی گاڑی تھی۔ جو صوبائی حکومت کی کلیدی آسامی پر بیٹھا تھا۔ اسے بے طرح پسند کرنے لگا تھا۔ پر اس پسندیدگی میں کسی عامیانہ پن کا اظہار نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی اوچھی اور بھونڈی حرکت تھی۔ بلند بانگ قسم کے دعوے نہیں تھے۔ بس باتیں تھیں۔ گپیں تھیں۔ لانگ ڈرائیو تھی۔
کتاب میں جو کچھ وہ اب تک پڑھتی آئی تھی اور لڑکیوں کے جو قصے کہانیاں اس نے سنے تھے وہ تقریباً سارے ہی غلط ہو گئے تھے۔ اس کے رکھ رکھاؤ اور اعلیٰ اطوار بہت متاثر کن تھے۔
پر پھر بھی وہ اکثر وبیشتر پریشان ہی رہتی۔ عجیب وغریب سے وسوسے اور اندیشے اسے ڈستے رہتے۔ کبھی کبھی نادانستہ طور پر ان کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔ جن کا جواب دینے کی شاید وہ اب ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔
تم نے جواب نہیں دیا۔
اس نے کھڑکی کا شیشہ ایک ہاتھ سے اوپر چڑھایا۔ ہوا میں خاصی خنکی ہو گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا جسم کانپ سا رہا ہے اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔
''کیا یہ اس بات کا فوری اثر ہے؟ یا واقعی مجھے ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے۔''
وہ خاموش تھی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جب اس کا اصرار بڑھا تب بھی اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ بس ٹپ سے دو آنسو اس کے ہاتھوں پر پڑے جنہیں وہ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں اس کی نظر ان آنسوؤں پر پڑی یا نہیں۔
وہ بڑے نرم اور ملائم سے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔
''مجھی میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے جسے اپنا کر میں تم پر یہ ثابت کر سکوں کہ میں تمہارے کیسے قرب اور کیسی رفاقت کا متمنی ہوں۔ شک وشبہات کے جو رنگ مجھے اکثر وبیشتر تمہاری آنکھوں میں نظر آتے ہیں وہ مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ یکسر ختم ہوں اور ان کی جگہ یقین اور اعتماد کی چمک ہو۔''
(جاری ہے)

دل فگاراں

رِدا احسن عابدی

جذبوں کی آنچ تیز کر کے فکر کے دریچے کھولا کرتا تھا۔ وہ ان کہی کو زبان دیتا، بھٹکے ہوئوں کو راہِ راست پر لاتامگر اس کے ایک جملے نے خود اسے عمیق کھائی میں دھکیل دیا، اس کی عقل سلب ہوگئی۔

ایک معروف صوفی کا انوکھا مگر سبق آموز واقعہ

اسلام کا نور پھیلے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ دوسری صدی ہجری خاتمہ کے قریب تھی اور لوگوں میں مذہبی رجحان اوج پر تھا۔ علم وحرفت کی اہمیت سامنے آرہی تھی لوگ تحصیل علم کے لیے دور دور کا سفر طے کرتے تھے۔

ایسے وقت میں دریائے دجلہ کے دونوں جانب دور دور تک پھیلا ہوا یہ حسین شہر بغداد جسے "مدینتہ السلام" کہا جانے لگا تھا، یہاں لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ یہاں دنیا بھر سے زیادہ خوبصورت اور حسین عمارتیں تھیں، بارونق بازار تھے، وسیع تفریح گاہیں تھیں اور علم کا چرچا تھا۔ کوئی شخص اس وقت تک مکمل تعلیم یافتہ نہ سمجھا جاتا تھا جب تک کہ



وہ بغداد سے تحصیلِ علم نہ کر لیتا تھا۔
یہاں علما کی مجلس، درس و تدریس کے مراکز، علم و ادب کے حلقے اور تبلیغ دین کی بلند آوازیں اس بات کی علامت تھیں کہ فرزندانِ توحید فروغِ دین کے لیے آج بھی اتنے ہی پُرجوش ہیں جتنے ان کے آباؤ اجداد تھے اور توحید کے انہی فرزندوں میں بغداد کے یہ نوجوان عالم اور خوش بیان استاد ابوعبداللہ بھی تھے جو بلاشبہ عالم بھی تھے اور استاد بھی لیکن عاشق نہیں تھے لہٰذا ہر شے میں خدا کے جلوے کو ماننے کے باوجود جاننے سے قاصر تھے گویا کہ "یقین" تھا لیکن علم کی حد تک عین الیقین اور حق الیقین کے مرحلے ابھی باقی تھے۔ جن کے بغیر علم بھی ناقص اور یقین بھی ادھورا مگر ابوعبداللہ اس سے بے خبر تبلیغ دین میں مصروف اسے بڑا کارنامہ سمجھ رہے تھے۔
اس طرح فرزندانِ توحید کی یہ جماعت بڑی تیزی کے ساتھ مصروفِ سفر تھی۔ یہ سفر بڑے بڑے شہروں میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور گاؤں میں کیا جا رہا تھا اور چونکہ ابوعبداللہ خود شریکِ سفر تھے اس لیے ہر پڑاؤ پر قیام کر کے وہاں کے باشندوں کو بنفسِ نفیس دینِ حق سے روشناس کراتے اور ان میں اسلام کی شمع روشن کر کے آگے بڑھ جاتے۔ اس جماعت کے رہن سہن اور انداز بڑے سادہ تھے جس کے باعث لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے وہ جدھر جدھر سے گزرتے لوگ ان کے لیے آنکھیں بچھاتے اور وہ جہاں جہاں جاتے ان کے جانے سے قبل ہی ان کی شہرت پہنچ جاتی۔
یوں وقت گزرتا رہا۔ ابوعبداللہ نے کئی علاقوں میں تبلیغ کا فرض ادا کیا۔ بے شمار افراد کو مسلمان کیا یہاں تک کہ وہ محسوس کرنے لگے کہ اس مرتبہ وہ اپنے ارادے کے مطابق مکمل کامیابی حاصل کر لیں گے۔ اسی خیال کے تحت سفر کرتے ہوئے وہ لوگ ایک ایسے علاقہ میں پہنچ گئے جہاں ابھی تک اسلام کے مبارک قدم نہ پہنچے تھے اور جہاں مکمل طور پر آتش پرستوں کا راج تھا۔ اس وقت دن ڈھل چکا تھا اور نمازِ عصر کا وقت تھا بستی سامنے نظر آ رہی تھی اسے دیکھ کر ابوعبداللہ نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کی اور بولے۔
"یہاں قیام کر کے نمازِ عصر ادا کر لی جائے۔"
"شیخ کا خیال درست ہے۔" فضل نے کہا۔ "لیکن حضرت پانی تو بستی میں ہی ملے گا۔"
"مگر بستی میں جاتے جاتے نماز قضا ہو جائے گی۔" ابوالحسن نے احساس دلایا۔ "کیوں کہ فاصلہ کم نہیں ہے۔"
یہ سن کر ابوعبداللہ نے فکر مند نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج کی سنہری کرنوں میں سرخی گھل رہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ وقت کی اس تنگی کو سب ہی ساتھی محسوس کر رہے تھے اسی وقت جنید اپنا گھوڑا نزدیک لاتے ہوئے بولا۔
"جناب! اس ٹیلے کے عقب میں آتش پرستوں کی عبادت گاہ نظر آ رہی ہے کیوں نا وہاں پانی دیکھیں؟"
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے ابوعبداللہ نے تیزی سے ٹیلے کی جانب گھوڑا موڑا تب سب مریدوں نے ان کی تقلید کی۔ انہوں نے دیکھا بہت کم فاصلہ پر آتش پرستوں کی قربان گاہ تھی جس کے شعلے دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب بستی کے مقتدایانِ مذہب کے ساتھ باقی سب عبادت کیا کرتے تھے وہ اب بھی کر رہے تھے۔
ابوعبداللہ نے دیکھا بستی کے بہت سے لوگ آتش کدے کا طواف کر رہے تھے۔ کچھ بلند آواز سے آگ کی تعریف میں قصیدے گا رہے تھے اور باقی سب مرد و خواتین آگ کو معبود گردانتے ہوئے اسے سجدہ کر رہے تھے۔ عود و عنبر کی خوشبو فضا میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابوعبداللہ نے یہ منظر بغور دیکھا، نفرت و کراہیت کا احساس قلب کو گھیرتا چلا گیا۔ وہ ہمیشہ گناہ کو ناپسند کرتے تھے لیکن باطل پرستی کا منظر دیکھ کر آج وہ گناہ گاروں سے نفرت محسوس کر رہے تھے۔
انہوں نے حقارت سے سوچا۔ "عجیب لوگ ہیں۔ آخر یہ اپنی عقل کو استعمال کیوں نہیں کرتے۔ جاہل بے شعور لوگ خود ساختہ چیزوں کو پوجتے ہیں۔ تُف ہے ان پر......"
اس کراہیت و نفرت کے ساتھ ساتھ طمانیت کا احساس دل میں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ فخر تھا اپنے موحد ہونے کا، مومن ہونے کا، انہیں لگا کہ مالکِ حقیقی کو پہچان لینے کے بعد وہ باطل پرستوں سے بہت برتر ہو گئے ہیں۔ اسی جذبہ فخر کے ساتھ انہوں نے یہاں کے پانی سے وضو کیا اور نمازِ عصر ادا کرنے لگے لیکن نماز تمام کرتے کرتے انہوں نے محسوس کیا جیسے کوئی غیبی آواز ان سے مخاطب ہے۔
"ابوعبداللہ! ایمان اور توحید تمہارا ذاتی کمال تو نہیں جو فخر کر رہے ہو یہ تو ہماری توفیق ہے ہم چاہیں تو سب کچھ سلب کر لیں تمہارے عقل و ایمان سب پر ہمارا اختیار ہے۔"
ابوعبداللہ نے نمایاں طور پر اس تنبیہ کو سنا۔ نماز تمام کر کے اردگرد دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا نہ ان کے کسی اور ساتھی نے یہ آواز سنی تھی۔ ابھی وہ محسوس ہی کر رہے تھے کہ غیبی آواز

سے زیادہ حیران کن بات ایک اور ہوئی کہ انہیں یوں لگا کہ سینے کے اندر سے کوئی شے کھنچ گئی ہے، نکل گئی ہے۔ تب ایک لمحہ اور ایک ساعت میں ابوعبداللہ کی دنیا ہی بدل گئی۔

آتش پرستوں کی اس بستی میں دین حق کا کوئی تصور نہ تھا یہاں کا سردار مہران تھا جس کے بے شمار مویشی اور لاتعداد لونڈی وغلام تھے وہ ایک حویلی میں اپنی اکلوتی بیٹی فیروزاں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہاں کا اپنا قانون تھا اپنے اصول تھے جن سے سرتابی کی مجال کسی کو نہ تھی اور وہ اصول وقانون تھے کہ ہر فرد محنت کرے، عورت مرد بچے بوڑھے ان کا دین وایمان سب کچھ محنت تھا۔ یہ لوگ آگ کی پرستش کے بعد صرف کام کرتے تھے، ہاں کام کی نوعیت سب کے لیے مختلف تھی۔ عام لوگوں کے ساتھ سردار مہران بھی کام کرتا اور دیگر عام لڑکیوں کی طرح اس کی اکلوتی بیٹی فیروزاں بھی کنویں سے پانی لاتی۔

فیروزاں حسن کی دنیا میں عجائبات میں سے تھی۔ بستی میں اس کے حسن کا چرچا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی عادتوں میں وہ بڑی منفرد تھی۔ کھیل تماشے سے دور، ہر صبح اپنے معبد میں جاتی مقدس آگ کی پرستش کرتی، طواف کرتی اس کی تعریف میں قصیدہ گاتی اور دعا مانگ کر لوٹ آتی۔ حویلی کے عقبی دروازے سے معبد کے دروازے تک بس ایک پگڈنڈی ہی تھی جسے وہ روز طے کرتی ایسے میں جو نظر اس کی جانب اٹھتی حسن وپاکیزگی کی معترف ہو کر لوٹتی۔

اس کے دل میں کیا ہے یہ کسی کو علم نہ ہوتا کیوں کہ ہمجولیاں رکھنا یا پھر ایک سے بے تکلف ہونا اس کی عادت نہیں تھی ہاں شگوفہ اس حویلی کی لونڈی فیروزاں کی تنہائیوں کی ساتھی تھی۔ اس وقت بھی جب کہ مہران کی حویلی کے پائیں باغ میں شام بڑی حسین لگ رہی تھی فیروزاں حوض کے کنارے بیٹھی دونوں پاؤں پانی میں لٹکائے اسے ہلکورے دے رہی تھی اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی شگوفہ اسے دنیا بھر کی خبریں سنا رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''آقازادی، آپ کو علم ہے کل صبح آقا نے کاہن اعظم مہرویہ اور معبد کے داروغہ جہانداد کو طلب فرمایا ہے۔ ان کے ساتھ بستی کے معززین بھی آنے والے ہیں۔''

''کیا بابا جان کوئی مجلس منعقد کرنے والے ہیں؟'' فیروزاں نے بدستور پانی کو ہلکورے دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں!'' شگوفہ نے کہا۔ ''اور سنا ہے کہ بغداد کی طرف سے مسلمانوں کی ایک جماعت اپنے دین کی تبلیغ کے لیے آرہی ہے۔ آقا نے کاہن اعظم مہرویہ سے کہا کہ ان کے بڑے عالم سے ملیں گے۔''

''اچھا۔'' فیروزاں نے اسے بغور دیکھا۔ ''تم یہ خبر مجھے کیوں سنا رہی ہو؟''

یہ سن کر شگوفہ ہنس دی اور قدرے رازداری سے بولی۔ ''آپ خوب جانتی ہیں کہ میں یہ خبریں آپ کو کیوں سناتی ہوں اس لیے کہ میں مجلس میں ہونے والی گفتگو سننا چاہتی ہوں۔''

''لیکن تمہیں منع کس نے کیا ہے؟ سن لینا۔'' فیروزاں نے کہا۔

''منع تو کسی نے نہیں کیا مگر آقا مجھے تنہا تو اجازت نہیں دیں گے، نہ میں ان سے اپنی خواہش کا اظہار کرسکتی ہوں آپ ان سے اجازت لیں گی تو مجھے آپ کے ساتھ رہنے کا حکم ملے گا۔'' شگوفہ نے اپنے مطلب کی وضاحت کی۔

''اچھا میں بابا جان سے بات کروں گی۔'' فیروزاں نے وقت کا احساس کرتے ہوئے کہا شاید شام گہری ہونے کے بعد اسے باغ میں رہنا پسند نہیں تھا یا پھر سردار سے بات کرنا مقصود تھی کہ وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر عمارت کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس شب سردار مہران نے کاہن اعظم مہرویہ، معبد کے داروغہ جہانداد اور بستی کے بڑے نجومی جوشن کو مدعو کیا تو بستی کے معززین بھی پہنچ گئے۔ اس وقت فیروزاں کی خواہش پر مردانہ نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں خواتین کے لیے خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ان دونوں نشست گاہوں کے درمیان میں پردے پڑے ہوئے تھے اور چونکہ زنانہ نشست گاہ میں روشنی کا انتظام برائے نام تھا اور مردانہ حصہ میں شمع و فانوس کی کثرت سے بقعہ نور بنا ہوا تھا ایسے میں خواتین پردے کے عقب سے دیکھ سکتی تھیں، سن سکتی تھیں لہٰذا وہ سب کارروائی کے شروع ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بستی کا بڑا عالم مذہبی پیشوا اور کاہن اعظم مہرویہ کھڑا ہوا اور بولا۔

''مقدس آگ کے پوجنے والو! بغداد کی طرف سے آنے والی یہ جماعت مختلف علاقوں میں اپنے مذہب کا پرچار کرتی ہوئی ہماری طرف آرہی ہے۔ وہ یقیناً دوسرے علاقوں کی طرح ہماری بستی میں قیام کریں گے اور اس قیام کا مقصد بھی ان کا مذہب ہوگا۔ ایسے میں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم لوگ دوسرے گاؤں اور علاقہ کے لوگوں کی طرح ان سے متاثر مت ہوجانا ابھی تک ہم لوگ ان کے مذہب کے

بارے میں کچھ نہیں جانتے نہ میں اس بارے میں کچھ جانتا ہوں بلکہ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری معبود مقدس آگ ہے جو ایک لمحہ میں جلا کر خاک کر دیتی ہے اور اہرمن کے غضب سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مقدس آتش کو پوجتے رہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ان دنوں زیادہ سے زیادہ اہرمن کے نام پر قربانیاں دو' صبح و شام ہر وقت معبد اور آتش کدے کا طواف کرو......''

مہرویہ کی اس تقریر نے بستی والوں کو متاثر کیا کچھ لوگوں کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ مہرویہ نے کافی دیر تک انہیں سمجھایا جب اس کی بات پوری ہوگئی تب سردار مہران نے بستی کے نجومی سے کہا۔

''جوشن! تو کہتا تھا کہ علم نجوم کی روشنی میں اس بستی کے مستقبل پر غور کرے گا بتا تیرا علم کیا کہتا ہے۔''

''آقا!'' جوشن نے ادب سے کہا۔ ''میں نے کئی طریقوں سے بستی کے مستقبل کو پڑھا ہے۔ ستاروں کی چالوں کو جانچا ہے لیکن ہر مرتبہ میرے علم نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی یہ جماعت ناکام واپس جائے گی......''

سب نے نجومی کو عقیدت و اطمینان سے دیکھا لیکن اس سے قبل کہ کوئی کچھ کہتا جوشن کا ایک شاگرد اٹھا اور بولا۔

''آقا! ان دنوں ہمارے استاد آقا زادی کے ستاروں کو پڑھ رہے ہیں۔''

مہران نے پوری توجہ سے بات سنی اور بولا۔ ''ہم نے پہلے بھی سنا تھا کہ جوشن ہماری بیٹی فیروزاں کے ستاروں کی چالوں کو پڑھ رہا ہے۔ جوشن! کیا کہتی ہے ان کی چال؟''

''جناب!'' جوشن نے ادب سے کہا۔ ''پچھلے چند دنوں سے میں آقا زادی کے ستارے کے گرد ایک روشن ہالہ دیکھ رہا ہوں۔ اس کے معنی تو یہی ہیں کہ آقا زادی بہت خوش بخت ہیں لیکن فی الحال میرا علم اس ہالہ کے اندر تک پہنچ کر ستارے کو پڑھنے سے قاصر ہے لہٰذا کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی۔''

''اچھا جب بھی کوئی نئی بات محسوس کرو ہمیں مطلع کرنا۔'' مہران نے کہا۔

پھر کچھ وقت انہی موضوعات کی نذر ہوگیا اور محفل برخاست ہوگئی لیکن اس رات کاہنِ اعظم اور نجومی جوشن کی گفتگو ہر گھر کا موضوع بن چکی تھی۔ کوئی مقدس آگ کوئی آتش کدے کے طواف پر بول رہا تھا تو کوئی فیروزاں کے بارے میں پیش گوئی کر رہا تھا لگتا تھا ان باتوں پر بستی والے یقین کیے ہوئے تھے اور انہیں بڑا اہم سمجھ رہے ہیں۔

صبح کا وقت تھا اور بستی سے قدرے فاصلے پر نوجوان عالم ابوعبداللہ کی جماعت بیدار ہو کر عبادت میں مصروف تھی لیکن آج خود عبداللہ کی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ حقیقت میں تو انہیں ان کے چند لمحوں کے متکبرانہ تصور نے مبتلائے آزار کیا تھا لیکن انہیں اس کی خبر نہیں تھی ہاں وہ صرف محسوس کر رہے تھے کہ اندر کچھ بھی نہیں رہا۔

اس سے پہلے ہر روز طلوعِ صبح کا منظر انہیں نا صرف جسمانی بلکہ روحانی فرحت عطا کرتا تھا ایسے میں ان کے دل کا گوشہ گوشہ ہی نہیں بلکہ رواں رواں ثناء خوانی کرتا تھا اور جب بلند درختوں پر بیٹھے ہوئے طیور نغمہ سنجی کرتے تو انہیں لگتا کہ وہ ان سب کی بولی سمجھ رہے ہیں۔ رات کو جب ستارے آسمان پر افشاں بکھیرتے تو انہیں خدا کا جلوہ نظر آتا۔ چاند نور کی بارش کرتا تو اس کے حسن میں وہ اپنے خالق کو دیکھتے الغرض یہ کہ ماہتاب کا طلوع و غروب' آفتاب کی تابانی' آسمان کی بے پناہ وسعتیں' ستاروں کا نظام اور موسم کی رنگینیاں ہر ہر شے میں انہیں حکمتِ الٰہی کی نشانیاں نظر آتیں۔ زمین کی گردش' بحر بیکراں کا نظارہ اور دریا کی موجوں کی روانی انہیں خدا کی عظمت کی یاد دلاتی۔ پہاڑوں کی پُرعظمت بلندیاں' پستیوں کا نشیب اور وقت کی مسلسل رفتار انہیں مالک حقیقی کی بے پایاں قدرت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی اور کارخانۂ ہستی کے ہر ہر گوشہ کو تصور میں لاکر وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے ''علیٰ کلِ شیٔ قدیر'' پھر جب ایک ساعت یا ایک لمحہ کے لیے انہیں اپنی عقل و دانش ایمان اور توحید پر فخر ہوتا تھا تب وہ اسے غرور و تکبر نہیں اپنی خوشی پر محمول کرتے ہوئے جائز سمجھتے تھے لیکن اس تکبرانہ سوچ کے سبب قادرِ مطلق نے ان سے حکمت الٰہی کی پوشیدہ تہوں میں اتر جانے والی نظر چھین لی تھی۔

آج کی صبح ان کے لیے عجیب تھی سب کچھ وہی تھا لیکن ان کے پاس نہ خصوع قلب تھا نہ معرفت کی نگاہ' آج انہوں نے دنیاداروں جیسے انداز میں قلب سے نہیں بلکہ نطق سے نماز کا فرض ادا کیا تھا اور کائنات میں حسن و زیبائی کے انوکھے جلوؤں کو نہیں بلکہ ہر شے کو حسن پرستوں کی نظروں سے دیکھا تھا اور شاید ان کی سوچوں کے تغیر پر وقت نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ ستارے انہیں دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ چاند نے افسردگی کے ساتھ نور کی چادر کو سمیٹا اور سورج اس عالمِ دین کے دیدار کے لیے تیزی

سے سرا و نچا کرنے لگا جو اپنے وطن سے اشاعت دین کے لیے نکلا تھا مگر اثنائے راہ میں ہی اس کے علم کی پونجی لٹ گئی تھی اور لوٹنے والا خود وہی تھا جس نے یہ سب عطا فرمایا تھا۔

وقت کچھ اور تیزی کے ساتھ گزرا تب پروگرام کے مطابق مریدوں نے رخت سفر باندھا اور فضل بولے۔

”شیخ! آپ نے فرمایا تھا کہ سامنے والی بستی میں قیام کریں گے جہاں آبادی ہے لیکن حق نہیں ہے۔“

”ہاں ہم نے کہا تھا“ ابو عبداللہ نے رضامندی کا اظہار کیا تو تلامذہ و مریدوں نے پھر سفر شروع کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں فرزندانِ توحید کا یہ قافلہ آتش پرستوں کی اس بستی میں پہنچ گیا جہاں کے رسم و رواج کے بارے میں ابو عبداللہ کو برسوں سے علم تھا اور دراصل اس سفر کا مقصد ہی یہ علاقہ تھا جہاں کچھ وقت قیام کر کے وہ یہاں کے مشرکوں کو توحید کا درس دینا چاہتے تھے لیکن آج اس وقت ان کی حالت اس شخص جیسی تھی جو سب کچھ بھول گیا ہو اور اسی کیفیت میں ایک پہر سے کم کا یہ سفر انہوں نے یوں طے کیا جیسے لائے جا رہے ہوں خود آئے نہیں۔

یہ جماعت بستی میں داخل ہوئی جہاں جگہ جگہ شرک کے مناظر عام تھے۔ کہیں مرد آگ کے سامنے ڈنڈوت کر رہے تھے کہیں عورت مرد جمع ہو کر سورج کی طرف ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے تھے۔ کہیں آگ کی بڑی بڑی انگیٹھیوں میں اگر عود اور لوبان ڈالتے ہوئے بستی کی لڑکیاں تعریفی گیت گا رہی تھیں یہ سب دیکھتے ہوئے جماعت کے لوگ توبہ استغفار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے لیکن ابو عبداللہ چپ چاپ چلتے رہے نہ زبان پر توبہ کے لفظ آئے نہ دل نے کچھ محسوس کیا لگتا تھا کہ اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے والی حس مٹ گئی ہے۔ ہمیشہ سے وہ جب بھی شرک کے مناظر دیکھتے تو برملا اعلانِ حق کا فرض ادا کر دیتے۔ اس کام میں ان سے کبھی تاخیر نہیں ہوئی تھی اور اس وقت بھی مریدوں کا یہی خیال تھا کہ شیخ ان لوگوں سے خطاب کریں گے لیکن ابو عبداللہ کا سینہ تو خالی تھا ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، کان ہر بات سن رہے تھے لیکن عقل سمجھنے سے قاصر تھی۔ مریدوں نے اسے بھی ان کی مصلحت سمجھا اور خاموشی سے چلتے رہے یہاں تک کہ مسلمانوں کی یہ جماعت بستی کے معبد تک پہنچ گئی۔

اس وقت بستی کی عورتیں معبد سے عبادت کر کے نکل رہی تھیں۔ ان میں فیروزاں بھی شامل تھی جو حسب عادت کسی طرف دیکھے بنا اپنے راستے پر چل رہی تھی۔ ابو عبداللہ نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ آدم کی اولاد پر عقلِ سلیم کا پہرا رہے تو وہ خلیفۃ اللہ ہے، اشرف المخلوقات ہے اور انسان ہے لیکن اگر عقلِ سلیم کا پہرہ اٹھ جائے تو قلب غفلت اور بے خبری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جب قلب غافل ہو تو نظر ہر شے میں دنیاوی حسن ڈھونڈ کر نفس کو تسکین دیتی ہے۔ نفس جو کبھی سیر نہیں ہوتا......

ابو عبداللہ نے فیروزاں کو اسی نظر سے دیکھا اور اسی ایک نظر نے انہیں خیرہ کر دیا۔ انہیں لگا کہ معبد سے نکلنے والی عورتوں میں یہ لڑکی سب سے نمایاں ہے۔ جب تک ابو عبداللہ ہر شے میں قدرت کے مظاہرے دیکھتے رہے انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ بجز کبریائی حسن کے لیکن آج انہوں نے نسوانی حسن پر غور کیا تو انہیں یہی دنیا کا سب سے بڑا حسن نظر آیا۔ اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن انہوں نے نہ غور کیا نہ اس کی ضرورت سمجھی پھر سامنے سے گزرنے والی لڑکی کے سراپے کا جائزہ لیتی ہوئی نظریں چہرے کی طرف اٹھیں تو وہ جیسے دیوانے سے ہو گئے۔ یوں ان کی نظروں نے چہرے سے جسم اور جسم سے چہرے تک کا طواف کیا اور کئی بار کیا تب انہیں لگا کہ یہ صورت کائنات کی سب سے حسین صورت ہے۔ تب ان کے قدم رک گئے انہیں رکتا دیکھ کر مریدوں نے بھی اپنے قدم روک لیے وہ سمجھے کہ شیخ کسی سبب سے شرک کا نظارہ خاموشی سے کر رہے ہیں یا شاید یہاں دین حق کا اعلان وہ کسی اور طرح کرنا چاہتے ہیں لیکن ابو عبداللہ کو نہ شرک کی خبر تھی نہ حق و باطل میں فرق محسوس کرنے والا شعور باقی تھا بلکہ وہ تو دنیاوی نظارے میں کھوئے ہوئے تھے۔ فضل نے کہا۔

”جناب! بستی کی خواتین آتش کدہ سے لوٹ رہی ہیں۔“

مگر ابو عبداللہ نے اب بھی کچھ نہیں کہا چند لمحے توقف کے بعد ابوالحسن نے کہا۔ ”کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسان ہو کر بھی یہ لوگ حق و باطل کی تمیز نہیں رکھتے۔ خدا تعالیٰ انہیں شعور عطا فرمائے۔“

اس وقت شیخ کے منہ سے ”آمین“ بھی نہیں نکلا بلکہ وہ بالکل خاموش رہے تب جنید نے انہیں مخاطب کیا۔

”شیخ! آپ ان لوگوں سے کب خطاب فرمائیں گے؟“

اس سوال پر ابو عبداللہ چونکے لیکن جواب ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ خطاب کریں تو کیا کریں لیکن اس تردد یا لاعلمی

پر خاموشی نے پردہ ڈال دیا۔ مریدوں نے اسے ان کا انہماک سمجھا اور کسی کو بھی علم نہ ہوا کہ ابوعبداللہ ایک لڑکی کے جلوؤں میں گم ہیں جو ان کے دل و دماغ میں اٹھنے والی قیامت سے بے خبر ان میں آجانے والے انقلاب سے بے نیاز اپنی راہ پر چلی جارہی تھی...... پھر انہوں نے بھی قدم بڑھادیے چونکہ اندرونی خرابی کا علم ابھی باہر والوں کو نہیں ہوا تھا لہٰذا مریدوں کے سر بدستور عقیدت سے جھکے ہوئے تھے۔

اس دن سردار مہران کے مصاحب ان کے پاس آئے تو حسبِ دستور مریدوں نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''جناب! ہماری اس تبلیغی جماعت کے سردار ابو عبداللہ ہیں جو تیس ہزار احادیث اور قرآن پاک کے حافظ ہیں اور قرآن پاک کو ساتوں قرأت سے پڑھتے ہیں۔''

سردار مہران کے سفیروں نے دریافت کیا۔ ''کیا تمہارے یہ سردار ابھی ہمارے کاہنِ اعظم سے مناظرہ کرنا پسند کریں گے؟''

مریدوں نے اس سوال کے جواب کے لیے ابو عبداللہ کی طرف دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ ابھی مناظرہ کے لیے رضامند ہوجائیں گے لیکن انہوں نے بدستور سکوت رکھا اور کچھ نہ بولے۔ تب مریدوں نے خود ہی مہران کے لوگوں کو جواب دیا اور بولے۔

''فی الحال طویل سفر کے باعث ہمارے شیخ کی طبیعت ناساز ہے لہٰذا وہ کل جواب دیں گے۔''

مہران کے آدمی لوٹ گئے۔ اس شب مرید دھیمی آوازوں میں ایک دوسرے سے دریافت کررہے تھے۔ سوال ایک ہی تھا۔ ''اس مرتبہ شیخ کو کیا ہوگیا ہے جو اس قدر خاموش ہیں پہلے تو کبھی سفر کی طوالت یا تھکن تبلیغ میں رکاوٹ نہیں بنی؟''

مگر اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا ہاں وہ سب ہی اس تبدیلی کو بے چینی کے ساتھ محسوس کررہے تھے۔ ادھر بستی میں آتش پرست کاہنِ اعظم مباحثہ کی تیاریاں کررہا تھا ادھر مریدوں کو پوری طرح یقین تھا کہ ابوعبداللہ کسی مقابلہ مباحثہ یا تقریر میں کہیں بھی مات نہیں کھاسکتے کیوں کہ آج تک کسی بھی علاقے میں ان کے سوالوں کا جواب کوئی عالم بھی نہ دے سکا تھا اور یہ تو محض مجوسیوں کی چھوٹی سی بستی تھی بھلا کسی عالم کی حیثیت بھی کیا تھی پھر بھی ان کی حالت میں تغیر مریدوں کو پریشان ضرور کررہا تھا وہ سب ہی ان کی طرف سے کسی کلام یا اقدام کے منتظر تھے لیکن اس شام عجیب اتفاق ہوا ابوعبداللہ کچھ کہے بنا ہی بستی کے کنویں پر پہنچ گئے۔ احترام کے طور پر سب مریدوں نے ان کا ساتھ دیا باقی عبادت میں مصروف رہے۔ کنویں پر جاکر ابوعبداللہ رک گئے مرید بھی ٹھہر گئے اس وقت بستی کی لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں فیروزاں بھی تھی۔ ابوعبداللہ اور ان کے ساتھی پہنچے تو لڑکیوں نے انہیں حیرانی سے دیکھا کوئی بولی۔

''کیا آپ کو پانی پینا ہے؟''

''نہیں۔'' ابوعبداللہ نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ لوگ بستی کی سیر کررہے ہیں۔'' کوئی اور لڑکی بولی۔

''نہیں!'' ابوعبداللہ نے کہا۔ ''ہم بستی کی سیر نہیں کررہے بلکہ صرف ایک بات دریافت کرنا چاہتے ہیں۔''

یہ سن کر لڑکیاں ٹھہر گئیں وہ وضع قطع اور لباس سے عالم نظر آتے تھے لہٰذا سب ہی انہیں عزت کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں لیکن آج انہوں نے نہ ناصحانہ بات کی نہ عالمانہ بلکہ فیروزاں کی جانب اشارہ کرکے بولے۔ ''صرف اتنا بتادو کہ یہ کون ہے؟''

اس سوال نے مریدوں کو حیرت زدہ کردیا جس عالم نے علم کے سوا کبھی کوئی بات نہیں کی تھی وہ ایک لڑکی کے بارے میں استفسار کررہا تھا سب نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن خاموش رہے اسی وقت ایک لڑکی نے کہا۔

''جناب! یہ ہمارے سردار مہران کی بیٹی فیروزاں ہیں۔''

ابوعبداللہ نے چند ساعت اسے دیکھا پھر قدرے تعجب سے بولے۔

''اگر یہ سردار کی دختر ہے تو کنویں پر پانی بھرنے کیوں آئی ہے۔ سرداروں کے گھروں میں لونڈی غلام ہوتے ہیں تمہارا سردار غلاموں سے کام کیوں نہیں کراتا؟''

''ہمارے سردار کا خیال ہے کہ ہر فرد کو محنت کرنا چاہیے اس لیے ہم سب اپنا کام خود کرتے ہیں اور آقازادی بھی اپنا کام خود کرتی ہیں۔''

ابوعبداللہ کو یہ بات بہت پسند آئی وہ ماحول سے بے خبر فیروزاں کو تک رہے تھے جو اپنا پانی بھر کر گھڑا اٹھا کر سب کو نظرانداز کرکے روانہ ہوئی تو ابوعبداللہ کی حالت جیسے غیر ہوگئی۔ مریدوں نے اندر کی کیفیت کو نہیں صرف ظاہری حالت کو دیکھا اور کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلتے ہوئے وقت کا احساس دلایا تو ابوعبداللہ بھی کھوئے ہوئے سے پلٹ آئے

اور جماعت تیار دیکھ کرانہوں نے نماز ادا کی لیکن اس طرح جیسے مجبور ہیں صرف ایک رسم ادا کرنا ہے۔ اس دن ذکر الٰہی کرتے ہوئے نہ قلب موجود تھا نہ عقل حاضر، نہ لذت ملی نہ تسکین بلکہ انہوں نے یہ فرض یوں ادا کیا جیسے مجبور ہیں......

پھر اندر کی تبدیلی آہستہ آہستہ مریدوں اور تلامذہ پر آشکار ہونے لگی اور تین دن گزر گئے نہ انہوں نے تبلیغ کا ارادہ کیا نہ اظہارِ حق کے لیے کچھ کہا ایک دن ابوالحسن نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا۔

''شیخ! ہمیں اس بستی میں آئے ہوئے تین دن گزر گئے مگر آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ بستی والے بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ہم بھی منتظر ہیں کہ آپ جس مقصد کے لیے آئے ہیں وہ بات کریں۔''

ابوعبداللہ نے ان سب کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس انداز پر حاضرین نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا اب حیرت ہی نہیں بلکہ انہیں تشویش ہو رہی تھی اس بار فضل نے کہا۔

''شیخ! آپ کی حالت میں یہ تغیر ہم سب کے لیے باعثِ حیرت ہے اور اس علاقہ کے لوگ بھی ہم سے بار بار آپ کے بارے میں استفسار کرتے ہیں آپ کچھ تو فرمائیے کہ ہم انہیں کیا جواب دیں؟''

اس سوال پر ابوعبداللہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ رخ سے بیچارگی عیاں تھی وہ برسوں کے مریض معلوم ہو رہے تھے۔ اس بار ان سب نے انہیں دکھ اور پریشانی سے دیکھا اور جنید نے کہا۔

''جناب! اگر طبیعت ناساز ہے تو وضاحت کیجیے جانثار ہر خدمت کے لیے موجود ہیں۔''

اب تک کئی اور مرید بھی جمع ہو چکے تھے۔ ابوعبداللہ کے گرد ہجوم سا لگا ہوا تھا ایسے میں سب ہی جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ ابوعبداللہ نے گہرا سانس لیا اور آہستہ سے بولے۔

''عزیزو! نہ میں بیمار ہوں نہ مستحقِ علاج۔ ہاں میں مریض ضرور ہوں مگر میرا مرض لاعلاج ہے پھر بھی میں اسے چھپانا نہیں چاہتا اور چھپا بھی نہیں سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں اس بستی کے سردار مہران کی بیٹی فیروزاں سے عشق کرنے لگا ہوں......''

یہ سن کر تمام مرید سناٹے میں رہ گئے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کچھ [illegible] کا حوصلہ ہی نہیں ہو۔ ابوعبداللہ نے اپنی باتیں جاری [illegible] ہوئے کہا۔ ''اب میرے لیے نہ تبلیغ دین ممکن ہے نہ اشاعت علم۔''

یہ سنتے ہی مریدوں میں ایک کہرام مچ گیا۔ اس سفر کی صعوبت ہی کیا کم تھی کہ اب توہین و تذلیل کا احساس بھی دامن گیر ہو گیا۔ کچھ تو رونے لگے کچھ پتھر کے بتوں کے مانند رہ گئے۔ کافی دیر یہی کیفیت رہی آخر سمجھ دار قسم کے مریدوں نے باہمی اتفاق و مشورے کے بعد پھر بات کی جنید نے کہا۔

''شیخ! آخر یہ سب کیسے ہوا کہ آپ خود کو تبلیغ کے قابل نہیں سمجھ رہے کیا یہ سب اس لڑکی کے عشق کا سبب ہے؟''

''نہیں......'' ابوعبداللہ نے اپنی تمام قوت صرف کر کے دھیرے سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ قدرت نے مجھ سے وہ صلاحیت چھین لی ہے۔''

اس کورے جواب پر مریدوں میں غم کی لہر دوڑ گئی لیکن صاحبِ علم قسم کے لوگ سمجھے کہ یہ سب وقتی سی بات ہے اور ایک لڑکی کے عشق کی بدولت ہے لہٰذا سب ہی اپنے اپنے طور پر انہیں سمجھانے لگے۔ ابوالحسن نے کہا۔

''جناب! آپ نے تمام جوانی حصول علم اور اشاعت علم کی نذر کی ہے اب ایک لڑکی کے لیے عمر بھر کے تقدس اور عظمت کو پامال مت کیجیے پھر وہ لڑکی تو آتش پرست ہے مشرک ہے اور آپ مسلمانوں کے ایک بڑے عالم۔ آپ کو مسلمانوں ہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ عورت مل سکتی ہے۔''

اس بات پر شیخ ابوعبداللہ نے انہیں یوں دیکھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو تب فضل نے گزارش کی اور بولے۔

''شیخ! آپ کا علم و فضل اور زہد و عبادت شہرۂ آفاق ہے آپ نے تو خود ہمیں عمر بھر یہی نصیحت فرمائی ہے کہ راہ حق سے نہ ہٹیں مگر یہ آپ کو کیا ہو گیا؟''

اس وقت تمام مرید رو رہے تھے۔ بہت سوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں یہ کیسی آزمائش تھی کہ ان کے سب سے بڑے معلم نے جس نے تبلیغ دین میں عمر گزاری تھی۔ آتش پرستوں کی بستی میں آجانے کے بعد تبلیغ سے انکار کر دیا تھا یہ ان سب کی توہین تھی جس پر ہر فرد دل گرفتہ تھا شرمندہ تھا۔ ایسے میں وہ جس قدر بھی روتے کم تھا۔ تھوڑی دیر یہی کیفیت رہی پھر ابوعبداللہ نے بےچارگی کے عالم میں کہا۔

''میرے عزیزو! اصل بات یہ ہے کہ مجھے لگتا ہے مجھ سے ہدایت کا منصب چھین لیا گیا ہے۔ فضیلت کی تمام

علامات چھین لی گئی ہیں۔ اب نہ مجھے تیس ہزار احادیث یاد ہیں نہ قرآن پاک کی کوئی آیت بس یہ یاد ہے کہ میں تمہارا استاد و معلم تھا لیکن اب کچھ نہیں ہوں۔''

مریدوں نے بڑے غم سے دیکھا کچھ بدستور اشکبار تھے کچھ نے خود کو سنبھالا جنید نے کہا۔

''شیخ! پھر تو ہمیں واپس لوٹنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سرزمین کو چھوڑنے سے آپ کی حالت میں تبدیلی آ جائے۔''

''لیکن اب میں اس سرزمین کو چھوڑ نہیں سکتا۔'' ابو عبداللہ نے گہری سانس لی۔ ''ہاں تم واپس جاسکتے ہو تم واپس لوٹ جاؤ۔''

گویا کہ یہ آخری بات تھی آخری فیصلہ تھا جس کے بعد مریدوں نے ہر طرح انہیں واپسی کے لیے تیار کرنا چاہا' التجا کی انہیں درس گاہیں یاد دلائیں۔ ان ہزاروں شاگردوں کا واسطہ دیا جو ان کا انتظار کررہے تھے اور جنہیں ان کی اشد ضرورت تھی لیکن کوئی اصرار ابوعبداللہ کو اس بستی سے واپسی پر تیار نہ کرسکا اور تھک ہار کر ایک شام تلامذہ کی ایک جماعت روتی پیٹتی بغداد کی طرف واپس لوٹ گئی۔ اپنے عظیم استاد اور بڑے عالم کے اس انجام پر وہ دل گرفتہ تھے انہیں تنہا چھوڑ کر چلے جانا اتنی آسان بات نہ تھی۔

اور جن دنوں بغداد کے مریدوں میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ بے شمار خانقاہیں بند تھیں ہر محفل میں ابو عبداللہ ہی موضوع بنے ہوئے تھے۔ ان دنوں ابوعبداللہ فقیروں کے لباس میں آتش پرستوں کی بستی میں صبح و شام گھومتے نظر آتے۔ انہوں نے فیروزاں کی زیارت کئی بار کی تھی کبھی آتش کدے میں، کبھی کنوئیں پر اور کبھی ہمجولیوں کے ساتھ جھولا جھولتے ہوئے اور یہ سب نظارے انہیں دیوانہ کرتے رہے۔ وقت گزرتا رہا اور فیروزاں کے ساتھ ان کے عشق کا چرچا ہوتا گیا۔ بہت کم وقت میں ان کے نام سے ''عالم'' کا لفظ محو ہوکر ''بے وقوف عاشق'' کا خطاب مشہور ہوگیا تھا لیکن انہیں علم کی بلندیوں سے عشق مجازی کی پستیوں تک پہنچنے کا کوئی احساس نہ تھا لگتا تھا کہ ذلت محسوس کرنے والی کوئی حس ان میں باقی ہی نہیں رہی تھی لہٰذا ایک شام عشق کے ہاتھوں مجبور ہوکر انہوں نے سردار مہران سے فیروزاں کا رشتہ طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔

شام کا وقت تھا بستی کا معزز کاہن مہرو یہ معبد کا داروغہ جہانداد اور مشہور نجومی جوشن سب سردار کی حویلی میں جمع تھے اور ابوعبداللہ بوسیدہ لباس میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ مہران نے دریافت کیا۔

''نووارد تمہارا نام کیا ہے؟''

''مجھے ابوعبداللہ کہتے ہیں۔''

''تم غالباً مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ہماری بستی میں آئے تھے؟'' مہران نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ابوعبداللہ بولے۔

''سردار یہ مسلمانوں کی جماعت کا بڑا عالم ہے۔'' جوشن نجومی نے فخر سے کہا۔ ''وہ جماعت جو ہماری بستی سے ناکام ہوکر واپس لوٹ گئی ہے میں نے ستاروں کی چالیں دیکھ کر پہلے ہی کہا تھا کہ آنے والی جماعت ناکام ہوجائے گی۔''

''ہمیں تیری پیش گوئی یاد ہے جوشن۔'' سردار مہران نے کہا پھر ابوعبداللہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ابوعبداللہ! اپنی جماعت کو رخصت کرنے کے بعد خود یہاں قیام کرنے سے تمہارا مقصد کیا ہے۔ کیا تم آہستہ آہستہ اپنے دین کی تبلیغ کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' ابوعبداللہ نے صفائی کے ساتھ کہا۔ ''اب میں اپنے مذہب کی اشاعت نہیں بلکہ تمہاری دختر سے شادی کا خواہش مند ہوں۔''

''کیوں؟'' سردار مہران کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''کیوں کہ میں اس لڑکی سے عشق کرنے لگا ہوں۔'' ابوعبداللہ نے ایک دم کہا۔

اس جواب پر سردار مہران نے پہلے غصے سے پھر بڑے تحمل سے انہیں دیکھا اور بولا۔ ''ہم نے سنا ہے کہ تم نے اپنی زندگی اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کردی ہے......''

''یہ پرانی بات ہے جب میں نے ایسا کیا تھا۔'' ابو عبداللہ بولے۔ ''اب میرے دل میں اس کے سوا کوئی خواہش نہیں کہ میں اس لڑکی سے شادی کروں۔''

اس جواب پر محفل کا رنگ عجیب ہوگیا ان کی اس صاف گوئی پر معززین کے چہرے سرخ ہوگئے تھے لیکن کاہن اعظم مہرو یہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا اس کی آنکھوں میں ابوعبداللہ کے لیے تمسخر تھا۔ سردار مہران نے اس کے انداز کو محسوس کیا اور جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی اور بولا۔

''کاہنِ اعظم! آپ بتائیے کہ اس شخص کی بات کا کیا جواب دیا جائے۔ اسے ذلیل کرکے اس بستی سے نکال دیا جائے یا خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔''

''دونوں میں سے ایک صورت بھی صحیح نہیں ہے۔''

کاہن اعظم مہرو یہ نے بھی سرگوشی کی۔
''مگر کیوں؟'' سردار مہران نے آہستہ سے کہا۔
''میرا خیال ہے کہ اپنی قوم کا اتنا بڑا عالم ہماری دختر سے بلا مقصد شادی کا خواہش مند نہیں ہوسکتا یہ لوگ ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔''
''جب ہی تو کہتا ہوں کہ دھوکے باز کو دھوکا دینا ہی بہتر ہے۔'' کاہن اعظم مہرو یہ نے کہا۔ ''آپ مجھے اس شخص سے بات کرنے کی اجازت دے دیجیے۔''
''ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں۔'' سردار مہران نے کہا۔
یہ اجازت ملنے پر کاہنِ اعظم مہرو یہ نے قدرے بلند آواز سے اپنی بات شروع کی اور بولا۔ ''ابو عبداللہ! ہم نہیں جانتے کہ تمہاری نیت کیا ہے۔ تم واقعی سردار کی دختر فیروزاں کو چاہتے ہو یا کسی اور ہی مقصد سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو لیکن جو کچھ بھی ہے رشتہ طلب کرتے وقت یہ سوچ لو کہ فیروزاں مقدس آگ کی پرستش کرتی ہے' اہرمن اور یزداں کو مانتی ہے اور چونکہ وہ ایک سردار کی دختر ہے لہٰذا اس سے شادی کی دو شرطیں ہیں اوّل یہ کہ جو اس سے شادی کی خواہش کرے وہ اسی کے دین سے تعلق رکھتا ہو دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شخص کامل ایک برس تک سردار کے مویشی چرانے کی خدمت انجام دے اور یہ بھی سن لو کہ باقی تمام مویشی چرانے کے لیے غلام موجود ہیں لیکن سردار کو اپنے سور چرانے کے لیے ایک خادم چاہیے کیا تم یہ خدمت انجام دے سکو گے؟''
یہ طویل سوال بذاتِ خود ایک جواب تھا ایک تذلیل آمیز جواب۔ اس وقت تمام حاضرین محفل سمجھ رہے تھے کہ ایک مسلمان عالم کے لیے یہ دونوں شرطیں پوری کرنا ناممکن بات تھی لہٰذا سب کو یقین تھا کہ ابو عبداللہ انکار کردیں گے لیکن ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب ابو عبداللہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔
''سردار مہران! اگر تم اپنی بستی میں اعلان کردو کہ تم فیروزاں کا مجھ سے نکاح کرنے والے ہو تو مجھے تمہاری دونوں شرطیں منظور ہیں۔''
اس جواب پر آتش پرستوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب ہی حیران تھے لیکن اسی شام سردار مہران نے اپنی اکلوتی بیٹی فیروزاں اور ابو عبداللہ کی منگنی کا اعلان کیا اور اسی وقت سے ابو عبداللہ سردار کے سور چرانے پر مامور ہوگئے۔
یہ سردار مہران کی حویلی کا زنانہ حصہ تھا اور وہ وقت تھا جب فیروزاں ہر روز اٹھ کر اس حویلی کے عقبی راستے سے معبد جاتی۔ آتش کدے میں طواف کرتی' مقدس آگ کی تعریف میں قصیدہ گاتی اور دعا مانگ کر پلٹ آتی مگر پچھلے دنوں سے اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ وہ جب بھی آگ کا طواف کرکے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو ایک سراپا اس کی نظروں کے سامنے آجاتا تب اسے یاد ہی نہ رہتا کہ وہ کیا مانگ رہی تھی بس سامنے آنے والے سراپا کے لب ہلتے اور وہ بے آواز اس طرح بولتا کہ کوئی کچھ نہ سن سکتا لیکن یہ جملے فیروزاں کے قلب میں اتر جاتے اسے لگتا کوئی کہہ رہا ہے۔
''فیروزاں! آگ کی پرستش کو چھوڑ دے اور اصل معبود کو پہچان۔''
تب وہ حیران ہو کر ارد گرد دیکھتی لیکن نہ کوئی نظر آتا اور نہ کوئی آواز سنائی دیتی۔ ایسے میں وہ بری طرح سے پریشان ہوجاتی۔
کئی دن سے مسلسل یہی ہو رہا تھا چنانچہ وہ آج آتش کدہ جانے کے بجائے حیران و پریشان سی بیٹھی ہوئی تھی اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ اس نے شب خوابی کا لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ جائے یا نہ جائے گومگو کا عالم تھا ابھی وہ محوِ فکر ہی تھی کہ قدموں کی آواز نے توجہ بٹائی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کی خاص کنیز شگوفہ کھڑی ہوئی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے تکتے رہنے کے بعد بولی۔
''آقا زادی! کیا بات ہے آپ چند دن سے متردد سی نظر آتی ہیں۔ معبد میں بھی پریشان رہتی ہیں اور اب بھی مضطرب ہیں بلکہ آج تو عبادت کے لیے بھی نہیں گئیں کیوں؟''
اس لمحہ فیروزاں نے خود کو سنبھالا شاید وہ شگوفہ پر بھی آشکار کرنا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اطمینان کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات ٹالنے کے لیے بولی۔ ''کوئی خاص بات نہیں ہے بس آج طبیعت کچھ مضمحل سی تھی۔''
''خیر!'' شگوفہ نے غور سے اور قدرے شوخی سے دیکھا۔ ''آپ چھپانا چاہیں تو بات دوسری ہے ورنہ کنیز کو آپ کا مزاج سمجھنے میں دیر نہیں لگتی...... ہاں خوب یاد آیا۔ آج پھر ان کے دیدار ہوگئے۔''
''کن کے؟'' فیروزاں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
''وہی آپ کے مسلمان عاشق منگیتر۔'' شگوفہ نے تمسخر سے کہا۔ ''وہ آقا کے مویشیوں کے ساتھ جنگل کی طرف جا رہے تھے۔''

"ہاں۔ ہم نے سنا ہے کہ بابا جان نے اسے مویشی چرانے پر مامور کردیا ہے۔" فیروزاں نے کہا۔

"اور وہ پوری ایمانداری کے ساتھ یہ خدمت انجام دے رہا ہے......" شگوفہ نے کہا۔ "اور سچ بات یہ ہے کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عاشق نہیں دیکھا اسے جس خدمت پر مامور کیے مہینوں گزر گئے وہ اسی پر کاربند ہے۔ عاشق تو چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ دیواریں کود کود کر دیکھنے آتے ہیں۔ تحفے تحائف بھجواتے ہیں لیکن وہ تو خاموشی سے سال پورا ہونے کا انتظار کررہا ہے۔"

فیروزاں نے خاموشی کے ساتھ بات سنی اور دھیرے سے بولی۔ "کیا یہ زیادتی نہیں کہ وہ ہمارے سؤر چرانے کے لیے لے جائے؟"

"نہیں......" شگوفہ نے کہا۔ "زیادتی تو اس وقت تھی جب وہ حقیقت میں آپ کا منگیتر ہوتا مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ آقا کاہنِ اعظم مہرویہ سے کہہ رہے تھے کہ ایک برس پورا ہونے پر ہم اسے دھکے دے کر بستی سے نکال دیں گے تاکہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو پتا چلے کہ وہ ہمیں اپنا مذہب سکھانے آیا تھا تو انجام کیا ہوا۔"

فیروزاں کچھ نہ بولی اسے نہ تو منگنی سے غرض تھی نہ ابو عبداللہ سے۔ ہاں اپنی فطرت سے مجبور ہوکر وہ اس شخص سے ہمدردی کررہی تھی جو اس کے عشق میں اپنی حیثیت سے گرگیا تھا لیکن یہ ہمدردی دل تک ہی محدود تھی اس نے اس بارے میں کچھ کہنا پسند نہیں کیا تھا اس وقت بھی کچھ کہنا پسند نہیں کیا چند لمحے توقف کے بعد شگوفہ بولی۔

"آقازادی! آج آپ آتش کدے نہیں گئیں لیکن کیا کمرے سے بھی نہیں نکلیں گی؟"

"نہیں۔" فیروزاں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آج کچھ کرنے کا دل نہیں چاہتا۔"

"آقا نے دریافت کیا تو......؟"

"کہہ دینا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" فیروزاں نے بیزاری سے اس کی بات قطع کی اور بستر پر لیٹ گئی۔ شگوفہ چند ساعت متردد سی کھڑی رہی پھر اس کی توجہ نہ پاکر چپ چاپ لوٹ گئی اور فیروزاں ایک بار پھر خیالوں میں کھوگئی یہ خیالات تھے۔ فرضی منگنی...... عجیب وغریب عاشق اور نرالے عشق کے...... اور بستی میں ہونے والی ان باتوں کے جو اس شخص کے بارے میں کی جاتی تھیں...... آخر وہ اتنا کیوں گرگیا...... پھر خیالات بھٹکتے گئے اور ہمیشہ کی طرح ایک نقطہ پر منجمد ہوگئے۔ یہ نقطہ پھیلتا گیا ایک عجیب سا سراپا واضح ہوتا گیا او فیروزاں کے ذہن کو جکڑتا گیا اور وہ سوچتی ہی رہ گئی یہ کو ہے اور کیا کہتا ہے۔

"فیروزاں! بتوں کو چھوڑ...... معبود حقیقی کو پہچان۔"

پھر وہ سوچتی رہی، پریشان ہوتی رہی لیکن دن بھر کی نین اور آرام نے قلب وذہن کو سکون دیا تو طبیعت کچھ بحال ہو لیکن اسی شام پنگھٹ سے واپس آنے والی ہجولیوں بتایا۔

"فیروزاں! ابوعبداللہ جنگل سے واپس آتے ہو پنگھٹ کی طرف آیا تھا لیکن تجھے نہ پاکر واپس چلا گیا۔"

ہر روز کی طرح آج بھی فیروزاں نے یہ باتیں سنیں ہجولیاں مذاق کرتی رہیں لیکن اسے نہ تعجب ہوا نہ خوشی اور نہ اس نے اس مذاق کو پسند کیا۔ ہجولیاں لوٹ گئیں اور فیروزاں کی تنہائی پسندی بڑھتی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ پنگھٹ پر جانے سے ناغہ کرنے لگی۔ آتش کدہ جانے سے گھبرانے لگی۔ غیبی آواز والے انوکھے کلام اور سراپا نے اسے گھبرا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ محفل میں بیٹھے ہوئے بھی تصورات میں کھو جاتی اور تنہا ہوتی تو اسی الجھن کو سلجھانے کی کوشش کرتی یوں الجھ الجھ کر آخر اس نے ایک دن آتش کدہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس دن عجیب اتفاق ہوا وہ جونہی آتشکدہ پہنچی داروغہ جہانداد اسے دیکھ کر ایک جانب ہٹ گیا وہ آگے بڑھی اور بصد احترام معبد میں داخل ہوگئی۔ جہاں ایک بہت بڑا الاؤ دہک رہا تھا۔ ڈنڈوت کرنے کے لیے کئی خادم رکھے ہوئے تھے جونہی پرستش کرنے والے آتے یہ سب ہٹ جاتے۔ فیروزاں نے تنہائی ملتے ہی طواف شروع کردیا۔ اس کے لبوں پر مقدس آگ کا قصیدہ تھا اور قدم تیزی سے الاؤ کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ کچھ دیر گزری وہ ہر طرف سے بے نیاز مصروف عبادت تھی کہ ایک دم چونک گئی۔ وہی سفید لبادہ اوڑھے سراپا اس کی راہ میں حائل تھا۔ فیروزاں کے قدم رک گئے اس نے خوفزدہ سے انداز میں دیکھا اس سراپا کی کوئی شکل نہ تھی۔ نہ آج کوئی آواز... سنائی دی ہاں اس نے دیکھا اس کا دایاں ہاتھ آگے بڑھا جیسے مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسے میں فیروزاں کی چیخ نکل گئی جسے سن کر جہانداد اور دوسرے لوگ متوجہ ہوئے لیکن وہ پلٹی اور ایک لفظ بولے بنا آتش کدہ سے نکل گئی۔

"یہ کون تھا؟"

"مرا ہاتھ کیوں مانگ رہا تھا؟"

"وہ ہر روز معبد میں کیسے آجاتا ہے؟"
"اسے کوئی اور کیوں نہیں دیکھتا؟"
ان سوالوں کا فیروزاں کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن وہ سب اسے الجھا رہے تھے۔ اس نے سوچا آج وہ یہ بات سب پر ظاہر کردے گی۔ یہی سوچتی ہوئی وہ تیزی سے چلی جارہی تھی۔ اگرچہ حویلی سے معبد تک کا راستہ خاصہ طویل تھا لیکن جب عقب والی کچی پگڈنڈی کو اختیار کیا جاتا تو یہ رستہ نصف رہ جاتا تھا مگر اس وقت اسے یہ راہ بڑی ہی طویل اور دشوار نظر آرہی تھی اور لگتا تھا جس غیبی سراپا سے بچ کر وہ آتش کدہ سے بھاگی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ ہے اور مخاطب ہے۔
"فیروزاں! اصل معبود کو پہچان...... فیروزاں حقیقی معبود کو پہچان۔"
فیروزاں نے حیران ہوکر دیکھا لیکن آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کردی اور اس دن شب ہونے سے قبل ہی پوری بستی میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ معبد میں کوئی مشتبہ آدمی فیروزاں کو تنگ کرتا ہے اس شام سردار مہران نے کاہنِ اعظم مہرویہ، داروغہ معبد جہانداد اور نجومی جوشن کو طلب کیا اور بولا۔
"جہانداد! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ معبد میں کسی ایسے شخص کو داخل ہونے کی اجازت کیوں دی گئی جو مقدس آتش کے احترام کو نظر انداز کرکے فیروزاں سے مذاق کرتا ہے؟"
یہ سن کر جہانداد ادب سے کھڑے ہوکر بولا۔ "سردار! یہ غلام ہر وقت آتش کدہ میں موجود رہتا ہے اور یزداں کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ غلام نے آج تک اس متبرک جگہ کسی کو نہیں دیکھا کہیں معزز فیروزاں کو دھوکا تو نہیں ہوا؟"
"ہم نے ہر طرح معلوم کرلیا ہے۔" سردار مہران نے کہا۔ "فیروزاں ایک عرصہ سے اس سراپا کو دیکھ رہی ہے وہ اس سے بات کرتا ہے اور آج اس نے اس کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔ ہم نے تمہیں اسی لیے طلب کیا ہے کہ اس کا پتا لگاؤ۔"
"بہتر ہے جناب!" جہانداد نے احترام سے کہا۔
پھر سردار نے کاہن اعظم مہرویہ کی جانب دیکھا اور بولا۔ "کاہن اعظم! آپ بھی اس جانب توجہ فرمائیے آخر یہ سب کیا ہے؟"
"بہتر جناب۔" مہرویہ نے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی مناسب ہوگا کہ حضور بستی کے کونے کونے میں پہرا لگوادیں تاکہ جونہی وہ شخص آئے اسے پکڑ لیا جائے۔"
سردار مہران نے فوراً اعلان کرایا اور بستی میں مختلف جگہوں پر پہرا لگا دیا گیا لیکن جہانداد کی احتیاطیں۔ کاہن اعظم کی توجہ اور سردار مہران کے احکامات کے باوجود فیروزاں کو وہ سراپا نظر آتا رہا جسے کوئی اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ غیبی آوازیں بدستور سنائی دیتی رہیں جنہیں کوئی اور نہ سن سکتا تھا۔
ادھر یہ ہورہا تھا اور اُدھر ابوعبداللہ سردار مہران کے خاص مویشی چرانے کی خدمت پوری تندہی سے انجام دے رہے تھے۔ وہ صبح اٹھتے جانوروں کو ہانکتے ہوئے جنگل کی طرف نکل جاتے۔ اب ان کا لباس بھی عامیانہ تھا اور رہن سہن کا انداز بھی البتہ علمیت کے زمانے کی یادگار صرف ایک شے باقی رہ گئی تھی اور وہ تھا ان کا عصا۔ وہی عصا جس سے ٹیک لگا کر وہ کبھی اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے کبھی خطبہ اور جسے ہاتھ میں لے کر کبھی صبح کی سیر کو نکل جاتے تھے اب وہی عصا ٹیک کر وہ کھڑے ہوتے تو وقت کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔ ان کے گرد جانور ہی جانور ہوتے جو دوڑتے، چرتے، کلیلیں کرتے مگر انہیں خبر ہی نہ ہوتی۔ وہ عالم دین جو نماز کا وقت شروع ہونے سے قبل اس کی تیاری کرنے لگتا تھا ایک نماز کا فرض ادا کرکے دوسری نماز کا بے چینی سے انتظار کرتا اب اس کا یہ عالم تھا کہ نماز کا وقت آتا اور قضا ہوجاتا مگر اسے احساس ہی نہ ہوتا لگتا تھا اس کے دل سے ہر جذبہ اور ہر احساس مٹ گیا نہ اسے اپنے مرتبے کی خبر ہے نہ معبود و عبد کے فرق کی پروا ہاں اگر علم ہے تو صرف اس کا کہ شرط کی معیاد پوری ہونے والی ہے۔ اس شخص کو ہر بات کی عقل تھی بجز اس کے کہ وہ کیا تھا اور اسے کیا کرنا تھا۔
یہ طویل عرصہ ابو عبداللہ نے یوں گزارا کہ صبح ہوتے ہی جنگل چلے جاتے تمام دن حیوانوں کے درمیان گزارتے۔ شام کو واپس لوٹتے تو ان سب کی گنتی کرکے مہران کے نوکروں کے حوالے کرتے اور اپنی کٹیا میں لوٹ جاتے جو بستی کے باہر تھی اس تمام عرصے میں انہوں نے صرف چند بار ہی فیروزاں کو دیکھا تھا لیکن ان کے لیے یہی کافی تھا کیوں کہ اس کے تصور نے تو ان کے ذہن کو یوں جکڑ لیا تھا کہ ہر شے میں انہیں اسی کا جلوہ نظر آتا۔
ہر چیز کی رعنائی اسی کی یاد دلاتی گویا کہ اس محبوب مجازی کی محبت کے باعث اب دل کے کسی گوشے میں دور دور بھی محبوب حقیقی کا تصور باقی نہ رہا تھا الغرض کہ بے شمار انسانوں کو صراط مستقیم سے آشنا کرنے والا اب خود حیوانوں کا نگہبان بن کر رہ گیا تھا اور بستی کے اندر باقاعدہ اس کا مذاق

اڑایا جاتا تھا مہران کا فیصلہ تھا کہ جس دن سال پورا ہوگا وہ حسبِ وعدہ فیروزاں کا ہاتھ طلب کرنے آئے گا اس دن بستی کے ہر فرد کو اجازت ہوگی کہ جتنا دل چاہے اسے ذلیل کردے لیکن ابوعبداللہ ان سب باتوں سے بے خبر اس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا فیروزاں آتش کدہ پہنچی تو حسبِ دستور جہانداد نے خوب توجہ اور دیکھ بھال کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دی وہ اندر داخل ہوئی تو ایک معطر جھونکے نے اسے چونکا دیا پھر اس نے آگ کا طواف شروع کیا تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے اور آگ کے درمیان حائل ہے پھر جونہی اس نے طواف مکمل کر کے مقدس آگ کی تعریف میں قصیدہ شروع کیا تو کسی نے اس کے کان میں کہا۔

”فیروزاں! حق کو چھوڑ کر باطل کی تعریف کرتی ہے۔“

اس آواز پر فیروزاں نے اپنی آواز دھیمی کرلی جو دھیمی ہی ہوتی چلی گئی اور عمر میں پہلی بار وہ ڈری نہیں بلکہ کوئی شے اسے پورے حوصلہ کے ساتھ حق و باطل کے فرق کو محسوس کرنے کا شعور دے رہی تھی کوئی خود اس کے اندر سے سوال کررہا تھا۔

”مقدس آگ کو کس نے پیدا کیا؟“

فیروزاں غور کرتی ہوئی اپنی ہی سوچوں میں گم باہر نکلی تو جہانداد نے ادب سے پوچھا۔

”آقازادی! کیا آپ نے آج بھی کچھ دیکھا؟“

”نہیں۔“ فیروزاں نے ایک دم ہی جھوٹ بولا۔

”آج ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔“

یہ خبر آنِ واحد میں بستی میں مشہور ہوگئی۔ جہانداد نے اطمینان کا سانس لیا' کاہن اعظم نے اسے اپنے علم کا کمال سمجھا اور سردار مہران نے اس عذاب کے ٹل جانے پر اہرمن اور یزداں کے حضور قربانیاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا لیکن فیروزاں کی حالت کا کسی کو بھی علم نہ تھا کیوں کہ غیبی آوازیں اور سراپا اس آتش کدہ میں ہی نہیں بلکہ حویلی کے اندر بھی نظر آتا تھا وہ اسے جاگتے ہوئے بھی دیکھتی اور نیند میں بھی۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے وہ اس سے ڈرتی تھی اب مانوس ہوتی جارہی تھی۔ نہ معبد میں جا کر طواف کرنے کو دل چاہتا نہ آگ کی تعریف میں قصیدہ گانے پر دل مائل ہوتا بلکہ یہ غیبی سرگوشیاں اچھی لگتیں اور عقل بار بار ایک ہی سوال کرتی۔

”مقدس آگ کو کس نے بنایا؟“

ایسے میں فیروزاں سوچنے لگتی اور ہر چند کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا مگر یہ معبودِ حقیقی تک رسائی کی طرف پہلا قدم تھا۔

وقت اچھا ہو یا برا گزر ہی جاتا ہے۔ ابوعبداللہ کی زندگی کا یہ طویل اور دشوار سال بھی گزر ہی گیا۔ اس زمانے میں ان کے مریدوں کی ایک جماعت بغداد سے سفر کرتی ہوئی ادھر آئی لیکن انہیں ہوش وخرد سے بیگانہ دیکھ کر دل گرفتہ سی واپس لوٹ گئی کسی انسان کو بنانے اور بگاڑنے کی کوشش کرنا انسان کے اختیار میں ہوسکتا ہے لیکن اس کے سوا کوئی اختیار نہیں لیکن قدرت کسی کو بگاڑنے یا بنانے کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ بس ”کن“ کہا اور ہوگیا چنانچہ جس شام ابو عبداللہ کو مویشی چراتے ہوئے بارہ ماہ پورے کر کے حویلی میں حاضر ہونا تھا اسی دن قدرت کی جانب سے ان کی آزمائش کی معیاد بھی پوری ہونے والی تھی اور اسی دن ایک لمحہ ایک ساعت میں ان کی دنیا پھر بدل گئی۔ ہوا یہ کہ وہ سر پر مجوسیوں کی ٹوپی رکھے کمر میں زنار باندھے' پیروں میں غلاموں والے ٹوٹے ہوئے جوتے پہنے اور ہاتھ میں اپنا عصا لیے ہوئے کھڑے تھے اس وقت ان کے گرد سردار مہران کے سؤر چر رہے تھے تب اچانک ہی انہیں محسوس ہوا کہ کوئی ان سے پوچھ رہا ہے۔

”ابوعبداللہ! تم اپنی عقل کیوں نہیں استعمال کرتے؟“

یہ سوال نہ تھا ایک تنبیہہ تھی۔ ایک تلمیح تھی اور عہد رفتہ یا ماضی قریب کے اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا جس کے بعد وہ آزمائے گئے تھے اور جو انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی یاد نہیں آیا تھا مگر آج اس سوال پر وہ چونک گئے انہیں ایک دم ہی وہ شام یاد آگئی جب مریدوں کی پوری ایک جماعت کے ساتھ وہ اس بستی میں آئے تھے اور آتش پرستوں کو شرک کرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے تکبر اور کراہیت کے ساتھ سوچا تھا کہ یہ لوگ آخر اپنی عقل کو استعمال کیوں نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یاد آیا کہ اسی شام نماز عصر کے وقت انہیں اس غرور وتکبر پر تنبیہہ ہوئی تھی اور کسی نے کہا تھا۔

”اگر ہم چاہیں تو تمہارا سب کچھ سلب کرلیں تمہاری عقلیں تو کچھ بھی نہیں......“

ابوعبداللہ کو یہ سب کچھ ایک ساعت میں یاد آگیا اور اب جیسے کوئی طنز کررہا تھا کہ ”اب تم عقل کو استعمال کیوں نہیں کرتے؟“

اس پر ابوعبداللہ نے ایک چیخ ماری اور سجدہ میں گر گئے۔ یہ چیخ کی آواز تھی یا کیا کہ پرواز کرتے ہوئے پرند منتشر ہو گئے۔ ان کے گرد کھڑے ہوئے حیوان بدحواس ہو کر بستی کی طرف بھاگ پڑے لیکن انہیں کچھ ہوش نہ تھا وہ معلم کے درجہ سے سؤر چرانے تک کی تذلیل آمیز حیثیت کا تصور کر کے بری طرح سے رو رہے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ خداوند عالم کے حضور ان کا رواں رواں شرمسار تھا اور سجدہ میں سر رکھے ہوئے وہ فریاد کر رہے تھے۔

"پروردگار عالم! مجھے اس بھول کی اتنی سنگین سزا نہ دے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ تو واحد ولاشریک ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہماری عقلوں پر بھی تیرا ہی قبضہ ہے تو اگر چاہے تو دلوں پر مہر لگا دے اور تو چاہے تو ہمارے دلوں کو علم کے لیے کھول دے۔ بے شک تو ہی ہر شے کا مالک ہے مختار ہے۔ علیٰ کل شی قدیر ہے۔

پھر ان کی زبان ان کا دل اسی آیت ربانی کا ورد کرنے لگی۔ غفلت کا پردہ چاک ہونے لگا اور اس ورد کے ساتھ ساتھ کلام الٰہی جسے وہ فراموش کر چکے تھے اب پھر ان کے قلب پر اترنے لگا اور سینہ روشن ہونے لگا۔ زبان سے فرمان الٰہی کے جاری ہونے کے ساتھ ساتھ ابوعبداللہ تڑپ تڑپ کر گریہ کرنے لگے۔

ایک برس وہ یوں ذلیل ہوتے رہے کہ انہیں کوئی عزت نہ دے سکا اور وہ خود بھی سب کچھ دیکھتے ہوئے مجبور تھے۔ ان کے پاس عقل تھی عقل سلیم نہیں۔ ذہن تھا غور نہیں کر سکتے تھے۔ آنکھیں تھیں، لیکن بصیرت نہ تھی، کان تھے لیکن ہدایت کا اثر لینے والے نہیں جو مریدوں کے سمجھانے پر سمجھ پاتے۔ انہوں نے حیوانوں میں حیوانوں کی طرح اور مشرکوں میں مشرکوں کی طرح وقت گزارا تھا اور اب عاجزی اور پشیمانی سے سجدہ میں سر رکھے قادر مطلق کے اعلیٰ وارفع ہونے کا اعتراف کر رہے تھے۔ ذہن کا قفل ٹوٹ چکا تھا اور وہ اپنے منصب کی طرف لوٹ رہے تھے اپنی خطا کا اعتراف اور توبہ و استغفار کر رہے تھے۔

عجیب بات ہے کہ انسان کی اوّلین عبادت بھی توبہ اور آخری عبادت بھی توبہ ہے جو قبول ہو جائے تو سب کچھ ہے اسی کی بدولت ابوعبداللہ کا سینہ ایک بار پھر علم کے لیے کھول دیا گیا تھا اور انہیں بار بار وہ آیت مبارکہ یاد آ رہی تھی۔

"مسلمانو! اگر تم خدا سے ڈرنے والے ہو جاؤ تو اللہ تمام دنیا میں تمہارے لیے ایک امتیاز اور سربلندی پیدا کر دے گا۔"

اس مبارک آیت کا یاد آ جانا گویا بخشش کی علامت بھی تھا اور سربلندی و عزت کا وعدہ بھی۔ غافل منور ہوا اور ابو عبداللہ اس آیت ربانی کو پڑھنے لگے تب قرآن پاک کی ہر ہر آیت انہیں یکے بعد دیگرے یاد آنے لگی۔

پھر وہ استغفار کرتے رہے۔ حالت میں انقلاب آتا گیا اور انہیں بھولا ہوا تمام علم واپس ہوتا رہا اس شام صرف چند ساعت اور چند لمحوں میں قدرت نے انہیں سلب کیا ہوا تمام علم واپس کر دیا اور اس انوکھے تجربہ کے بعد عقل پہلے سے زیادہ کامل اور قلب پہلے سے زیادہ منور ہو گیا اور وہ حافظ قرآن اور تیس ہزار احادیث کے پھر سے امین بن گئے۔ اس بار روتے روتے انہوں نے خدا کی وحدانیت اور اس کے محبوب کی رسالت کی گواہی دیتے ہوئے سر اٹھایا تو ان کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔

آج پھر غروب آفتاب کی سرخی فضائی رنگینی اور نباتات کی صورت آرائی میں انہیں حسن کبریائی نظر آ رہا تھا یہ وہی جلوہ، وہی حسن تھا جس سے وہ کامل ایک برس غافل رہے تھے۔ اب انہوں نے ہوش مندوں کی طرح اپنے اردگرد دیکھا، شام کا جلوہ، طائران خوشنوا کی نغمہ سنجی، زمین کے نشیب و فراز اور حد نظر تک پھیلے ہوئے آسمان کی وسعتیں انہیں خدا کی عظمت کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ روتے روتے پھر سجدہ میں گر گئے ایک طویل سجدہ شکر، آزمائش میں ڈالنے والی ہستی بھی وہی تھی اور آزمائش سے نکالنے والی ہستی بھی وہی۔

پھر اس عظیم آزمائش کے بعد قدرت نے انہیں بطور انعام اس علم سے سوا علم عطا فرمایا جو سلب کیا تھا۔ آج اس علم میں یقین تھا وہ علم الیقین اور عین الیقین کے درجے سے گزر کر اب حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچ چکے تھے یہی تیسرا درجہ تھا علم اور یقین کا لہٰذا اس بار جو وہ سجدہ سے اٹھے تو ان کی نظریں فاصلوں کی قید سے آزاد تھیں اور جسم سفر کرنے کے لیے سواری کا محتاج نہ تھا۔ آج بغداد کا یہ عالم دین ولایت کے درجہ پر فائز ہو چکا تھا۔ آج ابوعبداللہ نے عاجزانہ انداز میں سر جھکایا اور کلمہ پڑھتے ہوئے ایک ساعت میں بغداد پہنچ گئے۔

اس شام آتش پرستوں کی بستی میں تمام مویشیوں کے بدحواس ہو کر واپس آنے اور ابوعبداللہ کے اچانک غائب ہونے پر گھر گھر تشویش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ عین اس وقت ابوعبداللہ بغداد میں اپنی درس گاہ میں سفید لباس زیب تن

کیے عصا ٹیکے اپنے مریدوں سے ہمکلام تھے۔ ہزاروں مرید اس ابتلا و آزمائش کے بارے میں جان کر عقیدت سے آبدیدہ ہو رہے تھے۔ آج عبداللہ کے رخ پر علیت اور جلال کے ساتھ اعتراف بندگی کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تو سننے والے چونک گئے۔ یہ تقریر ہمیشہ سے مختلف اور عجیب وغریب تھی۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو دیکھا اور بولے۔

''میرے عزیزو! سنو! بہترین ساتھی زبان ہے' یہ ساتھی اگر لغزش کر جائے تو زمانہ دشمن ہو جاتا ہے۔ یہی مبتلائے آزار کرتی ہے' یہی ذلت کا باعث ہوتی ہے کوئی شخص بھی آزمائش میں گرفتار نہیں ہو سکتا اگر اس ساتھی کو بے لگام نہ چھوڑے...... بہترین لباس پرہیز گاری ہے۔ اس سے بہتر کوئی پوشاک نہیں' یہ وہ جامہ ہے جو جسم کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اعمال کی بھی...... سنو! سب سے بڑی دولت قناعت ہے اس سے بڑا اور مسلسل ساتھ دینے والا خزانہ کوئی نہیں اور لوگو! بہترین غذا صبر ہے یہ غذا روح کو بھی تقویت دیتی ہے اور جسم کو بھی اور سنو سب سے مضبوط ہتھیار توبہ ہے اس سے بہتر مدافعت ممکن نہیں......''

اس وقت سب ابوعبداللہ کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے ان کا ہر ہر جملہ روح میں اتر رہا تھا اور وہ ہدایت دے رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا ان کے مریدوں میں اضافہ ہوتا گیا ان کی درس گاہ بغداد کی سب سے بڑی درس گاہ بنتی گئی جہاں سے علم کا کوئی پیاسا سیراب ہوئے بغیر نہیں لوٹتا تھا۔ یوں وقت گزرتا گیا تب ایک صبح ابوعبداللہ بدستور عصا ٹیکے ہوئے اپنی درس گاہ میں کھڑے مریدوں اور تلامذوں کو درس دے رہے تھے تب کسی نے عرض کیا۔

''جناب! آتش پرستوں کی بستی سے ایک خاتون آئی ہیں اور خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں۔''

''ہم جانتے ہیں اسے آنے دو۔'' ابوعبداللہ نے اجازت دی۔

پھر انہوں نے دیکھا سردار مہران کی دختر فیروزاں آرہی تھی جس کے رخ پر تقدس تھا پاکیزگی تھی ابوعبداللہ نے کہا۔ ''تم یہاں کیسے آئی ہو؟''

''شیخ!'' فیروزاں بولی۔ ''عرصہ دراز سے مجھے معبد میں گھر میں کبھی جاگتے ہوئے یا سوتے ہوئے کوئی سراپا نظر آتا تھا لیکن آج اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ فیروزاں آ تجھے صراط مستقیم دکھاؤں میں نے وہ ہاتھ تھام لیا اور یہاں آ گئی اس نے کہا۔ یہی تیری آخری منزل ہے۔''

''نہیں۔'' ابوعبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تمہاری آخری منزل نہیں ہے ہاں میں تمہیں اس منزل کا پتا بتا سکتا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' فیروزاں نے کہا۔ ''اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔''

''آج میں تمہیں بتاؤں کہ وہ سراپا اور آواز حضرت خضر علیہ السلام کی تھی جو بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔''

''میں یہ بات خوب سمجھ چکی ہوں اور اب مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔'' فیروزاں نے کہا۔

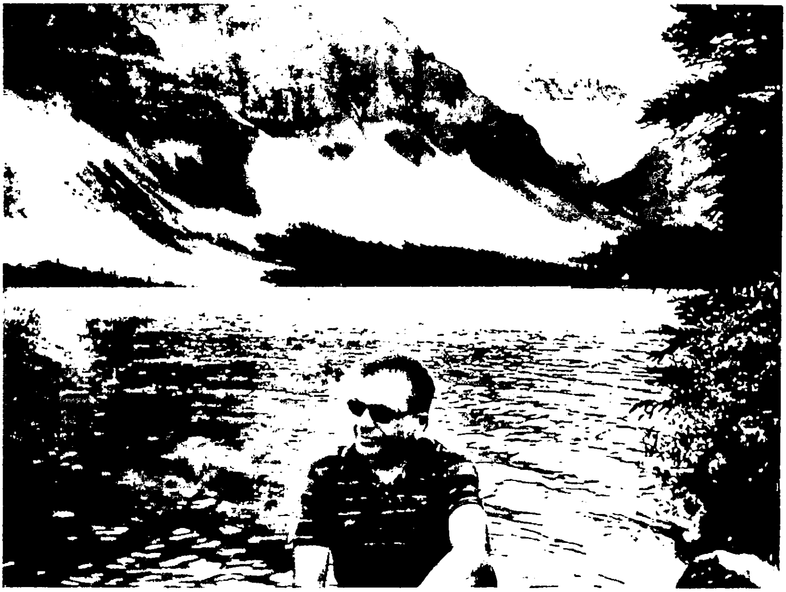
اس دن ابوعبداللہ کے تلامزہ میں ایک اور اضافہ ہو گیا فیروزہ مسلمان ہو گئی۔ ابوعبداللہ نے درس کے دوران میں کہا۔

''ایک بات یاد رکھنا خداوند عالم کا وعدہ ہے کہ جو نعمت یہاں نہیں ملتی وہ وہاں ملتی ہے اور چھینی نہیں جاتی۔'' یہ سن کر فیروزاں نے سر جھکا لیا اور کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔

پھر ابوعبداللہ تبلیغ دین کرتے رہے وقت گزرتا رہا اور فیروزاں ایک تنہا حجرہ میں علم حاصل کرتی رہی' عبادت کرتی رہی لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے خود کو عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے اس کے دل میں یاد الہیٰ کے سوا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا تھا سب کچھ مٹ چکا تھا اسی کیفیت کو ایک عرصہ گزر گیا تب ایک دن فیروزاں مر گئی ابوعبداللہ نے سنا اور اسے اس کی آخری منزل تک پہنچانے گئے اس دن انہوں نے دنیا کی بے ثباتی پر مریدوں کو درس دیا اور بولے۔

''عزیزو! جو نعمتیں دنیا میں نہیں مل سکتیں وہ آخرت میں منتظر ہوتی ہیں یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔''

مرید کچھ نہ سمجھے لیکن دوسرے دن ابوعبداللہ کا وصال ہو گیا بغداد کا ایک بڑا عالم اس دار فانی سے کوچ کر گیا جو بہت کڑی آزمائشوں سے گزرا تھا جس نے علم اور یقین کے ہر درجہ کو طے کر لیا تھا۔ اس عظیم عالم دین کے لیے لوگوں کا خیال تھا کہ ایک آتش پرست لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ان کے لیے بغداد آئی تھی مسلمان ہو گئی لیکن انہوں نے شادی نہیں کی تھی شاید ایک طویل رفاقت کے لیے۔



سفر پہلا پہلا

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدہ کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ”نانگا پربت کا عقاب“ اور ”شمشال سے ٹورنٹو“ کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی کا پندرہواں حصہ

میں اپنی موج میں تھا کہ لطیف مجھے سمجھانے لگا کہ کنول کے پیار کو اتنا سیریس نہ لوں۔ میں اس کی کہی بات پر بوجھل ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا کہ سامنے کھڑے پہاڑ کا بوجھ اس نے میرے سینے پر رکھ دیا ہے۔

پھر اچانک میری نظر گھومی تو دیکھا کنول ہوٹل کے دروازے سے باہر کھڑی مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ اسے دیکھا اور میں وہیں اپنی جگہ پتھر کا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں سوز اور چہرے پر فسوں تھا۔ وہ چہرہ تھا کہ کوئی روشن چراغ جس کے آگے چاندنی بھی مدھم پڑ گئی۔ میں اس کی بے حجاب نظروں کی زد میں آ کر کہیں بہہ گیا۔ سمجھ گیا تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہے

وہ سب محبت کا پھیلاؤ ہے۔
اتنے میں کسی نے عقب سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر مڑا۔ دیکھا تو کنول تھی۔
"کس کو دیکھے جارہے ہیں؟"
میں نے کہا۔ "چاند کو، اور کس کو؟"
وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔ "کس چاند کی بات کررہے ہیں؟"
"وہی جس سے روشنی پھوٹ رہی ہے....."
"میں کچھ اور سمجھی تھی مگر آپ تو آسمان پر چاند کو دیکھ رہے ہیں....."
میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا اس سے بھی کوئی روشنی پھوٹ رہی ہے؟"
پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھے ہنسنے لگی۔ "بھائی آپ بڑے چالاک ہوگئے ہیں....."
اتنے میں اطہر میرے پاس آکر بتانے لگا۔ "آج باجی بہت روئی ہیں....."
میں نے حیرت سے پوچھا۔ "روئی ہیں؟"
"امی نے کہا اتنی زیادہ کیوں تیار ہورہی ہو۔ کسی شادی پر جانا ہے۔ اس پر باجی رونے لگیں؟"
میں کنول کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ بھائی کی بات سن کر گڑبڑا گئی۔ اطہر مجھے بتا رہا تھا۔ "پھر بابا نے منایا تو آئی ہیں۔ ورنہ آ بھی نہیں رہی تھیں۔"
کنول نے اطہر کو ڈانٹا۔ "کیا ضروری ہے ہر بات باہر آکر بتاؤ؟"
"میں نے تو صرف بھائی کو بتایا ہے....."
"بھائی کو بتانا کیا ضروری تھا؟"
"امی بھی تو انہیں سب بتاتی ہیں۔ کنول باجی بھی تو ان سے باتیں کرتی رہتی ہیں....."
دانت پیس کر کنول نے کہا۔ "چپ نہیں کرتا۔ اب سب کو بتائے گا کہ کس کس سے باتیں کرتی ہے....."
وہ خاموش ہوکر رہ گیا۔ کنول کے سامنے اطہر کی بالکل نہیں چلتی تھی۔
اتنے میں باقی سب روانہ ہوئے تو ہم بھی چل پڑے۔ کچھ ہی لمحوں میں لطیف اور اطہر اکٹھے ہوکر آگے نکل گئے۔ کنول، طاہرہ اور ثروت درمیان میں تھیں اور ہم دونوں پیچھے چلے آرہے تھے۔ میرے ذہن پر ایک ہی بات چھائی تھی کہ کنول میری لیے تیار ہوئی اور اس تیاری نے اسے رلا دیا ہے۔ اس کا اندر کمرے میں میری خاطر رونا اور باہر آکر میری جانب مسکراتی نظروں سے دیکھنا یہ کنول کی محبت کی ذرا سی جھلک تھی۔ لطیف کہتا تھا کہ اس کی محبت کو سیریس نہ لوں۔ وہ جو پیار کو ایک عبادت سمجھتی ہے اس کو میں دھوکے میں رکھوں؟ مجھے لطیف کی باتوں پر مجھے غصہ آنے لگا تھا۔
میں نے ماں اور بیٹی کے معاملے پر بولنا مناسب نہ سمجھا۔ تبھی گویا سو نے چاندی کی تاروں پر سے لہراتی ہوئی اس کی آواز آئی۔ "آپ خاموش کیوں ہیں۔ کوئی بات نہیں کررہے؟"
"دراصل میں خود کو یقین دلا رہا ہوں کہ واقعی میں اور تم ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا....."
وہ مجھے کریدتی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے شکوہ کررہی ہو میرے رونے کا معلوم ہوگیا تو کچھ کہتے کیوں نہیں۔
میں نے سوچا کہ نہ پوچھ کر میں نے غلطی کرلی ہے۔ مگر لگا اب دیر ہوچکی ہے۔ اب کچھ بولا تو بات گلہ بن جائے گی۔
مسکرا کر کہنے لگی۔ "میں آج کسی کی خاطر خود کو سنوار رہی تھی کہ کسی بات پر رونا شروع کردیا۔ مجھے بھی یقین نہیں ہورہا میرا رونا کیا خواب تھا کہ حقیقت تھی؟"
میں بیچ بازار میں رک گیا۔ شرم سے اپنا ماتھا سہلانے لگا، پھر شرمندگی بھرے لہجے میں وضاحت دی۔ "میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے اور آنٹی کے بیچ کسی بات کو ڈسکس کروں... ورنہ تو میں تمہارے رونے پر ہی بے چین ہوگیا تھا مگر تم سے پوچھتے پوچھتے خود کو روک لیا....."
وہ بدستور مسکرا رہی تھی پھر دھیرے سے بولی۔ "میں نے کوئی شکایت تو نہیں کی....."
میں نے سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ "اچھا ہے کردی ورنہ میں دل میں یہ بات لیے کڑھتا رہتا۔"
دھیمی دھیمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھل اٹھی، پھر اس نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا اور بولی۔ "آپ اس بات کو لے کر یہاں کھڑے رہیں گے؟ آتے جاتے لوگ ہم دونوں کو دیکھ رہے ہیں....."
میں نے چٹکی لینے کے انداز میں پوچھا۔ "تمہیں میری لیے اتنا سجنے سنورنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم تو ویسے ہی ان سب سے پیاری ہو جو ادھر گھوم رہی ہیں....."
حیا کی سرخی پھیلی اور وہ دوبارہ سے مسکرا دی اور ہم پھر سے چل پڑے۔
کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "میں کبھی اتنا تیار نہیں ہوئی جو آج اتنی خوشی سے ہورہی تھی۔ ادھر کنول کان کھا رہی تھی یہ پہنو یہ نہ پہنو۔ امی حیران کہ مجھے کیا ہوگیا جو آج اتنا تیار ہورہی ہوں۔

انہوں نے بس پوچھا اور میں رونے لگی۔‘‘

یہ کہنے کے بعد وہ مجھے دیکھنے لگی۔ مسکراہٹ تو جیسے زمانوں سے اس کے ہونٹوں پر سجی تھی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی جس کا اظہار کرنے میں وہ کوئی بخل نہیں دکھا رہی تھی۔

میں نے شرارت سے پوچھا۔ ’’مگر آج اتنا تیار ہونے کی وجہ کیا تھی؟‘‘

چاند کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’کوئی خاص نہیں اور آپ کو کیوں بتاؤں؟‘‘

’’میں تو اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جو وقت کسی کی خاطر تیاری میں لگایا وہی وقت اسی کو دے دیتی تو کیا معلوم وہ تم کو بہشت کی حوروں کی مانند سجا دیتا......‘‘

’’میں تو کچھ نہیں سجی۔ میں تو کسی کو دیکھ کر اور زیادہ سج جاتی ہوں......‘‘

’’وہ ہے کون؟‘‘

’’یہ کیوں بتاؤں۔ جو سمجھنے کی بات کو نہ سمجھ سکے اسے سمجھایا نہیں جاتا......‘‘ یہ کہہ کر وہ انجان بنی سامنے دیکھنے لگی۔

میں نے شرارتی انداز میں پوچھا۔ ’’سجنے کے علاوہ شاعری سے لگاؤ بھی اب ہوا ہے......‘‘

وہ عمر ہی ایسی تھی کہ جملے خود ہی زبان پر مچلنے لگتے تھے۔ آج اس عمر میں سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ تب میں کیسے فر فر ایسے جملے بول لیا کرتا تھا۔ خیر میرے خاموش ہوتے ہی اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ’’لگاؤ تو پہلے سے تھا مگر اب فقروں میں کوئی نظر آنے لگا ہے۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’تم کو شاعری کب سے اچھی لگتی ہے؟‘‘

الٹا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ’’آپ کو کب سے اچھی لگتی ہے؟‘‘

اسے جواب دینا ہی تھا سو اس کی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ’’جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تب سے جب میں بچوں کی نظمیں پڑھتا تھا۔ محلے کی لائبریری سے نونہال اور بچوں کے ڈائجسٹ لے آتا۔ رسالوں کا کرایہ نہ ہوتا تو مفت لے آتا۔ کرائے کے بدلے وہ مجھ سے لائبریری کا کام کرواتا۔ کوئی نظم اچھی لگتی تو اسے کاپی پر اتار لیتا۔ مجھے پریوں، جزیروں اور بہادر شہزادوں کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ پڑھ کر یاد رکھتا تھا۔ میں خود بھی لکھتا اور پھر اپنے لکھے کو بار بار پڑھتا تھا۔ عمر کے ساتھ بات بڑھتے بڑھتے ادبی صفحوں پر آٹھہری۔‘‘

وہ اپنی باتیں مجھے بتانے لگی۔ ’’میں آپ کی طرح لکھتی نہ تھی بلکہ اپنی پسندیدہ نظموں کو رسالے سے کاٹ کر کاپی پر چپکایا کرتی تھی۔ ہمیشہ کاغذ کی کترنیں میرے بیڈ کے اردگرد بکھری ہوتی تھیں۔ کول گڑیوں سے کھیلا کرتی اور میں نظموں سے اپنا دل بہلاتی۔‘‘ پھر میری جانب دیکھ کر پوچھا۔ ’’آپ نے اپنی ساری کاپیاں سنبھالی ہوئی ہیں؟‘‘

’’ہاں میں اپنی یادیں اور یادداشتیں ہمیشہ محفوظ رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے جو دوست ابتدائی کلاس میں اور محلے میں تھے ان کو بھی اور اپنے سارے بچپن کے قصوں کو بھی محفوظ رکھے ہوئے ہوں۔‘‘

وہ بولی۔ ’’میں نے بھی سب سنبھال کر رکھا ہے......‘‘

اسی وقت بازار کی کسی دکان پر یہ نغمہ گونج رہا تھا......

چلو دلدار چلو چاند کے پار چلو......\
ہم ہیں تیار چلو\
آؤ کھو جائیں ستاروں میں کہیں\
چھوڑ دیں آج یہ دنیا یہ زمیں\
چلو دلدار چلو چاند کے پار چلو......\
ہم نشے میں ہیں سنبھالو ہمیں تم\
نیند آتی ہے جگالو ہمیں تم\
زندگی ختم بھی ہو جائے اگر\
نہ کبھی ختم ہو الفت کا یہ سفر\
چلو دلدار چلو............

میں گانے کے بولوں میں کھو گیا۔ مسرتوں کے گھیرے مجھے چاند کے پار لیے چلتے تھے۔ ایک خمار مجھ پر چھایا تھا۔ قدم کہاں پڑ رہے ہیں مجھے کوئی ادراک نہ تھا۔ میرا سفر سامنے چمکتے چاند کے کہیں پار تھا۔ میں نے پوچھا۔ ’’تم کیا بتا رہی تھی؟‘‘

مسکرا کر کہا کہ اپنی ساری کاپیاں سنبھال کر رکھی ہیں۔

میں بولا۔ ’’ہم اپنی اپنی کاپیاں ایک دوسرے کو جاتے ہی بھیجیں گے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے بچپن میں خوب گھومیں گے......‘‘

پھر وہ اپنی سوچوں میں کہیں گم ہو گئی۔ ایسا لگا کہ وہ چپ نہیں بلکہ مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ تو نہیں بول رہی مگر فضائیں اس کی باتیں مجھے بتا رہی ہیں۔ وہ بولتی تو اس کا لہجہ محبت سے چھلکتا۔ وہ خاموش ہوتی تو وہ سراپا محبت سے مہکنے لگتی۔

ہمارا راستہ چاندنی نے سجا رکھا تھا۔ اس کی خوشبو نے مجھے بہکا دیا تھا۔ اس سے پوچھا

’’کہاں گم ہو گئیں؟‘‘

بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئی پوچھا۔ ''اسکول میں آپ کیسے تھے؟''

''بالکل نکما نہ تھا، بس عام سا لڑکا۔ پڑھنے میں کچھ بہتر مگر زیادہ نہیں کہ استاد نظروں میں رکھتے۔ اسکاؤٹ تھا کیونکہ گھومتا پھرتا بہت تھا......''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں رہی تو میں نے پوچھا۔ ''تم صرف مسکراتی ہو کہ ہنستی بھی ہو؟''

وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ پھر ہونٹ وا ہوئے تو دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ''لیکن ابھی تو ہنسی تھی......''

''تم ہنسی نہ تھیں۔ صرف مسکرائی تھیں......'' میں نے خبر دی۔

''کبھی غور نہیں کیا اور نہ کسی نے مجھے بولا۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم یا تو اداس نظر آتی ہو یا پھر مسکراتی ہوئی...... مگر ہنستے ہوئے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔''

وہ بولی۔ ''میں جب خوش ہوتی ہوں تو اس طرح کی لگتی ہوں جیسے اب آپ کو نظر آ رہی ہوں۔''

''تم ہنسا کرو ناں......''

''بس آپ ہی ہنسا کریں۔ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''اور کبھی نہ ہنسوں تو؟''

''آپ جب نہ ہنسے تو لگے گا میرے رونے کا موسم آ گیا ہے۔''

میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ سادہ باتیں کرتی کرتی گہری بات کر جاتی ہو۔ توجہ لینی ہو تو معصوم باتیں کرتی اور جب توجہ دینی ہو تو ڈوب کے بات کرتی۔ وہ شکل اور آواز کے علاوہ بہت سی اضافی خوبیوں کی مالک تھی جس کا ادراک مجھے آہستہ آہستہ ہوا۔

اس نے مجھ سے اچانک پوچھا۔ ''مجھے اس طرح سے کیوں دیکھتے ہیں؟''

''کس طرح سے دیکھتا ہوں؟''

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ''اتنے پیار اور اتنی محبت سے......''

''تو نہ دیکھا کروں؟''

''سب کے سامنے تو نہ دیکھیں۔ شرم آتی ہے......''

میں نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہاں تو ہمارے علاوہ کوئی نہیں......''

''کتنے تو لوگ ہیں......''

''مجھے تو تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آ رہا......''

پھر ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے اٹھی اور رخساروں تک پھیل گئی۔

ہم بازار کے آخر میں لگے خیمہ ہوٹل کے آگے سے گزر کر ویرانوں میں داخل ہو گئے۔ ہر جانب خاموشی بچی تھی اور تنہائی کا راج تھا۔ چاندنی سے روشن راستہ اور چاند سے چمکتا آسمان تھا۔ دور پرے پہاڑ تھے اور قریب بہتا دریا تھا۔ دریا کے بہنے کا شور ماحول کا حصہ تھا لہٰذا میرے لیے ساری فضا ساکن تھی۔ راستے اور درختوں کے علاوہ چھوٹے سے چھوٹے پتھر بھی منور تھے۔ زمین سے آسمان تک کی کائنات چاند نے روشن کر رکھی تھی۔ شوریدہ دریا کی موجیں سمندری لہروں کی طرح چاند کی جانب لپکتیں محسوس ہوتی تھیں۔

وفا اور محبت کی آمیزش سے جو خوشبو پھوٹتی ہے وہ مجھے کنول کے وجود سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ہمارے ساتھی باتیں کرتے کرتے آگے بہت آگے نکل گئے تھے۔ راستے کے دونوں جانب چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے۔ سامنے ایک درخت کی چوٹی پر چاند منور تھا۔ میرا دل چاہا کہ یہیں کسی پتھر پر ہم دونوں بیٹھ جائیں۔ سامنے چمکتے چاند اور درخت کی ٹہنیوں سے کھیلتی چاندنی نے ایک سماں باندھ رکھا تھا، مگر دل میں وسوسے تھے کہ کہیں وہ میرے ہمراہ ایک ویران راستے پر بیٹھنے سے ہچکچائے نہیں.. مگر ہمت باندھ کر پوچھا......

''تھک گئی ہو تو یہیں بیٹھ جاتے ہیں؟''

''آپ اتنا پیدل چلیں ہیں تو تھکے تو ضرور ہوں گے۔ چلیں یہیں بیٹھتے ہیں......''

یہ کہا اور راستے کے ساتھ رکھے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔ میں نے ساتھ بیٹھنے کی بجائے زمین پر بیٹھنا زیادہ پسند کیا۔ میں بیٹھا تو وہ بھی نیچے پتھر سے ٹیک لگائے مجھ سے لگ کر آ بیٹھی۔ میرے احساس نے اسے چھوا تو لگا اندر کے خشک دریا بہنے لگے ہوں۔ ایک سرشاری پورے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ وہ بڑے آرام سے کوٹ کی جیب سے چلغوزے نکال کر چھیلنے لگی۔

''یہ چلغوزے کیوں لے آئی ہو؟ لگتا ہے یہ تمہیں بہت پسند ہیں؟'' میں نے کہا۔

''اوں ہوں...... یہ تمہارے لیے لائی ہوں۔'' یہ کہہ کر چند دانے میری جانب بڑھائے۔ پھر بولی۔ ''کمرے

میں سب بیٹھے کھا رہے تھے تو سوچا آپ کے لیے بھی لے چلتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں اچھا لگتا ہے میں بھی کھاؤں؟"

"ہاں...... تو۔" اس نے اس انداز سے جواب دیا جیسے میں نے کوئی غیر ضروری سوال کر دیا ہو۔ وہ مسلسل چلغوزے چھیل رہی تھی۔

"کیا تمہیں میں بہت اچھا لگتا ہوں؟"

میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں مگر یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کیونکہ تمہارا مجھ سے کچھ اظہار کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اپنی خوش نصیبی پر یقین آنے لگتا ہے۔"

مجھے چند لمحے مسکرا کر دیکھتی رہی۔ پھر کہا......

"آپ کو واپسی پر دیر ہوئی تو میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ شام کی نماز میں بہت دیر تک دعا کرتی رہی کہ اللہ آپ کو خیریت سے واپس لائے۔ چپ چپ تھی تو امی نے کہا کہ طاہرہ کے کمرے میں چلی جاؤں۔ امی کے مشورے پر طاہرہ کے کمرے میں چلی آئی۔ وہاں جا کر اطہر کو اکرام کے پاس بھیجا۔ اس نے تسلی دی پھر بھی مجھے غصہ آ رہا تھا کہ میرے کہنے کے باوجود آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ سوچا آپ آجائیں تو غصہ دکھاؤں گی یعنی آپ سے بولوں گی نہیں۔ مگر جب آپ کو دیکھا تو سب بھول گئی۔ آپ سے ناراض ہونا مجھے جچتا ہی نہیں......"

"اگر تم کبھی ناراض ہو اور میں مناؤں۔ مان تو جاؤ گی ناں؟"

"مانوں گی تو تب جب آپ سے روٹھوں گی......"

"مجھے خط بھی لکھا کرو گی؟"

"وہ تو میں آجکل بھی لکھ رہی ہوں۔ ایسا سمجھو یہ خط نہیں میرے احساسات ہیں۔ شب و روز جو بھی ہو رہا ہے میں اسے خطوں کی صورت لکھ رہی ہوں۔ یہ میری یادیں ہیں۔ واپس جا کر سونے سے پہلے انہیں پڑھا کروں گی۔ آپ بہت یاد آئیں گے......"

میں نے پوچھا۔ "شادی تو مجھ سے کرو گی ناں؟"

"وہ تو میری آپ سے سمجھو ہو گئی۔"

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "مگر وہ کیسے؟"

بولی۔ "جسے دل دے دیا ہے اس کی دل سے ہو گئی ہوں۔ اب اس دل میں کسی کا آنا جانا نہ ہوگا۔ ایک آیا تھا اور وہ میرے دل کو گھر بنا کر بیٹھ گیا ہے اور بس۔ وہی میرا ہے اور میں سدا اس کی دلہن رہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "جب تمہارا دولہا ہو ہی گیا ہوں تو اپنی دلہن لینے کب آؤں؟"

"یہ تو آپ بتائیں گے کہ کب آسکتے ہیں؟"

"مجھے چار پانچ سال لگیں گے۔ اپنی ڈگری لے کر کوئی اچھی جاب کر لوں پھر آکر اپنی دلہن لے جاؤں گا۔"

وہ لجاجت سے بولی۔ "چار پانچ سال تو بہت ہیں۔ کچھ کم نہیں ہو سکتے۔ یہ عرصہ میں اکیلے کیسے گزاروں گی؟"

"اسی دوران تم اپنی ڈگری لے لینا؟"

"ہاں۔ میں نے بھی قانون کی ڈگری لینی ہے۔"

میں خوشی سے معمور لہجے میں بولا۔ "ٹھیک۔ تم اپنی پڑھائی میں مصروف ہو جاؤ گی۔ اسی دوران ہم ایک دوسرے کو خط لکھا کریں گے۔ میں بھی کوئی بہانہ کر کے لاہور تم سے ملنے آجایا کروں گا۔ دیکھنا یہ وقت تیزی سے گزر جائے گا۔"

اسی دوران اس نے بہت سے چلغوزے چھیل لیے تھے۔ سارے میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیوں نہیں پوچھا کہ امی نے مجھے کیوں ڈانٹا؟"

میں اسے تواتر سے دیکھ رہا تھا۔

مجھے بغور دیکھتے پا کر اس نے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے جواب دینے کی بجائے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ بولی۔ "کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اپنا ہاتھ مجھے دو......"

اس نے ہاتھ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ ہاتھ ایسے لے کے بیٹھا تھا جیسے اسے مہیب طوفانوں کی زد سے بچا کر بیٹھا ہوں۔

کچھ لمحے بعد اس سے کہا۔ "تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اسی طرح سے تمہاری حفاظت کروں گا۔ کوئی گرم سرد ہوا تم کو نہیں لگنے دوں گا۔ مگر ماں اور بچوں کے رشتے میں ڈانٹنا اور بچوں کو سینے سے لگانا یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ ماں بچوں کو بلاوجہ نہیں ڈانٹتی مگر بلاوجہ اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔ ماں کی ڈانٹ پر رونا بھی ماں سے پیار کی ایک نشانی ہے۔ ماں ڈانٹے تو رونے پر راحت ملتی ہے۔"

"لیکن میں تو آپ کی خاطر تیار ہو رہی تھی۔"

"تمہارا یہ ہنسنا سنورنا ہماری محبت کی نشانی ہے۔ اور ماں کا تم کو ڈانٹنا ماں کی تم سے محبت ہے۔ میں ماں اور بیٹی کے

بیچ تو نہیں بول سکتا مگر جو تم میرے لیے اس چاندنی رات میں کسی دلہن کی طرح آئی ہو، اس کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اپنے ہونٹ میں نے اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیے۔ راحت کی کوئی ندی میرے سر سے پاؤں تک چل پڑی۔ میں نے سر اٹھایا تو دیکھا اس کے چہرے پر چاند چمک رہا تھا اور آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس پر انتہائی درجے کی دل آویزی چھائی تھی۔ آس پاس کی ہر چیز سے اس کا چہرہ حسین تھا۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا......

"آپ کی باتوں میں بڑا اثر ہے۔ بات ایک بار کرتے ہیں اور سنائی بار بار دیتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کنول۔ میری محبت تمہارے لیے کیا ہے؟"

"میرے لیے ایک نعمت ہے۔ میری زندگی اور میری جنت ہے۔ میری محبت آپ کے وجود سے زیادہ آپ کی محبت کا حصول ہے۔ ہماری محبت کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ کبھی نہیں مر سکتی۔ جن لمحوں میں ہم بیٹھے ہیں یہ لمحے امر ہو گئے ہیں۔"

ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالوں میں گم بیٹھے تھے۔ سماں ٹھہرا تھا۔ نہ کوئی چاپ اور نہ کوئی آہٹ تھی۔ دل کر رہا تھا کہ وقت یہیں تھم جائے۔ چاند ٹھہر جائے اور تارے ساکت ہو جائیں۔ ہوائیں رک جائیں اور ہم دونوں یہیں منجمد ہو جائیں۔

مجھ سے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے آپ کو میری جگہ کوئی اور پسند نہیں آئی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہ مجھے کوئی دوسری تمہاری طرح پسند کرتی اور نہ مجھے کوئی اس طرح سے پسند آتی۔ ہم دونوں کا ملنا لازمی تھا۔"

"اس لیے کہ ہم کوئی اجنبی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے آشنا تھے اور یہ کہ میں آپ کے خوابوں میں بھی آتی تھی۔ ہر جگہ آپ مجھے متلاشی نظروں سے کیوں دیکھتے تھے۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں...... کیا واقعی میں آپ کے خوابوں میں آتی تھی؟"

وہ ذہین تھی جو میری نظروں کا مفہوم جان گئی تھی۔ سوچنے لگا اسے بتا دوں کہ غزالہ کی تلاش میں اسے پایا ہے۔ اس نے جھیل پر بھی یہ سوال پوچھا اور ابھی پھر پوچھ رہی ہے۔ نہیں بتایا تو کل کو پھر پوچھے گی، پھر سوچا کہ کہیں اپنی توہین محسوس نہ کرے۔ یہ نہ سوچے کہ مجھ سے نہیں یہ تو غزالہ سے پیار کرتا ہے۔ پھر خیال آیا اس میں توہین کا پہلو کہاں ہے۔ اگر خفا ہوتی بھی ہے تو میری محبت کی شناخت اسے کہیں جانے نہ دے گی۔"

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ایسا سوال کیا کہ میں حیرت زدہ گیا......

"وہ کون تھی جو آپ سے بچھڑ گئی ہے۔ اس نے آپ کو چھوڑا یا آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ ہوا کیا تھا؟"

پھر اس نے میری ہتھیلی پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ دھیمے سروں میں کہنے لگی۔ "نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ آپ سے دوبارہ نہیں پوچھوں گی۔ اگر آپ کسی کو چاہتے تھے تو میرا خفا ہونا نہیں بنتا...کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے زیادہ اب کسی کو نہیں چاہتے......"

پھر میں نے اس کو غزالہ کے اور اپنے بارے میں بتایا کہ کیسے ہم ملے اور کس طرح سے جدا ہوئے تھے۔ اسے یہ بھی بتایا کہ غزالہ نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ میں نہ ہوں گی مگر میرے جیسی ایک لڑکی تمہیں ضرور ملے گی۔ وہ لڑکی مجھ سے بڑھ کر تم سے پیار کرے گی۔"

کنول میری ہتھیلی پر اپنے رخسار رکھے خاموشی سے مجھے سن رہی تھی۔ اس کا نرم و ملائم لمس میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی......

"جس رات مری میں تم کو مال روڈ پر دیکھا تھا اسی رات غزالہ کی شادی تھی۔ میں یہ یقین کر بیٹھا کہ تم اسی کی دعاؤں کا ثمر ہو۔ وہ جا رہی ہے اور تم مل رہی ہو...اور ہم مری میں خاص طور پر ایک دوسرے سے ملنے آئے ہیں۔ پھر ہر مقام پر جہاں تم ہوتیں میں بھی وہیں چلا آتا۔ ہمارا ہر جگہ مل کوئی اتفاق نہ تھا۔ مجھے لگا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اسی لیے تو کہتا ہوں تم وہ ہو جس کو دیکھنے سے پہلے مجھے تم سے محبت تھی۔"

اس نے اپنا چہرہ اٹھایا تو میں لرز گیا۔ آنکھیں اس کی بھیگی تھیں۔ میں ڈر گیا کہ کہیں ناراض تو نہیں ہو گئی۔ کون لڑکی برداشت کرتی ہے کہ اس سے پیار کی وجہ صرف یہی ہے کہ کسی کی ہمشکل ہے...مگر اب تیر ہاتھ سے نکل چکا تھا......

وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ پوچھا۔ "اگر غزالہ نہ ہوتی تو ک میں بھی نہ ہوتی۔ وہ تم کو نہ ملتی تو مجھے بھی تمہارا پیار نہ ملتا؟"

میں بولا۔ "میں تم دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ ہے تو بڑی عجیب بات مگر مجھے محسوس یہی ہوتا ہے ک دونوں میں جو بھی مجھے ملتا میری محبت اس سے ہوتی۔ جس

طرح سے اس سے ہوئی یونہی تم سے ہو جاتی۔‘‘

وہ بڑے نرم انداز میں مجھ کو بتانے لگی......

’’جھیل پر تم سے کہا تھا کہ بتاؤں گی محبت میرے نزدیک کیا ہے۔ یہ ہمیشہ بنا سوچے سمجھے ہوتی ہے۔ چاہو تو نہیں ہوتی اور نہ چاہو تو ہو جاتی ہے۔ نہ کوئی تول مول کرتی ہے اور نہ کوئی پیشگی اصول وضع کرتی ہے۔ نہ شرطیں رکھتی ہے اور نہ شرطیں مانتی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو لمحوں میں بنتا ہے اور لمحوں میں چٹان کی مانند کھڑا ہو جاتا ہے۔ محبت کا راستہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ نہ اس میں کوئی لالچ اور نہ کوئی اس میں طلب ہوتی ہے۔ محبت کسی کی شکل دیکھ کر نہیں بلکہ خوبیاں دیکھ کر ہوتی ہے۔ محبت میں کوئی فریق نہ حسین اور نہ بدصورت ہوتا ہے۔ بلکہ دونوں ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ کسی کی کوتاہیوں کی اصلاح محبت کرتی ہے اور کسی کی خوبیوں کو محبت اپناتی ہے۔ یہ نہیں کہ محبت کا رشتہ ہمیشہ توانا رہتا ہے۔ یہ کمزور لوگوں میں کمزور بھی پڑ جاتا ہے۔ اس میں نہ کوئی حرص ہوتا ہے اور نہ بے ایمانی ہوتی ہے۔ اگر ہوتی ہیں تو وہ محبت نہیں ہوتی۔ پیار یہ نہیں کہ آپ مجھے کیا دیتے ہیں۔ پیار یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کیا پیش کرتے ہیں۔ یہ عزتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ برائیوں کے آگے طاقت ور بند ہے۔ یہ پاک ہے یہ صاف وشفاف ہے۔‘‘

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا اس کو سنتا جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

’’میں آپ کو اس لیے پسند ہوں کہ میری شکل غزالہ سے ملتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنی اور اپنے علاوہ غزالہ کی بھی ساری محبتیں آپ کو دے دوں۔ میرے یہ آنسو خوشی کے آنسو ہیں کہ میں نے اس کی محبت پائی جو سچ بولتے نہیں گھبراتا۔ تم نے سچ بولا اور سچ بول کر مجھے محبت دی ہے۔ مجھے قابلِ احترام بنایا ہے۔ اگر ہم میں سچ کو سننے اور سمجھنے کا حوصلہ نہیں تو ہماری ساری محبت بے کار ہے، اور ہم جھوٹے لوگ ہیں۔ میری محبت یہ کہ ہم پہلے اپنی عزت کریں۔ اپنی عزت کریں گے تو دوسرے کو عزت ملے گی۔ اپنی عزت کرنا یہ ہے کہ سچ بولیں اور سچائی کا ساتھ دیں۔ اور دوسرے کو عزت دینا ہمارا اپنا سچ بولنا ہے۔ کسی کو دھوکا اور فریب دینا نہیں ہے۔‘‘

’’اس کے علاوہ محبت یہ ہے کہ آپ مجھ پر اعتماد کریں اور میں آپ پر اعتماد کروں۔ مجھے آپ کے رویے اور سوچ پر مکمل اعتماد کرنا ہوگا۔ یقین کریں کہ جب اعتماد ختم ہوا تو سمجھو محبت بھی ختم ہوگئی۔ ہم ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند کا احترام کریں۔ اپنی باتیں ایک دوسرے کو سنائیں۔ ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کریں۔ محبت میں دوستی کا ہونا بہت ضروری ہے، اور تم نے محبت میں دوستی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میرے دل میں تمہارا پیار بہت بڑھ گیا ہے۔ آج میں اس دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ پیار میرے لیے ایک بڑا خزانہ ہے۔‘‘

اس کی گہری باتوں نے مجھے دم بخود کر کے رکھ دیا۔ میں اس لہجے اور ایسے الفاظ کا ہرگز عادی نہ تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جذبات کا اظہار اتنی شدت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے کنول کے پھیلائے سحر نے دبوچ رکھا تھا۔ اس سے بولا......

’’میں تو سمجھا تھا تم کو پیار کی الف بے سمجھاؤں گا۔ مگر تم نے تو اس کی ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ یہ سوز و گداز تمہارے اندر کہاں سے آیا؟‘‘

مجھے جواب دیا۔ ’’جھیل سے واپسی پر رضائی اوڑھے بستر پر لیٹی تھی۔ آپ بہت یاد آرہے تھے۔ ایک ایک پل گن رہی تھی کہ کب آپ آؤ گے۔ سب سوئے تھے اور میں متواتر جاگ رہی تھی۔ مجھے اپنے پر غصہ آرہا تھا کہ کیوں تم کو وہاں رکنے دیا۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں سوچنے لگی کہ یہ محبت آخر ہے کیا جس نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ میں بہت دیر سوچتی رہی اور بہت سی چیزیں ڈھونڈ لیں۔‘‘

میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ’’مجھے یاد کیا اور میری یاد میں محبت کا فلسفہ ڈھونڈ لیا۔ اتنی زیادہ محبت تمہارے اندر موجود ہے؟‘‘

’’ہاں بہت زیادہ ہے اور ساری صرف آپ کے لیے ہے۔‘‘ اس نے آواز کی سرگوشی بنا کر کہا۔

وہ میرے لہو میں ہلچل مچا رہی تھی۔ میں اس کے الفاظ کو محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کی محبت اور اس کی شدت کا قائل ہو گیا تھا۔

’’میری باتوں کا یہ مطلب نہیں لینا کہ میں صرف محبت کی تھیوری جانتی ہوں......‘‘

’’میں نہیں سمجھا......‘‘

گلے بھرے انداز میں کہا۔ ’’میں تمہاری استانی تو نہیں کہ ہر بات سمجھاؤں؟‘‘

یہ کہہ کر میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ میں نے اپنے بائیں بازو کو گھیرے سے اسے سنبھال لیا۔ میرا دائیاں ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اس سے کہہ رہا تھا...... ’’تمہارے قرب کی مہک نے مجھے سب بھلا دیا ہے۔ مجھے تو وہ مل گیا ہے جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔‘‘

''تم میرے بارے میں تو پوچھو کہ میں کون ہوں۔ میری عادات کیا ہیں۔ کیا پسند اور کیا نہ پسند ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں کرنا کہ تمہارے اندر کیا ہے۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو۔'' اس کی ہتھیلی کو اپنے رخساروں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''پیار نہ ہو تو کئی سال نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو لمحوں میں ہو جاتا ہے۔ کسی کی شکل سے پیار ہو جاتا ہے۔ کسی کے غصے اور کسی کی سچائی ہمیں اپنے ہمراہ لے جاتی ہے۔ پیار ایک مقدس تصور ہے۔ نہ اس میں کوئی لالچ ہے اور نہ طمع۔ اس کی منزل کچھ اور نہیں بس کسی کا کچھ قرب ہے۔ چند لمحے ذہنی فرصت کے ہوں اور ان لمحوں میں بیٹھ کر کسی کو سنتے رہیں۔ کبھی کوئی ہم سے لڑے کبھی ناراض ہو اور کبھی ستائے۔ وہ جو کرے ہم ہنس کر سنتے رہیں۔ وہ جو کہے کہنے دیں۔ جو سنائے سنتے رہیں۔ جو کرے کرنے دیں۔ وہ آگ بنے تو جل جائیں۔ جل بنے تو ڈوب جائیں۔ وہ ہوا بنے تو پر لگ جائیں۔ وہ ہنسے تو خوش ہو جائیں۔ وہ خوش ہو تو ہنس دیں۔ وہ اداس لگے تو تڑپ جائیں۔ وہ کہے تو بکھر جائیں۔ وہ پکارے تو چونک پڑیں۔ وہ خاموش ہو تو انتظار کریں۔ وہ چلی جائے تو راہ تکیں اور وہ آ جائے تو آنکھیں بچھائیں۔ محبت کسی سے کوئی تقاضا نہیں کرتی بلکہ اپنا آپ لٹا دیتی ہے، محبت عزت کرتی ہے اور عزت دیتی ہے۔''

''پیار میں آپ میرے لیے جھوٹ بولیں گے؟''

میں خاموش ہو گیا۔ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

''تم کو کوئی خطرہ ہوا تو بول سکتا ہوں ورنہ کبھی نہیں۔ تم کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لیے میرا جھوٹ میری دوزخ ہے......''

اس نے اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔ محبت سے پُر لہجے میں کہا۔ ''پیار جب ادراک کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو باقی ساری باتیں بے معنی رہ جاتی ہیں۔ محبت اپنی راہ سے نہ بھٹکے تو عقل کے دریچے بند کر کے دل کے در کھول دیے جاتے ہیں۔ پاکیزہ دل کے شفاف آنگن میں چاندنی بچھا کر کسی کا ہاتھ تھام کر اسے بٹھا دیتے ہیں پھر پوجا پاٹھ کی رسمیں شروع ہوتی ہیں جو تمام حیات پر محیط ہو جاتی ہیں۔ محبت میں ملنا نہ ملنا اہم نہیں بلکہ محبت میں محبت کرنا اہم ہوتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اگر کوئی اپنی کوئی مجبوری بتا کر محبت سے الگ ہو جائے؟''

''محبت نہ تو مجبوری میں کی جاتی ہے اور نہ مجبوری میں چھوڑی جاتی ہے۔ محبت تو صرف محبت مانگتی ہے، یہ کسی کو جھٹلاتی نہیں۔ جو اپنی مجبوری بتا کر چلا جاتا ہے اس نے تو محبت کبھی کی ہی نہیں ہوتی... اور یہ کسی کو مجبور بھی نہیں کرتی۔ محبت کسی سے لازوال قربت تو نہیں مانگتی ہے۔ وہ تو صرف لازوال شدت مانگتی ہے۔ مجبوری سے دور تو کوئی بھی جا سکتا ہے مگر مجبوری کا بہانہ کر کے کوئی پیار کرنا نہیں چھوڑ سکتا......''

مجھ سے پوچھا کہ اگر میں جانا چاہوں تو مجھے روکو گے؟

کنول کے گرد اپنے بازو کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے بولا۔ ''جانے والے کو کبھی نہیں روکنا چاہیے کیونکہ اس نے کبھی لوٹ کر نہیں آنا۔ محبت کو شکست میں نہیں بدلنا ہے مجھے۔ جانے والی کو کچھ آنسوؤں اور کچھ مسکراہٹوں سے رخصت کر دو۔ اس طرح سے اپنی اور اس کی عزت رکھ لو تا کہ وہ کوئی بڑا بوجھ لے کر نہ جائے۔ پچھتاوؤں کا بہت بار ہوتا ہے۔ جانے والے سے یہ بار لے لو اگر واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔''

''تو آپ کو کیا میری یاد نہیں آئے گی؟''

''یاد اور فاصلوں کا آپس میں کیا لین دین ہے؟ ہجر ہو کہ وصل یہ محبت کیا کم ہو جاتی ہے؟ تم یہاں بیٹھی ہو تو میری بن کر بیٹھی ہو اور اگر چلی گئی تو یاد بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔ تم کیا سمجھتی ہو تم کو بھول جاؤں گا؟ تمہیں یہ سمجھ نہیں میں قبلہ نہیں بدلتا۔ تم مجھ سے دور جانا چاہو تو نہیں روکوں گا۔ تم رکنا چاہو تو تمہیں کوئی لے کر جا نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک ساتھ رہیں یا نہ رہیں مگر ایک دوسرے کو یاد کرتے رہیں گے۔''

میرے سینے پر اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔ ''مجھے آپ صرف غزالہ کی وجہ سے پسند کرتے ہیں؟''

''غزالہ کی جدائی نے تم سے پیار کی بنیاد رکھی... مگر اب بیٹھا یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم سے پیار صرف اس لیے ہوا کہ تم پیار کرنے کے قابل ہو۔ کچھ تم میں ایسا مختلف ہے جو نظر تو نہیں آتا مگر محسوس ہوتا ہے۔ مجھے تمہاری طرح کی ایسی مختلف لڑکی کہیں نہیں ملے گی۔ تم تو نایاب ہو کیونکہ تم ایسی نہیں جیسی سب ہیں۔ تم میں بناوٹ نہیں۔ کوئی جھوٹ نہیں اور جھوٹ سے مجھے نفرت ہے۔ تم خوبصورت ہو مگر میرا معیار صرف یہ نہیں ہے۔ تم صاف دل ہو۔ شفاف ذہن رکھتی ہو۔ کبھی اپنے آپ کو کم نہ سمجھنا کیونکہ شاید تم اپنی اچھائیاں نہیں جانتی ہو۔ تمہیں دیکھا تو تم مجھے اچھی لگیں اور جب باتیں ہوئیں تو یہ اچھائی ایک طوفان میں بدلتی جا رہی ہے۔ دکھی ہوں کہ مجھے تم پہلے کیوں نہیں ملی۔ اب آس ہے کہ ملی ہو تو ہمیشہ ملتی ہی رہنا۔ مجھ سے دور نہ ہونا کبھی۔''

وہ اپنے بازو سے مجھے جکڑ رہی تھی۔ جتنا زور لگاتی میری قربت اتنی اسے کم لگتی۔ اس پر سونے جاگنے کی کیفیت طاری تھی۔ کھلی ہوا اور چاندنی ہم دونوں کو چھیڑ رہی تھی۔ سر اس نے کندھے سے اٹھایا تو آنکھوں میں ننھے ننھے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ آسمانی دنیا کے سنگھاسن پر بیٹھا چاند ساری کائنات کو منور کر رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

''میرا پیار میرا غرور ہے اور میں اپنا غرور کبھی نہیں توڑوں گی۔''

سامنے دریا کنارے پیپل کا درخت ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جھوم اٹھا۔ لگا کہ درخت ہماری باتیں سن رہا ہے۔ درخت کے اوپر آسمان پر آویزاں چاند ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ دریا کے پانیوں کی مسلسل گونج ہم تک آرہی تھی۔ یہ گونج ماحول کا حصہ بن کر ہم میں رچ بس گئی تھی۔

بولی۔ ''یہ چاند مجھے بہت خوبصورت لگ رہا ہے......''

میں نے پوچھا۔ ''کیا مجھ سے بھی زیادہ......''

کہا۔ ''اس کی خوبصورتی تم سے ہے......''

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس کی خوبصورتی صرف تم سے ہے۔ مجھے کیوں شرمندہ کر رہی ہو؟''

''تم کو معلوم ہے میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ تم کو بتا رہی ہوں کہ اس کی خوبصورتی تمہاری موجودگی میں ہے... ورنہ یہ حسین تو ہوگا مگر میرے لیے نہیں......''

وہ بہت خوش تھی...... جیسے کوئی ناقابل یقین خزانہ اس کے ہاتھ لگا ہو۔ اس کے روشن چہرے پر میری نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

چاندنی سے بچھا راستہ سنسان پڑا تھا۔ ہمارے دوست درخت کے پیچھے ذرا دور پتھروں کے بیچ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی......

''نتھیا گلی میں ہماری گاڑی سے اتر کر آپ اپنے ہوٹل چلے گئے تھے۔ جیسے آپ گئے مجھے لگا میرا دل کہیں گر گیا ہے۔ میرا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل کر رہا تھا۔ خود سے کہا کہ کاش آپ ہماری گاڑی سے لفٹ نہ لیتے۔ اندر میرے بالکل قریب بیٹھے تھے۔ گو درمیان میں اطہر تھا مگر محسوس ہوتا کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کو دیکھ رہی تھی۔ جب آپ متوجہ ہوتے تو نظریں جھکا لیتی اور آپ مسکرانے لگتے۔ بابا سے تو ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے بہت پرانے جاننے والے ہیں... پھر آپ چلے گئے۔ امی بار بار پوچھ رہی تھیں کہ میں اتنی چپ کیوں ہوں۔ کیسے انہیں بتاتی کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ میں یہ قبول کرنے پر تیار بھی نہ تھی کہ آپ ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔ وہیں کومل کو بتایا مجھے اس لڑکے سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ جسے امی لوفر لفنگا کہتی ہیں......''

پھر میری جانب کچھ لحظہ دیکھتی رہی اور دیکھتے دیکھتے مسکرا پڑی۔ ''شکل سے ویسے لوفر لوفر لگتے بھی ہو۔ ساتھ میں کچھ بدھو اور ذرا شرمیلے بھی......''

میں اسے مسکرا کر دیکھے جا رہا تھا...... مجھ سے اچانک پوچھا۔

''کیا میں بہت زیادہ تو نہیں بول رہی؟''

''نہیں تو۔ میں تو چاہتا ہوں تم بہت بولو۔ مگر بولتی بھی نہیں......''

کہنے لگی۔ ''کومل مجھے اتنا بولتے دیکھے تو حیران رہ جائے۔ میں گھر اور کالج میں بالکل زیادہ نہیں بولتی۔ مگر آج تو مجھے بریک بھی نہیں لگ رہی ہے۔''

پھر بڑی لجاجت سے کہا۔ ''مجھے بولنے دیں ناں۔ میری قسم بور نہیں ہونا۔ آپ سے باتیں کر کے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے......''

''پوچھتی کیوں ہو۔ میں تو بڑے دھیان اور آرام سے سن رہا ہوں۔''

اچانک چونک کر بولی۔ ''اگر آپ سب ایبٹ آباد سے واپس گھروں کو چلے جاتے تو ادھر میں نے تو مر جانا تھا......''

میں اپنی نظریں اس پر مرکوز کر کے بولا۔ ''آئندہ اس قسم کی باتیں مت کرنا۔ میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ نہ مجھے جانچنے کے لیے اور نہ مجھے تنگ کرنے کے لیے یہ کہنا، اور کہنا ہو تو ساتھ میرے مرنے کی دعا بھی کرنا۔''

''اچھا ناں۔ نہیں کہوں گی، لیکن آپ کو ناران کا خیال اچانک کیسے آ گیا؟''

میں اس کے چہرے کے سامنے آئے بال ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''میں دل ہار کر ایبٹ آباد سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک موہوم سی اُمید مجھے زندہ رکھی تھی کہ شاید کہیں تم آملو۔''

''یہاں جب لطیف بھائی کو امی سے بات کرتے دیکھا تو میں سناٹے میں آ گئی۔ جب شملہ پہاڑی پر آپ سے ملی تھی تو تب سے مجھے بھی اُمید تھی کہ آپ یہاں ناران میں ضرور آئیں گے۔ میں نے تو آپ کو شوگران میں بھی ڈھونڈا مگر آپ وہاں نہ ملے۔ مجھ پر یاسیت طاری تھی۔ لگتا میں بہت تھک چکی ہوں۔ اداس رہنے لگی تھی۔ کبھی رو دیتی ورنہ چپ رہتی۔ امی سمجھتیں کہ

میں بور ہو گئی ہوں اور مجھے گھر یاد آرہا ہے۔ میں کیا کرتی کہ مجھے قرار ملتا؟ کنول مجھے سمجھاتی رہی مگر میں اس کی بات سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ شکر اللہ پاک کا شکر کہ آپ یہاں نظر آگئے اور پھر ہمارا ہوٹل بھی ایک تھا۔ آپ کی کزن طاہرہ بھی یہاں آ گئیں۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوتا گیا۔''

''میری یہاں کوئی کزن نہیں ہے......''

''میں طاہرہ کی بات کر رہی ہوں......''

''وہ میری کزن نہیں۔ پہلی ملاقات ان لوگوں سے ٹھنڈیانی پر ہوئی جب تم مجھے شملہ پہاڑی پر ملی تھی۔ اس سے پہلے میں ان لوگوں کو نہیں جانتا تھا......''

کنول آنکھیں پھاڑے مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے پھر سب بتایا کہ وہ کیوں اور کس طرح سے ہماری مدد کر رہی ہے۔

وہ بولی۔ ''مجھے بالکل یقین نہیں آرہا ہے۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ آپ کی وجہ سے وہ میرے قریب ہوئی ہے۔ میں سمجھی کہ وہ اپنے بھائی کی مدد کر رہی ہے مگر یہ سب میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ ایک اجنبی لڑکی چند دنوں میں آپ کی دوست بن گئی۔''

میں نے کہا۔ ''واقعی بہت مخلص ہے۔ وہ نہ ہوتی تو شاید ہم آج اس وقت اتنے قریب نہ بیٹھے ہوتے......''

''ہاں۔ مجھ سے ہر وقت آپ کی تعریف کرتی رہتی ہے۔ مجھے تو یہ باور کراتی ہے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں......''

میں نے اس سے تاکید کی کہ طاہرہ کو معلوم نہ ہو کہ تم حقیقت جانتی ہو۔ ورنہ وہ دکھی ہوگی۔

کنول حیرت کے دائرے سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ کچھ سوچتی پھر الجھ جاتی۔ کبھی مسکرانے لگتی۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

میں نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ ''تمہارے بابا کے لیے لگتا ہے تمہاری امی بہت پریشان رہتی ہیں؟''

میری جانب چند لمحے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''امی سمجھتی ہیں کہ بابا بہت سادے ہیں۔ امی سمجھتی ہیں کہ میرے بغیر وہ دنیا کو ڈیل نہیں کر سکتے۔ ادھر بابا امی کی باتیں جو پیروں سے متعلق ہیں ان پر ہنستے ہیں اور امی کو بہت غصہ آتا ہے۔ مگر وہ بابا کی ہلکی سی تکلیف بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ بابا کو ذرا بھی پریشان دیکھا تو فوراً ان کے لیے تعویذ لینے نکل پڑتی ہیں۔ وہ آفس سے تھکے تھکے سے آتے ہیں تو پانی دم کر کے پلانے لگتی ہیں۔ صدقہ خیرات کرتی ہیں۔ اب بابا نے بھی امی کا کہنا ماننا شروع کر دیا ہے۔ یعنی وہ خاموش ہو جاتے ہیں یا پھر امی کی باتوں پر مسکراتے رہتے ہیں......''

مجھے وہ اس طرح سے سب کچھ بتا رہی تھی کہ میں اس کے خاندان کا فرد بننے والا ہوں۔ مجھ کو وہ اپنے گھر کے ماحول سے آشنا کروا رہی تھی۔ میری دلچسپی ایک دم اداسی میں بدلتی چلی گئی۔ حال احوال اس طرح سے دے رہی تھی کہ جیسے ہم سالوں سے یہی کرتے آرہے ہیں۔ صرف اپنی نہیں بلکہ اپنے اردگرد کی باتیں بھی ایک دوسرے سے کرتے رہے ہیں۔ دونوں یہ بھول بیٹھے تھے کہ یہ میلہ چند دن کا ہے اور پھر ایک جدائی ہے۔ ایسی جدائی جس میں ملنے کی صرف ایک آس ہے۔ صرف ہمارے پیار کی ایک چنگاری جس کی اُمید تھی کہ ایک دن شعلہ بن کر بھڑ کے گی۔ یہ میرے ساتھ آج بیٹھی چاند کو دیکھ رہی ہے اور یہ لمحے کچھ دیر بعد ہواؤں میں بکھر جائیں گے پھر میں اور وہ اکیلے اکیلے بیٹھ کر اپنا اپنا چاند دیکھا کریں گے۔ میں سوچتا کیا پیار ہمیشہ خوشی کے بعد ایک لمبا دکھ بھی دیتا ہے؟

کون ہم دونوں کو ان لمحات میں تسلی دے گا جب ہم ایک دوسرے سے دور ہوں گے۔ کوئی رویا تو ہمیں چپ کون کرائے گا۔ بے چین ہوئے تو گلے سے کون لگائے گا۔ کوئی خوشی ملی تو کس طرح سے ایک دوسرے کو بتائیں گے۔ کوئی روٹھا تو دوسرا کس طرح سے منائے گا.... چاند چمکے گا تو کس حوصلے سے اسے دیکھا کریں گے۔ کنول تمہاری یہ آواز میں دوبارہ کب سنوں گا۔ تیری گفتگو کی لہک اور تمہاری یہ مہک میں کس طرح سے بھول پاؤں گا۔ یہ بکھرے بال کس طرح سے سنواروں گا۔ ان گہری آنکھوں میں کیسے جھانکوں گا۔ تمہیں گلے لگانا ہے، تمہاری سانسیں گننی ہیں۔ تمہیں صبح بھی دیکھنا ہے اور شام بھی دیکھنا ہے۔ کبھی انتظار کرنا ہے اور کبھی انتظار کرانا ہے۔ تمہیں اپنی نظمیں سنانی ہیں اور مجھ کو تم پر نئے گیت لکھنے ہیں۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں اور بہت سی باتیں سننی ہیں۔ مجھے کتنے سارے کام کرنے ہیں لیکن تمہارے بغیر کس طرح سے کر سکوں گا۔ وہ چاند دیکھ رہی تھی اور میں اپنی آنکھیں آنسوؤں سے بھگو رہا تھا۔

مجھ سے بولی۔ ''معلوم ہے میں کیا سوچ رہی ہوں......''

''کیا؟'' میری بھرائی ہوئی آواز سنی تو مڑ کر میری جانب دیکھا۔ آنکھیں دیکھیں تو تڑپ اٹھی۔ ''رو رہے ہیں؟''

میں چپ رہا اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ''میں نے آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔ میں نے آپ کے ساتھ جانا ہے۔ میں

امی سے بات کرتی ہوں۔ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ امی اور بابا میرا کہنا نہیں ٹالیں گے۔ دیکھنا آپ کے سامنے وہ مجھ سے وعدہ کریں گے کہ ہماری شادی پر انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

وہ رو رہی تھی۔ دبی دبی ہچکیاں مجھے گھائل کیے جاتی تھیں۔ میں اسے چپ کراتا اور وہ زیادہ رونے لگتی۔ میں اپنی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھتا تو میرے ہاتھ پکڑ کر کہتی...... "میں بابا اور امی سے آج ہی بات کرتی ہوں۔ ہم دونوں کو یقین دہانی مل جائے تو مطمئن ہو کر واپس جاسکیں گے۔ ورنہ ان حالات میں اپنی پڑھائی کیسے مکمل کریں گے۔"

بڑی مشکل سے وہ تھمی۔ دریا کے پانی سے اپنا رومال بھگولایا۔ اس کا چہرہ صاف کیا۔ میں نے خود پر جبر کیا ہوا تھا۔ جس طرح سے وہ روئی تو میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس کو میں نے کہہ دیا کہ ابھی اپنے والدین سے بات نہیں کرنی ہے۔ ہماری ایک ذرا سی غلطی سارے گلشن کو جلا سکتی تھی۔

ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ چاند اپنی جگہ ٹھہرا تھا اور ہم اپنے مقام پر رکے تھے۔ سرگوشیوں میں کی گئی باتیں کانوں سے نہیں دل سے سنی جا رہی تھیں۔ دل کرتا رات ٹھہر جائے اور ہم یونہی بیٹھے رہیں۔ چاندنی کا چھڑکاؤ جاری رہا اور کائنات چمکتی رہی۔

☆☆☆

سب دوست اٹھے تو ہم مل کر بازار کی جانب چل پڑے۔ راستے میں دیکھا تو ہمارے دوستوں کا دوسرا گروپ خیمہ ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ ہم گزرے تو ہمیں بھی بٹھا لیا گیا۔ اندر ایک محفل جمی تھی۔ ہم بھی وہیں کہیں نہ کہیں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ خیمے کا پردہ آدھا اٹھا تھا اور میں وہیں اپنی جگہ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ کچھ میں خیمے کے اندر اور تھوڑا سا باہر تھا۔ جو خیمے کے اندر تھا وہ مجھے نظر آرہا تھا۔ جو باہر تھا وہ میرے سامنے تھا۔ ایک چاند باہر آسمان پر روشن تھا اور ایک اندر خیمے میں جگمگا رہا تھا۔ میرے اندر کا موسم اور باہر کا موسم ایک ہوئے اور ساز چھڑ گئے......

حسن کے قافلے ساحل پہ اتر آئے تھے
ایک ہی رات میں دو چاند نظر آئے تھے
آج تک کا یاد ہے وہ پیار کا منظر مجھ کو
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے پھرتا ہوں

ہواؤں سے خیمے کا پردہ ہلتا تھا۔ نمدے بچھے تھے اور اندر ماحول گرم تھا۔ خیمے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی تھی اور پیالیوں سے چائے کا دھواں اٹھ کر خیمے کی چھت تلے تیرتا تھا۔ شہزاد نے گانا گا کر سماں باندھ دیا۔

قدموں کو چھو رہی ہیں یہ جھومتی گھٹائیں
کرتی ہیں التجائیں یہ شام کی ہوائیں
چہرے سے گیسوں کا آنچل ذرا ہٹا دو
خاموش ہیں نظارے ایک بار مسکرا دو......

کسی کو اپنا بنا لینے کا احساس بہت دلآویز ہوتا ہے۔ یہ احساس محبت کے موسم میں جنم لیتا ہے۔ یہ موسم دنیا کی تلخ حقیقتوں میں نہیں بدلتا۔ یہ صرف خیال و خواب کی نگری میں ملتا ہے۔ اس موسم میں چند آنسو کچھ اداسی اور بہت ساری سحر انگیزیاں ہوتی ہیں۔

میں آسمان کے چاند کو دیکھتے دیکھتے کنول کو دیکھ لیتا۔ وہ نظروں کے اشاروں سے مجھے پاس بلا رہی تھی۔ میں اسے اشاروں میں سمجھا رہا تھا کہ سب کی موجودگی میں میرا تمہارے پاس آکر بیٹھ جانا ٹھیک نہیں۔ شاید وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس کی آنکھوں میں شکایتیں نظر آنے لگیں۔ میں اس کی شکایتوں کو بھی پیار کا ایک انداز سمجھ رہا تھا۔

اندر کے ہنگامے سے میں گھبرایا تو باہر نکل آیا۔ سامنے پتھر پر ایک ملنگ طرز کا نوجوان بیٹھا تھا۔ گہرے رنگ کا شلوار قمیص پہنے تھا اور اسی رنگ کی چادر کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ سیاہ تراشیدہ داڑھی اور مونچھوں نے اس کی شخصیت کا حسن بڑھا دیا تھا۔ آنکھوں سے سرخ شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ مجھ سے سلام دعا ہوئی تو معلوم ہوا وہ اس خیمہ ہوٹل کا مالک ہے، گھر بار سب چھوڑ کر ویرانے میں آبسا ہے۔ میں سوچنے لگا کتنے خوش قسمت لوگ ہیں جو اپنی زندگی کے فیصلوں کا مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان ایک خانہ بدوش ہی تھا۔ خانہ بدوش ایک جگہ نہیں رکتے۔

خانہ بدوشوں کا ایک مقولہ ہے کہ ہمارے دلوں میں حیرتیں اور روح میں گہرے خواب ہوتے ہیں۔ ہر نئی زمین ہمارے لیے حیرت کدہ اور ہر نیا آسمان ہمارے خوابوں کی تعبیر ہوتا ہے۔ چار دیواری بنا کر رہنا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ جب یہ خانہ بدوش کسی مالی منفعت کے بدلے اپنے مستقل گھر بنا کر رہنے لگیں گے تب دنیا کا اختتام قریب ہوگا۔ یہ بات اللہ نے عرب کے خیمہ زن بدوؤں کے بارے میں قرآن میں کہی ہے۔

میں گمان کر رہا تھا کہ میں بھی ایک خانہ بدوش ہوں۔ میری روح کی بے چینی مجھے ایک جگہ نہیں ٹھہرنے دیتی۔ میں

کہیں بھی جاؤں میری نظریں آسمان پر رہتی ہیں۔ کھلی فضائیں مجھے اپنی جانب بلاتی ہیں۔ پرندوں کو اڑتے دیکھتا ہوں تو ایک خواہش سر اٹھاتی ہے کہ مجھے بھی پنکھ ملیں اور انہی کی طرح اڑتا پھروں۔ ویرانوں کی خاموشی میری موسیقی بنے اور کائنات کو میرا رب میرے سامنے کھول دے۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں اور کنول خانہ بدوش ہوتے۔ نہ کسی کا خوف ہوتا اور نہ کسی رسم و رواج کے پابند ہوتے۔ ہم بھی اپنی دنیا یہاں سے کہیں دور بساتے۔ آسمان ہمارا سائبان ہوتا اور زمین فرش ہوتی۔ جہاں پھول ہوتے وہیں ٹھکانا بناتے۔ نہ رشتوں میں گھرے ہوتے اور نہ دنیا داری کا غم ہوتا۔ ہم بھی اسی طرح مطمئن ہوتے جیسے یہ ملنگ نوجوان نظر آرہا ہے۔

سب خیمے سے باہر آئے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے آواز دی تو اس کی جانب متوجہ ہوا۔ کنول پر نظر ڈالی تو دیکھا اس پر حزن و ملال کی کیفیت چھائی ہے۔ وہ میرا انتظار کرتے کرتے طاہرہ اور ثروت کے ساتھ چل پڑی۔ میں نے شہزاد سے باتیں کرتے کرتے اسے دیکھا تو وہ سب کے درمیان تنہا تنہا لگ رہی تھی۔ بوجھل سی چل رہی تھی۔

جب اپنے ہوٹل کے سامنے پہنچے تو وہ سب کے ہمراہ کھڑی تھی۔ مجھے قریب آتے دیکھا تو چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ آنکھوں میں بے اعتنائی اور چہرے پر کرب تھا۔ اس کے روشن چہرے پر غم کی لو چھائی تھی۔ چہرے ایسے کہ کسی ویران مسجد کے طاق پر شام کے بعد کوئی چراغ جل رہا ہو۔

دوست اندر تاش کھیلنے چلے گئے۔ اطہر تھکا ہوا تھا اور وہ کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ میں نے کنول سے کہا۔ ”تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ ایسا کرو کہ تم بھی جا کر کمرے میں آرام کرلو۔ کل ہم نے لالہ زار بھی جانا ہے......“

طاہرہ بولی۔ ”ہم تو نہیں تھکے...... تھکاوٹ آپ کی ہے اور نام ہمارا کر رہے ہیں۔“

کنول شمالی جانب اشارہ کر کے بولی۔ ”اس سمت کیوں نہ جائیں۔ سب بازار کی جانب جاتے ہیں۔ ہم ادھر کو چلتے ہیں۔“

میں نے کنول سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

سنجیدگی سے بولی۔ ”بالکل ٹھیک ہوں۔ نہ تھکی ہوئی ہوں اور نہ آپ کی طرح بیزار ہوں......“

میں سن کر پریشان ہو گیا۔ سوچنے لگا خیمے میں کوئی بد مزگی تو نہیں ہوئی جو اتنی اکھڑی اکھڑی سی نظر آرہی ہے۔

”میں کیوں بیزار ہوں گا۔ سوچا تم شاید تھکی ہوگی۔“

”جھیل سے پیدل آپ آئے ہیں اور تھکی میں ہوں گی؟“

میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔ ”ابھی رات بہت باقی ہے۔ کچھ اور واک کر لیتے ہیں......“

ہم سب چلنے لگے تو وہ سب سے مخاطب ہوئی۔ ”میں کمرے میں جاتی ہوں۔ نیند آرہی ہے......“

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ طاہرہ نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ”تھوڑا سا چل کر واپس آتے ہیں۔ پھر سو جانا۔“ اور وہ راضی ہو گئی۔

سب چلے تو میں نے کنول کو روک لیا۔ ”ناراض لگ رہی ہو؟“

”اللہ کرے میں مر جاؤں۔ سب کو چین مل جائے گا۔“

میں نے سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”یہ کیا بولے جا رہی ہو۔ کوئی سنوائی کا وقت بھی ہوتا ہے۔ جو بھی منہ میں آیا وہ بول دیا؟“

”آپ اپنے دوستوں میں رہیں، میری فکر کیوں کرتے ہیں......“

”کیا مطلب دوستوں میں رہوں؟“

”مجھے تو یقین نہیں آرہا تھا کہ کچھ دیر پہلے میرا ہاتھ تھام کر کتنی محبت سے بیٹھے تھے۔ جب دوستوں کو دیکھا تو دور جا بیٹھے۔ پھر جلدی سے چائے پی اور مجھے اکیلا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔“

”اکیلا؟ مگر سب تو وہیں بیٹھے تھے......“

بڑی معصومیت سے کہا۔ ”مگر آپ جو نہ تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ایک جنگل ہے اور میں اس میں راستہ بھول چکی ہوں......“

سنا اور میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنی بھرپور محبت کا جواب میں کن الفاظ میں دیتا۔ کیا میرے الفاظ اس کی محبت کا نعم البدل ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ میں اسے کچھ بھی کہتا وہ نہ مجھ کو جچتا اور نہ اس پر سجتا۔

”مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

میں نے صرف یہی کہا......

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اس کے گلے شکوے پر یہ رومانوی شعر میں نے کیوں کہا۔ میں اس



جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات
دنیا بھر میں
خدمات
اور مصنوعات
کی موثر تشہیر کے لیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے خزانوں کا انتخاب
جنہیں برِاعظم کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں
JASOOSI PUBLI
جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
63-C فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون نمبر: 35804200, 35802552 (21-92) فیکس: 35802551 (21-92) ای میل: group@hotmail.com

سے بولا......

''جب اتنا زیادہ پیار دکھاؤ گی تو دور ہونا تم سے مشکل ہو جائے گا۔ خیمے کے اندر کا شور میری یکسوئی سلب کر رہا تھا۔ میرا تمہارے قریب آکر خیمے میں بیٹھنا اس وقت صحیح نہ تھا۔''

''آپ کی یکسوئی سلب ہو رہی تھی اور آپ چلے گئے۔ مگر آپ کے چلے جانے سے میری یکسوئی ٹوٹ گئی۔ آپ اپنی جگہ سچے ہیں اور جھوٹی میں بھی نہیں۔''

ایک بار میں نے غزالہ سے پوچھا تھا لگتا ہے تمہیں میری عادت ہو گئی ہے۔ اس نے کہا تھا عادت نہیں محبت ہو گئی ہے۔ کنول سے پوچھا تو جواب دیا عادت نہیں عقیدت ہو گئی ہے۔

وہ نظر انداز ہونے پر روٹھی اور پیار کی زبان سمجھ کر مان گئی۔

ہم چل رہے تھے اور ہمارے ہر جانب خاموشی تھی۔ دریا کی گونج وادی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ سربلند پہاڑ چپ چاپ کھڑے تھے۔ راہ کی دونوں جانب جھاڑیوں پر پھول ہوا سے کبھی کبھار جھومنے لگتے۔ ایک پھول میں نے توڑ کر کنول کو دیا تو وہ مجھ سے گلے آ لگی۔ ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے اور چاند کی چاندنی کئی گنا بڑھ گئی۔

ہم دونوں چاندنی پر قدم رکھ کر چل رہے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا پہلا سفر چاند کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ ایک مہیب اداسی کے اندر سے مسرتوں کے غنچے پھوٹیں گے۔ ایک انجان سفر میں بچھڑے دوست آ ملیں گے۔ کنول نے میری خوابیدہ محبتوں کو جگا دیا۔ اس سے دل اٹکا، اُمید کبھی بندھی اور کبھی ٹوٹی، پھر سفر کی راہوں نے ہمیں ناران میں آ جوڑا۔

غزالہ کو بھولا تو کبھی نہیں مگر جدائی کا درد کنول نے آکر کم کر دیا۔ اس کے گھر سے جب آخری بار نکلا تو اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر نکلا تھا۔ کئی بار سوچا اس کا درد ختم کرنے کے لیے اپنے دل کو کسی جگہ لگا لوں، مگر دل لگانے سے کب لگا ہے۔ کسی غیر پر یہ اپنے دروازے نہیں کھولتا۔ چہرے بہت سے خوبصورت ملے مگر کنول جیسا ایک بھی نہ تھا۔ لوگ اجنبی بھی نہ تھے مگر اس کی طرح شناسا بھی نہ تھے۔ آنکھوں کو بہت بھلے لگے مگر دل میں نہیں اترتے تھے۔ کنول کو دیکھا تو غزالہ کی یاد ستانے لگی۔ غزالہ کی یاد کچھ کم ہوئی اور کنول نے دل پر قبضہ کر لیا۔

''میں آپ کو ہر روز خط لکھا کروں گی۔ مجھے ہر روز نہیں تو ہر دوسرے روز جواب ضرور دینا۔''

''اگر نہ لکھ سکا تب؟''

''پھر مجھے منانے کے لیے لاہور آنا پڑے گا......''

''مجھے منظور ہے......''

پھر رک گئی۔ تیور اپنے بگاڑے اور پوچھا۔ ''مطلب کہ خط کا جواب نہیں دیں گے؟''

''میں ملنے آیا کروں گا ناں......''

''اور خط؟''

''وہ ہر دوسرے دن نہیں لکھوں گا، بلکہ روزانہ لکھوں گا۔ سب لکھوں گا آج کیا میں نے کیا۔ کیا دیکھا اور کیا سوچا۔ آج دل پر کیا بیتی آج دل میں کون اترا۔ آج شام کتنی سحر انگیز تھی اور رات کتنی کالی تھی۔ آج چاند کیا بولا۔ آج تاروں نے کیا پوچھا۔ ہر روز نئی بات لکھوں گا۔ کوئی کہانی بھی لکھی تو وہ بھی لکھوں گا۔ کوئی خواب دیکھا تو وہ بھی اور کوئی تعبیر بوجھی تو وہ بھی لکھوں گا۔ ساری چنگاریاں لکھوں گا سارے شعلے لکھوں گا۔ شہزادوں کے قصے اور پریوں کی کہانیاں لکھوں گا۔ تم کو لکھوں گا اور تمہارے ساتھ خود کو لکھوں گا۔''

یہاں آکر میری آواز بھرّا گئی۔ میں خاموش ہو کر پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھنے لگا۔ میری تو آواز بھرّائی مگر اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی......

''مجھے معلوم ہے آپ بھی میری طرح دکھی ہیں مگر مجھ سے چھپاتے ہیں کہ کہیں میں رونے نہ لگوں۔ ہم کب تک ایسے رہیں گے۔ ایک دوسرے کی شکل کیا، ہم ایک دوسرے کی آواز بھی نہیں سن سکیں گے۔ کیا محبت اسی لیے کی تھی کہ اتنے غم زدہ ہو جائیں؟''

میں نے کہا۔ ''ذرا سوچو اگر دنیا میں محبت نہ ہوتی تو کائنات کتنی پھیکی لگتی۔ ہر چیز بے رنگ ہوتی۔ نہ کوئی پڑھتا اور نہ کوئی کام کرتا۔ جو ملا وہی کھا کر سو جاتا۔ نہ کسی پر دل دھڑکتا اور نہ کوئی یاد آتا۔ نہ شاعری ہوتی اور فلمیں کتنی بور بنتیں۔ ماں بے حس اور باپ بھی خود غرض ہوتا۔ بیوی اور خاوند کا رشتہ جانوروں سے بھی بدتر ہوتا۔ نہ کسی سے محبت کرتے اور نہ کسی کو محبت دیتے۔ پہلے اپنا پیٹ بھرتے اور پھر بچوں کے آگے کچھ پھینک دیتے۔ ہم محبت کو ایک وسیع کینوس میں دیکھیں تو سمجھ سکیں گے یہ نہیں تو رب بھی نہیں ہے۔''

اسی دوران ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کی شال کا آنچل نیچے ڈھلکا۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ کنول نے آنچل کے کونے میں گرہ لگا دی۔

''یہ کیوں لگائی ہے؟''

بولی۔ ''اسے تب کھولوں گی جب آپ کا خط ملے گا۔ اگلے دن دوبارہ لگا دیا کروں گی جب تک دوسرا خط نہیں آتا اسے نہیں کھولوں گی۔ یوں محسوس کروں گی کہ آپ کو اپنی زندگی سے باندھ رکھا ہے......''

اس کی صورت میں ملاحت تھی۔ وہ یوں مجھے لگ رہی تھی جیسے چاندنی کی تاروں سے گندھی ہو۔ اس کی محبت کے انداز مبہم تھے۔ کبھی رو کر محبت وصول کرتی اور کبھی مسکرا کر اسے نچھاور کرتی۔ آنکھیں اس کی دل کی باتوں کا مفہوم بیان کرتیں۔ ہماری محبت اس تیزی سے آگے بڑھی کہ لگتا کہ پہلا قدم اس جانب اٹھا اور دوسرا قدم ٹھیک منزل پر پڑا۔

اس کی حالت عجیب تھی۔ میں بہلاتا تو بہل جاتی مگر اگلے لمحے پھر رنجیدہ ہو جاتی۔ آنکھیں اس کی نم ہونے لگتیں۔ اس نے پیار نہیں کیا تھا بلکہ کوئی روگ پال لیا تھا۔

اچانک کہنے لگی۔ ''جب چاہو کہ کنول مر جائے تو کچھ اور نہ کرنا۔ بس صرف مجھے چھوڑ دینا۔ میں ویسے ہی مر جاؤں گی۔''

میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''کوئی سنائی کی گھڑی ہوتی ہے۔ دیکھ رہی ہو ہر جانب نور پھیلا ہے۔ پہاڑوں کی برفیں چاندنی میں چمک رہی ہیں۔ پھولوں کو دیکھو اپنی شاخوں پر ڈول رہے ہیں۔ ہر ذرے میں خالق نظر آ رہا ہے۔ سمجھو یہی لیلۃ القدر ہے۔ ان لمحوں میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ہم اللہ سے کوئی دعا کریں تاکہ کوئی مرنے کی بات کریں۔''

وہ چاروں جانب دیکھنے لگی۔ ہونٹ اس کے متواتر ہل رہے تھے۔

☆☆☆

مجھ سے کہا کہ جانے سے پہلے مجھے اتنی تسلی تو دے دو کہ ہم کس طرح سے ایک ہوسکیں گے۔ تاکہ میں خوشی خوشی واپس جا سکوں۔ بچھڑنے سے پہلے میرا حوصلہ بڑھا دو۔ جانے سے پہلے روک نہیں سکتے تو جانے سے پہلے میری ہمت تو بڑھا سکتے ہو۔

میں اس کو بار بار یہی بتلا رہا تھا۔ ''مجھے اپنی ڈگری اور کوئی جاب پکڑنے میں چار سال لگ سکتے ہیں۔ اسی دوران تم نے اپنی بات پر ڈٹے رہنا ہے۔ والدین سے یہی کہنا کہ مجھے شادی سے پہلے اپنی ڈگری مکمل کرنی ہے۔ شادی کی ہامی کہیں نہیں بھرنی......''

میرا بازو پکڑ کر بولی۔ ''یہی کہوں گی کہ مجھے شادی ابھی نہیں کرنی ہے......''

''والدین دباؤ ڈال سکتے ہیں......''

''وعدہ ہے...... آپ دیکھ لینا......'' ایک توقف کے بعد کہا۔ ''بابا کی فکر نہیں ہے۔ بس امی کی جانب سے ڈر ہے۔ وہ میری مخالفت کریں گی......''

میں بولا۔ ''ان کے لیے تو سائیں بھی بہت ہے۔ وہ ایک دم مجھے داماد قبول کرلیں گی۔''

مجھے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ ''آپ دونوں کو دیکھ رہی ہوں کس طرح سے میری بھولی بھالی ماں کو چکرایا ہوا ہے۔ میں ان کی طرح معصوم نہیں......''

''تو چاچا شفیع سے بھی نہیں ڈرتی؟''

گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اب تو میرے بلاوے پر بھی آجاتا ہے۔ اگر کہو تو ابھی آواز دیتا ہوں؟''

اس کے ہاتھ کی گرفت میرے بازو پر سخت ہوگئی۔

میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ ''چاچا جی۔ دیکھیں اسے......''

خوف کے مارے مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں میرے کندھوں میں پیوست ہوگئیں۔

☆☆☆

اگلی صبح میں منہ اندھیرے دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ ننھے ننھے پرندے ڈالوں پر پھدکتے رسیلے نغمے گا رہے تھے۔ سب کو ایک پیغام دے رہے تھے کہ کمروں سے باہر آکر دیکھو کس انداز سے دن طلوع ہو رہا ہے۔ دیکھو کیسے کائنات بیدار ہو رہی ہے۔ پھولوں اور گھاس پر اوس پڑی ہے۔ ہر چیز تازہ اور دھلی ہوئی ہے۔

میں کنول کو یاد کر کے کہنے لگا کہ تم بھی باہر آجاؤ تاکہ ان رنگوں کی سمفنی مکمل ہو۔ آکر کائنات کی اس تصویر کو مکمل کر دو۔

سامنے درخت پر چند پرندے نہیں بلکہ ڈال ڈال بھری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا سارا درخت چہک رہا ہے۔ وہاں ایک شور برپا تھا۔ خنکی کے باعث میں نے جیکٹ کی زپ گلے تک چڑھا رکھی تھی۔ میں نے اس کمرے کی کھڑکی کی جانب دیکھا جس میں کنول مقیم تھی۔

خوشبو کی پوشاک پہن کر
کون گلی میں آیا ہے
کیسا یہ پیغام رساں ہے
کیا کیا خبریں لایا ہے
کھڑکی کھول کر باہر دیکھو

موسم میرے دل کی باتیں
تم سے کرنے آیا ہے

میں بہتے دریا کے پانیوں پر نظریں رکھے اس موسم اور فضا کی خوبصورتی میں کھویا تھا۔ ایک آسودگی میرے بدن میں تیرتی تھی۔

ناران نے میرا دل کھینچ لیا تھا۔ جس وادی کا میں تصور کر کے آیا تھا یہ اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ ان دنوں بہت کم لوگ سیاحت پر نکلتے تھے۔ جو نکلتے بھی تھے وہ مری جا ٹھہرتے۔ بہت زیادہ مہم جوئی کی تو نتھیا گلی اور ایوبیہ چلے گئے... اور ناران کا نام بھی کم سننے میں آتا تھا۔ آجکل سنا ہے ناران بھی بدتمیز ہو گیا ہے۔ وہاں شور پھیلا رہتا ہے۔ جہاں خاموشی بسیرا کرتی تھی وہاں اب ہنگامہ داخل ہو گیا ہے۔ خاموشی کہیں اوپر پہاڑوں کی چوٹیوں کے قریب جا چھپی ہے۔ شکر ہے میں نے ناران تب دیکھا جب میرے اندر کی خاموشی ناران کی خاموشی سے گھل مل گئی تھی۔

کوئی فلسفی یہاں گھنٹوں تنہا بیٹھا رہ سکتا تھا۔ مصور روز نئے رنگ دیکھتا ہے۔ شاعر کے مصرے کنہار کے پانیوں کی طرح رواں ہوتے تھے۔ موسیقار کو فضائیں نئی دھنیں ہر روز سناتی تھیں۔ زاہد کو سجدے کے لیے ہر سو رب دکھائی دیتا تھا۔ لکھنے والا کہیں بھی بیٹھ جائے تو کئی صفحے بھر دے۔ ناران ایک محبت ہے جسے ہارنے کے بعد ہی جیتا جا سکتا ہے۔ ناران ایک خوبصورت چہرہ ہے جس کا ہر نقش الگ ہے۔ ایسا خوبصورت چہرہ نصیب والوں کو ملتا ہے۔ ایسے چہرے تک پہنچنے کے لیے ہر آزمائش قبول ہے۔

☆☆☆

سب لالہ زار جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ جیپیں اسٹارٹ تھیں۔ میں ڈائننگ ہال میں بے چین کھڑا تھا۔ کنول اور کومل ابھی تک

والدین
نھ کھڑی
سا لیے
نے پر
اکمرا
لی۔
ی
گم

بھی نہ ہے
بھلے لگے مگر دل؟
کی یاد ستانے لگی۔ غزالہ
قبضہ کرلیا۔
"میں آپ کو ہر روز خط لکھا
تو ہر دوسرے روز جواب ضرور دینا۔"

غزالہ بھی ایسی ہی تھی۔ وہ تو بلکہ کئی ہاتھ آگے تھی۔ ایک بار بن ٹھن کر آئی تو میں دیکھتا رہ گیا اور تعریف کرنا بھول گیا تھا۔ ادھر مجھے دیر ہوئی اور ادھر وہ لڑنے مرنے پر تل گئی۔ پھر بلو نے سمجھایا کہ کسی نے بھائی جان پر جادو کر کے ان کی زبان بندی کر دی ہے۔ تب جا کر وہ ٹھنڈی پڑی۔

اس بار کنول کو دیکھ کر میری وہی حالات ہو گئی۔ کومل کھنکھاری اور میں چونک پڑا۔ مجھ سے کہا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری بہن کو اس طرح سے کیوں دیکھتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "اتنا تیار ہوئی ہے تو دیکھوں گا نہیں؟"

پھر میں نے کنول کے جوتے دیکھے تو کہا۔ "جا گرز پہن آؤ۔ یہ لالہ زار میں کہاں چلیں گے......"

وہ مسمسی صورت بنا کر مجھے دیکھنے لگی۔ "یہ ٹھیک نہیں ہیں......"

"یہ پہن کر چل بھی نہیں سکو گی......"

کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ پھر کہا۔ "میرے آنے تک آپ یہیں رہیں۔" یہ کہہ کر ڈائننگ ہال خالی کر گئی۔ میں خالی راہداری کو دیکھ رہا تھا۔

"بھائی......" کومل نے اتنے زور سے کہا کہ میں چونک گیا۔ "یہ آپ دونوں کو کیا ہو گیا ہے کہ عجیب حرکتیں کر رہے ہیں۔ اس کو بار بار کہا کہ یہ جوتے مت پہنو تو میری سنی ہی نہیں۔ آپ نے ایک بار کہا تو اندر بھاگی چلی گئی... اور ادھر آپ جیسے ہی اس کو دیکھتے ہیں اردگرد سب بھول جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ میں بھی کھڑی ہوئی ہوں......"

"اور تم بھی تو ہر جگہ موجود ہوتی ہو......"

"اللہ کا شکر ہے کہ محبت وغیرہ کرنے کی میری عادت نہیں ہے۔ میں نہیں کسی کے پیچھے اس طرح سے دیوانی بن کر گھوم سکتی۔"

"تم دیوانی بن کر تو نہیں بلکہ مرنے مارنے کے لیے کسی کے پیچھے دوڑ سکتی ہو......"

پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے کہا...... "یہ کیوں کہا کہ میں ہر جگہ موجود ہوتی ہوں۔ تو کیا اپنی اتنی حسین بہن کو آپ کے حوالے کر کے بھول جاؤں؟ اس کا سایہ بن کر رہوں گی اور آپ کا کیا بھروسا......"

"اللہ کرے کومل تمہیں کوئی جن چمٹ جائے......"

وہ کڑک کر بولی۔ "آپ کے جن کی ایسی کی تیسی۔ میرے قریب آیا تو اس کا چہرہ نوچ کھاؤں گی......"

مجھے ہنسی آگئی۔

"بھائی مجھے یہ بتائیں۔ کیا آپ کو میں بہت بری لگتی ہوں؟"

"ہاں بہت زیادہ۔ اتنی زیادہ کہ تم سامنے ہو اور تم سے بات نہ کروں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تم بہت اچھی ہو۔ تمہاری دوستی اچھی لگتی ہے اِس لیے نہیں کہ تم کنول کی بہن ہو، بلکہ اس لیے کہ تم مختلف ہو۔ مجھے خط لکھنا۔ میری تمہاری بہت بنے گی۔"

وہ کچھ دیر کھڑی مسکراتی ہوئی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر کہا......

"زیادہ مکھن مجھے نہ لگائیں۔ آپ کا جادو میری معصوم بہن پر تو چل سکتا ہے مگر مجھ پر نہیں۔ معلوم نہیں کیا اس پر پھونکا ہے کہ آپ کے علاوہ نہ کسی کی بات سنتی ہے اور نہ سمجھتی ہے۔ میری صبر والی بہن اب آپ کو نہ دیکھ لے تو مجھ سے بھی لڑنے لگتی ہے۔ آپ دونوں ہی پاگل ہیں......"

"ہاں کومل۔ ہم دونوں پاگل اور سرپھرے ہیں کیونکہ ہماری سمجھ میں یہ دو اور دو چار والی باتیں نہیں آتیں... بلکہ ہماری سمجھ میں دو اور دو کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ہم کوئی چیز جمع تفریق نہیں کرتے۔ نہیں دیکھتے ہم کہ راستہ آسان ہے یا دشوار۔ ہم تو بس چل پڑتے ہیں۔ منزل ہمیں ملے نہ ملے، ہمارا چلنا ہی ہماری منزل ہے۔ ہم بہت عجیب لوگ ہیں۔ شاید دوسروں کی نظروں میں احمق یا بے کار۔ ہم جو بھی ہیں اپنی دنیا میں خوش ہیں......"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کتنی مشکل باتیں ہیں آپ دونوں کی۔ مجھے تو کنول کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" پھر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا سارے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جن کو پیار ہو جاتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ مجھے یہ اندازہ ہے کہ تم کو جب کسی سے پیار ہوا تو تم اظہار نہیں کرو گی۔ اس میں تم کو اپنی شکست دکھے گی۔ حالانکہ اس میں کیا جیت اور کیا شکست؟ یہ بازی تو صرف ہارنے کے لیے کھیلی جاتی ہے......"

بولی۔ "اللہ کرے مجھے کسی سے پیار نہ ہو۔ گھر بیٹھے کوئی رشتہ آئے اور امی مجھے بیاہ دیں۔ مجھے یہ جھنجٹ نہیں پالنے......"

"کیا تمہارے اندر دل ہے؟"

"ہے تو زندہ ہوں......"

"صرف سانس لینے کو زندگی نہیں کہتے، لیکن میں تمہیں کیوں سمجھاؤں۔ میری ایک عرضی ہے کہ بہن کا خیال رکھنا۔ وہ

کیرالا (Kerala)

ساحل مالا بار پر، جنوب مغربی بھارت کی ایک ریاست 1956ء میں ریاست ٹراونکور کوچین کی نئی حد بندی کے بعد وجود میں آئی۔ زرعی پیداوار میں کافی ربر، چائے اور کالی مرچ قابلِ ذکر ہیں۔ لوگوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ تعلیم کا تناسب بھارت کی تمام ریاستوں سے زیادہ ہے۔ ٹریونڈرم ریاست کا صدر مقام ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح بابل اور مصر وغیرہ سے کیرالا کے تجارتی تعلقات تھے، البتہ اس کی باقاعدہ تاریخ کی ابتدا پہلی صدی عیسوی سے ہوئی جب سینٹ تھامس چین اور دوسرے مشرقی ممالک کے دورے پر نکلے۔ انہوں نے یہاں سات گرجے تعمیر کرائے جن کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ اس دور میں کیرالا کئی حصوں میں منقسم تھا۔ ہر حصے پر الگ الگ راجے اور سردار مقتدر تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں ولندیزی آئے۔ انہوں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا یعنی ٹراونکور، کوچین اور زمامورین (جو بعد میں مالا بار کے نام سے موسوم ہوا)۔ 1948ء تک یہ تقسیم قائم رہی اس کے بعد ٹراونکور اور کوچین کو ملا دیا گیا اور ٹراونکور کوچین ریاست قائم ہوئی۔ یکم نومبر 1956ء کو پہلی بار کیرالا کی الگ سیاسی حیثیت قائم ہوئی۔ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کی بھی خاصی آبادی ہے۔ اسلام یہاں آٹھویں صدی میں ان عربوں کے توسط سے پھیلا جو تجارت کے غرض سے یہاں آتے تھے۔ رقبہ: 15,000 مربع میل یا 38900 مربع کلومیٹر۔

مرسلہ: زاہد شیخ، لاہور

بہت معصوم اور سیدھی سادی ہے۔"
"اور میں؟"
"تم بڑی شاطر ہو......" میں نے ہنس کر کہا۔
وہ سوچنے لگی۔ پھر کہا۔" بھائی میں ایسی نہیں جیسے نظر آتی ہوں۔ میں پہیلی ہوں۔ جو مجھے بوجھے گا میں اسی کی ہو جاؤں گی......" سنجیدہ لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔" کنول میری بہن ہے تو ظاہر ہے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ مگر جب سے آپ اس کی زندگی میں آئے ہیں تو وہ اور اچھی لگنے لگی ہے۔ آپ دونوں کا پیار دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے بھی اسی طرح سے چاہے...مگر شاید میں اتنی خوش نصیب نہیں ہوں......مجھ سے جو ہو سکا میں کروں گی کہ آپ دونوں ایک ہو جائیں۔"
اتنے میں کنول آ گئی۔ مجھے اپنے جاگرز دکھاتے ہوئے بولی۔" اب ٹھیک ہے؟"
" بالکل ٹھیک ہیں۔ اب تم باہر جاؤ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں......"

☆☆☆

جب قافلہ روانہ ہوا تو ہماری جیپ آگے آگے تھی۔
ناران جانے والوں کی پہلی ترجیح جھیل سیف الملوک ہوتی تھی۔ لالہ زار کی جانب بہت کم لوگ جایا کرتے تھے۔ بابوسر ٹاپ تک جانا تو ایک پوری مہم تھا۔ وہاں تک راستہ مخدوش تھا۔ سڑک کا نام و نشان نہ تھا اور ہم لالہ زار جا رہے تھے۔
ناران سے کچھ ہی منٹ میں ہم باہر نکل آئے۔ وہی دیکھے بھالے مناظر تھے۔ پتھر، دریا، پہاڑ، کہیں کہیں درخت اور پھر اندر ہماری جیپ کے انجن کا متواتر شور۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہماری جیپ ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔ کوئی پتھر ٹائر تلے آتا تو جیپ اچھل پڑتی۔ جیپ کے دھچکوں سے میں بمشکل سنبھل کر بیٹھا تھا۔ مجھے کنول کی فکر لاحق تھی کہ اس کی کیا حالت ہو گی......
آگے ایک پہاڑ دائیں جانب نظر آیا جہاں پر ایک راستہ چیک کر اوپر جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی میرا دم اوپر نیچے ہو گیا۔ ایسا راستہ میری راہ میں پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔
ہماری جیپ اس راستے پر چڑھی اور ہم ایک اور طرح کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ پہاڑ سے ربن کی طرح لپٹے اس راستے نے سب کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ ناران سے بابوسر جاتا راستہ بہت نیچے رہ گیا۔ کھائی ہم سے دائیں جانب تھی اور خوف ہمارے اندر تھا۔ راستہ ویران تھا اور دور دور تک نہ کوئی سواری اور نہ کوئی انسان تھا۔ پہاڑ چٹیل تھے اور کہیں کہیں ڈھلوانوں پر لمبے درخت نظر آ رہے تھے۔ چوٹیوں پر سفید برفوں کی تہہ تھی اور کہیں سے وہی سفید دھارے نیچے تک گرتے نظر آتے تھے۔ کسی پہاڑ پر سبزہ بھی تھا مگر بیشتر بنجر تھے۔ ایک عجیب طرح کا ماحول تھا اور زندگی مجھے عجیب مگر حسین لگنے لگی تھی۔ جیسے جیسے کھائی کی گہرائی بڑھتی گئی اسی طرح تمام دوستوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ سائیں اور میں ہمیشہ کی طرح ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا......
" آپ ہماری طرح اس سفر میں کیوں خوار ہو رہے ہیں۔ آرام سے اڑ کر سیدھا لالہ زار پہنچ جاتے......"
اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔" اگر اس راستے میں کچھ ہو جائے تو......پھر کہو گے سائیں کو اپنے اڑنے کی پڑی تھی اور ہم یہاں مشکل میں پھنسے ہیں......"
" استاد جی مگر............" میری بات کاٹ دی۔
"میرے ساتھ زیادہ ٹر ٹر نہ کر۔ وہ بھی لالہ زار کے رستے پر اور بھری جیپ میں......"
پھر خود ہی بات شروع کی۔" آج بچی کی والدہ سے بات کر کے معاملے کی تہہ تک پہنچتا ہوں......"
" استاد جی۔۔۔آپ کو کیا معلوم کہ ایسے معاملات کتنے نازک ہوتے ہیں......"
" جندڑی۔ یہ معاملات اگر میں نہیں جانتا تو یہ ڈرائیور جانتا ہے؟"
" استاد جی۔ آپ ان سے زیادہ بات نہ کرنا۔ صرف یہ کہنا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔ بڑے پیر سے بات کر کے آپ کو کلام کے علاوہ تعویذ بھی بھیج دوں گا۔"
" جندڑی پھر یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ میں دو نمبر پیر ہوں اور یہ ندیم میری طرح کا دو نمبری ہے......"
" استاد جی یہ کیا فرما رہے ہیں......"
" تو میری پیری کو کچھ نہیں سمجھتا تو میں کیوں تیری حرکتوں پر وظیفے پڑھوں......"
میں نے بات بگڑتے دیکھی تو پوچھا۔" استاد جی ویسے پیار میں لوگ تعویذ کیوں کرواتے ہیں۔ یہ تو ہم پیار سے بھی پا لیتے ہیں......"
" جندڑی کسی کے پاس ٹائم نہیں۔ ہر ایک شارٹ کٹ مار رہا ہے۔"

”کیا پیار میں شارٹ کٹ چلتا ہے؟“

اپنی موچھوں کو مروڑا۔ آنکھیں بند کر کے وجد کے عالم میں کہا۔ ”وہ تو لانگ کٹ سے بھی حاصل نہیں ہوتا......“

سامنے پہاڑوں کی بلندیوں اور کھائی کی گہرائی نے دماغ سن کر دیا تھا۔ ذہن میں خطرہ رینگتا تھا۔ میری ساری توجہ کنول کی جانب تھی۔ بے بس بیٹھا سوچتا تھا کہ وہ کتنی سہمی بیٹھی ہو گی۔ اس کا خوف زدہ چہرہ آنکھوں کے سامنے بار بار آ رہا تھا۔

اتنے میں کوئی کسی سے پوچھ رہا تھا۔ ”مجھے نہیں لگتا کوئی ان بلند پہاڑوں پر چڑھا ہوگا۔“

سوال کو سائیں نے راستے میں اچک لیا...... ”سیدھا راستہ ہے۔ دنیا یہاں سے گزرتی ہے۔“

”مگر سائیں ان بلند اور سیدھی چٹانوں پر کون چڑھ سکتا ہے؟“

سائیں نے اپنی مخصوص طنزیہ ہنسی ہنسی۔ ترچھی نظروں سے اردگرد بیٹھے دوستوں کو دیکھا۔ ”ان ٹیلوں کی بات کر رہے ہو۔ اصل پہاڑ جنڈڑی تم لوگ دیکھ لیتے تو بٹیرے کی طرح پھڑک کر گر جاتے......“

”اس سے اونچے پہاڑ کہاں ہوں گے سائیں؟“

”کوئی کوہ سلیمان کے پہاڑوں کی طرف گیا ہے۔“

”ادھر جا کر کسی نے کیا کرنا ہے......“ کوئی بولا۔

”میں نے وہاں کا چپہ چپہ چھانا ہے۔“

”نہیں سائیں......“ وہی پھر بولا۔

”ہاں ہاں......“ یہ کہہ کر سائیں بولا۔ ”اب پوچھو وہاں میں کیا کرنے گیا تھا۔“

”سلاجیت نکالنے گئے ہوں گے؟“

”نہیں جنڈڑی۔ قطری کو چرخ چاہیے تھا۔ پیچھے پڑا تھا۔ وہی پکڑنے گیا تھا......“ سب ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنے لگے۔ کسی نے پوچھا کہ ہمیں بھی بتائیں کہ کب اور کیسے گئے تھے......

پھر سائیں شروع ہو گیا...... ”سندھ مرشد کے پاس گیا ہوا تھا۔ پیغام ملا کہ قطری رحیم یار خان شکار کھیلنے آیا ہوا ہے اور یاد کر رہا ہے۔ میں ملا تو بولا کہ سائیں مجھے چرخ چاہیے۔ میں بولا کہ اگلے سال دیکھیں گے۔ مگر پیچھے پڑ گیا کہ مجھے تو انہی دنوں میں چاہیے۔ کہا کہ میں یہاں سے ہلوں گا نہیں اگر اس بار پرندہ مجھے نہ ملا۔ دل میں سوچا کہیں جرنل ضیا کو نہ کہہ دے اور جرنل صاحب کا گلہ نہ ملے اسی لیے وہاں سے سیدھا میں

ناصر الدین اللہ

عباسی عہد سلطنت کا چونتیسواں خلیفہ احمد نام، ابوالعباس نسبت ناصر الدین اللہ لقب۔ 10 رجب 553ء کو ایک ترکی کنیز زمرد کے بطن سے پیدا ہوا۔ المستضی بامر اللہ کا بیٹا، باپ کی وفات کے بعد 10 ذیقعد 575 کو تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد خلافت کے تیسرے دن یعنی 575ھ بمطابق 1176ء غوری خاندان کے شہاب الدین ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت یہ بغداد میں تھا۔ 575ھ میں والی تکریت امیر عیسیٰ کی وفات پر اس نے اپنے بھائیوں کے خلاف اقدام اٹھاتے ہوئے اس پر خود قبضہ کر کے امیر عیسیٰ کے بھائیوں کو جاگیریں دیں۔ اس کے ایک سال بعد عانہ پر قابض ہو کر وہاں کے امراء کو جاگیریں بخشیں۔ 591ھ میں خوزستان کو زیر نگیں کر کے مجیر الدین کو وہاں کا حکمران نامزد کیا۔ ابن خوارزم کو شکست دینے کے لیے اس نے سیف الدین طغرل کی قیادت میں لشکر اصفہان بھیجا، جو کامیاب رہا۔ اصفہان کے بعد ہمدان، زنجان اور قزدین وغیرہ بھی اس کے مفتوحہ علاقے بنے۔ 602ھ میں مجیر الدین کی وفات کے بعد اس نے اسی کے داماد سنجر کو امیر نامزد کیا، مگر 606ھ میں اس سے ناراض ہو گیا۔ اس کی راست روی کے لیے اپنے نائب وزیر کو بھیجا جو محرم 608 میں اسے گرفتار کر کے بغداد لایا۔ اس وقت خلیفہ کی ناراضگی ختم ہو چکی تھی۔ سو اسے خلعت دے کر چھوڑ دیا۔ محرم 613ھ میں اپنے پوتے کو لشکر کی امارت دی۔ رمضان 622ھ میں اس کی وفات کے ساتھ اس کا تقریباً سینتالیس سالہ عہد خلافت بھی ختم ہو گیا۔ کسی عباسی خلیفہ نے اتنے عرصہ حکومت نہیں کی۔ عمر کے آخری 20 ایام میں یہ بیمار رہا، جو موت کا سبب بنی۔ بہ اعتبار طبیعت وصلاحیت یہ عالم و فاضل، ذہین، حاضر دماغ، تیز طبع، جرأت مند اور باہمت انسان تھا۔ یہ علم حدیث کا ماہر تھا۔ 70 احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ: اس نے بڑے جاہ جلال سے حکومت کی۔ مخالفین ابھرے، جنہیں اس نے مغلوب کیا۔ یہ شطرنج سیاست کا چابک دست کھلاڑی تھا۔ اسی طرح تاریخ الخلفاء میں درج ہے کہ عالم اسلام کے تمام حکمران اس کے اطاعت گزار و تابع فرمان تھے۔ اور خلافت بغداد کے تمام قدیم باغیوں نے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ اس نے بڑے بڑے ملک مسخر کیے۔ اندلس سے چین تک اس کی دھاک بیٹھی تھی۔ اس کی ایک صفت کے بارے میں فخری لکھتے ہیں کہ ناصر رات کے وقت گلی کوچوں میں پیدل پھرا کرتا تھا۔ ابن طقطقی کا بیان ہے۔ ناصر کے خیراتی کام اور اوقاف لاتعداد ہیں۔ اس نے بہت سے مسافر خانے، خانقاہیں اور مسجدیں تعمیر کروائیں۔

مرسلہ: ذیشان اکمل شیخ، چنوٹ

زوب آیا۔"
گلو نے کہا۔ "مریدوں کو بھیج دیتے۔ خود کیوں گئے......"
"انہیں کیا سمجھ کہ اصل چرخ کیسا ہوتا ہے۔ ایک بار انہیں بھیجا تھا مگر دو چیلیں پکڑ لائے تھے......اصل تو وہ ہوتا ہے جس کے پر سفید اور سر کی ٹوپی کالی ہوتی ہے۔"
"پھر کیا ہوا؟"
"کیا ہونا تھا۔ زوب سے قندھار تک کا سارا علاقہ چھان مارا......"
میں نے پوچھا۔ "استاد جی۔ وہ پہاڑ ان سے اونچے ہیں؟"
حقارت بھری نظروں سے سامنے پہاڑوں کو دیکھا۔
"علامہ صاحب نے کوہ سلیمان کے پہاڑ دیکھ کر تو کہا تھا تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں ......اور یہ شاہین چرخ ہوتا ہے......"
"سائیں۔ سنا ہے چرخ سامنے پہاڑ پر بھی ملتا ہے۔ آئے ہوئے ہیں یہاں تو لگے ہاتھوں ایک ساتھ لیتے بھی جائیں......"
"کملا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں پر تو کوے انڈے دیتے ہیں۔ خود بھی تھکے گا اور مجھے بھی تھکائے گا ..."
شہزاد نے کہا۔ "کسی نے مجھے بتایا... کہ کوہ سلیمان بہت خطرناک پہاڑ ہے۔"
"وہ تو ہے......"
"گرے تو نہیں تھے؟"
"پاؤں پھسلا تھا، مگر سنبھل گیا تھا۔"
میں نے سوال کیا۔ "چاچا شفیع ساتھ تھا......"
"نہیں وہ مرشد نے بعد میں دیا تھا......"
"اور استاد جی۔ کس پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے تھے......"
"میں تو چوٹی سے چوٹی چلا تھا۔ پہلی، دوسری، تیسری اور اس طرح سے آگے۔ چرخ ایک جگہ بیٹھا تھا اور میں نے پکڑ لیا اور اوپر اس کے چادر ڈال دی۔"
"پہاڑوں سے نیچے بھی نہیں اترے تھے؟"
"ٹائم نہیں تھا، اور نیچے کرنا کیا تھا۔ چرخ اوپر رہتا ہے۔ مرغی تو نہیں کہ زمین پر دانہ چگے گا......"
فرید نے پوچھا۔ "بہت بڑا ہوتا ہے؟"
سائیں نے طنز کیا۔ "تیری سائز کا تو ایک پر ہوتا ہے۔"
"تو سائیں۔ زوب سے رحیم یار خان چرخ پر بیٹھ کر گئے تھے......"
"تیری وہی چخ چخ۔ دل کرتا ہے نیچے اتر کر جیپ سمیت تمہیں کھائی میں فنا کردوں......"
شہزاد نے پوچھا۔ "رحیم یار خان اسے چھوڑنے گئے تھے؟"
"نہیں جنڈڑی۔ قطری زوب خود آیا۔ دو جہاز لایا تھا۔ ایک میں خود تھا اور دوسرا خالی......"
"خالی کیوں؟"
"وہ چرخ کے لیے تھا، پھر قطری نے مجھ سے کہا جنڈڑی ہاں نال آ لگ۔ دل خوش کر دیا ہے۔ پھر کہا مانگ کیا مانگتا ہے۔ میں نے کہا تو اور میرا مول لگائے گا؟ نکل یہاں سے اور جان کھوٹی کر۔"
"وہ پھر ایسے ہی چلا گیا؟" امتیاز نے حیرت سے پوچھا
"وہ کہاں رکنے والا تھا۔ ایک تیل کا کنواں اور دو لینڈ کروزر چھوڑ گیا تھا......"

☆☆☆

ہمارے دائیں جانب کھائی تھی۔ بائیں جانب پہاڑ برابر ہو کر ایک پھیلے میدان کی شکل اختیار کرنے لگے۔ وہ میدان دور تک چلا گیا تھا۔ اس کے آگے پہاڑ برفوں اور درختوں سے ڈھکے تھے۔ کہیں کہیں پیپل اور چنار کے درختوں کے جھنڈ تھے اور باقی سارا حیرت کدہ تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ دور دور تک ایک خاموشی چھائی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور ہزاروں پیلے اور سفید خودرو پھول گھاس سے سر نکالے جھوم جھوم کر ہمیں دیکھنے لگے۔
ڈرائیور نے جیپ روکتے ہوئے اعلان کیا۔ "لالہ زار آ گیا ہے۔" پھر اپنی سیٹ سے جمپ لگا کر زمین پر آ گیا۔
میں نیچے اترا اور مہک دار ہوائیں مجھ سے لپٹ گئیں۔ ایک گہرا سانس لیا اور تازگی ہواؤں کے ساتھ جسم میں پھیل گئی۔ سفر اور دھکوں کی کوفت پانی کی طرح بہہ نکلی۔ ہم جیپ سے دریاں نکال کر بچھانے لگے۔ دو دریاں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بچھا دی گئیں۔ ایک کنول کی فیملی کے لیے اور دوسری پر ہم لیٹ گئے۔
ان کی جیپ دور سے آتی نظر آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں وہیں لگی تھیں۔ جیپ قریب آ کر رکی۔ میری نظر اترنے والوں پر تھی۔ میں نے جو دیکھا تو پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی دوست بھی کھڑے ہو گئے تھے......

(جاری ہے)

سنہرے لوگ

ارشاد حسین

لوگوں نے یکے بعد دیگر اس کی دسیوں تحریریں مسترد کیں، کہا کہ وہ لکھ ہی نہیں سکتا مگر اس نے ہمت نہ ہاری، سعی مسلسل میں مصروف رہا، پھر دنیا نے دیکھا کہ اسے صف اول کا قلمکار کہا جانے لگا۔

ایک عالمی شہرت یافتہ ڈراما نویس کا تذکرہ



دنیائے ادب میں جب بھی تھیٹر اور ڈرامے کا ذکر ہوگا انگریز ڈراما نگار جارج برنارڈ شا کا نام ضرور آئے گا۔ جارج برنارڈ شا کا شہرہ تقریباً سو سال پہلے ہوا تھا اور آج بھی ان کا نام جگمگاتے ستارے کی طرح روشن ہے۔ جارج برنارڈ شا 26 جولائی کو 1856ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 2 نومبر 1950ء کو ہوا۔ جارج برنارڈ شا کو 1925ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

جارج برناڈ شا آئرلینڈ کے شہر ڈبلن میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والدین ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے

نائیجیریا

مغربی افریقہ کی مسلمان جمہوریہ تقریباً 75 فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یہاں جمہوری طرز حکومت ہے اور ملک کا سربراہ صدر ہوتا ہے۔ مرکزی دارالحکومت لاگوس ہے۔ ملک کا مکمل رقبہ 356574 مربع میل ہے۔ اس کے ساحلی علاقے خلیج کینیا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کے مغرب میں ڈاموہے۔ شمال اور شمال مغرب میں نائجیر شمال مشرق میں چھڈ اور چھڈ جھیل اور مشرق میں کیمرون۔ دریائے نائجیر اور اس کی ایک شاخ نائجریا کو تین بڑے حصوں میں منقسم کرتی ہے۔ شمال میں اونچی سطح مرتفع اور جنگلات ہیں۔ جنوب مغرب میں سوانا کے نیچے ہیں۔ یہ ملک چار حصوں کی فیڈریشن ہے۔ جو مغربی، مشرقی، شمالی اور وسطیٰ مغرب پر مشتمل ہیں، انہیں بارہ ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ان کے باشندوں کی وسیع اکثریت افریقیوں کی طرح سیاہ ہے اور 250 قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سو سے زائد زبانیں بولتے ہیں مگر سرکاری زبان انگریزی ہے۔ پندرہویں صدی میں یہاں یورپی باشندے پہنچنا شروع ہوئے۔ ان کی آمد کے ساتھ جہاں عورتوں کی خریدوفروخت کا رواج پڑا اور نائجیریا کی تہذیب تباہ ہوگئی۔ انیسویں صدی میں یہاں انگریزوں نے پہنچنا شروع کیا۔ یہ افراد اس صدی میں یورپ اور 1903ء میں پورے ملک پر کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ 1914ء میں انہوں نے اسے برطانوی نوآبادیاتی نظام میں دھکیل دیا۔ 1940ء سے 1960ء تک یہاں برطانیہ نے وفاقی طرز

تھے۔ شا کو لڑکپن سے ہی ادب میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ اپنا ادبی کیریئر بنانے کے لیے صرف چودہ سال کی عمر میں لندن چلے آئے۔ لندن آکر انہوں نے اوپر تلے پانچ ناول تحریر کر کے مختلف پبلشرز کو روانہ کیے اور تمام پبلشرز نے ان کے تحریر کردہ ناول مسترد کردیے۔

جارج برناڈ شا ان ناکامیوں سے گھبرائے نہیں اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ناول تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف اخبارات میں لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا اور انہیں پہلی کامیابی موسیقی کے نقاد کے طور پر حاصل ہوئی اور ان کے تنقیدی مضامین اسٹار لندن میں شائع ہونا شروع ہوئے۔

موسیقی پر تنقیدی کالم لکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے میدان سیاست میں بھی قدم رکھ دیا اور 1890ء میں وہ لندن اور گردونواح میں سوشلسٹ لیڈر کے طور پر ابھرنے لگے اور تقریباً انہی برسوں میں وہ ڈراموں کے نقاد کے طور پر سیٹر ڈے ریویو لندن میں چھپنا شروع ہوئے اور شاید یہی وہ مقام تھا جہاں سے انہوں نے ڈرامے کے تخلیقی میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 1890ء سے 1897ء کے درمیان کا عرصہ جارج برناڈ شا کی کامیابیوں کا عرصہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ سیاست میں آگے بڑھ رہے تھے۔ موسیقی اور ڈرامے کے نقاد کے طور پر ابھر رہے تھے اور انہوں نے ڈرامے لکھنے کی شروعات انہی برسوں کے دوران کی

اور 1897ء ان کی حقیقی کامیابیوں کا نکتہ آغاز بنا۔ 1897ء میں وہ سوشلسٹ سیاستدان کے طور پر لندن کے سینٹ پینکراز ضلع سے کونسلر منتخب ہوئے اور اسی سال ان کا پہلا اسٹیج ڈراما Candida پیش ہوا۔ جس نے کافی مقبولیت حاصل کی اور اسی سال کے اختتام پر ان کا ایک اور معروف کھیل "The Devils Disciple" سامنے آیا۔ 1898ء میں جارج برناڈ شا رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ ان کی شادی آئرلینڈ کی ایک خاتون شارلٹ پینے ٹاؤن سینڈ سے ہوئی۔

1898ء سے 1900ء کے درمیان کے بارہ سال برناڈ شا کے عروج کے سال تھے اور انہوں نے اسی دوران تین اور کامیاب ڈرامے Arms and the man، Mrs. Warner's Profession اور Captian Brassbrunds Conversion تحریر کیے جو تھیٹر کی دنیا میں بہت مقبول ہوئے۔ برناڈ شا نے ابتدائی ڈراموں میں کامیڈی موضوعات کو اپنایا کیونکہ اس زمانے میں کامیڈی کو عوام الناس میں پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کے ڈرامے کتابی شکل میں شائع ہونے لگے۔ ان کے ڈراموں میں لمبے لمبے بلند آہنگ ڈائیلاگ اور کرداروں کے درمیان مکالمے بے جذباتی انداز میں تحریر کیے جاتے تھے۔ ان کے ڈراموں کے موضوعات بہت متنازعہ ہوتے نتیجتاً اپنے نکتہ نظر کو مضامین لکھ کر اجاگر کرتے اور ان

حکومت قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں جو آزادی کی تحریکوں کے پروان چڑھنے کی وجہ سے بار آور نہ ہو سکیں۔ 1960ء میں اسے آزادی نصیب ہوئی۔ آزادی کے بعد میں یہ اندرونی خلفشار سیاسی محاذ آرائی کا شکار رہا۔ اس کشمکش کے دوران 1967ء میں مشرقی صوبے میں بالآخر جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا جس سے یہاں زبردست سول جنگ شروع ہو گئی۔ یہ تیس دن کی خونریزی کے بعد جنوری 1970ء میں ختم ہوئی۔ بالآخر فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہاں کی 65 فیصدی آبادی پڑھی لکھی ہے، ستر ہزار پرائمری اور چھ سو ثانوی اسکول ہیں۔ تین سو ستر ٹیکنیکل ادارے اور پانچ یونیورسٹیاں ہیں۔ یہاں کا سکہ نائیجیرین پونڈ ہے۔ ملک کی زیادہ آمدنی قدرتی وسائل سے ہوتی ہیں جن میں تیل اور گیس کے ذخائر سرفہرست ہیں۔ دوسری معدنیات میں سونا، لوہا، سیسہ، زنک، ٹین اور کوئلہ شامل ہیں۔ زراعت میں کپاس، گنا، جوار، پھلیاں، کوکا وغیرہ بڑے پیمانے پر کاشت ہوتی ہیں۔ زراعت کے لیے ملک کا تقریباً 23 فیصد حصہ مخصوص ہے۔ ملک میں سالانہ چودہ کروڑ بھیڑ بکریوں اور ہزار ہا دوسرے مویشیوں کی افزائش نسل ہوتی ہے۔ مواصلات میں تقریباً چار ہزار میل لمبی سڑکیں۔ پچاس ہزار ٹیلی فون اور ہزار ہا ریڈیو ٹی وی کے علاوہ تقریباً 21 بڑے روزنامے نکلتے ہیں۔ ملک دولت مشترکہ اقوام متحدہ اور ایسی ہی بہت سی تنظیموں سے منسلک ہے۔ آج کل تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

مرسلہ: سید فدا حسین، لالہ موسیٰ

مضامین کو پیش رس کے طور پر اپنی کتابوں کا حسن بنا دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات ڈرامے کی طوالت کم ہوتی مگر پیش رس کی طوالت زیادہ ہوتی تھی۔

جارج برنارڈ شا نے غربت میں آنکھ کھولی تھی اور معاشرے میں موجود طبقاتی تفریق کو وہ بہت کڑی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ لندن میں رہتے تھے مگر اپنے وطن آئرلینڈ کی سیاسی، معاشی اور اقتصادی صورتِ حال پر بے چین رہتے تھے، مصروفیات کے باوجود وہ اپنے آبائی وطن کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اور آئرلینڈ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور تحریک آزادی کے منظرنامے میں خود کو شامل رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب آئرلینڈ میں بغاوت کا سلسلہ شروع ہوا اور Easter Rising ہوئی تو انہوں نے خود کو اس بغاوت سے لاتعلق نہیں رکھا اور باغیوں کے لیڈروں سے براہِ راست رابطے رکھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے باغیوں کے سرکردہ لیڈر مائیکل کولنز کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھا اور آہستہ آہستہ ان دونوں کے درمیان رہنے والے رابطے دوستی میں ڈھل گئے۔ کولنز لندن آتے تھے تو برنارڈ شا کے مہمان بنتے تھے اور باغی لیڈر کو شا کی طرف سے مالی اور اخلاقی امداد ہمیشہ حاصل رہتی تھی۔ برطانیہ کی حکومت ان تعلقات پر شا سے مسلسل ناراض رہتی تھی۔ لندن دربار کی خواہش تھی کہ برنارڈ شا آئرلینڈ کے باغیوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں لیکن سوشلسٹ ذہن رکھنے والے برنارڈ شا ان باتوں سے نہ تو خوفزدہ ہوتے تھے اور نہ ہی حکومتی دباؤ میں آتے تھے۔ 1922ء میں جب کولنز کا انتقال ہوا تو شاعر نے کھلے بندوں اس کے مرنے پر تعزیت کی اور تعزیت کے پیغامات کولنز کی بہن اور ان کے عزیزوں کو روانہ کیے۔ آئرش سول وار کے بعد جب آئرلینڈ میں برطانیہ مخالف کیتھولک عیسائیوں کی ریاست وجود میں آئی تو برنارڈ شا کی خواہش تھی کہ وہ اپنے وطن میں جا کر رہیں لیکن لندن اور برطانیہ میں ان کی مصروفیات، شہرت اور کامیابی نے اس بات کی اجازت نہیں دی اور انہیں مستقلاً برطانیہ ہی میں رہنا پڑا۔

جارج برنارڈ شا کی شہرت پروان چڑھتی رہی اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے دوران شا انگریزی ادب کا ایک ممتاز ترین نام بن چکا تھا اور دنیا بھر میں جہاں جہاں انگریزی بولی اور سمجھی جاتی تھی برنارڈ شا کا نام جگمگاتا تھا۔

عمر کے آخری حصے میں برنارڈ شا انگریزی زبان میں موجود گنجلک ہجے کو بدلنا چاہتے تھے اور انگریزی زبان کے ہجے کو بہتر بنانے کے لیے ایک نئے حروف ہائے تہجی ایجاد کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسی سلسلے میں باقاعدہ ایک پروجیکٹ بھی شروع کیا تھا جس کو Shavlan Alphabet کا نام دیا گیا تھا لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی پروجیکٹ پر کام شروع نہ ہو سکا اور ان کا 1950ء میں انتقال ہو گیا۔

برنارڈ شا کو ان کی زندگی میں ہی مرتبہ، مقام، دولت، عزت اور حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور وہ انگریزی زبان وادب کے واحد ادیب ہیں جنہیں ادب کا نوبل پرائز اور فلم کا اکیڈمی ایوارڈ ملا تھا۔ ادب کا نوبل انعام انہیں 1925ء میں جبکہ اکیڈمی ایوارڈ 1938ء میں ان کی فلم Pygmalion کا بہترین اسکرین پلے لکھنے پر دیا گیا۔

1906ء سے اپنی موت 1950ء تک برنارڈ شا ایک چھوٹے سے گاؤں Ayot. St. Lawrance میں مقیم رہے جو برٹ فورڈ شائر کے علاقے میں تھا آج کل اسے قومی یادگار کے طور پر سموج گیا ہے اور یہ گھر سیاحوں اور عوام کے لیے سال بھر کھلا رکھا جاتا ہے۔ شا کے اعزاز میں برطانیہ کے لندن شہر میں ایوسٹن روڈ پر شا تھیٹر تعمیر کیا گیا جس کی تکمیل 1971ء میں ہوئی۔

جارج برنارڈ شا ساری زندگی سوشلزم کا پرچار کرتا رہا۔ معاشرے میں دولت کی مساوی تقسیم کا وہ قائل تھا مگر اس کی اپنی زندگی تضادات کا شکار رہی۔ سوشلزم کے داعی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فسطائیت اور آمریت کی تعریفیں بھی کرتے رہے۔ جب دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر نے لاکھوں یہودیوں کو بھٹیوں کا ایندھن بنایا تو شا نے ہٹلر کے اقدامات کا دفاع کرنے کی کوشش کی اور ایک جگہ لکھا کہ زیادہ تر لوگ جلائے جانے سے نہیں بلکہ دم گھٹنے کے باعث ہلاک ہوئے۔ یہ بات انہوں نے اپنے ڈرامے جینوا کے پیش رس میں تحریر کی۔ اسی طرح روسی آمر اسٹالن کی بھی اس نے حمایت کی اور ایک جگہ لکھا کہ اسٹالن نے جس قدر تیز رفتاری کے ساتھ مسائل کو حل کیا اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ پارلیمنٹ بھی مسائل حل نہیں کرسکتی۔ شا جیسے سوشلسٹ اور غریب نواز ادیب کی یہ سوچ سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔

اسی طرح برنارڈ شا کا خاندان اور شادی شدہ زندگی کے بارے میں غیر یقینی اور ناقابل سمجھ رویہ ثابت ہوتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ تعلقات بڑھنے اور جنسی روابط رکھنے کے بارے میں اس نے کبھی احتیاط نہیں کی اور مختلف اداکاراؤں، سماجی مرتبے رکھنے والی عورتوں اور اپنے سے بہت کم عمر کی لڑکیوں کے ساتھ اس کے بے شمار تعلقات رہے اور اس نے ان تعلقات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی لیکن شادی شدہ زندگی اور بچے اس کے نزدیک پاؤں کی زنجیریں تھیں اور 1898ء میں اس نے جو شادی کی وہ بھی سماج میں اپنا بھرم رکھنے کے لیے کی تھی اور اپنی بیوی ٹاؤن سینڈ کے ساتھ ان کی انڈراسٹینڈنگ تھی کہ وہ بچے پیدا نہیں کریں اور ایسا ہی ہوا اور ان کے کبھی اولاد نہیں ہوئی۔

لیکن شا کے معاشقوں نے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کی۔ اس رویے کی وجہ شاید شا کا اپنا بیک گراؤنڈ تھا۔ اس کا باپ شرابی تھا اور وہ اپنے بچوں اور بیوی کو بری طرح مارتا تھا۔ لہٰذا چھوٹی عمر میں ہی شا اور اس کی بہنوں کو لے کر شا کی والدہ آئرلینڈ چھوڑ کر لندن آگئی تھی۔ باپ آئرلینڈ میں اکیلا رہ گیا تھا اور جب شا کے والد کا آئرلینڈ میں انتقال ہوا تو شا کے خاندان سے کوئی بھی ان کی تدفین میں شریک ہونے کے لیے نہیں گیا۔

جارج برنارڈ شا کے معاشقے جن عورتوں کے ساتھ رہے ان میں جینی پیٹرسن، مے مارس، ایڈتھ نیبت، ایلیس اور سز پیٹرک کیمبل کا نام شامل ہے ان عورتوں میں سے دو عورتوں کے ساتھ ان کے خطوط شائع بھی ہوئے ہیں جارج برنارڈ شا کے تقریباً 27 ڈرامے منظر عام پر آئے جن میں سیزر اور قلوپطرہ، مین اینڈ سپرمین، ہارٹ بریک ہاؤس، سینٹ جون، دی ایپل کارٹ، دی ڈیولز ڈی سائپل، آرمز اینڈ دی مین، یونیورکین ٹیل اور میجر باربرا جیسے ڈرامے شامل ہیں۔ ڈراموں کے علاوہ ان کے چند ناول اور مضامین کے مجموعے بھی اشاعت پذیر ہوئے۔

جارج برنارڈ شا انگریزی ڈرامے کے میدان میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی ڈرامائی تحریریں اب انگریزی ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ، واقعات، مکالمے اور واقعاتی اتار چڑھاؤ نا صرف اپنے عہد میں بلکہ آج ذہین شخصیت کے طور پر پہچانے گئے اور انہوں نے مختلف مواقع پر جو باتیں کی ہیں وہ اقوال زریں میں شامل ہوتی ہیں، آیئے آخر میں ان کے چند اقوال اور باتیں پڑھتے ہیں۔

☆ مشاہداتی قوت ان کے نزدیک جنون ہے جن کو یہ صلاحیت نصیب نہیں ہوتی۔

☆ جب تک قید خانے موجود ہیں تب تک یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان قید خانوں میں کون قید ہوگا۔

☆ سمجھ دار لوگ اپنے آپ کو دنیا کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور بے سمجھ لوگ دنیا کو اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا تمام تر ترقی کا دارومدار بے سمجھ لوگوں پر ہے۔

☆ دولت کا نہ ہونا تمام تر خرابیوں کی جڑ ہے۔

☆ میرے نزدیک پیغمبر محمدؐ کا مذہب اسلام تمام مذاہب سے بالاتر ہے کیونکہ اسلام میں تمام انسانوں کے لیے بے پناہ وسعت موجود ہے۔

ڈراما

ابو الفرح ہمایوں

مغالطہ کیسی کیسی کہانیاں جنم دیتا ہے، کیسے کیسے واقعات سامنے آتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی ایک مغالطے کا پیدا کردہ ہے۔

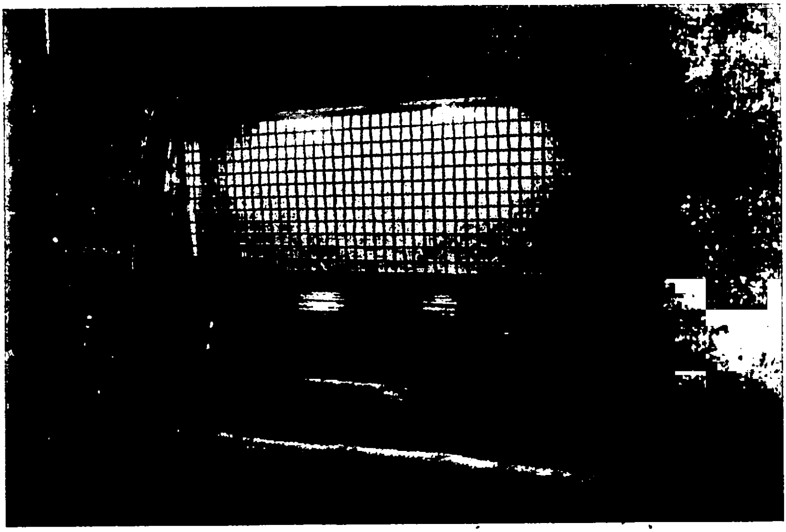
ایک ریڈیائی ڈرامے کا دلچسپ شاخسانہ

مسز ایملی ضعیف لیکن باہمت خاتون تھیں۔ شوہر پہلی جنگِ عظیم میں ہلاک ہوگئے تھے اور بڑا بیٹا دوسری جنگ عظیم میں، اب وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ شتم پشتم زندگی کے دن گزار رہی تھیں۔ بیٹے کا نام جارج تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد اس نے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت کرلی اور اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگا۔

اچانک ایک صبح لندن کے ایک وکیل کی جانب سے مسز ایملی کو ایک خط موصل ہوا۔ خط کا مضمون اس طرح تھا۔

قابلِ احترام مسز ایملی!

آپ کی بڑی بہن مارتھا ایک ہفتہ قبل انگلینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے میں انتقال کر گئی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی



مرزا غالب سے ملاقات

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن و اخلاق سے ملے۔ لبِ فرش تک آ کر لے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے۔ علی الخصوص یہ شعر

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ زینت المساجد میں ہم سے ملنے ہر تیسرے دن کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے میں اس قابل نہیں ہوں۔ مے خوار، روسیہ، گناہ گار۔ مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ ہم دوستی کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ تشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسرِ نفسی اور فروتنی تھی۔

☆☆☆

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مصنف فسانہ عجائب لکھنو سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو انہوں نے پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانہ عجائب کی

ہوگا کہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ اپنی وصیت میں انہوں نے اپنا تمام ترکہ آپ کے نام کر دیا ہے۔ دو لاکھ میں ان کی حویلی فروخت ہوئی ہے۔ تین لاکھ پاؤنڈ نقد انہوں نے چھوڑے ہیں۔ یہ تمام رقم یعنی کہ پانچ لاکھ پاؤنڈ آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا باغ ابھی موجود ہے۔ جلد ہی یہ بھی فروخت ہو جائے گا اور یہ رقم آپ کو مل جائے گی۔ میری فیس کا خیال رکھیے گا۔ آپ کا مخلص رابرٹ سٹکلف (وکیل)

شام کو جب جارج کام سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کا چہرہ گلنار ہو رہا ہے اور خوشی و مسرت چہرے سے پھوٹ رہی ہے۔ جارج کو دیکھتے ہی انہوں نے اسے گلے سے لگایا اور سرمستی کے عالم میں کہنے لگیں۔ ”جارج! قدرت کی نوازش ہم پر برس گئی ہے۔ اب ہم بہت امیر ہو گئے ہیں۔ لو! یہ خط دیکھو!“

چند دنوں بعد مسز ایملی نے کرائے کی کوٹھری سے جان چھڑائی اور ایک بنگلا خرید لیا۔ جارج کے لیے ایک الگ فلیٹ خریدا گیا جو اس کی جائے ملازمت کے قریب تھا۔ اب وہ اپنے پیارے بیٹے کو دنیا کی ہر خوشی فراہم کر سکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے دل کھول کر خرچ کیا اور بنگلے اور فلیٹ کو طرح، طرح کی اشیاء سے بھر دیا۔ دونوں مقامات پر ٹیلی فون بھی لگ گیا تا کہ وقت بے وقت ایک دوسرے سے باتیں کر کے اپنا دل بہلا سکیں۔ مگر جلد ہی ان کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ بے جا اسراف کسی دن ان کے لیے وبالِ جاں بھی بن سکتا ہے لہٰذا اب بقیہ رقم کو ذرا احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔

چند ماہ گزر گئے، ایک شام وکیل کا فون آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”آپ کی آن جہانی بہن کا باغ بھی فروخت ہو گیا ہے۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار پاؤنڈ میں۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈ اپنی فیس رکھ کر بقیہ ایک لاکھ میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا ہے، وصول ہونے کے بعد اطلاع دیجیے گا۔“

یہ اضافی رقم ملنے کے بعد مسز ایملی نے فیصلہ کیا کہ وہ جارج کو ایک نئی کار خرید کر دے گی۔ انہوں نے فوراً فون اٹھایا۔ ”جارج! تم فوراً مارکیٹ چلے جاؤ اور اپنے لیے ایک اچھی سی نئی کار منتخب کر لو۔ میرے پاس کچھ اور رقم آ گئی ہے لہٰذا تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نئی کار؟“ جارج نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ ”لیکن مجھے نئی کار کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔ اسے سنبھال کر رکھیں۔

کیسی ہے؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ لاحول ولاقوۃ۔ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا، بہت افسوس کیا اور کہا ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا۔ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو گئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑ دیا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے۔ ”جناب مولوی صاحب! رات میں نے فسانہ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آیندہ ہوگی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔“ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی ان کی بہت تعریف کی۔

☆☆☆

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ آپ کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے؟

سید غوث علی شاہ قلندر کی آپ بیتی سے اقتباس

جب میں شادی کروں گا تب اس رقم کی ضرورت پڑے گی۔“ جارج نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں میرے بچے۔“ ان کی آواز شدت جذبات سے رندھ گئی۔ ”میری ساری دولت تم پر قربان۔“ اور ٹھیک اسی لمحے انہیں جارج کے دروازے پر سے دستک کی آواز آئی۔

”ایک منٹ ممی!“ جارج نے کہا۔ ”دروازے پر کوئی ہے۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔“ اس نے ماں کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اور ریسیور میز پر رکھ کر غائب ہو گیا۔

مسز ایملی اس کے انتظار میں کسمساتی رہیں۔ چند لمحوں بعد دو آدمیوں کی آپس میں باتوں کی ہلکی ہلکی آواز آئی اور پھر دونوں کے لہجے میں تیزی اور ترشی آتی چلی گئی۔ باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں، کچھ ہی دیر بعد ایسا لگا جیسے اٹھا پٹک اور توڑ پھوڑ ہو رہی ہے۔ پھر کسی کے درد سے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ تشویش اور بے چینی کے عالم میں اپنی انگلیاں مروڑنے لگیں۔ ”جارج!“ انہوں نے روہانسے لہجے میں بیٹے کو پکارا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ مگر جواب میں ایک بے ہنگم شور کے سوا کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ اور پھر اچانک ایک زبردست چیخ سنائی دی۔ ”شاید کوئی میرے بیٹے کو قتل کر رہا ہے۔“ ابھی وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ”آہ میرے بیٹے! یہ کیا ہو گیا۔“ وہ نیم پاگل سی ہو گئیں۔ ”کیا جارج اب اس دنیا میں نہیں رہا؟“ فوراً ہی جذبہ انتقام ان کے دل میں ابھر آیا۔ ”میں قاتل کو اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گی۔“ انہوں نے فوراً پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔

”ہم پوری کوشش کریں گے کہ قاتل فرار نہ ہونے پائے۔ ہماری ایک ٹیم آپ کے بیٹے کے فلیٹ کے پاس ہی گشت کر رہی ہے۔ میں ابھی انسپکٹر ہنری کو کال کرتا ہوں۔ وہ حالات کا جائزہ لے کر جو بھی ممکنہ مدد ہوگی وہ آپ کو فراہم کریں گے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں......“

پانچ منٹ بعد انسپکٹر ہنری اور حوالدار تیزی سے جارج کے فلیٹ کی جانب لپکے۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ ہنری نے دروازے پر ایک ٹھوکر ماری۔ ”ہم پولیس والے ہیں۔ فوراً دروازہ کھول دو۔“

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ ایک معصوم صورت نوجوان ہکا بکا سا پولیس والوں کو دیکھ رہا تھا۔ ”آپ لوگ

رخمارنوف، امام علی

تاجکستان کے سیاسی رہنما اور پہلے صدر۔ 20 فیصد ووٹ حاصل کرکے تاجکستان کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ 6 نومبر 1999ء کو پھر صدارتی انتخاب کا انعقاد عمل میں آیا تو وہ 92 فیصد ووٹ لے کر تیسری مرتبہ سات سال کے لیے صدر بن گئے۔ ان کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ملک میں چار سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ کردیا اور اس ضمن میں مسلمان گوریلا لیڈر رسید عبداللہ نوری کے ساتھ 1997ء میں ماسکو میں معاہدہ طے کیا۔ انہوں نے 1999ء میں ریفرنڈم منعقد کرکے اسلام پسند سیاسی جماعتوں کو قانونی طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ پاکستان نے تاجکستان کا 13 ملین ڈالر کا قرضہ بھی ری شیڈول کرنے کا اعلان کیا۔

مرسلہ: شاہد علی ترمذی، ملتان

یہاں کیوں آئے ہیں؟ کیا مسئلہ ہے؟'' نوجوان نے سراسیمہ انداز میں پوچھا۔

لیکن پولیس والے کوئی جواب دیے بغیر نوجوان کو اپنی گرفت میں لے کر اندر گھس گئے۔ ان کا خیال تھا کہ قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے لیکن اندر جا کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہر چیز انتہائی سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود تھی اور لڑائی جھگڑے کے کوئی آثار نہ تھے۔ بس ایک ریڈیو چل رہا تھا جس میں سے زوردار انداز میں ڈائیلاگ بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انسپکٹر ہنری کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔ ''ریڈیو بند کرو۔'' وہ زور سے دہاڑا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میں جارج ایملی ہوں۔'' نوجوان نے شائستہ لہجے میں جواب دیا اور آگے بڑھ کر ریڈیو بند کردیا۔ ''کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ لوگوں کی آمد کا مقصد کیا ہے اور میرے ساتھ اس قدر بدسلوکی کیوں کررہے ہیں؟''

''تم نے لاش کہاں چھپائی ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں کوئی قتل ہوا ہے۔ سیدھی طرح بتادو لاش کہاں ہے؟'' انسپکٹر ہنری سخت طیش میں تھا اور مجرم کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''لاش؟ کیسی لاش؟'' جارج کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ''یہاں کوئی قتل وغیرہ نہیں ہوا ہے۔ آپ خوا مخواہ الزام تراشی نہ کریں۔ ورنہ میں بھی اپنے حقوق استعمال کرسکتا ہوں۔'' جارج نے بھی مشتعل انداز میں کہا۔

انسپکٹر ہنری کا لہجہ فوراً نرم پڑ گیا۔ ''بات یہ ہے کہ تمہاری والدہ نے پولیس اسٹیشن فون کرکے اطلاع دی ہے کہ اس فلیٹ میں زبردست مار پیٹ اور ہنگامہ ہورہا ہے۔ انہوں نے فائر کی آواز بھی سنی اور خدشہ ظاہر کیا کہ کسی نے ان کے بیٹے کو قتل کردیا ہے۔ ہم اسی اطلاع پر تفتیش کرنے یہاں آئے ہیں۔''

جارج کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔ ہنری نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ ''سب کچھ صاف صاف بتاؤ!''

جارج سنجیدہ ہوگیا۔ ''جس وقت میری ماں نے مجھے فون کیا، اس وقت ریڈیو پر ایک ڈراما نشر ہورہا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ماں سے فون ہولڈ کرنے کو کہا اور دروازے پر چلا گیا۔ باہر ایک دوست کھڑا تھا۔ میں اسے لے کر اندر آگیا اور باتوں میں اس قدر غرق ہوگیا کہ کسی اور بات کا دھیان ہی نہ رہا۔ ریڈیو پر ڈراما بدستور چل رہا تھا۔ ماں اس ڈرامے کو حقیقت سمجھ بیٹھی اور آپ لوگوں کو پریشان کردیا۔''

انسپکٹر ہنری اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''وہ کون سا ڈراما تھا؟''

''انتہائی دلچسپ۔ حیرت و تجسس سے بھرپور ڈراما تھا۔ اس کا عنوان ہے ''فلیٹ نمبر سات میں قتل'' اب آپ اپنے ہیڈ آفس کو فون کردیں کہ یہاں سب ٹھیک ہے اور میری ماں کو بھی تسلی دے دیں۔''

''تم ہمارے ساتھ چلو اور اپنی ماں کو خود ہی اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے دو۔'' ہنری نے مشورہ دیا۔

''آپ کی بات درست ہے۔ آیئے! چلتے ہیں۔''

جارج نے اپنا ہیٹ تھاما اور چلنے کو تیار ہوگیا۔

''ٹھہرو! پہلے میں ہیڈ آفس اطلاع کردوں۔ تمہارا فون کہاں ہے؟'' انسپکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور فون کی طرف ... بڑھ گیا۔

++

توہم پرستی

فرزانہ نگہت

یہ دنیا ایک گورکھ دھندا ہے۔ ایسی ایسی عجیب باتیں عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں کہ انسان حیران رہ جائے اور یہی حیرانی اسے توہم پرستی کی جانب دھکیلتی ہے۔ یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا اور زندگی گزارنے کے لیے ہدایت نامہ بھی دے دیا۔ قرآن میں کہیں بھی حیات بعد الموت کا تصور نہیں ہے۔

علم وعرفان کے شائقین کی مدارات



”جب میں آپ کی عمر کا تھا تو آپ کے ڈائپر تبدیل کیا کرتا تھا۔“ سیاہ بالوں والے لڑکے نے اپنے باپ سے کہا۔

رون نے مسکراتے ہوئے اپنے اس بیٹے کو دیکھا جو ابھی دوسال کا بھی نہ ہوا تھا۔ اسے اس کی بات عجیب ہی لگی تھی شاید اس سے سننے میں غلطی ہوئی تھی لیکن کمسن سام جب اگلے کئی ماہ تک یہی کہتا رہا تو اس نے اور اس کی بیوی نے ایک عجیب سی کہانی کے ٹکڑے جوڑے، سام کو یقین تھا کہ وہ اس کا آنجہانی دادا تھا۔ رون کا باپ جو اپنے خاندان میں واپس آگیا تھا۔ اس

کے اس دعوے نے رون اور کیتھی کو متحیر کرنے سے زیادہ چونکا دیا۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''تم کیونکر واپس آئے ہو؟''

''میں ہوا کا جھونکا بن گیا اور محراب سے باہر نکل گیا۔'' سام نے جواب دیا۔

وہ ہر چند کہ کمسنی میں بھرپور ذہانت کا مالک بن چکا تھا اور اٹھارہ ماہ کی عمر ہی سے مکمل جملے بولنے پر قادر ہو چکا تھا۔ اس کے والدین اس کی زبان سے لفظ ''محراب'' سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے اسے مزید کچھ کہنے پر اکسایا جس پر اس نے انہیں بتایا کہ اس کی ایک بہن تھی جو مچھلی بن گئی تھی۔ ''اسے کس نے مچھلی بنایا؟''

''کچھ برے لوگوں نے......وہ مرگئی۔''

یہ واقعی عجیب ہی بات تھی۔ سام کے دادا کی واقعی ایک بہن تھی جو ساٹھ سال قبل قتل ہوگئی تھی اس کی لاش سان فرانسسکو خلیج میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔ رون اور کیتھی نے پھر سام سے نرمی سے دریافت کیا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ تم کیسے مرے تھے؟''

سام ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا اور اپنے سر پر اس طرح ہاتھ مارا جیسے اسے سر میں شدید تکلیف ہو رہی ہو۔ اس کے دادا کا اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے دماغی شریان پھٹنے سے انتقال ہوا تھا۔

آج امریکا میں سات کروڑ افراد جو مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں حیات بعدالموت پر یقین رکھتے ہیں۔ جسے ہندو آواگون کہتے ہیں۔ مذہب اور معاشرتی زندگی پر کیے گئے سروے کی رپورٹوں کے مطابق دس میں سے ایک فرد اپنی ماضی کی زندگی کا کچھ علم ضرور رکھتا ہے۔ گذشتہ برس اکتوبر میں ''ڈاکٹر روز شو'' میں حیات بعدالموت کی حقیقت کے بارے میں ایک تحقیقاتی مضمون شائع ہوا تھا اور بھی کئی دستاویزات شائع ہوئی تھیں۔ ٹیلی وژن پر ''میرے بچے کے اندر بھوت'' نامی دستاویزی فلم سیریز بھی دکھائی گئی تھی۔ یہ تمام ایسے بچوں کے بارے میں تھی جنہیں ماضی کی زندگی یاد تھی۔ جس میں لوگ عمل تنویم کے زیر اثر اپنی ماضی کی زندگی کو کھوجتے تھے۔

''حیات بعدالموت'' کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لی جارہی ہے؟ اس کا جواب برکلے یونیورسٹی کے پروفیسر اور ''حیات بعدالموت کی حقیقت'' کے مصنف اسٹیفورڈ بیٹی کا کہنا ہے کہ ''ہم اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اپنی آیندہ زندگی کے لیے ایک بہتر لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں اس لیے حیات بعدالموت کے ساتھ ہمیشہ ایک دوسرا موقع موجود ہوتا ہے۔''

لیکن چند سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ سوائے شعبدہ بازی اور فریب کاری کے اور کچھ نہیں۔ حیات بعدالموت یا آواگون ایک غیر معمولی نفسیاتی شے ہے۔ یونیورسٹی آف لندن کے نفسیات کے پروفیسر کرسٹوفر فرنچ کا کہنا ہے جو غیر معمولی اور غیر مناسب تجربات کے یونٹ کے سربراہ ہیں۔ ''میرے خیال میں ماضی کی ایسی یادیں درحقیقت ماضی کی زندگی میں پیش آنے والے صحیح اور سچے واقعات کی بھونڈی یادیں ہوتی ہیں۔''

تقریباً پینتالیس سالوں سے یونیورسٹی آف ورجینیا میں معلوم نفسیات و اذہان کے ماہرین کی ٹیم ان لوگوں کی کہانیاں اکٹھی کرتی آرہی ہے جنہیں اپنی گزشتہ زندگیاں یاد ہیں۔ اگر ماہرین نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ان گزشتہ زندگیوں کی یادوں کی واقعی کوئی اہمیت ہے تو اس سے یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ آیا ہماری زندگی موت کے بعد واقعی ختم ہو جاتی ہے؟

ورجینیا یونیورسٹی کی طرف سے کیے جانے والے تحقیقاتی سروے کے دوران ایک لڑکے ریان کا کیس سامنے آیا۔ ایک رات دو بجے کے قریب وہ لڑکا چیختا ہوا نیند سے بیدار ہو گیا تھا۔ اس کے اگلے کئی ماہ تک وہ اپنی ماں سنڈی سے التجائیں کرتا رہا تھا کہ وہ اسے اس گھر لے جائے جہاں وہ پہلے رہا کرتا تھا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے اس سے التجائیں کیا کرتا تھا کہ وہ اسے ہالی ووڈ کی جگمگاتی زندگی میں واپس لے چلے۔ اس بڑے سے گھر میں جہاں سوئمنگ پول تھا۔ تیز رفتار کاریں تھیں۔ جو بے حد شاندار تھا۔ اس نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ ''میں ان حالات میں نہیں رہ سکتا۔ میرا آخری گھر بہت بہتر تھا۔''

ایک رات جب سنڈی اپنے بیٹے کے کمرے میں گئی تو اسے مسلسل اس کی گردان کرتے پایا۔ ''امی مجھے گھر یاد آرہا ہے۔'' اس کے بہلاوے دینے اور سلانے تک وہ مسلسل یہی گردانی کرتا رہا۔

''وہ ایک چھوٹے سے بوڑھے آدمی کی طرح تھا جو اپنی زندگی کی تفصیلات یاد نہیں کرسکتا۔ وہ بے حد مایوس اور اداس دکھائی دے رہا تھا۔'' سنڈی نے بتایا تھا۔

اگلی صبح وہ لائبریری گئی وہاں سے اس نے پرانے ہالی ووڈ کی بہت سی کتابیں مستعار لیں اور انہیں گھر لے آئی۔ ریان کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے وہ جلدوں پر جلدیں دیکھتی چلی گئی۔ اسے اُمید تھی کہ ان میں دکھائی دینے والی تصاویر اسے اطمینان بخشیں گی لیکن وہ انہیں دیکھتے ہوئے اور بھی بے چین و مضطرب ہوتا گیا۔ پھر جب 1932ء میں دکھائی جانے والی ایک فلم ''نائٹ آفٹر نائٹ'' کا ایک سین سامنے آیا تو اس نے

اسے روک دیا اور ایک اداکار پر انگلی رکھتے ہوئے چلّایا۔ ''امی! یہ میں ہوں!'' سنڈی نے اعتراف کیا تھا کہ اسے اس پر شدید دھچکا لگا تھا۔ ''میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ میں اس شخص کو کبھی تلاش کر پاؤں گی جس کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ یہ وہ ہے۔'' لیکن اس نے اس وقت اپنے آپ کو کچھ پُرسکون سا بھی محسوس کیا تھا۔ ''ریان اپنی پہلی زندگی کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا اور بے حد ناخوش رہتا تھا۔ اب ہمیں کچھ راہنمائی مل گئی تھی۔''

ہر چند کہ نہ تو سنڈی نہ ہی اس کا شوہر حیات بعد الموت یا آواگون پر یقین رکھتے تھے۔ اگلے دن وہ پھر لائبریری میں گئی اور ایک ایسی کتاب مستعار لے آئی جس میں ان بچوں کے حالات درج تھے جو اپنی گزشتہ زندگیوں کو یاد کرتے رہتے تھے۔ اس کتاب کے آخر میں مصنف جیمز ٹکر کی طرف سے ایک نوٹ دیا گیا تھا کہ وہ ایسی کہانیاں سنانے والے بچوں کے والدین سے ملنا چاہیں گے۔ سنڈی فوراً ہی انہیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر جیمز ٹکر بحیثیت چائلڈ سائکاٹرسٹ پرائیویٹ پریکٹس کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے ڈاکٹر وئن سٹیونسن، ورجینیا یونیورسٹی کے پرسیچوئل اسٹڈیز ڈویژن کے بانی اور ڈائریکٹر کے حیات بعد الموت یا آواگون پر ریسرچ کے بارے میں سنا تو انہیں بھی اس میدان میں تحقیق و جستجو کی تحریک ہوئی۔ چنانچہ چھ سال بعد جب اسٹیونسن ریٹائرڈ ہوئے تو انہوں نے اس شعبہ میں کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے شعبہ کی گزشتہ زندگی پر کی جانے والی تحقیق و جستجو کے کام کی نگرانی اور سربراہی سنبھال لی۔ ورجینیا یونیورسٹی کی ٹیم نے دنیا بھر کے ڈھائی ہزار کے لگ بھگ ان بچوں کی دستاویزات جمع کر رکھی تھیں جنہیں اپنی گزشتہ زندگیوں کی تفصیلات یاد تھیں۔ ان میں وہ بچہ بھی شامل تھا جسے گولف کے بارے میں تمام معلومات حاصل تھیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی میں مشہور لیجنڈری گولفر بابی جونز رہا تھا اور ایسا ہی ایک مڈوویسٹرن جو ایسی ہی یادیں رکھتا تھا اور اپنی گزشتہ زندگی والے جسمانی نقائص رکھتا تھا مثلاً ایک آنکھ سے اندھا، گردن پر سیاہ نشان، چال میں لنگڑاہٹ۔ بھارت کی ایک لڑکی تھی جس نے ایک دن نیند سے بیدار ہوتے ہی بڑی روانی سے ایسی بولی بولنی شروع کر دی تھی جس سے وہ ہمیشہ ناآشنا چلی آ رہی تھی (ٹکر نے ان کیسوں کا تذکرہ اپنی کتاب ''زندگی کی طرف مراجعت موت کے بعد'' میں کیا ہے)

ورجینیا یونیورسٹی کی تحقیقات کے مطابق ان بچوں نے اپنی گزشتہ زندگیوں کے بارے میں اس وقت بتانا شروع کیا تھا جب دو دو یا تین تین سال کی عمروں کو پہنچ جاتے تھے۔ چھ سات

مقناطیس

جزیرہ کریٹ کے کوہ ایڈا میں ایک چرواہا رہتا تھا۔ یہ چرواہا مختلف میدانی علاقوں میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن چرواہے نے ایک پہاڑی کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ ایک آنکڑا تھا جس کی مدد سے وہ اونچے درختوں سے اپنے مویشیوں کے لیے پتے توڑتا تھا، دن بھر بکریوں کو چرانے کے بعد وہ سورج کی گرمی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پہاڑ میں غار ڈھونڈنے نکلا۔ آخر کار اسے ایک کشادہ غار نظر آ گیا اور وہ اس غار میں داخل ہوا۔ اپنا سامان ایک طرف رکھ کر آرام کی خاطر ستانے لگا کہ اچانک ایک آواز کے ساتھ اس کا آنکڑا چھت کے ساتھ چپک گیا، وہ بہت گھبرایا۔ پھر اس نے آنکڑے کو چھت سے علیحدہ کر دیا اور نیچے رکھ دیا لیکن آنکڑا دوبارہ چھت سے جا چپکا۔ وہ آنکڑے کو چھت سے علیحدہ کرتا اور وہ چھت سے پھر چپک جاتا۔ وہ سمجھ گیا کہ غار کی چھت کے پتھروں میں ایسی خصوصیت ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ انہی پتھروں کو وہ مقناطیس کا نام دیا گیا گویا ''مقناطیس'' ایک چرواہے نے دریافت کیا۔

اقتباس: معلومات ایجادات

مرسلہ: عامر شہزاد، موضع دوسیرہ، ضلع جھنگ

آسکر فلم ایوارڈ

سال 1926ء مقام ہالی وڈ، امریکا

اکیڈمی آف موشن پکچرز اینڈ آرٹس کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ فلم کے مختلف شعبوں میں بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو ایوارڈ اور انعامات دینے کی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت اکیڈمی کی چیف ایگزیکٹو (CEO) آفیسر مارگریٹ ہیریکس کر رہی تھی۔ انعامات کا ٹرافی بکس جب کھول کر پہلی ٹرافی جو انسان نما ہے نکالی گئی تو اسے دیکھتے ہی مارگریٹ بولی ''او۔ یہ تو بالکل میرے چچا آسکر جیسا ہے۔'' سو اسی وقت ٹرافی کا نام آسکر رکھ دیا گیا۔ جبکہ چچا آسکر کا فلم کے کسی بھی شعبہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور نہ ہی پہلے ٹرافی کا کوئی نام تھا۔

مرسلہ: محمد اجمل خاں، کینٹن، مشی گن، امریکہ

سال کی عمر کو پہنچنے پر وہ کچھ کہنا چھوڑ دیتے تھے۔ ''یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ہم سب اپنے بچپن کی یادیں بھول جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر ٹکر کہتے ہیں۔ انہوں نے جب پہلی مرتبہ اس قسم کے واقعات کے بارے میں سنا تھا تو انہیں ان میں فریب دہی یعنی فراڈ کی بو آئی تھی۔ وہ دو سوال پوچھا کرتے تھے۔ ''کیا اس بچے کے ماں باپ قابلِ اعتبار ہیں؟ کیا بچہ ٹی وی، سنی ہوئی گفتگو یا دوسرے عام ذرائع سے حاصل شدہ یادیں اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتا ہے؟'' اگر انہیں فراڈ کا دھوکا ہوتا تو وہ اور ان کی ٹیم بچے اور اس کے خاندان سے ان کی گزشتہ زندگی کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے پھر وہ اس مردہ شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے جس کی زندگی یادوں سے ملتی جلتی تھی۔ تحقیق و جستجو کا یہ آخری حصہ نہایت اہم تھا کیونکہ اس کے بغیر بچے کی بیان کردہ کہانی محض خیال آرائی اور خود تخلیقیت ہی ثابت ہوتی۔

ان کیسیز میں ایک چوتھائی تحقیقاتی ٹیم نے حل کر لیے ہیں، یعنی ایک شخص جس کا ماضی بچے کی یادوں کے مطابق ہوگا، ضرور وجود رکھتا ہوگا۔ اس میں زخموں کے نشانات، تل اور دوسری چیزیں بھی ہوں گی۔ ایک بچے کا کہنا تھا کہ گزشتہ زندگی میں اسے گولی ماری گئی تھی۔ اس کے جسم میں پیدائشی طور پر وہ نشانات موجود تھے۔ ایک نشان ایک آنکھ کے اوپر تھا اور دوسرا سر کے پیچھے۔ گولی اس کے سر میں داخل ہوئی تھی اور آنکھ کے اوپر سے باہر نکل گئی تھی۔

ریان ہالی ووڈ کے ماضی میں اترنا چاہتا تھا۔ ایک لائبریرین نے فلم لائبریری کی بے شمار کتابیں دیکھنے کے بعد بالآخر ایک ایسا شخص تلاش کر لیا جسے اس نے پہچان لیا۔ ہالی ووڈ ایجنٹ میری مارٹائن، جس نے ''نائٹ آفٹر نائٹ'' کے ایک سین کی تصویر پتھر پر کھودی تھی۔ سنڈی نے ڈاکٹر ٹکر سے رابطہ کیا جنہوں نے ریان کا انٹرویو لیا۔ اس کے بعد انہوں نے مارٹائن کی دختر سے رابطہ کیا۔ اس نے ریان سنڈی اور ڈاکٹر ٹکر سے ملاقات کی اور پبلک ریکارڈ کے ساتھ اس نے پچاس کے لگ بھگ ان تفصیلات کی بھی تصدیق کی جو ریان نے اس کے باپ کی زندگی اس کے کام مقامات اور اس کے گھر کے بارے میں بیان کی تھیں۔ سنڈی کو یہ جان کر بے حد اطمینان ہوا کہ اس کے بیٹے کی کہانی مارٹائن کے بیان سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس نے کہا تھا ''میرا بیٹا پاگل نہیں تھا...... اس کا واقعی دوسرا خاندان تھا۔''

2002ء میں ڈاکٹر ٹکر کو ٹی وی پر پیش کیے جانے والے ''حیات بعد الموت'' کے موضوع پر منعقد کیے جانے والے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ وہاں انہیں لوزیانہ کے باشندے سے ایک چار سالہ لڑکے جیمز لنگز کے بارے میں بتایا گیا جس کا کہنا تھا کہ وہ دوسری جنگِ عظیم کے وقت پائلٹ تھا جسے آئیوجیما میں گولی مار دی گئی تھی۔

بروس اور اینڈریا لنگز کا خیال تھا کہ جیمز نے یہ یادیں اس وقت اپنے ذہن میں محفوظ کی تھیں جب وہ دو سال کا تھا اور اکثر راتوں کو بیدار ہو کر چیخنا چلّانا شروع کر دیتا تھا۔ ''جہاز کریش ہو گیا ہے! جہاز کو آگ لگ گئی ہے! چھوٹا آدمی باہر نہیں نکل پا رہا!'' اسے اس جہاز کی تفصیل بھی معلوم تھی۔ ایک مرتبہ اینڈریا نے ایک کھلونا جہاز کے نچلے حصے میں بنی ہوئی چیز کے بارے میں کہا کہ یہ ایک بم تھا جس پر جیمز نے تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ وہ بم نہیں بلکہ فیول ٹینک تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ اپنے والدین کے ساتھ ایک تاریخی چینل پر ایک دستاویزی فلم دیکھتے ہوئے اس نے ایک جاپانی جہاز کے ہر حصے کے بارے میں بالکل درست اور صحیح معلومات فراہم کیں۔

لڑکے نے کہا کہ گزشتہ زندگی میں بھی اس کا نام جیمز ہی تھا اور یہ کہ اس نے ''نانوما'' نامی بحری جہاز سے پرواز کی تھی۔ اس کے والدین نے جب اس بارے میں کھوج کی تو انہیں معلوم ہوا کہ واقعی دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں امریکا کا ایک جہاز بردار جہاز ''ناٹوما'' ہوا کرتا تھا۔ اس کے اسکواڈرن میں ایک پائلٹ جیمز ہسٹن تھا جو بحر الکاہل میں ایک مہم کے دوران مارا گیا تھا۔

جیمز نے بڑی روانی سے اپنے جہاز کی تباہی کی تفصیلات سنائیں پھر اس کے بعد اسے ایک ہفتے تک، ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ اس پر اس کی متوحش و سراسیمہ ماں نے حیات ماضی کے تھراپسٹ کیرول بومین سے مدد کے لیے رابطہ کیا۔ اس نے اینڈریا کو ہدایت کی کہ وہ جیمز کی کسی بات کی تردید نہ کرے اور اسے یقین دلائے کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس کی ماضی کی زندگی میں پیش آیا تھا۔ وہ اب ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اینڈریا نے اس ہدایت پر عمل کیا جس سے جیمز کے ڈراؤنے خوابوں کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ (اس کے والدین نے 2009ء میں باہم مل کر ''سول سروائیور'' نامی کتاب اپنے خاندان کی کہانی کے بارے میں لکھی)

ڈاکٹر ٹکر کے معاون پروفیسر فرینچ کا کہنا ہے۔ ''ان کی تحقیقات کا بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ تحقیقی کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب بچے کے والدین اور دوست اس کے موت کے بعد دوبارہ جنم لینے کو تسلیم کرتے ہیں۔'' جیمز کے بارے میں فرینچ کا کہنا ہے کہ ''ہر چند کہ اس کے والدین اس پر اصرار

کرتے ہیں کہ انہوں نے کبھی دوسری جنگِ عظیم کی دستاویزات نہیں دیکھیں نہ ماٹری ہسٹری کے بارے میں باتیں کی ہیں۔
ہمیں جان لینا چاہیے کہ اٹھارہ ماہ کی عمر میں جیمز کو ہوائی جہازوں کے ایک میوزیم میں لے جایا گیا تھا۔ جہاں دوسری جنگِ عظیم کے جہازوں نے اسے مسحور سا کردیا تھا۔ اس کے بعد کی تفصیلات اس کے والدین نے اس کے ذہن میں بٹھائیں اور اس کو نسلر نے بھی جو حیات بعدالموت پر پختہ یقین رکھتا تھا۔
ڈاکٹر ٹکر کا کہنا ہے کہ ان کے پاس جیمز کے بہت سے بیانات کے بارے میں تحریری ثبوت موجود ہیں۔ یہ اس کے پاس اس وقت سے بھی پہلے موجود تھے جب جیمز کا خاندان جیمز ہسٹن یا ناٹوما بے کے بارے آگاہ ہوا تھا۔ فرنچ کا کہنا تھا کہ بچوں کی باتیں اکثر ناقابل یقین اور ناقابل وضاحت ہوتی ہیں۔ مثلاً جیمز نے کچھ ایسا کہا ہوگا جو ناٹوما کی کہانی سے ملتا جلتا ہوگا۔
جیمز کا باپ بروس لینگر یہ ماننے سے یکسر انکاری ہے کہ اس نے اور اس کی بیوی نے مل کر یہ واقعات اپنے بیٹے کو ذہن نشین کرائے ہیں۔ ”آپ ایک دو سال کے بچے سے یہ توقع کرسکتے ہیں کہ وہ ایک اسکرپٹ یاد کرلے اور اسے فرفر سنادے؟“
ڈاکٹر ٹکر خود جانتے ہیں کہ بیشتر سائنس داں ہر چند کہ ان کے سامنے کتنی ہی شہادتیں کیوں نہ پیش کی جائیں حیات بعدالموت یا آواگون کو محض توہم و تخلیق کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کامیابی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ منکرین سے حیات بعدالموت یا آواگون کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کروالیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس پر غور و فکر کریں اور اس کی کھوج کریں اور صحیح نتیجے پر پہنچیں۔
”میں حیات بعدالموت یا آواگون کی ممکنات پر یقین رکھتا ہوں جو یہ کہنے سے مختلف ہے کہ میں اس پر یقین رکھتا ہوں۔“ ان کا کہنا ہے۔ ”میرا خیال ہے ان کیسوں کو وضاحت و تشریح کی ضرورت ہے لیکن اس کے لیے ہمارا حیات بعدالموت یا آواگون پر اعتقاد ضروری نہیں۔“
کیا ٹکر کو یہ یقین ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی ایسا بچہ ضرور پیدا ہوگا جو اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں کچھ بتا سکے گا؟ ”میں اس کی اُمید نہیں رکھتا لیکن مجھے اُمید ہے کہ موت کے بعد میرے اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی موت کے بعد دوبارہ زندگی کے مواقع ضرور ہوں گے۔“

++

کیرتھر نیشنل پارک

تفریح، تعلیم تحقیقی سرگرمیوں کے لیے یہ پارک بڑی موزوں جگہ پر قائم کیا گیا ہے، البتہ یہاں شکار پر سخت پابندی عائد ہے۔ یہ پارک سپر ہائی وے پر کراچی سے 81 کلومیٹر سفر کے بعد آگے جائیں تو آتا ہے۔ یہاں رات بھر کے قیام کا انتظام بھی موجود ہے۔ اس کا رقبہ 308733 ہیکٹرز ہے۔ یہاں پہاڑی بکریوں کی ایک نایاب اور معدوم ہوتی ہوئی نسل آئی بیکس کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ 1971ء میں اس پارک میں 12 سو آئی بیکس تھے اب ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہوچکی ہے۔ یہاں 36 اقسام کے دیگر جانور اڑیال، بھیڑیے، جنگلی بلیاں، خارپشت، ہرن، لومڑی، چرخ، اور بطخ وغیرہ بھی رکھے گئے ہیں۔ پرندوں کی اقسام کی تعداد 85 کے لگ بھگ ہے۔ کیرتھر نامی قریبی پہاڑی کی نسبت سے اس کا نام کیرتھر نیشنل پارک رکھا گیا۔ یہاں کی سیر کرنے اور جانور کو قدرتی ماحول میں دیکھنے کا بہترین موسم سرما کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: زاہد شیخ، لاہور

کیف بنارسی

تحریکِ پاکستان کے اہم کارکن اور شاعر، اصل نام یاور حسین۔ تعلیم بی اے، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رکن ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ تعلیم کے بعد ریڈیے میں بطور اکاؤنٹنٹ ملازمت اختیار کرلی لیکن 1946ء کے انتخابات میں سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے تحریک کے دنوں میں شعلہ آزادی کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ مسلم لیگ کا انتخابی نعرہ اور قومی ترانہ بن گئی۔ نوائے پاک صدائے قلب (1946ء) شعلہ آزادی (1968ء) بیت المقدس (عربی اردو) تصانیف ہیں۔

مرسلہ: نیاز حسن، کراچی



آٹھواں حصہ

روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہنپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

علی اور اسماعیل شاہد کے درمیان حیدر الماس کے بوسن روڈ والے باغ میں ملنا طے پایا۔ علی اور حیدر الماس، اسماعیل شاہد کا انتظار کر رہے تھے کہ حیدر الماس کو اطلاع ملی کہ عذرا فرار ہوگئی ہے۔ اسی دوران اسماعیل شاہد بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور اسے بھی اطلاع مل گئی تھی اس لیے وہ واپس چلا گیا۔ علی نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر علی ساہیوال چلا گیا۔ وہاں سرکس میں اس نے روشی سے ملاقات کی۔ وہاں علی پکڑا گیا تھا۔ ٹریز سلیم اس سے بات چیت کررہا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ ایک خیمے کو کسی نے آگ لگادی ہے۔ سلیم کے جاتے ہی روشی وہاں آگئی اور اس نے علی کو آزاد کردیا۔ علی ایک ہوٹل میں موجود تھا کہ کرامت کی اسے کال آئی۔ اس نے بتایا کہ اسماعیل شاہد لاہور میں موجود ہے چنانچہ علی لاہور پہنچ گیا۔ وہاں انارکلی میں اس نے شانزے کو دیکھا۔ شانزے اس کی بات نہیں سننا چاہتی تھی لیکن پھر وہ قائل ہوگئی۔ شام کو علی مٹرگشت کرنے کے بعد ہوٹل کی طرف آرہا تھا کہ اسے اداکارہ نیناں دکھائی دی جو فون پر اسماعیل شاہد سے بات کررہی تھی۔ علی گلبرگ میں واقع اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا کہ اچانک کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری جس سے وہ بے ہوش ہوگیا۔

اب آگے پڑھیں

میں نہیں جانتا تھا کہ میرے سر پر کوئی چیز مار کر مجھے بے ہوش کرنے والا کون تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو ایک کمرے کے فرش پر چٹائی پر پڑے ہوئے پایا۔

مجھے اپنا سر بے حد بھاری محسوس ہورہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے سر پر کوئی بھاری چیز رکھ دی گئی ہو۔ میں چند لمحے چٹائی پر پڑا چھت کو گھورتا رہا پھر بشکل تمام اٹھ کر بیٹھا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میں ایک تہ خانہ نما کمرے میں موجود تھا۔ دیوار پر لگا نائٹ بلب جل رہا تھا جس کی روشنی بہت کم تھی۔ اس بلب کے علاوہ کوئی دوسرا بلب نہیں تھا جسے میں آن کرسکتا۔ چند لمحوں کے بعد میری آنکھیں پھیلی ہوئی روشنی سے مانوس ہوگئیں تو میں غور سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اُس کمرے میں چٹائی کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر چیز موجود نہیں تھی۔ میرے دائیں طرف والی دیوار میں دو فٹ چوڑا دروازہ تھا جو یقیناً باتھ روم کا تھا جبکہ دائیں طرف والی دیوار کے کونے میں قدرے چوڑا دروازہ تھا جو کہ بند تھا۔ ایک دیوار پر بڑے بڑے فولادی کنڈے لگے ہوئے تھے۔ باتھ روم والے دروازے کے ساتھ ہی چھوٹی سی ایک الماری بھی بنی ہوئی تھی۔

کمرے کا جائزہ لینے کے ساتھ ہی ساری بات کسی فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے پر گھوم گئی تھی کہ میں اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد کی دوسری بیوی نیناں کی کوٹھی کے باہر موجود تھا کہ میرے سر پر اچانک دھماکا ہوا تھا جس سے میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگیا تھا اور اب مجھے اسی تہ خانہ نما کمرے میں ہوش آیا تھا۔

میں یہ سوچ کر بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا کہ اگر میں اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد کی تحویل میں ہوا تو وہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ وہ اپنی بیٹی کو اغوا کرنے کے بدلے مجھے جان سے ماردے گا۔

نجانے میں کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا تھا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چونکہ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہورہا تھا اسی لیے میں نے بے اختیار اپنے سر کے پچھلے حصے پر ہاتھ پھیرا تو درد کی ایک زوردار ٹیس میرے سر میں گھوم گئی اور مجھے اپنا سر جھنجھناتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں چھوٹا سا ایک گومڑ بھی بنا ہوا تھا میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا لیکن گومڑ سے خون نہیں نکلا تھا۔

چند لمحے چٹائی پر بیٹھا میں اپنے ''گومڑ'' کو سہلاتا رہا پھر میں نے ٹائم دیکھنے کے لیے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا سیل فون نکالنا چاہا تو چونک پڑا۔ جیب میں میرا سیل فون موجود نہیں تھا۔ میں نے پتلون کی دوسری جیبیں بھی کھنگال لیں کہ شاید میں نے غلطی سے فون کسی اور جیب میں رکھ دیا ہو لیکن دوسری جیبیں بھی خالی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ بے ہوش کرنے والے نے میری جیب سے سیل فون بھی نکال لیا تھا۔

میں اٹھ کر دروازے کے پاس آگیا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ یہ میرے لیے تشویش ناک بات تھی۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کردیا۔ ساتھ ہی میں چیخ چیخ کر دروازہ کھولنے کے لیے بھی کہہ رہا تھا لیکن کئی لمحے گزر گئے کسی نے دروازہ نہ کھولا اور نہ ہی مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میری آواز کمرے میں ہی گونج کر رہ جاتی تھی جو بازگشت بن کر میرے کانوں سے ٹکرا کر

معدوم ہو جاتی۔

''کوئی ہے جو میری آواز سن رہا ہو۔'' میں نے منہ دروازے کے قریب کرتے ہوئے چیخ کر کہا لیکن دوسری طرف سے ہنوز خاموشی تھی۔

''تم دروازہ کھولتے ہو یا میں اسے توڑ دوں۔'' میں نے گویا وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ میری وارننگ پر کوئی تو آکر دروازہ کھول دے گا لیکن مجال ہے جو کسی کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔ اگر دوسری طرف کوئی موجود تھا تو وہ میری بات بہ جان بوجھ کر کان نہیں دھر رہا تھا۔ دو باتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ یا تو مجھے اس کمرے میں قید کرنے والا بہرہ ہو گیا تھا یا پھر وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے اسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے تو محض دھمکی دی تھی لیکن اس دھمکی کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر میں پیچھے ہٹا اور مڑ کر ایک بار پھر نائٹ بلب کی روشنی میں کمرے کا غائرانہ جائزہ لینے لگا۔ میں دراصل وہاں سے ''فرار'' کا کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ کمرے کی کوئی کھڑکی نہ تھی البتہ ایک روشن دان تھا جو کافی بلندی پر واقع تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ روشن دان ون بائے ون فٹ کا تھا اس لیے اس سے نکلنا میرے لیے ناممکن تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔

میں نے ایک بار پھر دروازے پر زور آزمائی کا سوچا اور دروازے کے پاس پہنچ کر اس پر زور آزمائی کرنے لگا۔ دروازہ توڑنے کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں تو میں دروازے پر زور آزمائی ترک کر کے چوکنا ہو گیا۔ قدموں کی آہٹوں سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دبے قدموں سیڑھیاں اتر رہا ہو۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیا۔ قدموں کی آہٹیں بدستور ابھر رہی تھیں... پھر وہ آہٹیں دروازے کے پاس آکر ختم ہو گئیں اور دروازے کی کنڈی کھولی جانے لگی۔ میں تیزی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا تاکہ جیسے ہی کوئی اندر داخل ہو تو میں اسے چھاپ لوں۔ میرا دل یکبارگی تیز تیز دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنا چاہتا ہو۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ سلوموشن میں کھلنے لگا' اور جیسے ہی کوئی اندر داخل ہوا میں نے غور سے دیکھا تو وہ ایک نوجوان تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور اس نے گلے میں مفلر ڈالا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ منحنی سا شخص تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ میرا ایک مکا بھی برداشت نہیں سکتا تھا۔ وہ نائٹ بلب کی روشنی میں گھور گھور کر کمرے میں سرچ لائٹ کی طرح نظریں دوڑا رہا تھا۔

پھر وہ تھوڑا سا آگے ہوا۔ اب وہ باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے اسے چھاپنے کا یہ بہترین موقع تھا لہٰذا میں نے بجلی کی سی تیزی سے دروازے کی اوٹ سے نکل کر اس پر حملہ بول دیا۔ وہ سنبھلا ہی تھا کہ میں نے اس کی قمیص کے کالر سے پکڑ کر اسے دیوار کی طرف اچھال دیا۔ وہ اڑتا ہوا دھماکے سے منہ کے بل دیوار سے ٹکرایا اور دھپ سے چٹائی پر آگرا۔ اس کے حلق سے کربناک سسکاری نکل گئی اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح پھڑک کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالتا میں اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کر کے اس کے جبڑے پر تین چار مکے رسید کر دیئے۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کا بالائی ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون نکل آیا تھا۔

میں اسے ایک اور مکا مارنے ہی لگا تھا کہ وہ تکلیف کی شدت سے ہذیانی انداز میں چیخ پڑا۔

''رر...... رر...... رک جاؤ...... مم...... مم...... مجھے کیوں مار رہے ہو۔''

میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں خوف مترشح تھا لیکن مجھے اس کے خوف زدہ ہونے کی بالکل بھی پروا نہیں تھی۔ میں نے اس کا گریبان پکڑا اور غصیلے لہجے میں کہا۔ ''خاموش رہو۔ اگر تمہارے حلق سے ذرا سی بھی آواز نکلی تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔''

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ بمشکل تھوک نگل سکا۔ وہ بدستور اسی حالت میں پڑا میری طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ منہ سے نکلنے والا خون اس کی ٹھوڑی سے ہوتا ہوا اس کی گردن کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کے حلق سے اب ہلکی ہلکی خرخراہٹیں نکل رہی تھیں۔ جیسے وہ دمے کا مریض ہو اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔

''مجھے بے ہوش کر کے کون یہاں لایا ہے؟'' میں درشتگی سے بولا۔

''ب...... بالا...... تمہیں بے ہوش کر کے یہاں لایا تھا۔'' وہ تھوک سے اپنا خشک حلق تر کرتے ہوئے جلدی جلدی بولنے لگا۔
''کیوں؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
''وہ سمجھا کہ تم چور ہو اور نیناں بی بی کے گھر چوری کرنے کی نیت سے آئے ہو۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بالا کون ہے؟''
''وہ ......وہ رجب کا ساتھی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہ رجب کون ہے؟'' میں نے اگلا سوال داغا۔
''وہ ملک صاحب کا خاص آدمی ہے۔'' اس نے جھٹ سے جواب دیا۔
''ملک صاحب؟'' میں چونکا۔ ''کون ملک۔ اس کا پورا نام بتاؤ؟''
میرے ذہن کے پردے پر یکلخت اسماعیل شاہد کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ جس طرح اس نے اپنا فرضی نام چودھری ساجد رکھا ہوا تھا ہوسکتا ہے اس نے دوسرا نام ''ملک'' بھی رکھا ہو لیکن اس کی تصدیق ضروری تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ''ملک صاحب'' کوئی اور ہو۔ اگر ''ملک'' کوئی ہوگا تو اس نے مجھے یہاں کیوں قید کیا ہوگا۔ یہ سارے سوالات میرے ذہن میں کسمسا رہے تھے اور ان کا جواب ''ملک صاحب'' کے آنے پر ہی مجھے معلوم ہوسکتا تھا۔
''مم...... مجھے...... مجھے تو پورا نام نہیں پتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب انہیں ملک صاحب ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاید...... رجب کو ملک صاحب کا پورا نام پتا ہو۔''
میں پُرغور نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا پھر میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ہمکاری بھری۔ ''ہم...... یہ بتاؤ...... رجب کہاں ہے؟''
اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''وہ باہر بیٹھا ہے۔ بالا اور مٹھو بھی اس کے ساتھ ہیں۔''
''کیا یہ نیناں کی کوٹھی ہے؟'' میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے پوچھا۔
''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔
''تو یہ کون سی جگہ ہے......؟''
''یہ...... یہ کوٹھی نہیں ہے۔ یہ فارم ہاؤس ہے۔'' اس نے بتایا تو میں بے اختیار چونک گیا۔
''فارم ہاؤس؟'' میں نے زیرِلب دہرایا۔
''ہاں۔ یہ ملک صاحب کا فارم ہاؤس ہے۔'' اس منحنی شخص نے جواب دیا۔ ''وہ اکثر نیناں بی بی کے ساتھ یہاں چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔''
''کیا ملک یہاں موجود ہے؟'' چند ثانیوں کے بعد میں نے پوچھا۔
''نہیں۔'' اس نے پتلی سی گردن نفی میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
''کہاں گیا ہے وہ؟'' میں مستفسر ہوا۔
''پپ...... پتا نہیں۔ رجب کو پتا ہوگا۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''تم یہاں کیا کرتے ہو؟'' میں ایک بار پھر مستفسر ہوا۔ میں اس سے ساری معلومات لینا چاہتا تھا۔
اس نے تھوک نگلی اور جواباً بولا۔ ''میں فارم ہاؤس کی رکھوالی کرتا ہوں۔''
''ہم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''
''رجب نے بھیجا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''کہ دیکھ آؤں تم ہوش میں آئے ہو یا نہیں۔''
پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کچھ پوچھتا اسی لمحے میرے حساس کانوں میں آہٹیں ابھریں۔ میں نے بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا۔ شاید تہہ خانے کی طرف کوئی آرہا تھا۔ میں نے منحنی شخص کی طرف دیکھا۔
''کون ہوسکتا ہے؟''
''پپ...... پپ...... پتا نہیں۔'' وہ ہکلا کر بولا۔
آہٹیں اب دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی تھیں۔ عین اسی لمحے ایک مرد اندر داخل ہوا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ تو واضح دکھائی نہیں دیا البتہ وہ قدرے جسیم اور تنومند شخص تھا۔ میرے نیچے دبے منحنی شخص نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے چیخ کر کہا۔ ''مٹھو۔ مجھے بچالو۔''
منحنی شخص کا یہ کہنا ہی تھا کہ نووارد مرد جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ اس دوران اس نے اپنی شلوار کے نیفے سے ریوالور نکال کر اس کا رخ میری طرف کردیا تھا۔
''چھوڑ دو اسے...... ورنہ......'' میرے قریب آتے ہی اس نے غرّاتے ہوئے اپنا فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تو میں منحنی شخص کو چھوڑ کر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اٹھو اسلم۔" مٹھو نے منحنی شخص کو اس کے نام سے پکارتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہو گیا لیکن وہ بدستور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ عین اسی لمحے میں بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آ گیا۔

میں نے ایک سائیڈ پر ہوتے ہوئے اسلم کو پکڑ کر مٹھو کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس اچانک افتاد پر مٹھو سنبھل نہ پایا تھا کہ اس نے اسلم کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ عین اسی لمحے میں نے مٹھو کے ریوالور والے ہاتھ پر اپنا پیر زور سے مار دیا۔ ضرب نشانے پر لگی تھی، ریوالور مٹھو کے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور جا گرا جو مدھم روشنی میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دونوں بھی لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ میں مٹھو کو کسی قسم کا موقع نہ دوں کہ وہ مجھ پر غالب آ سکے۔ میں جانتا تھا کہ اگر مٹھو نے مجھ پر قابو پا لیا تو پھر میرا یہاں سے فرار ہونا مشکل ہو جائے گا۔

اسلم کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مجھ سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اس لیے میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ مٹھو نے سنبھلتے ہی مدھم روشنی میں ریوالور کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانی شروع کر دیں کہ میں نے اچھل کر اس کے سینے پر زوردار کک ماردی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی سسکاری سی نکلی اور وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ سنبھلتے سنبھلتے وہ اپنے عقب میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ گرا نہیں تھا۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے میرے جبڑے پر مکا جڑ دیا۔

مجھے اِس وار کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے بھرپور انداز میں میرے جبڑے پر مکا مارا تھا جس کی وجہ سے میرے حلق سے بھی سسکاری نکل گئی۔ یہاں تک کہ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون بہنے لگا تھا، پھر میں سنبھلنے ہی لگا تھا کہ مٹھو نے مجھے زور سے دھکا دے دیا اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے پشت کے بل چٹائی پر اسلم کے قریب ہی گر گیا۔ میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ مٹھو نے جست لگائی اور ایک دھماکے سے میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کا وزن قدرے زیادہ تھا جس سے مجھے اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں اسے اپنے اوپر سے دھکیلنا ہی چاہتا تھا کہ اگلے ہی لمحے مٹھو نے میرے چہرے پر مکوں کی بارش کر دی۔ میں نے اس کے مکوں سے بچنے کے لیے اپنے دونوں بازو چہرے کے سامنے کر لیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے مکے اب میرے بازوؤں پر پڑ رہے تھے۔ مٹھو پر تو جیسے جنونیت اور وحشت طاری ہو گئی تھی۔ پھر اس نے میرے چہرے کو چھوڑ کر میرے سینے پر زور زور سے مکے مارنے شروع کر دیئے تھے۔

"الو کے پٹھے...... تو نے مٹھو کو ہلکا لیا ہے۔ اب دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔ میں تیرا حلیہ ایسا بگاڑ دوں گا کہ کوئی تجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔" وہ سانپ کی مانند پھنکارتے ہوئے بولا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس پر قابو نہ پایا تو وہ حقیقتاً میرا حلیہ بگاڑ دے گا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن میری کوشش رائیگاں گئی۔ وہ سانڈ کی طرح پلا ہوا تھا۔ میں بہ مشکل اپنی ٹانگیں قینچی کی طرح اس کی گردن کے گرد حمائل کرنے کی کوشش کرنے لگا اور مٹھو میرا حربہ ناکام بنانے لگا۔ بالآخر میں نے اپنی ٹانگیں اس کی گردن میں قینچی کی طرح پھنسانے کی کوشش شروع کر دی اور کافی تگ و دو کے بعد میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے پوری قوت مجتمع کر کے اسے چٹائی پر اچھال دیا۔ وہ پشت کے بل چٹائی پر گرا تھا... پھر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے چشم زدن میں کروٹ بدلی اور پیر کی زوردار ٹھوکر اس کی پسلی پر ماردی لیکن وہ بھی شاید پھرتیلا تھا، اس لیے وہ جلدی سے کروٹ بدل گیا اور میرا وار ناکام گیا۔

"تیری......" اس نے مجھے ایک گندی سی گالی دی جس سے میرے اندر جوش غیظ پیدا ہو گیا۔ میرا دل چاہا میں اس کی زبان کاٹ کر کتوں کے آگے پھینک دوں۔ میں اس پر پل ہی پڑنا چاہتا تھا، تاکہ اسے گالی دینے کا مزہ چکھا سکوں لیکن وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں نے بھی جلدی سے اٹھ کر اس پر جست لگا دی اور اسے پکڑ کر پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ وہ چٹائی پر گرا لیکن جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اس کے اندر قوت مدافعت زیادہ تھی۔ اس نے ایک بار پھر مجھے گندی گالی سے نوازا اور اگلے ہی پل وہ اندھے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ میں اس کے وار کے لیے بالکل تیار تھا، اس لیے جیسے ہی وہ مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو میں نے لٹو کی مانند گھومتے ہوئے اس کے پیٹ میں کک مار دی۔

میری زوردار کک نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تکلیف کے باعث اس کے حلق سے نکلنے والی کراہ بے حد

خوفناک اور کریہہ آمیز تھی۔ وہ رکوع کے بل جھکا ہی تھا کہ میں نے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر کھڑی ہتھیلی کا وار کر دیا۔ یہ وار کافی خطرناک ہوتا ہے اس سے انسان کی گردن کی ہڈی بھی ٹوٹنے کا احتمال ہوتا ہے۔

لہٰذا میرا یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ شاید میرے اس وار سے مٹھو کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کراہ کر چٹائی پر منہ کے بل گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ یہاں تک کہ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپا بھی نہیں تھا۔ وہ ساکت و جامد ہو گیا تھا۔ اسی لمحے اسلم دوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن میں نے اسے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی چھاپ لیا۔ اس کی بانس کی طرح پتلی گردن میرے ہاتھ کی گرفت میں آگئی تھی۔

''مم......مم...... مجھے...... چھچھ...... چھچھ...... چھوڑ...... دو......دو......مم......مم......'' وہ بولنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھا دیا جس کے باعث اس کے حلق سے خرخراہٹیں نکلنے لگیں۔

''تُو بھاگ کر کہاں جاتا ہے۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

چند لمحوں کے بعد سانس رکنے کے باعث اسلم جلد ہی بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے گھسیٹتے ہوئے چٹائی پر لٹایا اور پھر مٹھو کا جائزہ لیا۔ مٹھو بدستور ساکت و جامد حالت میں پڑا تھا۔ یہ میرے لیے خوش آیند بات تھی کہ میں مٹھو پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ لڑائی بھڑائی میں کافی ماہر تھا۔ اگر کوئی عام شخص ہوتا تو شاید ہمارے درمیان ایسی فائٹنگ نہ ہوتی اور میں کراٹے والے وار کر کے اس پر جلد ہی قابو پا لیتا۔

میں نے ہتھیلی سے ہونٹ سے نکلتے خون کو صاف کیا پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ مجھے مٹھو کے ریوالور کی تلاش تھی لیکن نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں وہ کہیں پڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نجانے وہ کس سمت گرا تھا۔

وقت کم تھا اور میں رجب سے ''ملک'' کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں کمرے سے باہر نکل کر چھوٹی سی راہداری میں آگیا۔ دائیں طرف سیڑھیاں تھیں جو زیادہ طویل نہیں تھیں۔ سیڑھیاں سیمنٹ سے پلستر شدہ تھیں لیکن کہیں کہیں سے پلستر اکھڑا ہوا بھی تھا۔ اس کے اختتام پر دروازہ ذرا سا کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ راہداری میں ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی سیڑھیوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت یکبارگی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ نہ جانے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔

میں دبے قدموں اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میری نظریں مسلسل ذرا سے کھلے ہوئے دروازے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے اچانک ہی کوئی نمودار ہو سکتا تھا۔

اختتام پر پہنچ کر میں نے خود کو نارمل کیا البتہ میرے دل کی دھڑکن بہ دستور تیز تھی۔ ذرا سے کھلے دروازے سے میں نے دوسری طرف جھانکا تو دوسری طرف مجھے راہداری اور کھلا میدان دکھائی دیا۔ میدان میں بلب جل رہا تھا جس کی روشنی اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کھلے صحن میں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک قدرے چوڑی اور لمبی چارپائی پر دو ہٹے کٹے اور جسیم نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔

اُن کے ہاتھوں میں کپ تھے اور وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ شاید چائے یا قہوہ بھی نوش کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ رجب اور بالا ہیں۔ اُن کے بائیں جانب ایک پجارو کھڑی تھی جس کی رنگت مجھے اندھیرے میں واضح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

چارپائی کے قریب ہی مجھے ایک خونخوار اور جسیم کتا کھڑا دکھائی دیا۔ بلاشبہ وہ شکاری کتا تھا۔ شکاری کتے کو دیکھ کر میرے جسم میں سنسناہٹ اور یخ بستگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

دونوں نوجوانوں کی پشت میری طرف تھی اور وہ کیا باتیں کر رہے تھے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ ہی میں نے سن گن لینے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اُن دونوں پر کیسے قابو پاؤں کیونکہ میں نے غور سے دیکھا تھا، شکاری کتا آزاد تھا اور اگر ان دونوں کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ شکاری کتے کو میری طرف بھیج سکتے تھے۔ میں انسانوں سے تو فائٹنگ کر سکتا تھا لیکن خونخوار کتے سے فائٹنگ کرنا جان خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ کتا یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے مدمقابل انسان ہے یا جانور۔

میں اِسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اچانک میرے عقب میں مٹھو نمودار ہوا اور اس نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ انتہائی گربا پا چلتا ہوا اوپر آیا تھا کہ میرے حساس کانوں میں اس کے قدموں کی آہٹیں بھی سنائی نہیں دی تھیں۔ ساتھ ہی مٹھو نے رجب اور بالے کو بھی آوازیں دے کر متوجہ کر لیا۔ یہ افتاد اچانک ہی آن پڑی تھی۔ مٹھو بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ اس

نے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی تھی اور نہ ہی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی تھی۔

رجب اور بالا بھی اپنے اپنے کپ چارپائی پر رکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ تو مٹھو کی آواز ہے۔'' ایک کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''ہاں۔ وہ قیدی کو دیکھنے گیا تھا۔ آؤ دیکھتے ہیں۔'' دوسری آواز سنائی دی اور میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں اُدھر ہی آ رہے ہیں۔

میں نے خود کو مٹھو کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور اسی کشمکش میں ہی ہم دونوں سیڑھیوں پر گرے اور ایک دوسرے کو لے کر نیچے کی جانب لڑھکتے چلے گئے۔ فرش پر گرنے سے پہلے میں نے رجب اور بالے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔

پھر میں اور مٹھو نیچے گر کر اٹھے ہی تھے کہ رجب اور بالا ریوالورز تھامے ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ ان میں رجب کون تھا اور بالا کون، میں نہیں جانتا تھا لیکن ایک جسیم نوجوان نے میرے سنبھلنے سے پہلے ہی میرے پہلو میں زوردار ٹھوکر رسید کر دی تھی۔ ضرب کافی زوردار تھی اس لیے میرے حلق سے کراہ نکلی اور درد کی تیز لہریں مجھے اپنے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''بالے! لے چل اس حرامزادے کو۔'' میں نے اس کی غرّاتی ہوئی آواز سنی۔ ''ملک صاحب نے کہا ہے کہ وہ ابھی آ رہے ہیں اور اس کا فیصلہ وہ خود ہی کریں گے۔''

وہ رجب تھا۔ اپنی بات مکمل کرتے ہی اس نے مجھے گندی سی گالی سے نوازتے ہوئے ایک اور ٹھوکر میرے پہلو میں رسید کر دی اور ایک بار پھر درد کی ایک تیز لہر مجھے اپنی پسلیوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ عین اسی لمحے بالے اور مٹھو دونوں نے مل کر مجھے قابو کیا اور گھسیٹتے ہوئے اسی کمرے میں لے آئے جہاں میں پہلے قید تھا۔ اسلم بدستور بے ہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ بالے اور مٹھو کی گرفت خاصی سخت تھی۔ انہوں نے مل کر میرے ہاتھ پیر رسی سے باندھ کر مجھے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔

رجب، مٹھو سے بولا۔ ''اسلم کو دیکھ، کہیں مر مرا تو نہیں گیا؟''

مٹھو نے اثبات میں گردن ہلائی اور اسلم کو چیک کرنے لگا۔ ''نہیں...... یہ زندہ ہے اور بے ہوش ہے۔''

''اسے اوپر لے چل اور ہوش میں لا۔'' رجب نے دوسرا حکم دیا۔

بالے نے اسلم کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر لادا اور پھر وہ دونوں تہ خانے سے نکلتے چلے گئے۔ جاتے وقت رجب نے حفظ ماتقدم کے تحت باہر سے کنڈی لگا دی تھی اور میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

میں کافی دیر اسی حالت میں پڑا رہا۔ پسلیوں پر پڑنے والی ضربوں کی شدت ابھی تک مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ شاید رجب نے لمبی ٹوہ والا نوک دار بوٹ پہنا ہوا تھا جس کی ضربوں نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسرتی جسم بنانے والے یا جوڈو کراٹے کے ماہر لوگوں کو ضربیں لگنے سے درد نہیں ہوتا لیکن مجھے ان کی باتوں سے اختلاف ہے کیونکہ کچھ بھی ہو وہ بھی تو آخر گوشت پوست کے بنے انسان ہی ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عام انسان کے مقابلے میں تیز طرار اور ٹھوس جسم کے مالک ہوتے ہیں اسی لیے وہ شدید ترین ضربات بھی سہہ جاتے ہیں۔

میرا حال بھی ایسا ہی تھا۔ لڑائی بھڑائی میں پڑنے والے مکے اور گھونسے میں برداشت کر لیتا تھا لیکن جسم کے نازک اعضا پر پڑنے والی ٹھوکریں مجھے کیا ہر انسان کو بے حال کر دیتی تھیں۔ میں کافی دیر تک اسی حالت میں پڑا کراہتا رہا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور پہلے ایک سایہ اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد دو سائے یکے بعد دیگرے اندر آ گئے۔ مدھم روشنی کی وجہ سے مجھے آنے والے کا چہرہ واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن چٹک کی آواز کے ساتھ ہی تہ خانے میں روشنی پھیل گئی اور میری آنکھیں چندھیا گئیں اسی لیے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ آنکھیں روشنی سے مانوس ہو جائیں تو میں آنکھیں کھول کر آنے والوں کو دیکھوں۔

''علی! آنکھیں کھولو۔'' میری سماعت سے ایک مردانہ آواز ٹکرائی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ یہ آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کو دیکھ کر غصے کی شدید لہریں مجھے اپنے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایک مکروہ مسکراہٹ نے سماعیل شاہد کے چہرے کا

احاطہ کیا ہوا تھا۔ میرا شک درست ثابت ہو گیا تھا۔ اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد ہی دراصل ''ملک'' تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے رجب اور بالا تھے۔

اسماعیل شاہد استہزائیہ انداز میں ہنس کر مزید بولا۔ ''میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ تم میرے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے اور تمہارا مرنا ضروری تھا۔ لیکن خیر، یہ اچھا ہوا کہ تم خود ہی چل کر میرے شکنجے میں آ گئے۔ اب تمہیں مارنے میں مجھے آسانی ہو گی۔''

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جوشِ غیظ میں پوچھا۔ ''میری بہن کہاں ہے؟''

''وہ جہاں بھی ہو گی بڑے سکون اور مزے میں ہو گی۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو میں اندر تک تپ گیا۔

''بکواس بند کرو۔'' میں غرّایا تو اسماعیل شاہد نے میری بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے مکروہ انداز میں زوردار انداز میں قہقہہ لگایا۔ میں جوشِ غیظ سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ غصہ تو بہت چھوٹی چیز تھی، میرے اندر تو آتش فشاں ابل رہا تھا۔ اگر میں بندھا ہوا نہ ہوتا تو شاید میں اس پر پل پڑتا۔

''ویسے تم کافی بہادر اور جی دار نوجوان ہو۔'' قہقہہ لگانے کے بعد اسماعیل شاہد نے کہا۔ ''میں تمہاری بہادری اور ہمت کی داد دیتا ہوں۔ آج تک جتنی بھی لڑکیاں اغوا ہوئی ہیں ان کا کوئی بھی بھائی یا باپ ہماری تنظیم کے مقابلے میں نہیں آیا۔ تم واحد نوجوان ہو جس نے ہم سے ٹکر لی ہے اور اب تم اپنے انجام کو پہنچنے والے ہو۔''

''مجھے مار کر تم اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکو گے۔'' میں نے اسے اللہ کا خوف دلانے کی کوشش کی۔

''تم مجھے ڈرا رہے ہو؟'' اسماعیل شاہد کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''تم جیسے گھٹیا، بدفطرت اور روسیاہ انسان اللہ سے کہاں ڈرتے ہیں۔'' میں نے طنزاً کہا۔ ''ڈرتے وہ ہیں جن کے دل میں اللہ اور آخرت کا خوف ہوتا ہے۔''

''ہمم...... ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔'' اس نے ہمکاری بھرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم وہ سب میرے ساتھ ڈراما کرتے رہے ہو کہ تمہارا تعلق خفیہ ایجنسی سے ہے۔ جو تم اچھا بننے کی کوشش کرتے ہو وہ بھی دکھاوا تھا۔''

اسماعیل شاہد چند ثانیے خاموش رہا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے نہایت ڈھٹائی سے گویا ہوا۔ ''ہاں۔ تمہیں قابو کرنے کے لیے مجھے یہ سب کرنا پڑا تھا کیونکہ تم میرے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ تمہاری وجہ سے ہمارا ''بزنس'' لیک آؤٹ ہو سکتا تھا اس لیے مجھے یہ سب کرنا پڑا۔''

''میری بہن کہاں ہے؟'' میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے اس سے اپنی بہن کے بارے میں دوبارہ دریافت کیا۔

''پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے علی، کیونکہ تم اس تک نہیں پہنچ سکتے۔'' اسماعیل شاہد نے جواباً کہا۔

''مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے؟'' میں اس کی بات صرفِ نظر کرتے ہوئے دھاڑا۔

اسماعیل شاہد نے رجب اور بالے کی طرف دیکھا اور مشورہ طلب کرتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں کیا کہتے ہو، اس کی بہن کے بارے میں بتا دوں؟''

''ملک صاحب! چونکہ اس نے زندہ نہیں رہنا اس لیے میرا خیال ہے اسے بتا دیں تاکہ مرنے کے بعد بھی اس کی حسرت باقی نہ رہے۔'' یہ مشورہ رجب کی طرف آیا تھا۔ جیسے وہ مشورہ دے کر مجھ پر احسانِ عظیم کر رہا ہو۔

''تم کیا کہتے ہو؟'' اسماعیل شاہد نے اس بار بالے کی رائے دریافت کی۔

''رجب ٹھیک کہہ رہا ہے ملک صاحب۔'' بالے نے رجب کی بات کی تائید کی۔ ''آپ اس کو بتا ہی دیں ورنہ مرنے کے بعد بھی پچھتاتا رہے گا۔''

''ہمم۔'' اسماعیل شاہد نے ہمکاری بھرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں دیکھنے لگا جیسے مجھے زندہ نگل جائے گا۔ میں ہونٹ بھینچے غور سے اس کی مکروہ صورت دیکھ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں اس کے ٹکڑے کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔

اسماعیل شاہد چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''رجب اور بالے کے مشورے کے مطابق میں تمہیں تمہاری بہن کے متعلق بتا دیتا ہوں لیکن اس کے بعد تمہیں اذیت ناک موت مرنا ہو گا۔''

''تم بھی تو دوسروں کی بیٹیوں کو اغوا کرتے ہو۔ تمہیں سزا کون دے گا؟'' میں جوشِ غیظ میں تو پھٹ ہی پڑا۔ ''ہاں...... بولو، کون دے گا تمہیں سزا۔''

میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے لیکن ان شعلوں سے اسماعیل شاہد پر کچھ اثر نہیں پڑ رہا تھا۔

''مجھے کوئی سزا نہیں دے سکتا۔'' وہ غرور کی آخر حد پر تھا۔ لحہ بھر ٹھہر کر دوبارہ بولا۔ ''کیونکہ کسی کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت ہی نہیں ہے کہ میں گینگسٹر ہوں اور لڑکیوں کی اسمگلنگ کرتا ہوں۔ تم نے دیکھا نہیں میں کیسے دھڑلے سے، آزادی سے پھرتا ہوں۔ جہاں دل کرتا ہے چلا جاتا ہوں۔ میرے ساتھ کوئی باڈی گارڈ نہیں ہوتا کیونکہ میں انتہائی خفیہ طریقے سے کام کرتا ہوں۔ میں کبھی کسی کے سامنے نہیں آتا لیکن تمہاری وجہ سے مجھے سامنے آنا پڑا ہے۔ اگر تم میرے مقابلے میں نہ آتے تو شاید میں کبھی بھی سامنے نہ آتا۔ ویسے بھی میرے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں اس لیے مجھے کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔''

''تمہیں اللہ دنیا کے سامنے بے نقاب بھی کرے گا اور کڑی سے کڑی سزا دے گا رزیل انسان۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اس نے تمہاری رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے لیکن یاد رکھو، جس دن تم اس کے ہتھے چڑھ گئے تو تمہیں دنیا کی کوئی طاقت اس کے قہر و عذاب سے نہیں بچا سکے گی۔ لہٰذا ابھی بھی وقت ہے کہ تم تائب ہو جاؤ۔ جتنی بھی لڑکیاں اغوا کی ہیں انہیں ان کے گھروں میں پہنچاؤ اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ شاید اس طرح تمہاری اللہ کے ہاں جان بخشی ہو جائے۔''

اسماعیل شاہد نے میرا مشورہ سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ لحہ بھر کے بعد مکروہ لہجے میں بولا۔ ''علی! تم تقریر بہت اچھی کر لیتے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ تم بچوں کو تقریر سکھانے کی اکیڈمی کھول لو۔ بہت پیسا کماؤ گے لیکن تمہاری اس تقریر کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔'' پھر اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''بہرحال میرے پاس وقت بے حد کم ہے اس لیے اب میری بات غور سے سن لو۔ تمہاری بہن اس وقت امریکا میں موجود ہے اور وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہے اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''امریکا میں۔'' میں نے پریشان ہو کر زیرِ لب دہرایا۔ ''کیا تم نے اسے فروخت کر دیا ہے؟''

''ہاں۔'' اسماعیل شاہد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم نے اسے کس کے پاس فروخت کیا ہے؟'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے دریافت کیا۔

''امریکا میں ڈیپ ویب چلانے والی ایک بہت بڑی کمپنی ہے جو دنیا بھر سے لڑکیاں خریدتی ہے۔'' اسماعیل شاہد بے پروا انداز میں بتانے لگا۔ ''میں اسی کمپنی کے لیے کام کرتا ہوں اور اسی کمپنی کو لڑکیاں فروخت کرتا ہوں۔ تمہاری بہن بھی اسی کمپنی کو فروخت کی ہے میں نے۔''

غصے سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ ڈیپ ویب کے بارے میں، میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لڑکیوں کی لائیو پورن ویڈیو بنا کر اپنی ویب پر چلاتے ہیں جو دنیا بھر میں دیکھی جاتی ہیں۔ پہلے میرا شک تھا کہ اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد نے اسے ڈیپ ویب چلانے والی کسی کمپنی کو فروخت کیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گوگل پر سرچ بھی کیا تھا لیکن مجھے اپنی بہن کا پتا نہیں چل سکا۔ اب اسماعیل شاہد نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

اسماعیل شاہد نے میری بات صرفِ نظر کر دی۔ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے اب تک اس کی کئی فلمیں بھی نیٹ پر آ چکی ہوں۔''

مجھے اس کی آواز کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

''نہیں، خاموش ہو جاؤ۔'' میں چیخا۔ میری بے بسی پر اسماعیل شاہد نے مکروہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس لمحے مجھے اس سے شدید نفرت ہوئی اور میرے اندر الاؤ سے بھڑکنے لگے۔ میں نے غصے کی شدت سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسی لمحے اسماعیل شاہد نے مجھے زور سے دھکا دے دیا اور میں اچھل کر دیوار سے ٹکرا کر فرش بوس ہو گیا۔ اسماعیل شاہد نے میرا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے مجھے سیدھا کیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ ''اب تم اپنی بہن کے بارے میں جان گئے ہو، اب تم اس کی فکر چھوڑو۔ تم نے میری بیٹی کو اغوا کیا تھا۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم مرنے کے بعد بھی یاد رکھو گے۔''

''تم نے بھی تو میری بہن کو اغوا کیا ہے رزیل انسان۔'' میں نے دوبدو کہا۔ ''میں نے تو اپنی بہن کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا تھا۔ میں چاہتا تو میں اس کی زندگی برباد کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میرا تعلق عزت دار گھرانے سے ہے۔ میرے والدین نے میری بُری تربیت نہیں کی۔''

میری اس بات نے اسماعیل شاہد کو شاید اندر تک تپا دیا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا تھا جس کی آواز تہ خانے میں گونج اٹھی تھی۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے میرا

گریبان چھوڑا اور مڑ کر رجب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’رجب! میں اسے تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھے اس کی سڑی ہوئی لاش کی تصویر واٹس ایپ کر دینا؟ اور ہاں کوئی غفلت برداشت نہیں کروں گا۔ سمجھے۔‘‘

’’میں سمجھ گیا ہوں ملک صاحب، آپ بے فکر رہیں۔‘‘ رجب نے جواب دیا۔ ’’آپ کے حکم کی فوری تعمیل ہوگی۔‘‘

اسماعیل شاہد نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی پھر وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ’’اوپر جانے کی تیاری کر لو علی۔ گڈ بائے۔‘‘

’’میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا رزیل انسان۔ تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔‘‘ میں چلاّیا لیکن وہ وہاں سے چلا گیا۔ اب میں رجب اور بالے کے رحم و کرم پر تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اسماعیل شاہد کا کیا ارادہ تھا۔

رجب کے کہنے پر بالا پیٹرول سے بھرا کنستر لے آیا۔ اس نے کنستر کا ڈھکن کھولا اور اسے اٹھا کر مجھ پر پیٹرول چھڑکنے لگا۔ مجھے بھی موت اب آنکھوں کے سامنے رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ سب کچھ ختم ہونے جا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں اُمید کی ایک موہوم سی کرن پھوٹ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔ وہی تھا جو میری مدد کر سکتا تھا۔

بالے نے کنستر میں موجود سارا پیٹرول مجھ پر چھڑکنے کے بعد کنستر ایک سائیڈ پر رکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکال لی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں کلمہ پڑھ لوں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے کلمہ پڑھا ہی تھا کہ بالے کی جھنجلائی ہوئی آواز میری سماعت میں پڑی۔ ’’اوہو۔‘‘

میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور بالے کی طرف دیکھنے لگا۔

’’کیا ہوا؟‘‘ رجب نے دریافت کیا۔

’’ماچس میں ایک بھی تیلی نہیں ہے۔‘‘ بالے نے جواب دیا۔ لہجے میں بہ دستور جھنجلاہٹ کا عنصر شامل تھا۔ ’’دیکھو، تمہارے پاس ماچس ہوگی۔‘‘

رجب نے اپنی قمیص کی جیبیں ٹٹولیں لیکن اس کے پاس بھی ماچس نہیں تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’میرے پاس بھی ماچس نہیں ہے۔ تم کچن میں جا کر دیکھو، وہاں ماچس پڑی ہوگی۔‘‘

بالا ماچس لینے چلا گیا۔ اب تہ خانے میں، میں اور رجب رہ گئے تھے۔ تہ خانے میں پیٹرول کی بُو پھیلی ہوئی تھی جس سے میری حالت عجیب ہو رہی تھی۔ میں نے رجب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’رجب! میری بات سنو۔‘‘

وہ چند ثانیے میری طرف دیکھتا رہا پھر پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ’’کیا ہے؟‘‘

’’کیا تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے؟‘‘ میں مستفسر ہوا۔ وہ چونکا۔

’’کیا۔‘‘ وہ اچھنبے سے بولا۔ ’’کیا کہا۔ ذرا پھر کہنا۔‘‘

میں نے ہونٹ بھینچے اور اپنی بات دہرائی۔ ’’میں نے کہا، کیا تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔‘‘

’’تم نے کہا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں؟‘‘ اس کے لہجے میں استہزا شامل تھا۔

’’ہاں۔‘‘ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ’’یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔‘‘

’’یار! کیا میں تمہیں پاگل دکھائی دیتا ہوں؟‘‘ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ’’تم نے مجھے یار کہا ہے اس لیے تم مجھے اچھے انسان دکھائی دیتے ہو اس لیے.....‘‘

’’چاپلوسی مت کر۔‘‘ اس نے درشتگی سے میری بات کاٹی۔ ’’میں کوئی اچھا وچھا انسان نہیں ہوں۔ میں ایک سنگ دل، بے رحم اور خطرناک انسان ہوں۔ میرا دل پتھر ہے، ٹھوس پتھر۔ اس لیے تُو مجھے اپنی چاپلوسانہ باتوں سے موم نہیں کر سکتا۔ غور سے سن، سات قتل کر چکا ہوں میں۔ اشتہاری بھی ہوں۔ ایک سال سے سکھر پولیس کو مطلوب ہوں۔‘‘

وہ تو ایسے بتا رہا تھا جیسے اس نے سات قتل کر کے بہت بڑے ’’کارنامے‘‘ انجام دیے ہوں۔ میں نے کہا۔ ’’میں چاپلوسی نہیں کر رہا۔ میں تو......‘‘

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید بولنے سے روکتے ہوئے انتہائی درشتگی سے کہا۔

’’خاموش رہ لڑکے۔ کوئی فائدہ نہیں ہے بات کرنے کا۔ ملک صاحب نے تیری موت کا حکم دے دیا ہے تو مجھے ہر صورت اس پر عمل درآمد کرنا ہے۔ میں ملک صاحب کا حکم کسی صورت نہیں ٹال سکتا۔‘‘ پھر وہ مڑ کر تہ خانے کے دروازے کے پاس جا کر اونچی آواز میں بالے کو آوازیں

دینے لگا۔ ”بالے! او بالے! کہاں رہ گیا ہے تُو۔ کیا ماچس نہیں مل رہی؟“

”ماچس نہیں مل رہی، میں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ بالے کی آواز میری سماعت سے بھی ٹکرائی۔

”جلدی ڈھونڈ کر آ۔“ رجب جھنجلاتا ہوا واپس آ گیا۔

میں نے پھر اس سے بات کی۔ ”رجب! تمہیں خدا کا واسطہ دے رہا ہوں۔ مجھے چھوڑ دے۔“

”یار! تُو کیوں میرا دماغ چاٹ رہا ہے۔“ وہ سیخ پا ہوا۔ ”چپ کر کے بیٹھ۔ ایسا نہ ہو میں تیرے بھیجے میں دو گولیاں اتار کر تجھے موت کی نیند سلاد [illegible] ک صاحب نے تجھے جلا کر مارنے کا حکم دیا ہے اس لیے میں ان کی بات پر عمل کروں گا۔ اب خاموش رہ۔ تیری باتوں سے میرا دل موم ہونے والا نہیں ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اُس کی منتیں ترلے کرنا فضول ہے۔ میں اُس کے دل میں نرمی پیدا کر کے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ رجب واقعی پتھر دل واقع ہوا تھا۔ جب مزید کچھ دیر گزر گئی اور بالا واپس نہ آیا تو رجب جھنجلا اٹھا۔ اس نے بالے کو ایک گندی سی گالی دی اور تہ خانے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

میں اپنی کلائیوں کو اس انداز میں حرکتیں دے رہا تھا کہ کسی طرح رسی ڈھیلی پڑ جائے اور میرے ہاتھ اس میں سے نکل آئیں۔ میرا لباس پیٹرول سے گیلا تھا اور اس سے نکلنے والی بُو میرے دماغ پر چڑھتی جا رہی تھی اور مجھے اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے تہ خانے سے باہر سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں تو میں سمجھ گیا کہ رجب ماچس لے آیا ہے اور اب مجھے جل کر مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میرا دل یکبارگی ایسے دھڑک اٹھا جیسے پسلیاں توڑنا چاہتا ہو چنانچہ میں نے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد تیز کر دی۔ چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ تہ خانے میں ایک لڑکی نے جھانکا۔ اُس لڑکی کو دیکھ کر میں بیٹھے بیٹھے بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ لڑکی کوئی اور نہیں شانزے تھی۔ چونکہ میں عمودی سمت میں بیٹھا ہوا تھا اس لیے تہ خانے میں داخل ہونے والے کو ڈائریکٹ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شانزے نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ لپک کر اندر آ جاتی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ شانزے خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

”شانزے!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اِدھر ہوں۔“

میری آواز سن کر شانزے نے پوری طرح تہ خانے میں داخل ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی آمد میرے لیے حیران کن اور غیر متوقع تھی بلکہ اس کی اینٹری تو کسی فلمی سین کی طرح تھی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اچانک یہاں آ سکتی تھی لیکن میرا کامل یقین ہے کہ اللہ نے میرے دل کی دعا سن لی تھی اور اسے میری مدد کے لیے بھیج دیا تھا۔

پھر شانزے لپک کر میری طرف آئی۔ اس کا چہرہ فرطِ جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ مجھے دیکھ کر اسے بے پناہ خوشی ہو رہی ہے۔ اس نے جینز کی پینٹ اور لیدر کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال پونی کیے ہوئے تھے۔ اس حلیے میں بھی وہ کافی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

”علی!“ اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے تم مل گئے؟“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں قید ہوں۔“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ واقعی میرے لیے یہ حیران کن بات تھی۔ ”تم یہاں کیسے پہنچیں؟“

”لمبی کہانی ہے، بعد میں بتاؤں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”فی الحال ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”بالا اور رجب کہاں ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”کون؟ وہ جو باری باری اوپری احاطے میں آئے تھے؟“ شانزے نے پوچھا۔

”ہاں وہی۔“

”ہم نے انہیں بے ہوش کر دیا ہے۔“ شانزے نے میری پریشانی دور کی تو میں چونکا۔ ”ہم“ سے مراد وہ اکیلی نہیں آئی تھی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ یقیناً ماریہ ہوگی۔ پھر بھی میں نے تصدیق کے لیے پوچھ لیا۔

”تمہارے ساتھ کون ہے؟“

”ماریہ ہے۔“ وہ بولی۔ ”اور کون ہو سکتی ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر شانزے نے جلدی جلدی میری کلائیوں کے گرد بندھی رسی کھولنی شروع کر دی۔ رسی کافی مضبوطی کے ساتھ باندھی گئی تھی اس لیے اسے

وقت ہو رہی تھی لیکن وہ ہمت نہیں ہار رہی تھی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ شاید شانزے نے میری نظریں اپنے چہرے پر مرکوز محسوس کر لی تھیں اس لیے اس نے بے اختیار چونک کر دیکھا اور پھر ہم پلکیں جھپکنا ہی گویا بھول گئے۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔

چند سیکنڈ تک ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے فرحت آگیں انداز میں دیکھتے رہے۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں نے ٹرانس کی کیفیت میں کہا تو شانزے گڑبڑا گئی۔

''کک...... کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی اور اپنی توجہ رسی پر مرکوز کر لی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ایک عجیب سا جذبہ میرے اندر پنپنا شروع ہو گیا تھا جس سے میں نابلد تھا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ شانزے کی دوست ماریہ کی تہ خانے میں اینٹری ہوئی۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور شانزے سے بولی۔

''شانزے! جلدی کرو۔ کہیں وہ دونوں ہوش میں نہ آ جائیں۔''

''میں رسی کھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' شانزے نے اسے جواب دیا۔ ''لیکن رسی کھل نہیں رہی۔''

''میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور پھر وہ بھی رسی کھولنے میں شانزے کی مدد کرنے لگی۔ اس دوران اس نے میری طرف دیکھ کر میرا حال پوچھا۔ ''کیسے ہو علی۔''

''میرا حال تمہارے سامنے ہے۔'' میں نے جواباً کہا تو ماریہ بھی مسکرا دی۔ ''ویسے تم دونوں کی اینٹری کسی فلم کے سین کی طرح ہی ہے۔''

''ہاں...... لیکن کبھی کبھی حقیقت کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔'' ماریہ نے جواب دیا تو میں اس کی بات پر قائل ہو گیا۔

''یہ بُو کیسی ہے؟'' اچانک شانزے نے نتھنے پھلاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پیٹرول کی بُو ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میرے کپڑے تقریباً سوکھ گئے تھے۔ ''وہ مجھے جلا کر مارنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی پیٹرول میں نہلا دیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ ان کے پاس ماچس نہیں تھی اور دوسری مل نہیں رہی تھی۔''

''اوہ۔'' شانزے متوحش زدہ ہو گئی۔ ''کیا یہ انکل اسماعیل کر رہے تھے۔''

''ہاں۔ اسی کا حکم تھا۔'' میں نے تصدیق کی ''کہ مجھے جلا کر راکھ کر دیا جائے۔''

میں نے شانزے کے چہرے پر غصے کے تاثرات دیکھے۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ ہم بروقت یہاں پہنچ گئیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انکل تمہارے ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔''

''اس نے میرے ساتھ بہت کچھ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''وہ......''

''یہ میں بعد میں سنوں گی۔'' شانزے نے میری بات کاٹتے ہوئے جواباً کہا۔ ''فی الحال ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہے ورنہ ہم کسی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔''

چند منٹ کے بعد وہ دونوں اپنے ہاتھوں کے لمبے لمبے ناخنوں کی بدولت رسی کھولنے میں کامیاب ہو گئیں۔ پھر انہوں نے ایسے سکون کا سانس لیا جیسے منوں بوجھ ان کے سروں سے اتر گیا ہو۔ شانزے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تم پیروں کی رسی کھولو، ہم ان دونوں کو دیکھتی ہیں۔''

وہ دونوں تہ خانے سے چلی گئیں اور میں اپنے پیروں کی رسی کھولنے میں مگن ہو گیا۔ تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی اور اسے میری زندگی مقصود تھی اس لیے اس نے شانزے اور ماریہ کو میری مدد کے لیے بھیج دیا تھا۔ شانزے کو میرے یہاں قید ہونے کے بارے میں کیسے پتا چلا، اس نے یہاں پہنچنے کے لیے کیا جتن کیے یہ وہی بتا سکتی تھی لیکن مجھے خوشی تھی کہ اس کے دل میں میرے بارے میں جو خیالات پنپ رہے تھے وہ قدرے دور ہو گئے تھے۔ اس کی غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی اور جو رہ گئی ہو گی وہ میں دور کر دوں گا۔

چند منٹ کے بعد میں نے رسی کھول لی اور تہ خانے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر مجھے شانزے اور ماریہ نظر آئیں۔ شانزے سیڑھیاں اتر رہی تھی لیکن مجھے دیکھ کر وہ رک گئی اور واپس پلٹ گئی اور بولی۔ ''جلدی آؤ علی۔''

''آ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر میں چند لمحوں کے بعد اوپر احاطے میں آ گیا۔

اوپر کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ برآمدے میں ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ رجب کچن کے دروازے کے قریب اوندھے

بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی کپڑے دھونے والا ایک ڈنڈا پڑا ہوا تھا البتہ بالا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے حیرت بھری نظروں سے پہلے رجب اور پھر ان دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مجھے شکاری کتا بھی کہیں... دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''حیران بعد میں ہونا، پہلے یہاں سے نکل چلو۔'' شانزے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں چونکا۔ ''چلو۔ وقت بے حد کم ہے۔''

''بالا کہاں ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''مجھے کیا پتا بالا کون ہے؟'' شانزے نے جواب دیا تو میں نے رجب کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ رجب ہے۔''

''پھر وہ بالا ہوگا جو کچن میں بے ہوش پڑا ہے۔'' شانزے جواباً بولی۔

میں نے کچن میں جا کر دیکھا تو کچے فرش پر واقعی بالا اوندھے منہ گرا دنیا و مافیہا سے بے گانہ پڑا تھا۔ مجھے اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بھی دکھائی دیا جو اس کی قمیص کے کالر پر جما ہوا تھا' پھر میں کچن سے باہر نکل آیا۔

''ویری نائس۔'' میں خوش ہو کر بولا ''تم دونوں نے تو کمال کر دیا ہے اور ہاں، یہاں ایک شکاری کتا بھی تھا۔ کیا وہ تمہیں دکھائی دیا؟''

شکاری کتے کا سن کر دونوں خوفزدہ ہوگئیں۔

''کتا..... کیا یہاں کتا بھی ہے؟'' اس بار ماریہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ۔ لیکن کتا تو ہمیں کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔'' شانزے نے بھی خوف سے کہا۔

''شاید وہ تم دونوں کو دیکھ کر بھاگ گیا ہوگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے شرارتاً کہا۔ شانزے کو دیکھ کر نہ جانے میرے رویّے میں کیسی تبدیلی آ گئی تھی۔ میری بات پر اُن دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

''اگر کتا یہاں موجود ہے تو پھر ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہیے۔'' شانزے نے مشورہ دیا۔

''مجھے بھی کتوں سے بے حد خوف آتا ہے۔'' ماریہ بہ دستور خوفزدہ لہجے میں بولی۔

شانزے..... مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''چلو علی۔ ایسا نہ ہو کہ شکاری کتا کہیں سے نمودار ہو جائے اور ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچا دے۔''

پھر اس نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں خود بھی حیران تھا کہ اس دوران شکاری کتا کہاں چلا گیا تھا۔ میں اور شانزے آگے تھے اور ماریہ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ہم تینوں فارم ہاؤس کے جہازی سائز گیٹ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اچانک ماریہ کی چیخ نکل گئی۔

''اب کیا ہوگیا ہے؟'' شانزے بولی۔

''شش۔ شکاری کتا آ رہا ہے۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں اور شانزے نے بیک وقت مڑ کر دیکھا تو واقعی شکاری کتا انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے غراہٹیں بھی نکل رہی تھیں۔ اس صورتِ حال پر ہم تینوں کے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ جس رفتار سے شکاری کتا دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شکاری کتے نے ہم میں سے کسی ایک کو بھنبھوڑ کر رکھ دینا تھا۔

میں جیسے ہی ہوش میں آیا تو میں نے جلدی سے جہازی سائز گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی میں چلاّیا۔ ''تم دونوں باہر نکلو۔ جلدی۔''

میری بات سنتے ہی ماریہ اور شانزے تیزی کا مظاہرہ کرتی ہوئیں باہر نکل گئیں۔ عین اسی لمحے شکاری کتے نے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے سے مجھ پر چھلانگ لگا دی لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میں بھی نا صرف باہر نکل آیا تھا بلکہ میں نے بجلی کی سی تیزی سے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی دروازہ بند ہوا تو شکاری کتا دھماکے کے ساتھ دروازے سے آ ٹکرایا تھا' پھر میں نے جلدی سے باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی مبادا شکاری کتا باہر نکل کر ہم پر حملہ نہ کر دے۔ میرا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔

''آ جاؤ.....'' شانزے نے جلدی سے کہا تو میں اُن دونوں لڑکیوں کی ہمراہی میں ایک طرف چلنے لگا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا جسے چاند کی مدھم روشنی دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ تاحد نگاہ کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''وہ میرے سیل فونز.....'' میری زبان سے نکلا ہی تھا۔

''وہ میرے پاس ہیں۔'' شانزے میری بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے کچن میں پڑے مل گئے تھے۔'' دیکھتے ہی پہچان گئی تھی اسی لیے اٹھالیا تھا۔

پھر اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے میرے سیل فونز نکال کر میرے حوالے کر دیئے اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

فارم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر گھنی جھاڑیوں میں ایک شیراڈ کار چھپی ہوئی تھی۔ فارم ہاؤس غالباً چار کنال پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ چاروں طرف سے بند تھا اور یوں دکھائی دیتا تھا جیسے بہت بڑا قلعہ ہو۔ شانزے شیراڈ کار جھاڑیوں سے نکال لائی...... میں اور ماریہ بھی اس میں سوار ہو گئے۔ میں سائیڈ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا جبکہ ماریہ نے پچھلی سیٹ سنبھال لی تھی۔ شانزے نے کار کا رخ موڑا اور پھر آگے بڑھا دی۔ کچی اور ناہموار سڑک پر کار ہچکولے لیتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ شانزے نہایت ماہرانہ انداز میں کار چلا رہی تھی۔

''شانزے! کیا تم بتاؤ گی کہ تمہیں......''

شانزے نے میری بات کاٹ دی اور بولی۔ ''بتاتی ہوں۔ شاید تمہیں بہت جلدی ہے۔''

''ہاں بالکل۔''

''سنو۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ پھر شانزے ساری تفصیل بتانے لگی۔ اُس نے بتایا کہ آج اسماعیل شاہد کی بھتیجی کی منگنی تھی اور اس کی فیملی کو بھی انوائٹ کیا گیا تھا۔ منگنی کا فنکشن جاری تھا کہ اچانک اس نے اسماعیل شاہد کی باتیں سن لیں۔ اس نے کسی سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ...... ہاں وہ تصویر علی کی ہے اور وہ اس کا خیال رکھے۔ وہ تھوڑی دیر تک آ کر اس کی زندگی کی فیصلہ کر دے گا۔ چونکہ شانزے کو پہلے ہی علم تھا کہ میں نے اسماعیل شاہد کی بیٹی عذرا کو اغوا کیا تھا اس لیے علی میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ماریہ کے ساتھ اسماعیل شاہد کا تعاقب کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔

''ارے واہ، تم نے بازی ہی پلٹ دی۔ گڈ شانزے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا تو وہ جھینپ گئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بچانا چاہتی تھی۔'' وہ مجھے پیار... بھری نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

''اور بچالیا۔'' میں نے اس کی بات مکمل کی تو وہ مسکرا دی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ماریہ خاموش تھی۔

''کیا اسماعیل شاہد کو اپنے تعاقب کا احساس نہیں ہوا تھا؟'' میں نے مزید پوچھا۔

''نہیں۔ میں نے کار کافی فاصلے پر رکھی تھی۔'' شانزے نے جواب دیا۔ ''اس لیے انکل کو اپنے تعاقب کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ ویسے بھی میں نے یہ فارم ہاؤس دیکھا ہوا تھا۔ میں ایک بار عذرا کے ساتھ یہاں آ چکی ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سڑک بہ دستور کچی اور ناہموار تھی اور شانزے انتہائی ماہرانہ انداز میں ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ہم فارم ہاؤس سے کافی دور آ گئے تھے۔ جیسے ہی شانزے نے کار دائیں طرف دوسری کچی سڑک کی طرف موڑی تو آوارہ کتوں کے غول نے جھاڑیوں سے نکل کر کار پر ''حملہ'' کر دیا۔ وہ کار کے دائیں بائیں سے اچھل اچھل کر حملہ کر رہے تھے۔ ہم کار میں تھے اور کھڑکیاں بھی بند تھیں اس لیے کتے اپنے ''حملے'' میں ناکام ہو رہے تھے البتہ ان کے ناخنوں نے یقیناً کار پر خراشیں ڈال دی ہوں گی۔

تھوڑا فاصلہ عبور کرنے کے بعد سڑک ہموار ہو گئی تو شانزے نے اس کی رفتار میں اضافہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کتے پیچھے رہ گئے۔ شاید وہ مایوس ہو گئے تھے۔

''اف...... کتنے خونخوار کتے تھے۔'' ماریہ سرسراتی آواز میں بولی۔

''گاؤں کے کتے ویسے بھی کافی خونخوار ہوتے ہیں۔'' شانزے بولی۔ ''ایسا میرے دادا ابو بتاتے تھے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کافی دیر ماحول میں گہری خاموشی طاری رہی۔

''لگتا ہے ہمارے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔'' اچانک ماریہ نے سرسراتی آواز میں کہا تو میں نے بے اختیار چونک کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ غالباً وہ پجارو تھی جس کی ہیڈ لائٹس دور سے ننھے بلبوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

''اوہ واقعی۔'' شانزے نے بھی پریشانی کے عالم میں کہا۔

''شاید یہ بالا اور رجب ہوں گے۔'' میں نے قیاس کیا۔ ''تم کار کی اسپیڈ مزید تیز کر دو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسپیڈ بڑھا رہی ہوں۔'' شانزے نے کہا اور ساتھ ہی اس نے کار کی اسپیڈ میں مزید اضافہ کر دیا۔

جیسے جیسے ناہموار سڑک آتی تو کار اچھل اچھل کر آگے بڑھتی لیکن شانزے نے کار کی اسپیڈ میں ہلکی سی بھی کمی نہ کی۔ متعاقب پجارو بھی اب انتہائی اسپیڈ سے دوڑتی آ رہی

تھی۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ہم دیہاتی ایریئے سے نکل کر پختہ سڑک پر آ گئے۔ شاید تعاقب کرنے والے ہمیں ہاتھ سے نہیں نکلنے دینا چاہتے تھے اس لیے ان کی پجارو کی اسپیڈ میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے دوڑتی آ رہی تھی۔ میرا ذہن بھی انتہائی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار گردن موڑ کر متعاقب پجارو کی طرف دیکھا اور پھر شانزے کی طرف۔

''شانزے! تم پچھلی سیٹ پر چلی جاؤ۔''

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

''میں ڈرائیونگ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن تم......'' اس نے کہنا چاہا۔

''تم میری فکر مت کرو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''متعاقب پجارو کو ڈاج دینا بے حد ضروری ہے۔ میں دوبارہ کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا......''

شانزے میری بات سمجھ گئی تھی اس لیے وہ چلتی کار میں ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھی اور پچھلی سیٹ پر چلی گئی اور میں نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی کار کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ہم جلد سے جلد اس ایریئے سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتے تھے ورنہ اُن کے گھیرنے کی صورت میں ہمارے لیے مشکل ہو سکتی تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ جس سے میں اپنا اور اُن دونوں لڑکیوں کا دفاع کر سکتا۔

کار کا کنٹرول سنبھالتے ہی میں نے اس کی اسپیڈ میں اضافہ کر دیا۔ اتنی تیز رفتاری سے کار چلانا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں جس سڑک کی طرف کار کا رُخ موڑتا تو متعاقب پجارو بھی اسی طرف آ جاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس پجارو سے کیسے جان چھڑواؤں۔ متعاقب پجارو کی اسپیڈ سے لگتا تھا کہ وہ جلد ہی ہماری کار تک پہنچ جائے گی۔ رجب اور بالے کے پاس لازماً ہتھیار ہوں گے جن سے وہ ہمیں خاص کر مجھے بھوننے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔ ویسے بھی اسماعیل شاہد نے مجھے ہلاک کرنے کا انہیں آرڈر دے دیا تھا اس لیے ان سے اچھائی کی توقع رکھنا عبث تھا۔

''تم دونوں نیچے جھک جاؤ۔ ہو سکتا ہے رجب یا بالا ہماری کار پر فائرنگ کرے۔'' میں نے دماغ میں آئے خدشے کے تحت کہا تو وہ جلدی سے نیچے جھک گئیں۔ عین اسی لمحے میرا خدشہ درست ثابت ہو گیا اور ہماری کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ کی آواز سے خاموش فضا مرتعش ہوئی تھی کہ گولیاں بیک اسکرین پر لگیں جس سے اسکرین کے شیشے ریزہ ریزہ ہو کر شانزے اور ماریہ پر پڑے۔ وہ زور سے چیخی تھیں۔ شکر یہ تھا کہ شیشے کی کرچیاں لگنے کی وجہ سے وہ معمولی زخمی ہوئی تھیں۔ میں نے کار کی اسپیڈ میں کمی نہیں کی تھی۔ چونکہ وہ دیہاتی ایریا تھا اس لیے سڑکیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ کہیں بھی روشنی کا شائبہ تک نہیں ہوا تھا البتہ دائیں بائیں گھنے اور بڑے بڑے درخت چاند کی روشنی میں خوفناک ہیولوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔

متعاقب پجارو سے وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی تھی اور میں کار کو زگ زیگ انداز میں چلا رہا تھا۔ شانزے اور ماریہ بہ دستور نیچے جھکی ہوئی بیٹھی تھیں۔

''کیا تم دونوں ٹھیک ہو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں۔ بس معمولی سی زخمی ہوئی ہیں۔'' شانزے جواباً بولی۔

''ہم۔ اب احتیاط سے بیٹھو۔ وہ دوبارہ بھی فائرنگ کریں گے۔'' میں نے قیاس ظاہر کیا۔

''تم بھی اپنا خیال رکھو۔''

''میں محتاط ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور پھر انتہائی محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ سڑک تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہو۔ یہ صد شکر تھا کہ وہ تارکول کی بنی پختہ سڑک تھی۔ اگر سڑک ناہموار ہوتی تو اب تک ہماری کار یقیناً کسی گڑھے میں گر چکی ہوتی۔

''علی! ہماری جان پجارو سے کیسے چھوٹے گی؟'' شانزے پریشان کن لہجے میں بولی۔

''مجھے نہیں پتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں کہ انہیں ڈاج دے سکوں لیکن وہ ہماری جان چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔''

''کچھ کرو علی ورنہ وہ ہم تینوں کو مار دیں گے۔'' شانزے نے اس بار خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ارے تم دونوں تو بہادر لڑکیاں ہو، ڈرو مت۔'' میں نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ''اگر ہماری موت اِن کے ہاتھوں لکھی ہو گی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں بچا سکے گی اس لیے حوصلہ رکھو تم دونوں۔ اللہ نے چاہا تو ہمیں کچھ نہیں ہو گا۔''

میری بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ اچانک فضا خوفناک

دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی اور کار بھی یک لخت میرے کنٹرول سے باہر ہوگئی۔ رجب یا بالا، اُن دونوں میں سے، جو بھی فائرنگ کرنے کا کام سرانجام دے رہا تھا، اس بار اُس نے کار کے ٹائر کو نشانہ بنایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ٹائر برسٹ ہوتے ہی کار آؤٹ آف کنٹرول ہوگئی۔ شانزے اور ماریہ دونوں چیخیں مارنے لگیں۔ میں نے حتی الامکان کار کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میری کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ کار کا توازن یکدم بگڑا اور وہ بائیں طرف ڈھلوان میں اتری اور پھر دو بار قلابازیاں کھاتی ہوئی الٹ کر چھت کے بل گر گئی اور میری طرف کا دروازہ کھل گیا۔

کار کے یوں الٹنے سے میرا سر کار کی چھت سے ٹکرا گیا تھا جس سے میرا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔ پجارو بھی سڑک کے کنارے رک گئی تھی اور اس کا انجن بند ہوگیا تھا۔ جس سے صاف ظاہر تھا، رب اور بالا دونوں پجارو سے نکل کر اُدھر ہی آرہے تھے۔ مجھے شانزے اور ماریہ کا خیال آیا تو میں نے گردن موڑ کر بہ مشکل پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں سیٹ کے درمیان پھنسی ہوئی تھیں۔ ماریہ بے ہوش ہو چکی تھی اور شانزے زخمی تھی اور تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

''علی...... علی......'' ساتھ ہی شانزے مجھے بھی پکار رہی تھی۔

''شانزے! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' میں نے پریشان کن لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''میں...... میں زخمی ہوں علی۔'' اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

اچانک میرے کانوں میں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں سمجھ گیا کہ بالا اور رجب آرہے ہیں۔ وہ جب مجھے زندہ دیکھیں گے تو مجھے مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے۔ میں کشمکش میں مبتلا ہوگیا کہ اگر میں باہر نکل کر کہیں چھپ گیا تو وہ شانزے اور ماریہ کو مار سکتے ہیں۔ شانزے نے بھی دوڑتے قدموں کی آوازیں سن لی تھیں اس لیے وہ رک رک کر بولی۔

''علی! تم...... کہیں چھپ جاؤ۔ وہ آرہے ہیں۔''

''لیکن میں تمہیں کیسے اس حالت میں چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''یہ تو خود غرضی ہے۔''

''مجھے یقین ہے وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' وہ بولی۔ ''تم اسے خود غرضی مت سمجھو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ تم دونوں نے مجھے ان کے چنگل سے چھڑایا ہے ایسے میں وہ تمہیں کیسے زندہ چھوڑ سکتے ہیں۔''

''وہ تمہارے دشمن ہیں ہمارے نہیں۔'' اس نے دلیل دی۔ ''اس لیے مجھے یقین ہے وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بس تم جلدی سے کار سے نکل کر کہیں چھپ جاؤ۔''

''لیکن......'' میں کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں بھلا کیسے ان دونوں کو رجب اور بالے کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتا تھا۔ وہ انہیں بھی ہلاک کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کریں گے۔

''علی! تمہیں میری محبت کی قسم۔'' اس نے کہا تو میں ششدر رہ گیا۔ اس کے الفاظ میری سماعتوں میں گونجنے لگے۔ ''پلیز علی...... پلیز۔''

اس نے مجھے اپنی محبت کی قسم دے دی تھی حالانکہ میں نے ابھی تک اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا لیکن اس نے مجھے اپنی محبت کی قسم دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ فلمی سچویشن لگتی تھی کہ کیسے ایک ہیروئن اپنے ہیرو کو اپنی محبت کی قسم، واسطہ دے کر اپنی بات منوا لیتی تھی۔

شانزے نے بھی مجھے اپنی محبت کی قسم دے دی تھی اس لیے میں خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کار سے گھسٹنے والے انداز میں باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

قریب ہی کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور فصل سر اٹھائے کھڑی تھی۔ میں نے کار سے نکلنے کے بعد اپنی ہمت اور قوت مجتمع کی اور اٹھ کر جھکے جھکے انداز میں اُدھر دیکھنے لگا جدھر سے دو سائے دوڑتے ہوئے ہماری کار کی طرف آرہے تھے۔ ان کی چال ڈھال سے ثابت ہوگیا کہ وہ رجب اور بالا تھے۔

میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور کچھ سوچ کر فصل میں چھپ گیا۔ عین اسی لمحے وہ دونوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے فصلوں کی اُوٹ سے دیکھا کہ اُن دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ رجب نے جھک کر کار کے اندر جھانکا۔

''وہ لونڈا تو کار میں نہیں ہے۔'' مجھے رجب کی غصیلی آواز سنائی دی۔ ''وہ یقیناً زخمی ہے اور ہمیں دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہے۔''

''اوہو۔ پھر اب کیا کریں؟'' یہ آواز بالے کی تھی۔

''اسے ہر صورت تلاش کر کے مارنا ہے۔'' رجب کی

آواز گونجی۔ ’’اگر وہ زندہ بچ گیا تو ’’ملک صاحب‘‘ ہماری کھال کھینچ لیں گے۔ آؤ اسے تلاش کرتے ہیں۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔‘‘

پھر وہ دونوں مجھے تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے سیل فون کی ٹارچیں بھی آن کر لی تھیں۔ انہوں نے پہلے قرب و جوار میں مجھے تلاش کیا پھر وہ دونوں فصل میں گھس گئے۔ اب وہ مجھے دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن مجھے ان کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے لیے یہ خوش آئند تھا کہ اُن میں سے کوئی ایک اِدھر نہیں آیا تھا جدھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ میں اُن پر قابو پانے کی کوشش کرتا تو کامیاب ہوسکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس ہتھیار تھے جبکہ میں تہی دست تھا۔ معاملات بگڑ سکتے تھے لیکن ان پر قابو پانا بے حد ضروری تھا ورنہ ہم کسی صورت بھی یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔

مجھے شانزے اور ماریہ کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ وہ دونوں زخمی تھیں اور بہ دستور کار میں موجود تھیں۔ خاص طور پر ماریہ کی حالت بگڑ بھی سکتی تھی۔ مجھے دوبارہ اسماعیل شاہد تک پہنچنا تھا کیونکہ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے میری بہن روزینہ کو امریکا میں کس کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ اسماعیل شاہد تک مجھے شانزے ہی پہنچا سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ آج اس کی بھتیجی کی منگنی تھی اور وہ یقیناً تقریب میں موجود ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہاں چودھری باسط بھی آیا ہو۔ اس سے بھی میرا آمنا سامنا ہوسکتا تھا۔ میں یہی کچھ سوچنے میں مگن تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں سرسراہٹ کی آوازیں سنائی دیں تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ میں مڑنے ہی لگا تھا کہ اچانک میرے سر کے پچھلے حصے پر ریوالور کی نال ٹکرائی اور ساتھ ہی بالے کی جوشِ غضب میں ڈوبی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

’’کوئی حرکت نہیں لڑکے...... ورنہ گولی سے بھیجا اڑا دوں گا۔‘‘

میں ساکت و جامد ہوگیا۔ ظاہر ہے اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کوئی حرکت کی تو وہ میرا بھیجا اڑا دے گا۔ وہ ایسا کر بھی سکتا تھا۔ پھر بالا، رجب کو پکارنے لگا۔ ’’رجب۔ لونڈا مل گیا ہے۔ جلدی سے آجا۔‘‘

’’اوہ اچھا۔ میں آرہا ہوں۔‘‘ رجب نے جواباً اونچی آواز میں کہا۔

میرا دماغ انتہائی تیز رفتاری سے اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے سوچ رہا تھا اور ساتھ ہی بالے پر غصہ بھی آرہا تھا جس نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوسکی تھی ورنہ میں اپنے بچاؤ کی پوری کوشش کرتا۔ دوسرا اس کا مجھے ’’لونڈا‘‘ کہنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

بالا پھر مجھ سے بولا۔ ’’چل لونڈے۔ اب اٹھ کر کھڑا ہو جا لیکن یاد رکھنا، تیری تھوڑی سی غلط حرکت تجھے وقت سے پہلے اوپر پہنچا دے گی۔‘‘

میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور بہ دستور بیٹھا رہا۔ چند ساعتیں گزر گئیں تو وہ دوبارہ حکمیہ انداز میں بولا۔

’’تُو نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے۔ چل اٹھ کر کھڑا ہو۔‘‘

اتنا کہنے کے.... بعد اس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر ماری تو میرے حلق سے کراہ نکل گئی۔ ٹھوکر بڑی زوردار تھی جس نے میرے پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی۔

’’بڑا ہی ڈھیٹ لونڈا ہے تو یار۔ میری بات ہی نہیں مان رہا۔‘‘ وہ زہرخند لہجے میں بولا۔

پھر وہ دوسری ٹھوکر مارنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی اس کا پاؤں پکڑ کر اتنے زور سے مروڑا کہ وہ نا صرف کراہ کر رہ گیا بلکہ اچھل کر فصلوں پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان نکلا ہی تھا کہ میں نے اس کے پیٹ میں کہنی سے وار کر دیا۔ میرا وار بھی زوردار تھا اور وہ ڈکرا کر اٹھا تو میں نے اس... تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی ناک پر مکا رسید کر دیا۔ اب کی بار یقیناً اس کا دماغ جھنجھنا گیا ہوگا کیونکہ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ ناک پر رکھ لیے تھے۔ یقیناً اس کے ناک سے خون نکل آیا ہوگا لیکن اندھیرے میں مجھے واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

’’بالے...... بالے...... کہاں ہے تُو۔ یہ چیخ کس کی ہے...... بالے......‘‘ اسی لمحے مجھے قریب سے رجب کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید قریب پہنچ گیا تھا۔

’’رج......‘‘ بالا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی آواز دب گئی۔ اس نے اپنے منہ سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے سر پر اپنے سر کی ٹکر مار دی۔ نتیجتاً وہ پھر کراہ اٹھا لیکن اس کی کراہ بھی میرے ہاتھ میں دب گئی۔

''بالے...... او بالے...... کہاں ہے تو۔ جواب کیوں نہیں دیتا۔'' رجب کی پھر آواز سنائی دی۔ اب کی بار اس کی آواز قدرے قریب سے سنائی دی تھی اور پُرتشویش تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں رجب پر کیسے قابو پاؤں کیونکہ بالے سے میری جان ہی نہیں چھوٹ رہی تھی۔

اس دھینگا مشتی میں بالے کے ہاتھ سے شاید ریوالور نکل کر کہیں گر گیا تھا ورنہ وہ مجھے شوٹ کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ایک ہاتھ سے میری کلائی پکڑی اور اپنے منہ سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بے حد طاقتور انسان تھا۔ وہ زور لگاتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو ہی گیا اور پھر وہ چیخ کر بولا۔

''رج...... رج...... ب۔''

اسی لمحے میرے حساس کانوں میں فصل میں ہل چل ہوتی سنائی دی۔ شاید رجب کو سمت معلوم ہوگئی تھی کہ ہم کہاں دھینگا مشتی کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً اب اسی طرف آرہا تھا۔ میں ایک بار پھر بالے کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ اچانک اس نے اپنی ٹانگوں کی قینچی بنا کر میری گردن کے گرد حمائل کی اور پھر مجھے دائیں طرف اچھال دیا۔

میں فصل میں گرا ہی تھا کہ وہاں رجب بھی پہنچ گیا۔ اندھیرے میں مجھے اس کے چہرے کے تاثرات تو دکھائی نہ دے رہے تھے لیکن یقیناً وہ بے حد غضب ناک ہوگا۔ میں اسے بھی کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے لیٹے لیٹے ہی اپنے پیر کی ٹھوکر اس کی پنڈلی پر ماردی تو اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ لڑکھڑا کر وہیں فصل میں گر گیا۔ اُس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں جلدی سے اٹھا اور میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ میری ہر ٹھوکر پر اس کے منہ سے کریہہ آمیز کراہ نکلتی۔ گرنے سے شاید اس کے ہاتھ سے بھی ریوالور نکل گیا تھا کیونکہ وہ اب تہی دست تھا۔

میں نے اُسے اتنی ٹھوکریں ماریں کہ وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہوگیا۔ عین اسی لمحے بالے کو مجھ پر قابو پانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے میرے عقب سے آکر میری گردن کے گرد اپنا بازو حمائل کر کے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا بازو پکڑ کر زور سے ایک جھٹکا دیا تو اس کے منہ سے کریہہ آمیز کراہ نکل گئی۔ شاید اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پھر میں نے مڑ کر اس کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ میرا یہ وار ہمیشہ کارگر ثابت ہوتا تھا۔ مدِ مقابل کو نڈھال و بے حال کر کے رکھ دیتا تھا۔

بالا ایک بار پھر کرّاہا اور اس نے اپنا دوسرا ہاتھ ناک پر رکھا ہی تھا کہ میں نے جوڈو کراٹے کے وار کر کے اسے جلد ہی بے ہوشی کی وادی میں دھکیل دیا۔ اس کی طرف سے اب مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پھر میں رجب کی طرف متوجہ ہوا جو اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے مزید کچھ ٹھوکریں اس کی پسلیوں پر ماریں تو وہ بھی نڈھال ہو کر وہیں گر گیا اور کراہنے کے ساتھ ساتھ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے میں جلدی سے فصل سے باہر نکل آیا۔ اس دوران شانزے نا صرف خود کار سے باہر نکل آئی تھی بلکہ وہ ماریہ کو بھی نکال لائی تھی۔ ماریہ بہ دستور بے ہوش تھی اور شانزے اس پر جھکی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ماریہ...... ماریہ...... ہوش میں آؤ...... ماریہ۔ کیا تم مجھے سن رہی ہو؟'' ساتھ ساتھ شانزے بول بھی رہی تھی۔ میں شانزے کے قریب پہنچ گیا۔

شانزے نے مجھے دیکھا تو جلدی سے بولی۔ ''علی! ماریہ کی حالت خراب ہے۔ یہ ہوش میں نہیں آرہی۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔''

''شاید اسے اندرونی چوٹ لگی ہے اس لیے یہ بے ہوش ہے۔'' میں نے اندازاً کہا۔

''ہاں۔ ایسا ہی ہے شاید۔'' وہ بولی۔

''تم کیسی ہو شانزے؟'' میں نے اس کی حالت دریافت کی۔

''میں...... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جواباً بولی پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''وہ دونوں بدمعاش کہاں ہیں؟''

''ایک تو بے ہوش ہے اور دوسرے کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ میرا مقابلہ کر سکے۔'' میں نے تفاخر سے بھرپور لہجے میں کہا تو وہ مسکرا اٹھی۔

''تم واقعی ہیرو ہو علی۔'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''دو بدمعاشوں سے مقابلہ کرنا قابلِ تعریف ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے بھی شوخ لہجے میں کہا۔

''ہم ماریہ کو کیسے اسپتال لے جائیں گے؟'' اس نے تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''ہماری کار کا ٹائر تو

برسٹ ہو چکا ہے۔''

میں نے چند لمحے سوچا پھر کہا۔ ''ہم پجارو میں جائیں گے۔''

شانزے نے اثبات میں گردن ہلا دی پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں ماریہ کو اٹھا کر لے چلوں تو میں نے ماریہ کو اٹھا کر اپنے کاندھے پہ لادا اور ہم ڈھلوان سے نکل کر سڑک کنارے کھڑی پجارو کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے ماریہ کو پچھلی سیٹ پر لٹایا تو شانزے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی جبکہ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اگنیشن میں چابی موجود تھی۔ میں نے چابی گھمائی تو ''گھرر، گھرر'' کی آواز کے ساتھ ہی پجارو کا انجن غراتا ہوا جاگ گیا۔ پھر میں نے پجارو آگے بڑھا دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم شہر کی حدود میں داخل ہو گئے کیونکہ قرب و جوار میں ہوٹل، کریانے کی دکانیں دکھائی دی تھیں۔ شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے اسپتال کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانی شروع کر دیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے کسی اسپتال کا بورڈ دکھائی دیتا ماریہ کراہتے ہوئے ہوش میں آ گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شانزے اس سے اس کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ ماریہ نے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے اسے اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی بات سن کر مجھے بھی تسلی ہو گئی تھی۔

شانزے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''علی! اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''میں امریکا جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا تو میں بیک مرر میں اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔

''امریکا...... کیوں؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''تمہارے انکل اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد نے میری بہن کو امریکا میں ایک گروپ کو فروخت کر دیا ہے۔'' میں نے مختصراً بتایا۔ ''میں اس گروپ کے چنگل سے اپنی بہن کو بازیاب کرانے جاؤں گا۔''

یہ بات سن کر پجارو میں گہری خاموشی چھا گئی پھر شانزے سرسراتی آواز میں بولی۔ ''اُف۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ انکل اسماعیل گھٹیا انسان ثابت ہوں گے۔''

''ویسے وہ لگتے تو نہیں تھے۔'' ماریہ بھی حیران تھی۔

''بعض اوقات انسان اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہوتا ہے۔'' شانزے فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''اگر علی کو انکل اسماعیل کی اصلیت معلوم نہ ہوتی تو شاید...... ہم بھی انہیں

معلومات پاکستان...

☆ پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوا۔

☆ مزار قائد کا سنگ بنیاد سابق صدر ایوب خان نے 31 جولائی 1960ء کو رکھا۔

☆ افغانستان نے 1947ء میں پاکستان کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی مخالفت کی تھی۔

☆ اسلام آباد کو یکم اگست 1960ء کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔

☆ اقوام متحدہ کے سابق سیکریٹری جنرل اوتھانٹ نے کہا کہ ''اسلام آباد'' ایشیاء کا برازیلیہ ہے۔

☆ پاکستان کا قومی پرچم جناب امیر الدین قدوائی نے تیار کیا تھا۔

☆ پاکستان کا پہلا سکہ 3 جنوری 1948ء کو جاری ہوا۔

☆ گوادر 1958ء میں پاکستان کا حصہ بنا۔

☆ لیبیا ایک ایسا ملک ہے جس کے دو دارالحکومت ہیں۔

☆ پاکستان کے علاوہ بحرین ایسا ملک ہے جس کا یوم آزادی 14 اگست ہے۔

☆ محمد بن قاسم کا اصل نام ''عماد الدین'' جبکہ سراج الدولہ کا اصل نام ''محمد مرزا'' ہے۔

☆ قائد اعظم کو سب سے پہلے ''قائد اعظم'' مولانا مظہر الدین نے کہا۔

☆ ریاضی میں صفر کا استعمال سب سے پہلے الخوارزمی نے کیا۔

مرسلہ: عامر شہزاد، دوسیرہ، ضلع جھنگ

کبھی پہچان سکتے۔"

"ہم۔" ماریہ ہمکاری بھر کر بولی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"میں کبھی انکل اسماعیل کو معاف نہیں کروں گی۔" شانزے نے کہا۔

"وہ معافی کے قابل ہیں ہی کہاں؟" ماریہ کے لہجے میں مجھے نفرت محسوس ہوئی۔ "ایسے گھٹیا لوگوں کو تو سرِ عام پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے جو ہم جیسی معصوم لڑکیوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔"

ایک بار پھر پجارو میں خاموشی چھا گئی۔ پھر شانزے مجھ سے بولی۔

"علی! تم کیوں خاموش ہو۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے لگی لپٹی کے بجائے صاف لفظوں میں کہا۔ "معاف کرنا شانزے۔ ایک بات کہنا چاہ رہا ہوں۔ شاید تمہیں برا بھی لگے۔ اسماعیل شاہد کے اس گھٹیا بزنس میں تمہارا باپ چودھری باسط ... اور بھائی شانی بھی ملوث ہیں۔"

میری بات سن کر شانزے کے ساتھ ساتھ ماریہ بھی چونکی۔ پھر شانزے ششدر اور دلگرفتہ لہجے میں دریافت کرنے لگی۔ "کک ...... کیا کہہ رہے ہو علی؟ یہ...... یہ سچ نہیں ہوسکتا۔"

"یہ سچ ہی ہے شانزے۔" میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جواباً کہا۔ "اسماعیل شاہد، چودھری باسط اور تمہارا بھائی شانی یہ تینوں گینگسٹر ہیں۔ شانی نے ہی میری بہن روزینہ کو اغوا کیا تھا بلکہ وہی لڑکیوں کو اغوا کرتا ہے اور اسے تمہارے باپ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

شانزے حیرت سے گنگ ہی رہ گئی۔ یہی کیفیت یقیناً ماریہ کی بھی تھی۔ میرا مقصد شانزے کو شرمندہ کرنا نہیں بلکہ حقیقت سے آشکار کرنا تھا۔ عذرا نے تو اپنے باپ کے کرتوتوں پر اعتبار نہیں کیا تھا لیکن شانزے کو میری بات پر سو فیصد یقین تھا۔ اس کی خاموشی ہی یقین کو ظاہر کر رہی تھی۔ تاہم وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "علی! کہیں تمہیں غلط فہمی نہ ہوگئی ہو؟"

"تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو۔" میں نے کہا۔ "بے شک کڑوا ہی سہی لیکن یہ سچ ہے۔ اگر تم میری بات پر یقین نہ کرو تو الگ بات ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ بہت جلد یہ تینوں قانون کی گرفت میں ہوں گے۔"

"مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے علی۔" میری بات کے اختتام پر شانزے جھٹ سے بولی اور آگے بڑھ کر اس نے میرے کاندھے پر اپنا نرم و ملائم ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ایسا لگا تھا میرے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا ہو؟ پھر میں نے بھی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

"یقین کرنے کا شکریہ۔" میں نے کہا۔

"ہم۔ تمہیں یاد ہوگا جب میں تمہیں پہلی بار سڑک پر زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں...... مجھے یاد ہے۔" وہ بولی۔

"تم نے مجھ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ میرے ساتھ ظالمانہ سلوک کس نے کیا تھا لیکن میں نے نہیں بتایا تھا۔ مگر آج...... میں تمہیں حقیقت بتا دیتا ہوں۔ اس روز مجھے چودھری باسط کے غنڈوں نے ہی تشدد کا نشانہ بنا کر سڑک پر پھینکا تھا۔" میں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میں نے چودھری باسط کو شانی کے بارے میں بتایا تھا کہ اس نے میری بہن کو اغوا کیا ہے۔ چودھری باسط نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا تھا بلکہ مجھے ہی اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔"

شانزے اور ماریہ دونوں ہکی بکی رہ گئی تھیں۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو شانزے کے چہرے پر شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ میرا مقصد شانزے کو شرمندہ کرنا نہیں تھا صرف حقیقت سے پردہ ہٹانا تھا۔

میں نے سامنے دیکھتے اور محتاط ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔ "شانزے! تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے ساتھ ویسا ری ایکٹ نہیں کیا جیسا عذرا نے کیا تھا۔ اس نے تو یقین ہی نہیں کیا تھا کہ اس کا باپ گینگسٹر ہے۔"

"کوئی لڑکی اپنے باپ کے سیاہ کرتوت سن کر کبھی یقین نہیں کرے گی۔" شانزے دھیمی آواز میں بولی۔ "لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب میرے باپ اور بھائی کو یہ پتا چلے گا کہ میں نے تمہارا ساتھ دیا ہے تو......"

میں اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہ دو کشتیوں میں تو سوار نہیں ہوسکتی تھی۔ چودھری باسط کیسے چاہے گا کہ اس کی بیٹی مجھ سے محبت کرے اور ملے۔ وہ تو شانزے کو

جان سے بھی مار سکتا تھا۔ تاہم میں نے اسے رائے دی۔
''جو تمہیں بہتر لگے تم وہی کرنا۔ میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا۔''

شانزے کچھ لمحے سوچتی رہی پھر مضبوط لہجے میں بولی۔
''علی! کچھ بھی ہو جائے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ناسوروں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو۔ اس جنگ میں، میں ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں علی بھائی۔'' ماریہ بھی پُرعزم لہجے میں بولی تو میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

پھر شانزے مجھ سے میرے آیندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھنے لگی تو میں نے وہی بات دوہرائی کہ ہوسکتا ہے مجھے اپنی بہن کی بازیابی کے لیے امریکا جانا پڑے۔ شانزے خاموش ہوگئی۔ شاید وہ اداس ہوگئی تھی۔

پہلے میرا ارادہ اسماعیل شاہد اور چودھری باسط سے نبٹنے کا تھا لیکن اب چونکہ مجھے اپنی بہن کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پہلے میں اپنی بہن کو بازیاب کراؤں گا اس کے بعد واپس آ کر ان تینوں ناسوروں سے بھی نبٹ لوں گا اور انہیں بے نقاب کر کے ان کے مکروہ چہرے عوام کے سامنے لاؤں گا۔ ویسے اس سلسلے میں انکل حیدر الماس بھی کام کر رہے تھے۔ وہ ان تینوں کو کسی صورت چھوڑنے والے نہیں تھا۔

اچانک ڈیش بورڈ پر پڑے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی تو میں نے بے اختیار چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میری اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ شاید وہ رجب یا بالے کا سیل فون تھا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر ''ملک صاحب'' لکھا جگمگا رہا تھا۔

''ہونہہ۔'' میں نے طنزیہ ہنکارا ابھرا اور پھر سیل فون میوٹ کر کے اسے ڈیش بورڈ پر پھینک دیا۔

''کس کی کال ہے؟'' شانزے نے پوچھا۔

''اسماعیل شاہد کی کال ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے بدمعاشوں سے میرے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہا ہو گا۔''

''کیا انہوں نے تمہارے فرار کے متعلق انکل کو بتادیا ہو گا۔'' شانزے تشویش بھرے لہجے میں استفسار ہوئی۔

''میرا خیال ہے کسی نے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔'' میں نے اندازاً کہا۔ ''اگر وہ بتاتے کہ وہ مجھے ہلاک نہیں کر سکے اور میں ان کی گرفت سے فرار ہوگیا ہوں تو وہ ان دونوں کی کھال کھینچ لے گا۔''

''ہم۔'' شانزے نے ہنکاری بھری۔

''تم یہ بتاؤ کہ جب تم دونوں ان حلیوں میں گھر جاؤ گی تو وہ تم سے ضرور پوچھیں گے کہ تم کہاں سے آ رہی ہو پھر کیا جواب دو گی؟ تمہاری تو کار بھی نہیں ہے تمہارے پاس؟'' میں نے شانزے کی توجہ ایک اہم نقطے کی طرف دلائی۔

''میں کوئی نہ کوئی بات بنالوں گی۔ تم ٹینشن مت لو۔'' شانزے نے جواب دیا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

جس رفتار سے ٹرین آگے بڑھتی جا رہی تھی اس سے زیادہ تیز رفتاری سے میرا دماغ سوچنے میں مگن تھا۔ میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے اپنی بہن روزینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس وقت رات کا... پونے ایک بج رہا تھا اور ٹرین لاہور کی حدود سے نکل چکی تھی۔ میں واپس ملتان جا رہا تھا۔

لاہور شہر میں داخل ہونے کے بعد میں نے پجارو ایک ویران اور سنسان جگہ پر چھوڑ دی تھی اور ایک آٹو رکشے میں سوار ہو گئے تھے۔ شانزے اور ماریہ کو اسماعیل شاہد کے بھائی کی کوٹھی والی گلی میں چھوڑنے کے بعد میں وہیں رک گیا تھا۔ میں نے شانزے سے کہا تھا کہ اگر اسماعیل شاہد وہاں موجود ہو تو وہ مجھے بتائے لیکن اس نے میسج کر کے بتایا تھا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد میں ریلوے اسٹیشن آ گیا تھا۔ جب میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تو رات کے بارہ بج رہے تھے اور ملتان جانے والی ٹرین روانگی کے لیے تیار تھی۔ سو میں نے جلدی سے اپنے لیے ٹکٹ خریدی اور ٹرین میں سوار ہوگیا۔ مجھے سیٹ بھی مل گئی تھی اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

میرے جانے سے شانزے اداس ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے اپنا خیال رکھنے کی بے حد تلقین کی تھی اور ساتھ ہی رابطے میں رہنے کی بھی تاکید کی تھی۔ میرا دل بھی اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کا باپ چودھری باسط اور بھائی شانی بھی ناسور ہیں۔ معاشرے پر کلنک ہیں لیکن وہ ان کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے بھی اس پر زور نہیں ڈالا تھا۔ اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میرے ساتھ تھی اور اس نے اپنے باپ اور بھائی کی حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

مجھے یاد تھا جب... اخبار میں چودھری باسط کی حیدر الماس کی بیوی نازنین عرف ببلی کے ساتھ تصویریں شائع ہوئی تھیں تو شانزے نے کسی صورت نہیں مانا تھا بلکہ اسے فوٹو شاپ قرار دیا تھا۔

میرے ساتھ اب کیسے حالات پیش آنے تھے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ میں ملتان پہنچ کر حیدر الماس سے ملوں گا اور پھر کوئی لائحہ عمل طے کریں گے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے امریکا جانے کا جلد از جلد بندوبست کر دیں گے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جس وقت اسماعیل شاہد میرے سامنے آیا تھا اس وقت میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں اس میں موجود ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دیتا۔

ٹرین جب ملتان اسٹیشن پر پہنچی تو صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اندھیرا ابھی بھی موجود تھا۔ اسٹیشن پر بھی کافی چہل پہل تھی۔ کچھ لوگ اپنے پیاروں کو الوداع کرنے آئے تھے تو کچھ اپنے پیاروں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ ٹرین سے اتر کر میں نے اسٹیشن کی مسجد میں فریش ہونے کے بعد فجر کی نماز ادا کی اور اللہ پاک سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنی بہن اور ان لڑکیوں کو اپنے امان میں رکھنے کی دعا کی جنہیں اسماعیل شاہد اور اس جیسے دیگر درندوں نے فروخت کر دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں مسجد اور پھر ریلوے اسٹیشن سے نکل کر باہر آیا ایک آٹو رکشے میں سوار ہو کر اپنی ماں اور بہن کے پاس آ گیا۔ بڑے ماموں اسلم وحید اور ممانی بھی وہاں موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ سب بے حد خوش ہو گئے۔ امی اپنے کمرے میں تھیں۔ پھر میں اور مرینہ دوسرے کمرے میں آ گئے جبکہ ممانی ہم سب کے لیے ناشتا بنانے لگ گئی تھیں۔

''امی کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' میں نے مرینہ سے استفسار کیا۔

''ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے بھائی۔'' مرینہ جواباً بولی۔ ''وہ آپ کو یاد کرتی رہتی ہیں۔''

''کیا وہ سو رہی ہیں......؟'' یہ سن کر مجھے خوشی اور اطمینان ہوا تھا۔

''ہاں۔ وہ دوائیوں کے زیر اثر ہیں۔'' مرینہ نے بتایا۔

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری۔

''کیا آپ کی ملاقات اسماعیل شاہد سے ہوئی؟'' مرینہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا بتایا ہے اس نے۔ باجی کہاں ہیں؟'' مرینہ تجسس سے پُر لہجے میں بولی۔

''وہ......'' میں کہتے کہتے رکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ امریکا میں ہے۔ اس روسیاہ انسان نے روزینہ کو امریکا میں ایک گروپ کو فروخت کر دیا ہے۔''

''کیا......؟'' مرینہ دبی دبی چیخی۔ ''اس نے ایسا کیوں کیا؟''

اب میں اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اسماعیل شاہد نے روزینہ کو ڈارک ویب چلانے والے کسی کمپنی کو فروخت کیا ہے اس لیے میں نے گول مول جواب دیا۔

''اس بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا۔''

''پھر امی کو کیا جواب دیں گے آپ......؟'' مرینہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم امی کو ابھی کچھ مت بتانا۔'' میں نے اسے تاکید کی۔ ''میں روزینہ کو لینے امریکا جاؤں گا۔''

''آپ امریکا جائیں گے......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔''

''آپ امریکا کب جائیں گے؟'' لمحہ بھر ٹھہر کر اس نے دوبارہ پوچھا۔

''بہت جلد۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو ہم دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے بعد دروازہ کھلا اور ممانی اندر آ گئیں۔

''بچو! ناشتا تیار ہے۔ آ جاؤ۔'' وہ بولیں۔

''ٹھیک ہے ممانی۔ ہم آتے ہیں۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''جلدی آنا ورنہ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' ممانی نے تلقین کی۔

ممانی کے جانے کے بعد میں نے مرینہ کو تاکید کی کہ وہ اس بارے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کرے کہ روزینہ امریکا میں ہے اور میں اسے لینے امریکا جا رہا ہوں۔ وہ معاملے کی حساسیت کو سمجھ گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر پریشانی ہویدا ہو گئی تھی۔ ہم کمرے سے نکل کر ناشتے کی ٹیبل پر آ گئے۔ امی ابھی تک سو رہی تھیں۔

ناشتے کے بعد میں نے حیدر الماس کو کال ملائی۔ سلام و دعا کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ میں ملتان آ گیا ہوں تو وہ خوش ہو گئے اور پھر انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں تھوڑی دیر تک ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آج انہوں نے مجھے اپنی رہائش گاہ پر بلایا تھا جو بل براراں پر واقع تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد میں ان کی رہائش گاہ میں ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ وہ بڑے تپاک انداز میں مجھ سے ملے تھے اور مجھے زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ جب میں نے انہیں لاہور میں گزرے واقعات کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ میری بہن امریکا میں ہے اور میں امریکا جانا چاہتا ہوں تو وہ تفکرات میں گھر گئے۔

''علی! تم روزینہ بیٹی کو امریکا میں کہاں تلاش کرو گے؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد حیدر الماس نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''یورپ اور امریکا میں تو ڈارک ویب چلانے والی ہزاروں کمپنیاں ہیں۔ تم کس کس کمپنی کو تلاش کرو گے؟''

''حیدر صاحب!'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے روزینہ کی تلاش میں امریکا جانا ہوگا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں جب میری امی مجھ سے اُس کے بارے میں سوال کرتی ہیں تو میرا کلیجا منہ کو آ جاتا ہے۔''

''سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولے۔ ''لیکن......''

''لیکن کو چھوڑیں انکل۔'' میں نے نرمی سے ان کی بات کاٹ دی۔ ''میری بہن امریکا کے کسی بھی کونے میں موجود ہوگی میں اسے تلاش کروں گا اور اسے واپس لاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح میرے ذریعے عالمی گینگسٹر بے نقاب ہو جائے جو لڑکیوں کو اغوا کر کے ڈارک ویب کی کمپنیوں کو فروخت کرتے ہیں۔''

''مغربی ممالک میں ڈارک ویب کمپنیاں کھلے عام کام کرتی ہیں۔ وہاں کا معاشرہ ہی ایسا ہے۔ لڑکی اٹھارہ سال کی ہوتے ہی اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے لگتی ہے اس لیے وہاں کی لڑکیاں پیسا کمانے کے لیے ایسی کمپنیوں میں شوق سے کام کرتی ہیں اور اسے گناہ یا اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے اور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ''بہرکیف...... میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''ہر مشکل کا سامنا کروں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''بس آپ مجھے امریکا بھجوانے کا بندوبست کر دیں۔''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر ہمکاری بھرتے ہوئے بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے تم ایک اہم مقصد کے لیے جانا چاہتے ہو اس لیے میں تمہیں روکنے کے لیے زور نہیں لگاؤں گا۔ میں نے تم سے ہر پل ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے اس لیے میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا کیونکہ تمہاری ہی وجہ سے نا صرف اسماعیل شاہد بے نقاب ہوا ہے بلکہ چودھری باسط کے ''کرتوت'' بھی سامنے آئے ہیں۔''

اچانک مجھے حیدر الماس کی بیوی نازنین عرف ببلی کا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ اُن سے پوچھ لوں کہ وہ آج کل کہاں ہیں لیکن پھر میں خاموش ہو گیا کیونکہ یہ اُن کا ذاتی مسئلہ تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ دوبارہ بولے۔

''میں تمہارے کاغذات تیار کرواتا ہوں۔ تم آئی ڈی کی کاپی اور اپنی تصویریں دے دو۔ پراسس تو شروع ہو۔''

''کتنے روز لگ جائیں گے......؟'' میں دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ہفتہ، دو ہفتے یا ایک مہینا لگ سکتا ہے۔'' انہوں نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیونکہ امریکا کا ویزا ملنا آسان نہیں ہے۔''

''مجھے ویزا مل تو جائے گا نا۔'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''ہاں، ہاں۔ ایک ٹریول ایجنسی والا میرا قریبی عزیز ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں لیکن پہلے تمہارا پاسپورٹ تو بن جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آج شام تک آپ کو تصویریں اور آئی ڈی کی کاپی پہنچا دوں گا۔''

کچھ لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر حیدر الماس نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''تمہارے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں ایک بار پھر مستفسر ہوا۔

''تمہاری ضمانت میں بھی ایک مہینے کی مزید توسیع ہو گئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ یہ سن کر میں بھی خوش ہو گیا۔ واقعی یہ میرے لیے خوش خبری تھی۔ تاہم میں نے پوچھا۔

’’حیدر صاحب! یہ جھوٹا مقدمہ کب تک چلتا رہے گا؟‘‘
’’جب تک لڑکی خود پیش ہو کر بیان نہیں دے دیتی۔‘‘ حیدر الماس نے جواباً کہا تو میں چونک پڑا۔
’’آپ کا مطلب ہے عذرا......؟‘‘
’’ہاں۔‘‘ انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔’’عذرا عدالت میں پیش ہو جائے یا اسماعیل شاہد مقدمہ واپس لے لے تب جا کے تمہاری جان چھوٹے گی لیکن تم فکر نہ کرو۔ میرا وکیل اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لے گا۔ وکیل ایسے کاموں میں کافی ماہر ہوتے ہیں۔ میرا دوست ایس پی شیراز خان بھی میرے ساتھ مل کر اسماعیل شاہد کے کیس پر کام کر رہا ہے۔ انشاء اللہ وہ بھی جلد ہی اس کے خلاف ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا پھر اسماعیل شاہد کو قانون کے شکنجے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔‘‘
’’پتا نہیں وہ کب ہاتھ آئے گا۔‘‘ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔’’اتنا چالاک، مکار اور عیار انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔‘‘
’’ان شاء اللہ بہت جلد وہ قانون کے شکنجے میں ہوگا۔‘‘ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔’’اس کے گرد گھیرا مزید تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ثبوت ملنے کی دیر ہے اس کے بعد اس کی باقی کی ساری زندگی جیل میں گزرے گی۔‘‘
’’آپ ثبوت کیسے حاصل کریں گے؟‘‘ میں نے استفسار کیا۔’’وہ تو انتہائی خفیہ طریقے سے کام کرتا ہے۔ کبھی سامنے نہیں آیا۔ کسی کو شائبہ تک نہیں ہے کہ وہ گینگسٹر ہے اور لڑکیوں کو اغوا کرا کے دوسرے ملک کی ڈارک ویب پر کام کرنے والی کمپنیوں کو فروخت کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، اس نے اپنے کئی نام رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے چودھری ساجد اور ملک۔ پتا نہیں اور کتنے اس کے نام ہوں گے۔ میری بدقسمتی کہ وہ میرے سامنے ہی موجود تھا لیکن میں اسے پہچان ہی نہیں پایا تھا۔‘‘
’’تم نے ٹھیک کہا، وہ واقعی بے حد چالاک، عیار اور مکار انسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اکیلا پھرتا رہتا ہے۔ تم نے کبھی اس کے ساتھ ایک باڈی گارڈ یا غنڈا نہیں دیکھا حالانکہ ایسے لوگ اپنی حفاظت کے لیے چار پانچ غنڈے یا باڈی گارڈ ساتھ رکھتے ہیں۔‘‘ وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ’’بہرکیف، جو گزر گیا سو گزر گیا۔ وہ زیادہ دیر قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکتا۔ میں اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔‘‘

واقعی اُن کی بات درست تھی۔ اسماعیل شاہد کو میں نے ہمیشہ اکیلے ہی دیکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنے ساتھ غنڈے یا باڈی گارڈ نہیں رکھے تھے۔ شاید وہ خود کو اسی طرح پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کی نظروں سے محفوظ سمجھتا تھا اور وہ کامیاب بھی رہا تھا۔ نجانے وہ کتنے عرصے سے یہ گھناؤنا بزنس کر رہا تھا اور کسی کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ شاید اللہ نے میرے ذریعے ہی اسے بے نقاب کرنا لکھا تھا۔ اس کی بیٹی عذرا، چودھری باسط کی بیٹی شانزے اور اس کی دوست ماریہ کو اس کا بھیانک اور مکروہ چہرہ میں نے دکھا دیا تھا۔ یہاں تک کہ شانزے بھی اپنے باپ اور بھائی کے کرتوتوں سے واقف ہو گئی تھی۔
کچھ دیر کے بعد چائے آ گئی اور ہم چائے پینے کے ساتھ ساتھ مزید ڈسکس کرنے لگے۔ اچانک مجھے بابر عرف جوکر کا خیال آیا تو میں نے پوچھا۔
’’انکل! بابر کہاں ہے۔ وہ نظر نہیں آ رہا......؟‘‘
حیدر الماس مسکرائے پھر بولے۔’’وہ یہیں پر ہی ہے۔ دراصل اس کی طبیعت خراب ہے اس لیے وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہے۔ میں نے اسے تمہاری آمد کا نہیں بتایا ورنہ وہ تم سے ملنے بھاگم بھاگ آ جاتا۔ ویسے وہ تمہارے اچانک جانے پر بہت پریشان ہوا تھا۔‘‘
میں مسکرا دیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ امی جاگ چکی تھیں اور سب کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھیں اور اپنی باہیں پھیلا دیں تو میں ان کے گلے لگ گیا۔ دوسرے لمحے وہ بلک بلک کر رونے لگیں تو میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔
’’امی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟‘‘
’’میرے بیٹے۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟‘‘ امی نے مجھ سے دریافت کیا۔
’’امی! میں نے کہاں جانا ہے۔ میں تو آپ کے پاس ہی ہوں......‘‘ میں نے نم لہجے میں کہا۔
امی نے مجھے خود سے علیحدہ کیا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں جتنے بھی نفوس موجود تھے سب اشکبار نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔
’’علی! روزینہ کا کچھ پتا چلا؟‘‘ امی نے بالآخر وہ سوال پوچھ لیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب تو میرے پاس تھا لیکن میں جواب دے نہیں سکتا تھا۔ اگر میں

بتا دیتا کہ وہ امریکا میں کسی گروہ کی قید میں ہے تو شاید وہ یہ صدمہ نہ سہہ سکتیں۔ یہاں تک کہ یہ صدمہ ان کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''امی! بہت جلد روزینہ کا پتا چل جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بہت جلد اسے آپ کے پاس لے آؤں گا۔''

''تم ہر بار یہی تسلی دیتے ہو۔'' امی کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''لیکن اپنا وعدہ پورا نہیں کرتے۔''

''لیکن اس بار تسلی نہیں دے رہا امی۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ''پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔''

وہ خاموش ہوگئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔ پھر انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ تم اسے لے آؤ گے؟''

''جی امی......'' میں نے جواباً کہا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

میں پندرہ منٹ امی کے پاس بیٹھا رہا۔ اسی دوران شانزے کی کال آگئی اور میں اٹھ کر باہر آگیا۔ اس نے میری خیریت دریافت کرتے ہوئے پوچھا۔ ''علی! تم خیریت سے ملتان پہنچ گئے ہونا؟''

''خیریت سے پہنچا ہوں تو تم سے بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''تم سناؤ۔ تمہارے اور ماریہ کے لیے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا تھا؟''

''نہیں۔ میں نے بہانہ بنالیا تھا کہ ہم سیر سپاٹے کے لیے باہر گئی تھیں لیکن واپسی پر ہماری کار پستول دکھا کر چھین لی گئی اس لیے ہمیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ کار کی ایف آئی آر بھی درج کرادی ہے۔'' شانزے نے بتایا تو میں نے ایک طویل سانس لی۔

''کیا اسماعیل شاہد نے تقریب میں شرکت کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' شانزے بولی۔ ''میں نے انکل بلال سے ان کے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ انکل اسماعیل کسی ضروری کام کے سلسلے میں چلے گئے تھے۔''

''وہ یقیناً اسی فارم ہاؤس گیا ہوگا۔'' میں نے ہونٹ چباتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''کاش مجھے اس وقت وہ مل جاتا تو میں اسے جہنم واصل کردیتا۔''

''تم کیوں اپنے ہاتھ انکل کے گندے خون سے رنگو گے؟'' شانزے نے کہا۔ ''وہ اپنے سیاہ کرتوتوں کی وجہ سے خود ہی انجام کو پہنچ جائیں گے۔ چاہے ان کے گینگ میں جو بھی شامل ہے وہ بھی اپنے انجام کو پہنچے گا۔''

شانزے کی اس بات کا میں مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ اپنے باپ چودھری باسط اور بھائی کا حوالہ دے رہی تھی۔ تاہم میں نے کہا۔ ''انشاء اللہ ضرور۔''

چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر شانزے نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

''تم امریکا کب جارہے ہو؟''

''کچھ عرصے تک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرے کاغذات تیار ہورہے ہیں۔ میرے انکل ویزے کے لیے بھی اپلائی کردیں گے۔ جیسے ہی ویزا مل جائے گا تو میں روانہ ہوجاؤں گا۔''

''یعنی ابھی تم ملتان میں ہی ہو؟''

''ہاں۔''

''اوکے۔ میں ملتان پہنچ کر تم سے رابطہ کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے بھی تم سے مل کر خوشی ہوگی۔'' میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

''شکر ہے جناب کو مجھ سے مل کر خوشی تو ہوگی۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔ ''پہلے تو جناب لفٹ ہی نہیں کراتے تھے۔''

''طنز کر رہی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ایسے ہی بات کردی۔''

''میں سمجھا کہ تم طنز کر رہی ہو۔'' میں مسکرایا۔

''جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی ہر بات برداشت کی جاتی ہے۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' میں سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن تم جانتی ہو کہ محبت سے پہلے میرا اہم مقصد اپنی بہن کو تلاش کرکے واپس لانا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں محبت کے چکر میں پڑکر اپنے مقصد سے ہٹ جاؤں گا۔''

''میری محبت تمہیں تمہارے مقصد سے کبھی ہٹنے نہیں دے گی۔'' وہ رسانیت سے بولی۔ ''بلکہ میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں کروں گی۔''

''اپنے باپ سے ٹکرا جاؤ گی؟'' میں نے پوچھا تو وہ خاموش ہوگئی۔ تاہم لحہ بھر کی خاموشی کے بعد بولی۔

''کوئی بھی اپنے باپ سے نہیں ٹکرا سکتا اور نہ ہی ان کے سامنے گردن اکڑا کر کھڑا ہوسکتا ہے۔'' وہ سنجیدہ لہجے

میں بولی۔ ”ہمارے دین نے تو کہا ہے کہ ماں باپ کی عزت کرو اور ان کے سامنے اُف تک نہ کہو لیکن چونکہ میرے باپ کے کرتوت کالے ہیں، وہ گھناؤنے بزنس کا حصہ ہیں، وہ گینگسٹر ہیں اس لیے میں کبھی بھی ان کا ساتھ نہیں دوں گی۔“

”میرا باپ بھی اگر کالے کرتوتوں میں ملوث ہوتا تو میں بھی کبھی ان کا ساتھ نہ دیتا۔“ میں نے شانزے کی بات سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ”گناہ، گناہ ہے اور گناہگار کا ساتھ دینے والا بھی گناہ گار ہی کہلاتا ہے۔“

”ویسے تم امریکا جاؤ گے تو میں تمہیں مس بھی کروں گی۔“ شانزے نے اداس بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم بھی مجھے مس کرو گے؟“ شانزے نے وہ بات پوچھ لی جس کا میرے ذہن میں تصور تھا۔

”میں بھی تمہیں مس کروں گا۔“ بالآخر میں نے بھی جواباً کہہ دیا تو سیل فون سے مجھے ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”کاش!“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تو میں ٹھنکا۔

”کاش......کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”کاش! میں بھی تمہارے ساتھ امریکا چلتی۔“ اس نے صراحت سے جواب میں کہا تو میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ شانزے کی یہ حسرت، حسرت ہی رہ گئی تھی۔ اگر اس کا میرے ساتھ جانا ممکن ہوتا تو وہ کس حیثیت سے میرے ساتھ جاتی۔ اگر اس کے باپ چودھری باسط کو یہ پتا چل جائے کہ وہ میرے ساتھ رابطے میں ہے تو وہ سیخ پا ہو جائے گا۔

”کوئی بات نہیں شانزے۔ میں کون سا ساری زندگی کے لیے امریکا جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ان شاءاللہ میں بہت جلد روزینہ کو لے کر واپس آؤں گا۔“

”ان شاءاللہ۔“

پھر اس سے چند مزید باتیں کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کیا اور سیل فون جیب میں رکھ کر کمرے میں آ گیا۔

میرے پاس اب کوئی کام نہیں تھا۔ صرف بے چینی ہی بے چینی تھی۔ مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر امریکا جا رہا ہوں گا۔ میں جلد از جلد امریکا پہنچ کر اپنی بہن کو تلاش کر کے واپس لانا چاہتا تھا تاکہ میری ماں کو بیٹی کو زندہ دیکھ کر سکون مل جائے۔

شام تک میں نے اپنی تصویریں اور آئی ڈی کی کاپی حیدر الماس کو دے آیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت اب گھر میں ہی گزر رہا تھا۔ حیدر الماس اپنے دوست ایس پی شیراز خان کے ساتھ مل کر اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں مصروف تھے۔ اب مجھے اسماعیل شاہد کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی اصلیت میرے سامنے کھل چکی تھی لیکن کہتے ہیں کہ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے سو میں اسے اپنے لیے خطرہ نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ انسان کیسے ریاکار بن جاتا ہے۔ وہ اپنی موت کو بھول جاتا ہے بلکہ یہاں تک کہ وہ اللہ کو بھی بھول جاتا ہے جس کے سامنے اس نے پیش ہونا ہے۔

ایک روز میں شام کے وقت گھر میں بیٹھا تھا کہ جمیرہ کے میسجز آ گئے۔ ان میسجز میں اس نے شکوے کیے تھے کہ کافی عرصہ ہو گیا ہے میں نے اس سے بات کیوں نہیں کی، کیا میں اسے بھول چکا ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔ میرا دل اس سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میری بات سے اس کا دل ٹوٹ جاتا اسی لیے میں نے جواباً ”میں بزی ہوں“ لکھ کر میسج سینڈ کر دیا۔ اس کے بعد اس کا کوئی جوابی میسج نہ آیا۔ کچھ دیر کے بعد مرینہ نے آ کر ڈنر کا کہا تو میں ہاتھ دھو کر ایک اور کمرے میں آ گیا جسے ڈائننگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں امی، ماموں، ممانی اور مرینہ موجود تھے۔

ڈنر کرنے کے بعد میں نے چائے پی اور پھر چہل قدمی کی غرض سے گھر سے باہر نکل آیا۔ میں ایسے ہی گھومتے پھرتے کافی دور آ گیا اور ایک سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلتا جا رہا تھا کہ اچانک میری چھٹی حس بیدار ہوگئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔

میں نے نامحسوس انداز میں قرب و جوار کا جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہ دیا جس پر میں شبہ کر سکتا۔ اس کے باوجود میری چھٹی حس مجھے بار بار کسی خطرے کی کال دے رہی تھی۔ تعاقب کرنے والوں کا تعلق اسماعیل شاہد یا چودھری باسط سے بھی ہو سکتا تھا۔ شاید وہ میرا گھر دیکھنا چاہتے ہوں اور اس کے بعد کوئی ”کارروائی“ کرنا چاہتے ہوں۔ ان سے کچھ بھی تو بعید نہیں تھا۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ بہرحال جو بھی تھا مجھے تعاقب کرنے والوں کو چکمہ دینا ضروری تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک پتلی سی گلی دکھائی دی اور میں اسی گلی میں داخل ہو گیا۔ میرا گلی میں داخل ہونے کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کیا واقعی میرا تعاقب کیا جارہا تھا یا صرف مجھے ہی ایسا محسوس ہوا تھا۔ اُس گلی کا اختتام چھوٹی سڑک پر ہو رہا تھا۔ اُس چھوٹی سڑک پر کافی رونق تھی۔ برگر، چپس، تکے کباب، ڈرنکس اور شوارمے کی کئی شاپس تھیں اور ہر شاپ پر خاصے لوگ موجود تھے۔ میں کسی دکان پر رکنے کی بجائے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس دوران میں نے چیک کرلیا تھا۔ وہ تین لڑکے تھے جو میرا تعاقب کررہے تھے۔ ہمارے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔

پُر رونق علاقے سے نکل کر میں نسبتاً سنسان سڑک پر پہنچا تو وہ دونوں لڑکے بھی اسی طرف آ گئے پھر مجھے اپنے عقب سے ایک لڑکے کی تحکم آمیز آواز آئی۔ ”اے رکو......“

مجھے اس کا تحکم آمیز لہجے میں پکارنا ذرا بھی نہ بھایا تاہم میں رکا اور مڑ کر ان کی طرف دیکھا پھر میں نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر تصدیق چاہی۔ ”مجھ سے کچھ کہا......؟“

”نہیں۔ تیرے فرشتوں سے کہا ہے۔“ ایک لڑکے نے چبھتا ہوا طنز کیا۔ ”ظاہر ہے تجھے ہی رکنے کا کہا ہے۔“

اُس نے اپنے گلے میں سرخ رنگ کا مفلر ڈالا ہوا تھا۔ وہ تینوں میرے قریب آ گئے تھے۔ وہ تینوں میرے ہم عمر تھے لیکن شکل وصورت اور اپنی وضع قطع سے وہ بالکل اچھے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایک لڑکے کے دائیں رخسار پر کان کے قریب کٹ کا گہرا نشان تھا۔ اُس لڑکے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں یکدم ایک خیال آیا کہ میں نے اُسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ کہاں اور کب دیکھا ہے یہ باوجود کوشش کے یاد نہیں آیا تھا۔

”کوئی کام ہے مجھ سے؟“ میں نے اخلاقاً نرم لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔ لیکن ہمیں نہیں کسی اور کو تجھ سے کام ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

”اچھا۔ کس کو؟“ میں نے لہجے میں حیرت پیدا کی۔

”شانی......کو۔“ اس نے ”شانی اور کو“ کو الگ الگ کر کے کہا تو مجھے اس کا نام سن کر ناگواریت محسوس ہوئی۔ ایسے جیسے میں نے کڑوی گولی نگل لی ہو۔

”شانی کو......“ میں نے جان بوجھ کر زیرِ لب بڑبڑاہٹ کی۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

”ہاں۔ شانی کو۔ کیا اسے نہیں جانتے؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

”شانی نام کے تو بہت سے لوگ اس شہر میں موجود ہیں۔“ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا تم کس شانی کی بات کر رہے ہو۔ اس کا حدود اربع بتاؤ۔“

”مجھے تو یہ ڈراما باز لگتا ہے۔ یہ شانی کو جانتا ہے لیکن اقرار نہیں کر رہا۔“ مفلر والے کے ایک ساتھی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے بھی اسے گھور کر دیکھا۔

”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ میں نے مفلر والے سے پوچھا۔

”بتاتا ہوں، انتظار کرو۔“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم لوگ انتظار کرو۔“ میں جانے لگا تو انہوں نے روک لیا۔

”کہا نا، انتظار کرو۔“ مفلر والا درشتگی سے بولا تو مجھے اس پر غصہ آیا لیکن میں نے ضبط کرلیا۔

”میں تمہارا پابند تو نہیں ہوں۔“

”اب بننا ہوگا۔“ وہ بولا۔ ”اب خاموش رہو۔“

اس کے بعد اس نے اپنی قمیص کی جیب سے سیل فون نکالا اور کوئی نمبر پنچ کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شانی کو فون کر رہا ہے۔ نمبر پنچ کرنے کے بعد اس نے سیل فون اپنے کان سے لگایا اور رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مفلر والے کے دونوں ساتھیوں نے مجھے ایسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا جیسے اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو وہ مجھے بھاگنے نہ دیں۔

مفلر والے کا رابطہ ہو گیا اور میرے خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ وہ بولنے لگا۔

”ہاں شانی بھائی۔ ہاں ہاں۔ ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ یہ بالکل وہی ہے۔ نجو نے اسے ٹھیک پہچان لیا تھا۔ ہاں ہاں۔ تم بے فکر رہو۔ ہم اسے بھاگنے نہیں دیں گے۔ تم اس سے اپنا حساب چکتا کر لینا۔ اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ ہم اسے لے آتے ہیں۔ او کے۔ بے فکر رہو بھائی۔ تمہاری خاطر تو جان بھی حاضر ہے۔“

پھر نہ جانے شانی نے اس سے کیا بات کہی کہ اس نے

قہقہہ لگایا۔ اس کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ نجو نامی لڑکے کو جس کے چہرے پر کٹ کا نشان تھا، میں نے چائے کے ہوٹل پر شانی کے ساتھ دیکھا تھا جب میری شانی اور اس کے دوستوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی تھی تو یہ وہیں موجود تھا۔ اسی نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا ہوگا اور شانی کو اطلاع کر دی ہوگی جس نے اسے میرا تعاقب کرنے اور پھر گھیرنے کا ''حکم'' دیا ہوگا۔

مفلر والے لڑکے نے رابطہ منقطع ہونے پر سیل فون واپس جیب میں رکھ لیا اور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ بھئی! تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر تُو شرافت سے ہمارے ساتھ چلے گا تو اس میں تیری بہتری ہوگی۔''

''اگر نہ چلوں تو کیا کر لو گے؟'' میں نے نارمل انداز میں مفلر والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مفلر والے نے پہلے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر اپنا رخ میری طرف کیا اور سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ ''ہم تجھے زبردستی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اچانک مجھے اپنے دائیں طرف پہلو میں تیز دھار خنجر کی نوک چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تو میں نے پہلو کی طرف دیکھا۔ نجو نے ایک خنجر میرے پہلو کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی۔

''تُو شرافت سے چلتا ہے یا خنجر تیرے پیٹ میں گھونپ دوں۔ جلدی سے فیصلہ کر لے؟'' نجو نے زہرخند لہجے میں کہا تو میں... غصے کو ضبط کرتے ہوئے اندر ہی اندر پی گیا۔ یقیناً مفلر والے اور اس کے ساتھی لڑکے کے پاس بھی خنجر یا ریوالور ہوں گے لیکن ابھی تک انہوں نے شو نہیں کیے تھے۔

''یہ کیا بدمعاشی ہے؟'' میں نے احتجاجاً کہا۔

''ابھی تُو نے بدمعاشی دیکھی ہی کہاں ہے۔ اگر ہم بدمعاشی پر اُتر آئے تو تیرا حلیہ بھی بگڑ جائے گا۔ دیکھ بھئی! اگر تُو شرافت سے ہمارے ساتھ چلے گا تو ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔'' مفلر والا بولا۔ ''ورنہ شانی نے کہہ دیا ہے کہ اگر تُو چوں چرا کرے تو ہم تجھے موت کے گھاٹ اتار کر بھاگ جائیں۔ اب جلدی سے فیصلہ کر لے، ہمارے ساتھ شرافت سے چلو گے یا مرنا پسند کرو گے۔''

شاید مجھے مارنے والی بات اُس نے مجھے ڈرانے کے لیے کہی تھی۔ تاکہ میں خاموشی اور چوں چرا کیے بغیر ان کے ساتھ چل پڑوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس صورتِ حال کو کیسے ہینڈل کروں۔ خنجر کی نوک میرے پہلو کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور میری ذرا سی حرکت مجھے نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر مفلر والا دوبارہ بولا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے بے اختیار چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن جواب کوئی نہ دیا۔

نجو بولا۔ ''لگتا ہے یہ ہمارے ساتھ نہیں چلے گا۔ اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔''

مفلر والا دانت پیستا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تیری خاموشی کا مطلب ہے کہ تُو شرافت سے ہمارے ساتھ نہیں چلے گا؟''

''ہاں نہیں چلوں گا۔'' میں نے اس بار ترنت جواب دیا تو مفلر والا غصہ میں آ گیا۔

''نجو، ہاشم۔'' وہ زہریلی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن مخاطب اپنے دونوں ساتھیوں سے تھا۔ ''اسے باندھ کر یہیں بٹھاؤ، میں کار لے کر آتا ہوں۔''

نجو جلدی سے بولا۔ ''لیکن ہمارے پاس رسی تو نہیں ہے۔ اسے کس سے باندھیں۔''

مفلر والا چند لمحے گھوری سے مجھے نوازتا رہا پھر اس نے اپنے گلے سے مفلر اتار کر نجو کے حوالے کیا۔ اُس کی نظریں بدستور مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔

''اِس مفلر سے اس کی مشکیں باندھ دو۔ میں کار لے کر ابھی آیا۔ خیال رکھنا، یہ کافی چالاک بھی دکھائی دیتا ہے۔''

''تم بے فکر ہو کر جاؤ۔'' نجو نے کہا۔ ''اگر اس نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں اس کی ساری چالاکی اس کی ناک سے نکال دوں گا۔''

اُسی لمحے مفلر والے کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے چونکتے ہوئے جیب سے سیل فون نکالا۔

''شانی کی کال ہے۔ لگتا ہے وہ مکان پر پہنچ گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں کار لینے جا رہا ہوں۔ اس کی مشکیں باندھ دو۔''

یہ حکم صادر کرنے کے بعد اس نے کال اٹینڈ کی اور سیل فون کان سے لگاتا ہوا ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''جی شانی بھائی، بس بس ہم آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے

پاس ہی ہے۔''
پھراس کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہو کر اُس کے غائب ہوتے ہی غائب ہوگئی۔ نجو، ہاشم سے بولا۔''اس کے بازو پیچھے کرو، میں باندھ دوں۔''
ہاشم نے میرے بازوؤں کو موڑ کر پیچھے کیا تو نجو خنجر جیب میں رکھ کر میری مشکیں باندھنے کی غرض سے مفلر میرے بازوؤں کو باندھنے ہی لگا تھا کہ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے ہاشم کی گرفت سے اپنے بازو چھڑا لیے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے مڑتے ہی ہاشم کی ناک پر زور سے مکا جڑ دیا۔ ساتھ ہی میں نے جھکتے ہوئے نجو کے پیٹ میں بازو کی کہنی ماردی۔ ہاشم کے منہ سے تو چیخ ہی نکل گئی تھی جبکہ نجو صرف ''اوغ'' کر کے رہ گیا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے نجو کے ہاتھ سے مفلر جھپٹ لیا۔ نجو کے چہرے پر سناٹے کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ عین اسی لمحے اس نے اپنی شلوار کے نیفے سے خنجر نکال لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھل کاٹنے والا چاقو نما خنجر تھا جسے موڑ کر بند کیا جاتا تھا۔ اس نے خنجر موڑ کر بند نہیں کیا تھا ایسے ہی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق شاید بوقت ضرورت کام آسکے۔ وہ اب اس کے کام ہی آرہا تھا۔
''تیری......'' نجو مغلظات بکتا ہوا میرے قریب آیا ہی تھا کہ میں نے مفلر اس کے چہرے پر پھینک دیا۔ وہ بوکھلا کر رک گیا۔ میں نے اچھل کر ایک کِک اس کے سینے پر ماری تو وہ اچھل کر پشت کے بل ایک دھماکے سے سڑک پر گرا اور اس کے ہاتھ سے خنجر نکل کر لڑھکتا ہوا کہیں اندھیرے میں غائب ہوگیا۔
ہاشم خود کو قدرے سنبھال چکا تھا۔ وہ بھی مغلظات بکتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کا حملہ اپنے بازو پر روکا اور اس کے پیٹ میں یکے بعد دیگرے چار مکے جڑ دیئے۔ اس کے حلق سے ''اوغ'' کی آوازیں نکلیں۔ مکے کھانے کے باوجود اس نے سنبھلتے ہی میری گردن دبوچنے کی کوشش کی لیکن میں تیزی سے جھکائی دے کر خود کو نا صرف بچا گیا بلکہ میں نے ایک بار پھر اس کے پیٹ میں یکے بعد دیگرے مکے مارے۔ میں نے جیسے جیسے مکے مارے تھے وہ پیچھے کی طرف اچھلتا رہا تھا پھر وہ سنبھلنے ہی لگا تھا کہ میں نے ایک بار پھر اس کے ناک پر مکا جڑ دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ ناک پر رکھ لیے۔ اس کے ناک سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا اور اس کا چہرہ خون سے بھرتا جارہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لڑکھڑانے لگا۔ ایسے جیسے اس نے شراب پی ہو اور نشے میں دھت ہو اور خود کو نہ سنبھال پا رہا ہو۔ میں نے لٹو کی طرح گھومتے ہوئے اس کے پیٹ میں لات ماری تو وہ اچھل کر سڑک سے اٹھتے ہوئے نجو سے ٹکرا گیا اور وہ دونوں ہی سڑک بوس ہوگئے۔ قرب و جوار میں کوئی نفوس موجود نہیں تھا اس لیے کسی کی مداخلت کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔
وہ دونوں سڑک پر پڑے غصے اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ان دونوں پر بہ آسانی قابو پا سکتا ہوں۔
''اگر مجھ سے مزید لڑنا چاہتے ہو تو اٹھو...... آؤ۔'' میں نے انہیں طیش دلانے والے انداز میں کہا لیکن وہ دونوں بہ دستور سڑک پر پڑے مجھے گھورتے رہے۔
اُن کے نہ اٹھنے سے میں سمجھ گیا کہ اُن میں مجھ سے لڑنے کی مزید ہمت اور سکت نہیں ہے اس لیے اُن میں سے کوئی بھی نہ اٹھا۔
''تم دو ہو کر مجھ پر قابو نہیں پا سکے۔ بزدل کہیں کے...... افسوس ہوا ہے تمہاری مردانگی پر۔'' میں نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ میری باتوں پر طیش میں آجائیں گے اور مجھ سے پھر لڑنے بھرنے لگیں لیکن نہیں۔ ان میں ہمت اور جرأت ہی نہیں تھی شاید۔
میں نے نجو سے مخاطب ہو کر وارن کرنے والے انداز میں کہا۔''سنو نجو! اپنے شانی سے کہہ دینا۔ مجھے اس سے حساب کتاب چکتا کرنا ہے۔ میں بہت جلد اس سے ملنے آؤں گا۔ اسے اس کے انجام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''
پھر میں نے آگے بڑھ کر نجو کے پہلو میں زور سے ٹھوکر ماری تو وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے ایک ہمکاری بھری اور اس کے بعد میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔
میں نے چند گز کا فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ مجھے اپنے عقب سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں جس نے کافی دور تک سڑک کو روشن کر دیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مفلر والا کار لے آیا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کار وہیں رکی ہوئی تھی جہاں ہاشم اور نجو موجود تھے۔ اس کے بعد میں رکا نہیں بلکہ دوڑنے والے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔
یہ بات نہیں تھی کہ میں ان سے ڈر گیا تھا۔ دراصل میں

ابھی کسی مصیبت میں پڑنے کا متحمل نہیں تھا۔ ایک دو روز بعد یقیناً میری امریکا روانگی تھی۔ ایسی صورت میں اگر میں کسی مصیبت میں پھنس جاتا تو کئی مسائل جنم لے سکتے تھے اس لیے میں نے وہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ شانی سے تو میرا کافی حساب کتاب رہتا تھا۔ ابھی تو میں نے اسے اور اس کے باپ چودھری باسط کو بھی کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔

سڑک پر کسی کسی دکان یا کھمبے پر زرد بلب جل رہے تھے جن کی روشنی اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ دکانیں اور ورکشاپس بھی نہیں کھلی تھیں۔ دوڑتے دوڑتے میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے دیکھا تو کار اب میرے پیچھے ہی آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بے حد تیز تھی جیسے مجھے کار کے نیچے کچلنے کا ارادہ ہو۔

میں نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور اپنے بچاؤ کے لیے تدبیر کرنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے کار نے مجھے کچلنا چاہا تو میں تیزی سے ایک طرف ہو گیا اور کار کسی گولے کی طرح میرے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میں بروقت خود کو بچا گیا تھا اور یہی پھرتی ہی مجھے کار سے بچا گئی تھی۔

کار کچھ دور جانے کے بعد چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی رک گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کار سے وہی مفلر والا لڑکا برآمد ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ دندناتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے اکیلے آنے کا مطلب تھا کہ اس کے دونوں ساتھی اس کے ساتھ نہیں تھے۔

مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور اسی خطرے کے پیش نظر ہی میں جلدی سے تاریک گوشے میں ہو گیا تھا تاکہ وہ فوری طور پر مجھے تلاش نہ کر سکے۔ میرے دل کی دھڑکن بھی غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی تھی اور جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ وہ لڑکا تیز تیز چلتا ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے قرب وجوار کا جائزہ لیا تو مجھے چند فٹ کے فاصلے پر لکڑیوں کا ڈھیر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے لکڑی کا سالخوردہ سا ایک بڑا گیٹ بھی تھا جو شاید لکڑی کا ٹال تھا۔ میں جھکے جھکے انداز میں گریا پا چلتا ہوا لکڑیوں کے ڈھیر کی آڑ میں ہو کر بیٹھ گیا البتہ میری نظریں مفلر والے پر ہی مرکوز تھیں۔

مفلر والا لڑکا قریب پہنچ کر رکا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جھلاہٹ بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔ ”سالا کہاں چھپ گیا ہے۔ ایک بار نظر آ جائے گولی مارنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا۔“

میری نظریں اُسی پر ہی جمی ہوئی تھیں اور میں اس پر قابو پانے کے لیے موقع کی تاک میں تھا۔ وہ بدبخت کسی جونک کی طرح ہی میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ گو اگر اس کے پاس ریوالور نہ ہوتا تو میں براہِ راست آمنے سامنے اس کی مرمت کرتا۔ اس کے انداز واطوار بتا رہے تھے کہ وہ مجھے شوٹ کر کے ہی دَم لے گا۔ گو اس نے مجھے اپنی کار کے نیچے کچلنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن میں اپنی خوش بختی کی وجہ سے بچ گیا تھا۔

”سالے! کہاں چھپے ہو۔ سامنے آؤ۔“ وہ اونچی آواز میں چلّانے لگا۔

مجھے اس کے انداز پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں ضبط کر گیا۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر اپنی نظریں دوڑاتا رہا پھر اس کی نظر ایک جگہ ٹک گئی۔ جیسے اس نے ”مجھے“ دیکھ لیا ہو۔ میں بھی دَم سادھے اُس کی نقل وحرکت دیکھ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے اُسی طرف بڑھ گیا۔ میں نے لکڑیوں کے ڈھیر کی اُوٹ سے نکل کر دیکھا۔ وہ اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ کر رکا، بہ غور دیکھا اور جھلّا کر سڑک کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا۔

”تُو جہاں بھی چھپا ہے میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا سالے۔“ وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولا تو مجھے اس کے لہجے میں بھیڑیئے کی سی غراہٹ محسوس ہوئی۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ میں پولیس کو کال کر دیتا ہوں کہ ایک غنڈہ ٹائپ لڑکا سڑک کے درمیان ریوالور لیے لوگوں کو دھمکا اور ڈرا رہا ہے تو پولیس اسے یقیناً آ کر گرفتار کر لے گی۔

چنانچہ اسی ”نیک مقصد“ کے تحت میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا ہی تھا کہ عین اسی لمحے اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے بے اختیار مفلر والے کی طرف دیکھا۔ جیسے ہی گھنٹی بجی تو مفلر والا لڑکا بے اختیار چونک پڑا۔ میں نے جلدی سے سیل فون کا ایک بٹن پریس کر دیا تو گھنٹی بجنا بند ہو گئی لیکن اس کی لائٹ بہ دستور جل رہی تھی۔ مفلر والا چوکنا ہو گیا تھا اور اِدھر اُدھر بہ غور دیکھتے ہوئے سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے سیل فون بھی چھپا لیا تاکہ اس کی روشنی اُسے دکھائی نہ دے۔ پھر میں نے جھک کر سیل فون کی طرف دیکھا تو مرینہ کا نام چمک رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کال کاٹتے ہوئے سیل فون آف کر دیا۔

سیل فون آف کرتے وقت اس کی جو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی، اسپیکر پر ہاتھ رکھنے کی وجہ سے وہ آواز میرے ہاتھوں میں ہی دب گئی تھی۔ پھر میں نے سیل فون اپنی جیکٹ کی جیب میں منتقل کر دیا تھا۔

اچانک میں بے اختیار چونک پڑا۔ مفلر والا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اُدھر ہی آرہا تھا جدھر میں لکڑیوں کے ڈھیر کی اُوٹ میں تھا۔ شاید اسے میری اس طرف موجودگی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور اٹھ کر تیزی سے جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے سے ہوتا ہوا دوسری طرف آگیا۔ میں نے دیکھا کہ مفلر والا لکڑیوں کے ڈھیر کے قریب پہنچ کر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کے پاس موبائل نہیں تھا ورنہ وہ اس کی ٹارچ جلا کر لکڑیوں کے ڈھیر کے عقب میں ضرور دیکھتا۔

''وہ اِدھر بھی نہیں ہے۔ تو پھر کہاں چھپا ہوا ہے؟'' مفلر والا بڑبڑایا۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ وہ لکڑیوں کے ڈھیر کے عقب کی طرف آنے لگا۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اسی وقت لائٹ چلی گئی اور یک دم چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

لائٹ کے جاتے ہی اُس کے آگے بڑھتے قدم رک گئے اور وہ واپڈا کو مغلظات سے نوازنے لگا۔ اُس روز آسمان پر بھی بادلوں نے بسیرا کیا ہوا تھا اس لیے چاند کی روشنی بھی نہیں تھی۔ اب گہرے سناٹے کے ساتھ گہری تاریکی کا بھی راج ہو گیا تھا۔ جو میرے لیے خوش آئند تھی۔ میں دل ہی دل میں واپڈا کا شکریہ ادا کر رہا تھا جنہوں نے یہ ''نیک'' کام کر کے وہاں سے نکلنے میں میری مدد کر دی تھی۔

مفلر والا مغلظات بکنے کے بعد چپ ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ اب کیا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ مڑا اور لکڑیوں کے ڈھیر کی اُوٹ سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ نہ جانے اب وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اپنا سیل فون لینے گیا ہوتا کہ اس کی ٹارچ کی روشنی میں مجھے تلاش کر سکے۔ تاہم مجھے اُس کے وہاں سے جانے کی کوئی اُمید نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک مجھے اپنے عقب سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تو مجھے تاریکی میں دو ہیولے دکھائی دیئے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُدھر ہی آرہے تھے۔ میں ان ہیولوں کی چال ڈھال دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ ہاشم اور نجو ہیں۔

میں دل ہی دل میں اُن دونوں کو کوسنے لگا۔ اُن کی آمد میرے لیے اچھا شگون نہیں تھی۔ وہ دونوں میرے قریب سے گزرے تو نجو نے مفلر والے کو آواز دی۔

''نازو...... نازو......''

مفلر والے کا نام نازو تھا۔ یہ یقیناً اس کا ''نک نیم'' ہو گا۔ اصل نام نواز، نذیر یا نون سے کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ وہ مسلسل مفلر والے کو آوازیں دے رہے تھے۔

میرا خیال بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ وہ اپنی کار سے اپنا سیل فون نکال لایا تھا اور اس نے راستے میں ہی اس کی ٹارچ آن کر لی تھی۔ ٹارچ کی روشنی قدرے تیز تھی اور چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اُس مفلر والے لڑکے کا رُخ اب بھی لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف تھا۔ ایک ہاتھ میں اس نے سیل فون پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

میں فی الحال وہاں سے ''فرار'' نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے اور نازو مجھے گولی مارنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرے گا۔ چند منٹ سوچ و بچار کے بعد میں نے اُن تینوں سے نبٹنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس چارہ بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنی حفاظت کے لیے لکڑیوں کے ڈھیر سے ایک موٹی اور لمبی سی لکڑی بہ طور ''ہتھیار'' اٹھا لی، اور ان تینوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا تم نے اس چھوکرے کو کار کے نیچے کچل دیا ہے؟'' نجو کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''نہیں۔'' نازو کی آواز سنائی دی۔ ''وہ سالا میری کار کے نیچے آنے سے بچ گیا ہے۔''

''اوہو۔ تو کیا وہ فرار ہو گیا ہے؟'' اس بار ہاشم تشویش بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''نہیں۔'' نازو کی نفی میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ''وہ سالا یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ کم بخت بجلی نہ چلی جاتی تو میں نے اسے تلاش کر لینا تھا۔''

''وہ کہاں چھپا ہوا ہے؟'' نجو کی حیران کن آواز سنائی دی۔

''پاگل دے پُتر، مجھے کیا پتا وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔'' نازو نے اس بار پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اگر پتا ہوتا تو میں اسے تلاش کر رہا ہوتا؟ بے وقوفوں والے سوال کر کے میرا دماغ مت چاٹو۔ پہلے ہی میرے دماغ کی دہی

بنی ہوئی ہے۔ یہ سب تم دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم اسے قابو میں رکھتے تو اب ہمیں ایسے نہ خوار ہونا پڑ رہا ہوتا۔''

نازو کی بات درست تھی۔ مجھے بھی اتفاق تھا۔ میں اُن دونوں کی وجہ سے فرار ہوا تھا۔

''اچھا یار نازو، ناراض تو نہ ہو۔'' ہاشم کی منمناتی آواز آئی۔

''ناراض نہ ہوں تو کیا خوش ہوں؟ بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا ہے تم دونوں نے۔ ایک چھوکرے کو نہیں سنبھال سکے تم دونوں۔ یاد رکھو، اگر ہم اس سالے کو نہ پکڑ سکے یا اسے موت کے گھاٹ نہ اُتار سکے تو ہم موٹی رقم سے محروم ہو جائیں گے۔ شانی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم نے اس چھوکرے کو زندہ اس کے حوالے کیا تو وہ اس کے بدلے ہمیں موٹی رقم دے گا' اور اگر وہ مارا بھی گیا تب بھی وہ ہمیں موٹی رقم دے گا۔''

''کتنی رقم......'' ہاشم کا تجسس بڑھا تھا۔

''تقریباً پچاس ہزار......'' نازو نے جواباً کہا تھا۔

''پچاس ہزار۔ ہمیں بھی ہمارا حصہ دو گے نا؟'' اس بار نجو نے پوچھا تھا۔ پیسوں کا سن کر دونوں کی شاید باچھیں پھیل گئی تھیں اور وہ یکدم چوکنے ہو گئے تھے۔

''ہاں، ہاں۔ دوں گا حصہ۔ پہلے اس سالے کو تو تلاش کرو۔'' نازو کی جھلاہٹ بھری آواز سنائی دی۔ ''یاد رکھو، اگر تم اسے تلاش نہ کر سکے تو ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا۔ ذہن میں بٹھا لو اپنے۔''

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ نازو پاگلوں کی طرح مجھے کیوں تلاش کر رہا ہے۔ اسے پیسوں سے غرض تھی۔ وہ مجھے ہلاک یا زندہ پکڑ کر میرے بدلے شانی سے رقم بٹورنا چاہتا تھا۔

''تو پریشان نہ ہو یار۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔'' نجو کی آواز سنائی دی۔

''تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اسے تلاش کرو۔'' نازو کا لہجہ بہ دستور جھلاہٹ سے پُر تھا۔

''آؤ ہاشم، ہم اسے تلاش کرتے ہیں۔'' نجو کی آواز سنائی دی اور پھر وہ دوبارہ میری تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ میں چوکنا تھا لیکن مسئلہ نازو کے ہاتھ میں وہ ریوالور تھا جس سے مجھے نقصان پہنچ سکتا تھا اس لیے مجھے سب سے پہلے نازو پر قابو پانا تھا اور اس سے ریوالور چھیننا تھا۔

''تم اُس طرف دیکھو، میں اِس طرف دیکھتا ہوں۔'' نازو نے ان دونوں کو حکمیہ انداز میں کہا اور میں نے دیکھا کہ دو ہیولے سڑک کی دوسری طرف جا رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ ہیولے ہاشم اور نجو تھے اور نازو لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی کی وجہ سے مجھے نازو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کافی دیر گزرنے کے باوجود بجلی نہیں آئی تھی اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ بجلی کم از کم ایک گھنٹے تک نہ آئے تاکہ میں ان پر قابو پا کر یہاں سے بحفاظت چلا جاؤں۔

نازو لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس پہنچ کر ٹارچ کی روشنی میں پُر غور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے خود کو اس حد تک جھکایا ہوا تھا کہ وہ مجھے بہ آسانی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جھکے جھکے لکڑیوں کے ڈھیر کے گرد گھومتا ہوا نازو کے عقب میں جانے لگا۔ نازو اُس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں چند منٹ پہلے میں موجود تھا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

شاید نازو کو میرے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ جلدی سے پلٹا ہی تھا کہ میں نے چشم زدن میں لکڑی اس کے سر پر مار دی۔ اس کے منہ سے دلخراش چیخ نکلی اور وہ لہرا کر لکڑیوں کے ڈھیر پر ہی گر گیا۔ اُس کی چیخ نے فضا کے سناٹے کو چیر دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہاشم اور نجو اس کی چیخ سن کر دوڑے دوڑے اس طرف چلے آئیں گے۔ نازو کے ہاتھ سے ٹارچ اور ریوالور دونوں ہی نکل کر لکڑی کے ڈھیر پر گر گئے تھے۔

ٹارچ کا رخ لکڑیوں کے ڈھیر پر تھا اس لیے اس کی روشنی بھی تقریباً مدھم ہو گئی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے ریوالور بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نازو لکڑیوں کے ڈھیر پر بے سدھ پڑا تھا۔

اچانک میری سماعت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ٹکرائیں تو میں نے جلدی سے مڑ کر عقب میں دیکھا تو مجھے سڑک کی دوسری طرف ہاشم اور نجو کے ہیولے دکھائی دیئے۔ وہ لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف ہی آ رہے تھے۔

''نازو...... نازو...... کہاں ہو تم...... یہ چیخ کس کی تھی؟'' ہاشم آتے ہوئے نازو کو بھی پکار رہا تھا۔

میں الٹے قدموں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس پہنچے تو میں

نے پہلے ایک ہیولے کے سر پر لکڑی ماردی۔ وہ چیخ مار کر وہیں گرا ہی تھا کہ میں نے دوسرے ہیولے کے سر پر بھی لکڑی ماردی۔ وہ بھی اپنے ساتھی کے اوپر گر گیا اور دونوں کراہنے لگے۔ میں نے لڑکی وہیں پھینکی اور سڑک پر پہنچ کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

ان تینوں کی وجہ سے پہلے ہی میرا کافی وقت ضائع ہوگیا تھا۔ مرینہ الگ پریشان ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ میرے سیل نمبر پر حیدر الماس نے بھی کال کرنے کی کوشش کی ہو اور جب انہیں میرا نمبر بند ملا ہوگا تو ظاہر سی بات ہے وہ پریشان ہو گئے ہوں گے۔ میں تھوڑی ہی دور پہنچا تھا کہ بجلی آگئی اور اردگرد موجود کھمبوں اور گھروں کی پیشانیوں پر لگے بلب روشن ہوگئے۔ میں نے تھوڑی دور آنے کے بعد اپنا سیل فون آن کرلیا۔

جیسے ہی میں نے فون آن کیا تھا تو چند منٹوں کے بعد مرینہ کی کال آگئی۔ وہ یقیناً بے چین ہوگی کیونکہ میں نے اس کی کال کاٹ دی تھی اور سیل فون بند کردیا تھا۔

سیل فون یس کرنے کے بعد میں نے اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''بولو مرینہ۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں بھیا۔ سب خیریت ہے۔'' مرینہ نے جواباً کہا۔

''آپ کی پریشانی ہورہی تھی۔ آپ نے کال کاٹ دی تھی اور فون بھی بند کردیا تھا۔ خیریت تو تھی نا؟''

''ہاں خیریت تھی۔'' میں نے کہا۔ ''گھر آکر بتاؤں گا۔''

''آپ گھر کب آئیں گے۔ امی آپ کا پوچھ رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میں گھر ہی آرہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

پھر میں نے کال منقطع کرکے سیل فون جیب میں رکھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بارونق علاقے کی طرف بڑھتا چلا گیا تاکہ وہاں سے آٹو رکشے میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو سکوں۔

☆......☆

دو روز مزید گزر گئے۔ اُس روز صبح کے دس بج رہے تھے کہ اچانک آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بجلی بھی کڑکنے لگی تھی۔ بجلی کی کڑک اتنی زوردار تھی کہ دل دہل جاتے تھے۔ کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش ہوسکتی تھی۔ میں اس وقت گھر پر ہی تھا۔ ممانی تو وہیں ٹھہری ہوئی تھیں لیکن ماموں جان آج صبح ہی کسی ضروری کام سے چلے گئے تھے اور جاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ وہ شام تک آجائیں گے۔

ماموں اور ممانی جان کے آنے سے امی کی طبیعت بھی کافی حد تک بہل گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتا کرتی جارہی تھیں۔ ویسے بھی میں امریکا جارہا تھا اس لیے ماموں کا وہاں ہونا ضروری تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب میری امریکا روانگی کا وقت آئے گا تو میں ماموں سے علیحدگی میں بات کرکے انہیں اعتماد میں لے لوں گا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ حیدر الماس

کال کر رہے تھے۔ میں نے کال اٹینڈ کر لی۔ سلام ودعا اور حال احوال کے بعد بولے۔ ”تمہارا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار ہو گئے ہیں۔“

”شکریہ انکل۔“ میں نے جوش سے بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”امریکا روانگی کب ہے میری؟“

”آج ویزے کے لیے اپلائی کر دیا جائے گا۔“ اُنہوں نے اطلاع دی۔ ”جیسے ہی ویزا آئے گا تم روانہ ہو جاؤ گے۔“

میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ بات میرے ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔

”اور ہاں، تم امریکا اکیلے نہیں جا رہے۔“ حیدر الماس نے کہا تو میں چونک پڑا۔

”کیا مطلب انکل۔“ میں حیرت سے مستفسر ہوا۔ میں کبھی کبھی ان کو انکل بھی کہہ کر پکارتا تھا۔ ”کیا میرے ساتھ کوئی جا رہا ہے؟“

”ہاں۔“ جواباً وہ صرف یہی بولے۔

”کون......؟“ میں متجسس ہوا۔

”بابر......“

”بابر۔“ میں نے زیرلب دہرایا۔

حیدر صاحب کہہ رہے تھے۔ ”جب میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم اپنی بہن کی تلاش میں امریکا جا رہے ہو تو وہ بھی بضد ہو گیا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔ میں نے سوچا کہ چلو ایک اکیلا ہی ہوتا ہے اور ایک اور ایک گیارہ ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ میں نے ہامی بھر لی۔ ”جیسا آپ کو مناسب لگے۔“

”کیا تمہیں برا تو نہیں لگا، میں نے تم سے پوچھے بغیر ہی بابر کو بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“ وہ مستفسر ہوئے۔

”نہیں انکل، مجھے کیوں برا لگے گا۔ آپ میرے محسن ہیں اور آپ نے ہر مشکل اور ہر برے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ نہ دیتے تو شاید میں زندہ بھی نہ بچ پاتا اور اب تک چودھری باسط یا اسماعیل شاہد مجھے قبر میں اتار چکا ہوتا۔ آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔“ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا، اب اموشنل مت ہو۔“ وہ میرے خاموش ہونے پر فوراً بولے۔ ”اب میں فون رکھتا ہوں، تمہیں اگر وقت ملے تو میری طرف چکر لگا لینا۔ گپ شپ کر لیں گے۔“

میں نے ”ٹھیک ہے انکل“ کہا تو انہوں نے اللہ حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

بابر عرف جوکر کا میرے ساتھ امریکا جانا فضول تھا۔ نجانے وہاں میرے ساتھ کیا حالات پیش آئیں، مجھے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے اس بارے میں تو میں خود بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اب حیدر الماس نے کہہ دیا تھا تو میں نے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کو ماموں آئے تو میں نے انہیں امریکا روانگی کے متعلق بتایا۔ پہلے تو وہ حیران ہوئے پھر جب میں نے انہیں اپنے امریکا جانے کے مقصد کے بارے میں بتایا تو انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

”یار! تم اکیلے دشمنوں سے لڑتے پھر رہے ہو، روزینہ بیٹی کو تلاش کرتے پھر رہے ہو مجھے خبر تک نہیں ہے۔“ وہ حیران تھے اور مستفسر ہوئے۔

”آپ سے بول چال بند تھی اس لیے......“ میں نے جھکے سر اور دھیمے لہجے میں کہا۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ”اب تو بول چال ہے نا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ روزینہ بیٹی کے اغوا میں حکومتی پارٹی کے رکن چودھری باسط کا ہاتھ ہے۔ میرے بھی بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں، میں چودھری باسط کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔“

ماموں جان کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے تھے اور چہرہ سرخ بھی ہو گیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ ماموں جان کے بھی بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے لیکن میں اُس وقت الجھا ہوا تھا اس لیے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ بہرکیف اب وقت بھی تو گزر چکا تھا اور مجھے امریکا بھی روانہ ہونا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔

”ماموں جان! اب گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ میرے امریکا جانے کے بارے میں امی کو پتا نہ چلے ورنہ ان کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔“

”ہاں ہاں سمجھتا ہوں۔“ ماموں جان بولے۔ ”تمہاری ماں کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“

”شکریہ ماموں۔“

”کیا میں بھی تمہارے ساتھ امریکا چلوں؟“

میں ٹھٹکا۔ ماموں جان قدرے سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔
''نہیں ماموں جان! آپ کو میرے ساتھ امریکا جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ گئے تو پھر امی اور مرینہ کا کون خیال رکھے گا۔ میں انہیں اللہ کے بعد آپ کے سہارے ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے بس آپ کی فیور چاہیے۔''
''ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اپنی بہن اور بھانجی کا بھی تو خیال رکھنا ہے مجھے۔'' ماموں جان اثبات میں گردن ہلا کر بولے۔ ''ٹھیک ہے علی پتر۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے اور تم روزینہ بیٹی کو لے کر خیریت سے واپس آ جاؤ۔''
''آمین۔'' میں نے دل سے آمین کہا۔
''روانگی کب ہے؟'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔
''ابھی دیر ہے۔ انکل حیدر نے ویزے کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔ جیسے ہی ویزا آئے گا تو میں روانہ ہو جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔
''ہمم۔'' انہوں نے ہمکاری بھری۔ ''وہاں رہائش کس کے پاس رکھو گے؟''
''انکل حیدر کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ان کے وہاں بھی کافی لوگوں سے تعلقات ہیں۔ میرے ساتھ ان کا بھتیجا بھی جا رہا ہے۔''
ماموں جان نے ایک بار پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔ میں اب امی اور مرینہ کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔
مجھے اب ویزے کا شدت سے انتظار تھا اور دل ہی دل میں ہر وقت دعا گو رہتا تھا کہ جلد ہی ویزا آ جائے اور میں امریکا روانہ ہو جاؤں۔
اگلے روز میں حیدر الماس سے ان کی رہائش گاہ پر ملا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے دوست ایس پی شیراز خان کو اسماعیل شاہد کے ایک خفیہ اڈّے کی اطلاع ملی ہے جہاں وہ لڑکیوں کو اغوا کے بعد قید رکھتا ہے اور پھر انہیں خفیہ طور پر امریکا بھجوا دیتا ہے۔ وہ آج رات اُس خفیہ اڈے پر چھاپا مار رہے ہیں۔ انہوں نے آپریشن کے لیے ٹیم تشکیل دے دی تھی۔
''کیا آپ بھی اس آپریشن میں شامل ہوں گے؟'' میں نے استفسار کیا۔
''ہاں۔'' انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آج سے اسماعیل شاہد کے برے دن شروع ہو جائیں گے۔ اسے قانون کے شکنجے میں آنے میں دیر نہیں لگے گی۔''
جوش و جذبات سے حیدر الماس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مجھے بھی خوشی ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔
''اسماعیل شاہد کا اڈا کس علاقے میں ہے؟''
''اس بارے میں ایس پی شیراز خان کو ہی معلوم ہے۔'' وہ بولے۔ ''دراصل یہ آپریشن انتہائی خفیہ رکھا جا رہا ہے تاکہ اسماعیل شاہد یا اس کے حواریوں کو آپریشن کے بارے میں بھنک نہ پڑ جائے۔ اگر اسے بھنک پڑ گئی تو وہ فوراً لڑکیوں کو وہاں سے غائب کرا دے گا اور نشانات تک مٹا دے گا۔''
اُن کی بات درست تھی۔ میں نے مزید پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے تو خوشی ہو رہی تھی کہ اسماعیل شاہد کے گرد آہستہ آہستہ شکنجہ کسا جا رہا تھا، پھر میں ان سے اجازت لے کر اپنے گھر آ گیا۔
اگلے روز قومی اور مقامی اخبارات اسماعیل شاہد کے خفیہ اڈّے کے حوالے سے بھرے پڑے تھے۔ نیوز کے مطابق پولیس نے بہاولپور روڈ پر ایک قصبے میں ایک مکان پر چھاپا مارا تو وہاں سے چھ لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں اور ایک مرد پکڑا گیا تھا۔ دو مرد موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جن کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے تھے۔ مکان میں ایک تہہ خانہ بنایا گیا تھا جہاں لڑکیوں کو قید کیا گیا تھا۔ وہ لڑکیاں ایک دو ہفتے قبل ہی جنوبی پنجاب کے مختلف شہروں سے اغوا کر کے وہاں لائی گئی تھیں۔
لڑکیوں کے بیانات کے مطابق، وہاں پر موجود غنڈوں نے ان پر جسمانی، ذہنی اور جنسی تشدد بھی کیا تھا۔ انہوں نے ان کو خدا اور رسولؐ کے واسطے دیئے تھے لیکن ان شیطانوں پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ان کو بتایا تھا کہ چند روز کے بعد وہ امریکا جا رہی ہیں جہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گی۔ پوری دنیا میں ان کی دھوم مچ جائے گی۔ انہیں دھمکیاں بھی دی گئی تھیں کہ اگر کسی لڑکی نے شور شرابا کرنے، زبان کھولنے یا تنگ کرنے کی کوشش کی تو نا صرف انہیں بلکہ اُن کے گھر والوں کو مار دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے وہ لڑکیاں سہم گئی تھیں اور زبانوں کو تالے لگانے کے ساتھ ہی وہ امریکا جانے پر تیار ہو گئی تھیں۔
اخبارات میں لڑکیوں اور پکڑے جانے والے مرد کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ وہ سب لڑکیاں غریب اور پسماندہ

گھرانوں سے تھیں۔ کسی کا باپ مزدور تھا، کسی کا باپ کھیتی باڑی کرتا تھا تو کسی کا باپ دوسرے شہروں میں ملازمت کرتا تھا۔شکل وصورت سے وہ لڑکیاں خوبصورت اور جسمانی طور پر اسمارٹ تھیں۔ میری معلومات کے مطابق ڈارک ویب کمپنیاں ایسی لڑکیوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں اور ان کے دام بھی زیادہ لگتے ہیں۔لڑکیاں انتہائی معصوم، خوبصورت اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ جبکہ مرد انتہائی خرانٹ دکھائی دیتا تھا۔علاوہ ازیں خبر کے مطابق مرد نے ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی کہ وہ خفیہ اڈا کس کی ملکیت ہے اور اس نے کس کے کہنے پر لڑکیوں کو اغوا کر کے وہاں رکھا تھا۔اس کے فرار ہونے والے ساتھی کہاں چھپے ہوں گے اور کس کی پشت پناہی حاصل تھی انہیں۔

ایس پی شیراز خان کا بھی بیان چھپا تھا۔انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں اس اڈّے کی خفیہ اطلاع ملی تھی اس لیے انہوں نے فوراً ہی اس اڈے پر ریڈ کیا تھا۔ برآمد ہونے والی لڑکیوں کو ان کے گھروں میں پہنچا دیا گیا تھا اور وہ موقع پر پکڑے گئے ملزم سے اگلوانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی پشت پر کون ہے۔

خبر میں حیدر الماس کا نام تو شائع ہوا تھا لیکن ان کی تصویر شائع نہیں ہوئی تھی۔ بہرکیف ساری خبریں پڑھنے کے بعد مجھے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اپنے ''طریقے'' سے ملزم سے اس کے فرار ہونے والے ساتھیوں اور پشت پناہی کرنے والے اسماعیل شاہد کا نام اگلوا لے گی۔گو ایسے لوگ بڑی مشکل سے اپنے ''باس'' کا نام بتاتے ہیں لیکن زیادہ دیر قانون کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

میں نے حیدر الماس کو بھی فون کر کے اس کامیاب آپریشن کی بابت مبارک باد دی۔انہوں نے مجھے تاکید کی کہ میں جب بھی ان کی کوٹھی پر آؤں تو انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کروں...کیونکہ ان کی اطلاع کے مطابق اسماعیل شاہد کے اڈے پر چھاپے کے بعد وہ مجھے ہر قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اس لیے میں محتاط ہو گیا تھا۔

حیدر الماس کی ہدایت کے بعد میں گھر سے بہت کم نکلنے لگا تھا۔ میرا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔ یہ سب کچھ احتیاط کے تناظر میں تھا۔کئی روز گزرنے کے بعد شانزے سے بھی میرا رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔میں نے کئی بار اس کے سیل نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا فون سوئچڈ آف جا رہا تھا۔ مجھے انجانے وسوسے ڈس رہے تھے کہ کہیں چودھری باسط کو ہمارے ''تعلقات'' کے بارے میں علم تو نہیں ہو گیا۔

وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ دس روز ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ویزے کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ دن بہ دن میری بے چینی اور اضطراری کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی حیدر الماس سے ویزے کے متعلق دریافت کر لوں۔ چنانچہ میں انہیں کال کرنے کے لیے نمبر پنچ کر رہا تھا کہ بابر عرف جوکر کی کال آ گئی۔

میرے دل میں خیال آیا کہ یقیناً ویزے آ گئے ہوں گے اس لیے بابر مجھے خوش خبری سنانے کے لیے کال کر رہا ہو گا۔ میں نے کال اٹینڈ کرتے ہی سیل فون کان سے لگاتے ہوئے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''لگتا ہے ویزے آ گئے ہیں۔ کب ہے ہماری امریکا روانگی؟''

''علی......ابھی ویزے نہیں آئے۔'' بابر نے متوحش زدہ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں پریشانی کی جھلک واضح محسوس ہوئی تھی۔

''بابر۔تم ٹھیک تو ہو۔کیا ہوا ہے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''انکل حیدر......'' وہ صرف اتنا ہی بول سکا اور خاموش ہو گیا۔

''انکل حیدر......'' میں بے اختیار چونکا۔ ''کیا ہوا ہے ان کو۔وہ خیریت سے تو ہیں نا؟''

مجھے میرا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔اُس کی دھڑکن بھی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ مجھے اپنے کانوں میں ''دھم دھم'' بجاتی سنائی دے رہی تھی۔

''نن۔نہیں......'' بابر بہ مشکل بولا۔

''کیا ہوا ہے انکل کو؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ بابر۔خاموش کیوں ہو......؟''

''انکل کو اغوا کر لیا گیا ہے۔'' اُس نے بہ مشکل تشویش بھرے لہجے میں اطلاع دی۔ شاید وہ صدمے کے زیرِ اثر تھا اس لیے اس سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی بات سن کر نا صرف میں چونک پڑا بلکہ مجھے بھی اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی اور جسم میں سرد سی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

کتابِ عشق

محترم و مکرم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم......!
ایک اور سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ یہ بھی بتادوں کہ اس سچ بیانی میں تمام کرداروں کے نام تبدیل کردیے ہیں اور افسانوی رنگ میں بھی اضافہ کردیا ہے تاکہ قارئین کو پسند آجائے۔
کنیز زہرہ
(لاہور)

دربار میں معمول کی چہل پہل تھی۔ بوڑھے، جوان، عورتیں مرد سب ہی اپنی اپنی مرادیں لیے ننگے پیر حاضر تھے۔ ایک طرف وجد میں دھمال ڈالتے ملنگ جب کہ دربار کے وسیع و عریض صحن کے دوسری جانب بٹتے لنگر کے پاس گویا مرد و زن کی ایک لائن لگی تھی۔ کچھ لوگ وسیع برآمدے کو پھلانگ کے اندر کمرے میں بنی قبر کی طرف دعا مانگنے جا رہے تھے۔ کچھ دعا مانگ کے باہر نکل رہے تھے۔ وجد میں گھومتے ملنگ کے پیر بے ربط انداز میں تھرک رہے تھے۔

یوں جیسے ضدی بچہ کوئی فرمائش پوری نہ ہونے پہ ضد کے انداز میں پیر پٹختا ہو۔ خاموشی کی زبان میں کسی دکھ پہ احتجاج کرتا ہو۔

''کیا کر رہی ہو، راستے میں کیوں رک گئیں جلدی چلو یہ نہ ہو کہ حضرت بی بی وہاں سے اٹھ جائیں۔ پہلے ہی دو دن سے چکر لگا رہے ہیں مگر ملاقات نہیں ہوئی۔'' فرحانہ جو کہ ملنگ کے تھرکتے قدموں میں چھپے جنون کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سمیرا کا... کاندھا ہلا کے مخاطب کرنے پہ وہ چونک کر سمیرا کا ہاتھ پکڑے دربار کے پچھلے صحن کی طرف چل دی۔ پچھلے صحن کے کونے میں لگے گھنے درخت کی چھاؤں تلے آلتی پالتی مارے بیٹھی عورت کے منہ پہ لمبا گھونگھٹ تھا جو اس کی گود میں گر رہا تھا۔ وہ دنیا سے بے نیاز انگلی سے گرد آلود فرش پہ عجیب ہیئت کی تصاویر بنا کے مٹا رہی تھی۔ یوں جیسے دنیا میں اس سے اہم کوئی کام نہیں۔ سیاہ لباس گرد آلود تھا۔ ہلکی جھریوں سے اَٹے ڈھانچے سے ہاتھ کبھی خوبصورت رہے ہوں گے مگر اب بدصورت تھے۔ بے تحاشہ بڑھے ہوئے ناخن میل سے سیاہ تھے۔ میلے چکٹ سیاہ آنچل میں بدبو کے بھبھوکے اڑ رہے تھے۔ سمیرا نے جو پہلی بار حضرت بی بی سے مل رہی تھی بے اختیار اپنا دوپٹا اپنی ناک پہ رکھا۔

''حضرت بی بی! یہ میری ہمسائی ہے۔ اس کے شوہر کا رزق کا کوئی سلسلہ نہیں یہ بیچاری بہت پریشان ہے دعا کریں۔'' فرحانہ نے اسے گھورتے ہوئے مدعا بیان کیا۔

''حق اللہ حق اسے کہہ کہ اپنی میں مکائے۔ (ختم کرے) اس پہ بڑی دعاؤں کا سایہ ہے۔ عرش تک نہیں پہنچتی وہ دعائیں، جانتی ہو کیوں؟'' انگلی سے ایک دفعہ پھر وہ عجیب سی کھینچی گئی لکیریں مٹاتے... فرحانہ سے مخاطب ہوئی۔

''کیوں حضرت بی بی! کیا غلطی ہوئی ہے اس سے۔ بتا دیں مداوا کر دے گی یہ۔ بول کرے گی نا مداوا۔'' فرحانہ نے اسے یقین دلاتے ہوئے پاس بیٹھی سمیرا کو کہنی ماری۔

''ہاں حضرت بی بی، میں جو آپ کہیں گی وہ کروں گی مگر میرے شوہر کو نوکری مل جائے۔ پتا نہیں کس نے ہمارا رزق باندھ دیا ہے۔ خدا غارت کرے اسے۔'' ناک سے چادر ذرا سی ہٹا کے اپنے نادیدہ دشمن کو لعنت ملامت کی۔

''تو ہے اپنی دشمن تجھ میں۔ ہے وہ رکاوٹ۔ جو تیری عرضی ساتویں آسمان تک نہیں جانے دیتی۔ تیرے ہی اعمال ہیں جو تیرے رزق کی رکاوٹ ہیں۔ جا انہیں درست کر،



خود سے فلک تک کا راستہ ہموار کر، رب کے انسانوں کے لیے یوں ہو جا جیسا تو رب کو اپنے لیے دیکھنا چاہتی ہے۔''

اب وہ پھر سے عجیب سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''میں سمجھی نہیں بی بی! کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟'' سمیرا واقعی نہیں سمجھی تھی۔

''اک قصور تیری سمجھ کا بھی تو ہے پگلی! جس میں بات بھی وہ سماتی ہے جو تمہارے مطلب کی ہو۔ دل میں خواہشوں کے پتلے نہ بنایا کر اگر بنا بھی بیٹھے تو انہیں سجدے نہ کیا کر۔ چھوڑ دیا کر اس رب رحیم پہ جس کے ہاتھ میں دو جہانوں کی ڈور ہے۔'' وہ پھر اپنے بنائے ہوئے بد وضع خاکے خود اپنے ہاتھوں سے ملیامیٹ کر رہی تھی۔

''اچھا حضرت بی بی! میں سب سمجھ گئی۔ اسے بھی میں سمجھا دوں گی۔ آپ بس دعا کر دیجئے گا۔'' عاجزی سے کہتے ہوئے سمیرا اسے اٹھا کے وسیع و عریض برآمدے کی طرف لے گئی۔ وہ کئی ماہ سے باقاعدگی سے یہاں آتی تھی۔ وہ حضرت بی بی کی کئی باتیں سمجھنے لگی تھی۔

''کیا سمجھ گئی ہو مجھے بھی تو سمجھاؤ۔'' برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کے بیٹھتی فرحانہ جیسے ابھی بھی الجھی ہوئی تھی۔

''سادہ سی بات نہیں سمجھی تم؟ وہ کہہ رہی تھی جیسا مہربان اور دونوں ہاتھوں سے رزق کے خزانے لٹانے والا تم رب کو اپنے لیے دیکھنا چاہتی ہو ایسے ہی حسب توفیق تم بھی بن جاؤ۔ رزق بانٹنے والی لوگوں کی مدد کرنے والی پھر دیکھ رب تمہیں کہاں کہاں سے دیتا ہے۔'' اس کے پاس ہی بیٹھ کر وضاحت سے سمجھاتے ہوئے سمیرا کے چہرے پہ دھیمی مسکان سج گئی۔

''اور وہ کیا بنا رہی تھیں..... مجھے کیوں کہہ رہی تھیں کہ میں خواہشوں کے بت بناتی ہوں۔'' ناسمجھی سے پوچھتی سمیرا کے لہجے میں استعجاب ہی استعجاب تھا۔

''وہ تمہیں سمجھا رہی تھیں کہ خواہش کے پیچھے کبھی مت بھاگنا۔ وہ خواہشات کو بد وضع لکیروں میں ڈھال کے مٹا رہی تھی۔ خواہشات کی ڈسی ہوئی ہیرا سے دل کی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔''

اب حضرت بی بی! اپنی جگہ سے اٹھ کے دھیرے دھیرے وجد کے عالم میں جھوم رہی تھیں۔ تب ہی تیز ہوا کے جھونکے نے ان کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ سمیرا جو فرحانہ کی آخری بات پہ الجھ گئی تھی اور کچھ پوچھنے ہی والی تھی کہ بے

کیمیائی ہتھیار
(Chemical Weapons)

کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کچھ زیادہ پرانا نہیں اس کی ابتداء 22 اپریل 1915ء کو کی گئی اس ضمن میں جرمن فوجوں کے ذریعے، بعض کیمیائی اسلحوں کا پہلی دفعہ استعمال کلورین گیس کے کیپسول سے گیس خارج کر کے کیا گیا۔ 25 ستمبر 1915 کو برطانیہ بھی میدان میں آ گیا اور اس نے بھی کلورین گیس کے کیپسولوں سے گیس خارج کرنے کا حربہ اپنایا۔ 21 فروری 1916ء کو فرانسیسی فوجوں کے ذریعے پہلی بار کیمیائی فوسجن گیس استعمال کر کے کیا گیا۔ یکم جولائی 1916ء کو فرانسیسی فوج کے ذریعے پہلی بار زنک آکسائیڈ کے کیمیائی مرکب کا استعمال کیا گیا۔ 12 جولائی 1917ء کو فلینڈریا کی جنگ میں جرمن فوج نے پہلی بار ایبرٹ گیس استعمال کی۔ 1954ء میں امریکا کی بری فوج میں دوہرا اثر رکھنے والے ہتھیار بنانے کا آغاز ہوا۔ 1969ء میں امریکا نے کیمیائی جنگ کا دائرہ جنوب مشرقی ایشیا سے کمپوچیا تک بڑھا دیا۔ 1980ء سے 1988ء کے درمیان ایران عراق جنگ میں بھی کیمیائی ہتھیار استعمال کیے گئے۔ 1989ء میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس میں 149 اقوام نے کیمیائی ہتھیاروں کو متروک کرنے کا عہد کیا۔ 1992ء میں کیمیائی ہتھیاروں کے معاہدے پر 159 ممالک نے دستخط کیے، لیکن صرف 32 ممالک نے اس کی توثیق اور جب تک 65 مزید ممالک اس کی توثیق نہ کر دیں، عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔

مرسلہ: فہیم الدین، کراچی

اختیار چیخ پڑی۔ حضرت بی بی! کے چہرے کی زخم آلود جلد تازہ گوشت کے لوتھڑے کی مانند سرخ تھی جیسے ابھی خون رسنے لگے گا۔ کہیں کہیں سے کھرنڈ بھی جلد سیاہ پڑ رہی تھی۔ نیچے والا ہونٹ جیسے سرے سے تھا ہی نہیں۔ ایک آنکھ کی جگہ سیاہ سوراخ تھا۔ غرض ان کا چہرہ اس قدر بھیانک تھا کہ وہ اپنا چہرہ موڑ چکی تھی۔ سر جھکائے گول گھومتی حضرت بی بی کے پیروں میں تیزی آئی تھی۔ گرد آلود سیاہ بال جیسے اس کے جھکے ہوئے چہرے کو ڈھانپ چکے تھے۔ سمیرا نے دائیں ہاتھ کی مخملیں انگلیاں اپنے لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں پر رکھ کے اپنی چیخ روکی اس کی آنکھیں نم تھیں۔

''فرحانہ باجی! آپ جانتی ہیں حضرت بی بی کو؟ کیسے ہوئی ان کی یہ حالت۔'' سمیرا کو لگا اس کی آواز اس کے حلق میں گھٹ رہی ہے۔ بدقت اتنا بول کے وہ چپ کر گئی۔

''انہیں کون نہیں جانتا تم بھی تو جانتی ہوا نہیں۔ ایک زمانے میں تم بھی ان کی فین تھی۔ اس کے ہر مکالمے پہ گھنٹوں واہ واہ کرتی تھیں۔ ان پہ فلمائے گئے گیت کی تم فین تھیں۔'' فرحانہ نے بتایا تو اس کی نظریں دائیاں ہاتھ فضا میں بلند کیے سبک رفتاری سے گھومتی حضرت بی بی پہ جم گئیں۔

''ستارہ ناز؟'' سرگوشی کی صورت ایک نام اس کے لبوں سے نکلا تھا جس پہ خود حیران ہوگئی۔ یہ ناممکن تھا۔ کہاں عرش سے اتری پری اور کہاں یہ بدصورت چہرے والی جوگن۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ مغرب میں کچھ دیر باقی تھی۔ دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر کے مٹی سے لپے آنگن میں بچھی چارپائی پر بیٹھے دو نفوس اپنے کام میں مگن تھے۔ اوائل اکتوبر کی شامیں خوشگوار ہو چلی تھیں۔

''نانی! اب تو آپ خوش ہیں نا؟ میں نے آج پورا قرآن پاک حفظ کر لیا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے میں امیر ہوگئی ہوں۔'' دل کھینچ آواز میں قرأت سے قرآن کریم کی آخری آیت بہ آواز بلند سناتی احمریں نے پُرجوش لہجے میں کہا تو نجمہ خاتون مسکرا دیں۔

''ہاں یہ تو ہے آج میری پری فرشتوں میں شمار ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ قرآن کو سینے میں اتارنے والے نیک لکھنے والوں میں سے ہیں۔ نیک لکھنے والے یعنی فرشتے۔'' نجمہ خاتون نے اپنی ساڑھے پندرہ سالہ پُرنور باوضو چہرے پہ آسمانی اسکارف لپیٹے معصومانہ سوال کرتی نواسی کا چہرہ فرطِ جذبات سے چوم کر کہا۔

''نانی نواسی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں ہم بھی تو سنیں۔'' تنگ سی ڈیوڑھی سے سائیکل گزار کے اندر لاتے نانا نے مسکرا کے پوچھا۔

''ارے حکمت صاحب! بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ ماشاء اللہ سے ہماری احمریں نے آج قرآن پاک پورا حفظ کر لیا ہے۔'' نجمہ بیگم بے تحاشہ خوش ہوتے ہوئے اٹھ کے چائے بنانے چل دیں۔ احمریں بھی بھاگ کے قرآن پاک اس کی جگہ پہ رکھ آئی اور آ کے نانا کے پاس بیٹھ گئی۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ مجھے پتا تھا آج میری گڑیا کوئی عام گڑیا نہیں رہے گی بلکہ حافظہ بن جائے گی اسی لیے آج میں مٹھائی لے کے آیا ہوں۔'' حکمت الٰہی نے محبت سے احمریں کی پیشانی چومتے ہوئے کپڑے کے تھیلے سے مٹھائی کا ڈبا نکالا اور کھول کے ایک گلابی رنگ کا رس گلا اس کے منہ میں ڈال دیا۔ نانا جانتے تھے احمریں کو رنگ برنگے رس گلے بہت مرغوب تھے۔ وہ جو ابھی بھی دل میں قرآن کی آیتیں دہرا رہی تھی کھلکھلا کے ہنس دی۔

''ارے میرے پیارے نانا جی! کوئی بچہ جب کوئی کامیابی حاصل کرے تو اسے گفٹ دیتے ہیں۔ وہ گفٹ جو بچے کو بہت ہی زیادہ پسند آئے، اور وہ اٹھ کے اپنے نانا کے گلے لگ جائے پھر کہے شکریہ نانا جی! مجھے گفٹ بہت پسند آیا۔'' آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت سموئے وہ بولی تو چائے کی ٹرے لاتی نجمہ مسکرا دیں۔ البتہ حکمت الٰہی اپنا قہقہہ نہ روک پائے۔

''جی جی حافظہ جی! میں بھی وہ گفٹ لایا ہوں جو میرے بچے کو بہت پسند ہے۔'' اپنے کپڑے کے سلے ہوئے تھیلے میں سے ملتی چوڑیوں کا سیٹ نکالتے وہ مسکرا دیے۔ وہ فوراً ان سے لے کے پہننے لگی۔ اس کی گلابی سڈول کلائی لمحوں میں چوڑیوں سے بھر گئی۔

''واہ یہ تو بالکل میرے ہاتھ میں پوری آئی ہیں آپ میرا ناپ لے کے گئے تھے کیا۔'' اس نے پلیٹ میں سجے پیلے رنگ کے رس گلے کو اٹھاتے ہوئے پوچھا تو کب سے ہنستی نجمہ بھی مسکرا دیں۔

''پریوں کے ناپ کب ہوتے ہیں۔ انہیں تو ہر طرح کی چوڑیاں پوری آ جاتی ہیں۔ جیسے پہلے یہ چوڑیاں چھوٹی

سی تھی تم نے پہنی تو تمہارے ناپ کی ہوگئیں۔'' سفید رنگ کا رس گلا اٹھاتے ہوئے مسکرا کے کہتے نانا نے نانی کو دیکھا۔ جیسے اسے بدھو بنانے پہ داد مانگ رہے ہوں۔

''کیا واقعی نانی! یہ چوڑیاں پہلے چھوٹی تھیں؟ مجھے بھی ویسے پہلے چھوٹی لگ رہی تھیں۔'' نانی سے پوچھتی وہ نانا پہ یقین کر گئی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی سادہ سے دل کی مالک پُرخلوص سی لڑکی۔

''پتا نہیں بچی! تمہارے نانا کو ہی پتا ہوگا ان سے ہی پوچھو۔'' ناراض نظروں سے نانا کو دیکھتیں نانی اسے شک میں ڈال گئی تھیں۔ اس نے گھور کے نانا کو دیکھا تو وہ بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھے۔

''جائیں نانا! میں آپ سے نہیں بولتی۔'' روٹھے انداز میں کہتی ہوئی وہ منہ پھلائے اندر بھاگ گئی۔

''کر دیا نا پھر احمریں کو ناراض؟ جائیں اب منائیں جا کر اسے۔'' نجمہ نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''تو میں منا بھی لوں گا۔ تم تو جانتی ہو یہ میرے آنگن کی واحد رونق، میری چڑیا ہے۔ جب تک میں اسے خوب ستا کے کان پکڑ کے منا نا لوں مجھے چین نہیں آتا۔ گھر میں رونق ہی نہیں لگتی۔'' جذب سے کہتے ہوئے وہ بولے تو دل کی بات بتا کر جیب میں پڑی احمریں کے ناپ کی پرانی چوڑی نجمہ کو تھمائی۔ جو نا جانے کب وہ اِدھر اُدھر گرا کے بھول گئی تھی۔ نانا اور نانی چائے پی چکے تھے۔ نجمہ بیگم ٹرے اٹھائے کاندھے اچکاتیں کچن کی طرف چل دیں۔ احمریں چائے نہیں پیتی تھی۔ حکمت الٰہی اٹھ کے احمریں کے کمرے کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

''نعیمہ او نعیمہ کی بچی کہاں مرگئی ہے۔ تجھے کہا تھا نیم گرم پانی لے کے آ۔ پانی دریافت کرنے چلی گئی ہے کیا ہڈ حرام۔'' فلک ناز ابھی گھر آئی تھی وسیع و عریض لاؤنج میں بیٹھتے ہی اس نے سامنے سے گزرتی نعیمہ سے نیم گرم پانی منگوایا تھا۔ اب پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ چنگھاڑنے لگی۔

''آ گئی بی بی جی! آ گئی۔'' پینتالیس سالہ نعیمہ نے ٹب میں بھرا پانی اس کے پیروں کے پاس رکھا اور اس کے پیروں کو جوتے سے آزاد کرتے ہوئے ٹب میں ڈالنے لگی۔ پانی نیم گرم سے بھی کچھ زیادہ گرم تھا۔ ہلکی سی سسکی لے کر اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے اپنے پاؤں کھینچ کے دوبارہ اپنی ہیل پہ رکھے۔

''جاہل عورت یہ پانی گرم کیا ہے تو نے۔ جانور سمجھتی ہے مجھے۔ نیم گرم پانی کہا تھا ٹھہر تجھے بتاتی ہوں یہ نیم گرم ہے یا نہیں۔'' درشتی سے کہتے ہوئے نعیمہ کے بال اپنے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے اس نے جھٹکے سے نعیمہ کا چہرہ شیمپو ملے ٹب کے انتہائی گرم پانی میں ڈبو دیا۔ دفعتاً وسیع و عریض لاؤنج میں نعیمہ کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

''فلک ناز! یہ کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟'' نک سک سے تیار سیاہ ساڑی کا آنچل ایک ہاتھ سے سمیٹتی نیلم ناز لاؤنج کے دروازے پہ ششدر کھڑی تھیں۔ فلک کی گرفت جیسے ہی ڈھیلی پڑی نعیمہ اپنے بال چھڑاتی سرخ پڑتے چہرے سمیت بھکٹ بھاگی تھی۔

''اتنی ٹینشن میں کیوں ہو کچھ ہوا ہے کیا؟'' نیلم ناز نے ایل شیپ صوفے پہ فلک کے مقابل بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہونا کیا ہے ماما! وہی اس ذلیل سکندر بخت کی راگنی۔ عوام کی ڈیمانڈ نئے چہرے ہیں تم اب بڑی بہنوں کا رول کر سکتی ہو بس۔ خود جیسے کوئی منا سا بچہ ہے۔'' اکتائے ہوئے لہجے میں بتاتی فلک ناز کا چہرہ اب غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''کیوں پریشان ہوتی ہو؟ اور پروڈیوسر ڈائریکٹر مر گئے ہیں کیا۔ اب تم اس کے ساتھ کام مت کرنا۔ یہ جو کر رہی ہو اسے اس کے ساتھ آخری ڈراما سمجھو۔'' نیلم نے جھنجلاتے ہوئے اس کی پریشانی کا تدارک کیا۔

''اس نے مجھے اس ڈرامے سے الگ کر دیا ہے۔ اس کی اسسٹنٹ کہہ رہی تھی کہ اندر ہی اندر مشہور ماڈل سہانی سے اس رول کی ڈیل چل رہی تھی کب سے۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ اس جاہل سکندر نے مجھ پہ کل کی آئی ماڈل کو فوقیت دی۔'' استعجاب کے عالم میں کہتی فلک کے چہرے پہ تنفر ہی تنفر تھا۔

''دفع کرو اس کو تمہیں کام کرنے کے لیے اور بہت سی آفرز مل جائیں گی۔ تم فلک ناز ہو جس پہ فلک بھی ناز کرے تم یوں چھوٹی باتوں پہ گھبراؤ گی تو میرا کیا ہوگا۔'' نیلم ناز نے ایک نظر سامنے بیٹھی دھان پان اور سرو قد سی، مغلئی نقوش اور سرخ و سفید رنگت کی مالک بیٹی پہ ڈالی۔

''کچھ بھی ہے ماما! مجھے اس ڈرامے سے نکالنا اس سکندر کو بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔ کہاں وہ ایکٹنگ کی ابجد

سے بے خبر عام سی ماڈل کہاں میں یعنی فلک ناز اپنے دور کے کامیاب ڈائریکٹر تابش سعید اور اپنے دور کی مایہ ناز ہیروئن نیلم ناز کی بیٹی۔ ہمارا تو گھرانا ہی فن کی دنیا کا معزز گھرانا مانا جاتا ہے۔ ایکٹنگ تو گھٹی میں پڑی ہے ہماری۔'' فلک کا غصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''جب تم یہ جانتی ہو تو پریشان کیوں ہوتی ہو ویسے بھی......'' وہ اسے سمجھا ہی رہی تھی کہ ان کی ملازمہ عافیہ نے آ کے انہیں مشہور پروڈیوسر سفیر احمد کے آنے کی اطلاع دی۔ فلک نے عافیہ کو مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی ہدایت دی۔ نیلم نے معنی خیز انداز میں فلک ناز کو دیکھا۔ فلک ناز نے مسکرا کے پاؤں سامنے رکھے ٹب میں ڈال دیئے۔ اتنی جلدی تو وہ بھی ڈرائنگ روم میں نہیں جانے والی تھی۔ نیلم ناز مسکرا کے کچن کی طرف چل دی۔ ملازمہ کو چائے کے لوازمات ڈرائنگ روم میں پہنچانے کا آرڈر کرتی وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ انہیں اب اپنے میک اپ کو ازسرنو کرنے میں ایک گھنٹا لگنے والا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ ماں بیٹیاں تک سک سے تیار ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو سامنے اب جانے کا ارادہ کرتے سفیر احمد انہیں دیکھ کے احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ دونوں سلام دعا اور حال احوال پوچھتے ہوئے ایک صوفے پہ جا بیٹھیں تو سفیر نے بھی ہاتھ میں پکڑی فائل سامنے رکھی ٹیبل پہ رکھ دی۔ وہ اس فائل کو پانچویں بار پڑھ رہا تھا۔

''آپ اور پانچ منٹ نہ آتیں تو بس میں جانے والا تھا۔ اصل میں میرے اسسٹنٹ کا فون آ رہا ہے۔ بار بار مجھے شوٹ پہ پہنچنا ہے آٹھ بجے۔'' مسکرا کے کہتے ہوئے سفیر نے جیسے ان میک اپ میں لتھڑی بلاؤں کو احساس دلانا چاہا۔ فلک کی نظر پونے آٹھ بجاتی گھڑی پہ جا رکی۔

''لگتا ہے آپ کو کافی ویٹ کرنا پڑا۔ اصل میں بے بی! ابھی کچھ دیر پہلے ہی شوٹ سے واپس آئی ہے اس لیے کچھ دیر لگی آپ کو شرف ملاقات بخشنے میں۔'' بجائے معذرت کرنے کے نیلم ناز ادائے بے نیازی سے احسان جتانے والے لہجے میں کہنے لگیں تو سفیر نے حیران نظروں سے فلک ناز کے میک اپ میں اٹے چہرے کو دیکھا جہاں تھکاوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

''ماشاء اللہ شوٹ سے آ کے بھی آپ کا چہرہ بہت فریش لگ رہا ہے۔ خیر میں بھی آج آپ کے لیے بہت اچھی آفر لایا ہوں۔ ایک سوپ سیریل ہے جس کی ہیروئن کا کردار آپ سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا اس لیے میرے سوپ کے لیے تو آپ کو ٹائم نکالنا ہی ہوگا۔'' فائل کھول کے فلک کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو فلک مسکرا دی۔ رول واقعی بہت پاورفل تھا۔ لیڈنگ رول تھا وہ بھی سوپ کے اینڈ تک۔

''وقت تو بالکل نہیں ہے سفیر صاحب! آج تو اتفاق سے گھر آ گئی ورنہ تو شوٹ پہ ہی رات ہو جاتی ہے۔ کئی دفعہ تو رات بھی آدھی سے زیادہ ہو جاتی ہے گھر آتے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے انکار کیا تھا۔ سفیر کے چہرے کا رنگ جیسے یکلخت پھیکا پڑا تھا۔

''نہیں یہ سوپ تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ دیکھیں میگا کاسٹ ہے اس کی۔ اس سوپ کی کہانی دیکھنے والوں کے ذہنوں پہ ثبت ہو کے رہ جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یعنی اس سوپ کا حصہ بن کے آپ کئی برسوں تک لوگوں کے دلوں پہ راج کر سکیں گی۔'' سفیر نے وضاحت سے بتاتے ہوئے اسرار کیا جس پہ فلک مطمئن سی مسکرا دی۔

''فلک! سفیر بیٹا! اتنے اسرار سے کہہ رہے ہیں تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ باقی لوگوں کو چاہیے آگے کی ڈیٹس دے دو مگر ان کے پروجیکٹ میں تم ضرور حصہ لو۔'' نیلم ناز نے جھریوں زدہ چہرے پہ سفیر کے لیے جھوٹی شفقت سموتے ہوئے جیسے بات ہی ختم کر دی۔

''شکریہ نیلم آپا! اس میں ہیروئن کی ماں کا رول بھی ہے اور میری خواہش ہے کہ وہ آپ کریں۔'' سفیر اتنی شفقت پہ جیسے عقیدت سے دہرا ہو گیا۔ ان کے سرکل میں سب انہیں آپا کہتے تھے۔ ان کی ساتھی فنکارائیں خود کو آپا کہلوا کے بڑھاپے کے احساس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ابھی بھی سفیر کے آپا کہنے پہ کھل اٹھیں اور فوراً ہیروئن کی ماں کا رول قبول کر لیا۔ وہ ہیروئن کی ماں کا رول تھا۔ نیگیٹو تھا مگر اس میں پرفارمینس کا بہت مارجن تھا۔

''شکریہ آپا! آپ نے میرا کہنا مان کے ہمیشہ مجھے مان دیا ہے۔ اچھا باقی معاملات میں کل آ کے تفصیل سے طے کروں گا۔ ابھی مجھے اجازت دیں شوٹ پہ جانا ہے۔'' آٹھ بج کے دس منٹ ہو چکے تھے جب وہ تیز تیز بولتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی نیلم نے معنی خیزی سے فلک ناز کو دیکھا وہ گردن تانے سج سج قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

"نانا! اللہ نظر کیوں نہیں آتا؟ آپ ہی تو کہتے ہیں اللہ ہم سے دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہے... پھر وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتا جیسے آپ میرے سامنے ہیں نانو میرے سامنے ہیں بالکل ایسے۔" وہ اس وقت چھوٹے سے صحن میں بچھی چارپائی پہ نانی کے ساتھ لیٹی تھی مگر رخ کچھ دور بچھی چارپائی پہ لیٹے نانا کی طرف تھا۔ یہ اس کا معمول تھا وہ سونے سے پہلے ڈھیروں باتیں کرتی تھی۔

"احمریں! چلتی ہوا کبھی نظر آتی ہے؟ سردیوں میں دھوپ میں بیٹھتی ہو اس کی حدت کبھی نظر آتی ہے؟ تمہارے اسکول میں ڈھیروں پھول لگے ہیں جن کے پاس تم فری پیریڈ میں پائی جاتی ہو ان کی خوشبو دیکھی کبھی تم نے۔ نہیں نا؟... ایسے ہی اسپیشل چیزیں بس محسوسات میں سمائی ہوتی ہیں۔ بس تسکین دیتی ہیں روح تک سرشار کرتی ہیں۔ ویسے ہی ان سب چیزوں کا اور ہمارا خالق ہے۔ وہ نظر نہیں آتا بس محسوس ہوتا ہے پوری شدت سے۔" آسمان پہ سجے ستاروں کے جھرمٹ پہ نظر جمائے نانا نے تفصیل سے بتایا۔

"ویسے ہماری گڑیا! کے منے سے دماغ میں یہ سوال کیوں آیا۔" اس کے سلکی بالوں کو سہلاتے ہوئے نجمہ خاتون نے ہنس کے پوچھا۔

"نانی! میری کلاس میٹ ہے صائمہ اس کے بابا بیمار ہیں، وہ کہہ رہی تھی کہ کاش اسے اللہ مل جائیں تاکہ وہ ان سے اپنے بابا کی صحت اور زندگی مانگ سکے۔" اس نے نانی کی طرف رخ موڑتے ہوئے من وعن اسکول میں گزری ساری کتھا سنادی۔

"اللہ اس کے بابا کو صحت کاملہ سے نوازے آمین۔" نانی کے منہ سے بے اختیار دعا نکلی۔

"نانا! مجھے آپ کے جواب کی سمجھ ہی نہیں آئی کتنی مشکل باتیں کرتے ہیں نا آپ۔ بتائیں نا اللہ کیوں نظر نہیں آتا؟" حکمت الٰہی کی باتیں واقعی اس کے ذہن میں نہیں سماتی تھیں۔ حکمت الٰہی سوچ میں پڑھ گئے پھر ایک خیال کے تحت ان کی آنکھیں چمکنے لگ گئیں۔

"اچھا میں آسان الفاظ میں سمجھاتا ہوں، پہلے تم اپنی نانی کی طرف رخ موڑو جلدی سے۔" احمریں رخ موڑتے ہوئے رک کے نانا کو دیکھنے لگی۔

"یہ کیسا جواب ہے کہیں آپ مجھے سونے کا تو نہیں کہہ رہے؟ سن لیں میں جواب جانے بنا نہیں سونے والی۔" احمریں نے نروٹھے انداز میں جھنجلا کے کہا۔

"نانا کی جان! منہ نانی کی طرف موڑو بیچ میں میں جواب ہی دینے والا ہوں۔" نانا نے مسکراتے ہوئے جیسے ایمانداری سے جواب دینے کا عہد کیا تھا۔ اس نے جھٹ یقین کر کے رخ نانی کی طرف موڑلیا۔

"اب بولو تمہیں میں نظر آرہا ہوں؟" نانا جیسے شرارت سے مسکرائے تھے۔ انہیں اس بچی کے ساتھ بچہ بننا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

"نانا! جب میرا رخ نانی کی طرف ہے تو مجھے آپ کیسے نظر آسکتے ہیں۔ ظاہر ہے نانی ہی نظر آئیں گی نا۔ کوئی حال نہیں آپ کا۔" نانی کے مسکراتے جھریوں زدہ چہرے پہ نظر جمائے وہ نانا سے یوں کہہ رہی تھی جیسے اندر ہی اندر ان کی کم عقلی پہ ماتم کررہی ہو۔ نانا قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔

"بیٹا جی! ایسا ہی حساب ہمارا ہے۔ ہم دنیا کی طرف رخ موڑے اندھا دھند بھاگتے ہیں پھر یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ ہمیں رب نظر کیوں نہیں آتا۔ حالانکہ ہمارا رب تو اس قدر عظیم ہے کہ ہمارے گناہوں کے باوجود ہمیشہ توبہ کا در کھلا رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میری طرف جو ایک قدم چلے میں اس کی طرف دس قدم چلوں گا۔" ان کے متبسم لہجے میں اللہ کی محبت کی حلاوت تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب سمجھ گئی میں۔ پتا ہے نانا! میں جب قرآن کی آیات پڑھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا دل میری روح روئی کے گالے کی طرح ہلکی پھلکی ہوگئی ہے۔ یوں جیسے میں یہاں ہوں ہی نہیں۔ یا شاید ایسے جیسے ان آیات سے سکون پھوٹتا ہو جو میرے دل و روح میں سرائیت کر جاتا ہو۔" وہ اپنی کیفیات پہ حیران تھی۔ آنکھیں بند کیے وہ بتارہی تھی جبکہ نجمہ اور حکمت الٰہی جیسے سرخرو نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔

"میری ننھی سی پری! تو بڑی بڑی باتیں کرنے لگ گئی ہے واہ۔" کوئی بھی تبصرہ کیے بنا نانی نے مسکراتے ہوئے کہا تو احمریں چڑ گئی۔

"نانی! میٹرک کے ایگزام دے دیے ہیں میں نے، آپ کو ابھی بھی میں بچی ہی نظر آتی ہوں۔ اگلے ماہ میں پندرہ سال کی ہو جاؤں گی۔ میں آپ سے اس بات پہ بعد میں لڑائی کروں گی ابھی مجھے نانا سے کچھ پوچھنا ہے۔" فخرو انبساط سے کہتی وہ لڑائی کو کل پہ ٹالتی پھر نانا کی طرف متوجہ ہوئی۔ جبکہ نانی نے اسے ہلکی سی دھپ لگائی تھی۔

"نانا! ساتھ والی عذرا نے بھی تو قرآن پاک حفظ کیا

ہے نا اسے یہ سب کیوں نہیں محسوس ہوتا؟ میں نے اسے بتایا تو وہ ہنسنے لگی کہتی کہ میں اپنے آپ کو پری سمجھنے لگی ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں نا ایسا کچھ نہیں۔'' وہ انہیں یقین دلاتے ہوئے ابھی بھی الجھی ہوئی تھی۔

''تمہیں اس طرح اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ تم ان آیتوں سے محبت کرتی ہو۔ انہیں دل سے پڑھتی ہو۔ انہیں محبت سے اپنے فہم میں محفوظ رکھتی ہو۔ تم حقیقت میں موؤذن حکمت الٰہی کی جانشین ہو۔ کون کہتا ہے کہ محنت رائگاں جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں محنت کا کبھی نا کبھی پھل ضرور ملتا ہے۔'' حکمت الٰہی نم آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔

''نانا! اگر ان آیتوں کو صرف محبت سے پڑھنے پہ اتنا سکون ملتا ہے تو سمجھ کے پڑھنے سے کیا ہوتا ہوگا؟'' نانا کی باتیں اس کے لیے حیرتوں کے نئے در کھول رہی تھیں۔

''خدا کے کلام کو سمجھ کے پڑھنے اور اس پہ پورے دل سے چلنے والا خدا کی مقدس کتاب کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ہی وہ راستہ ہے جو ایک دن خدا سے روشناس کرواتا ہے۔ یہ ہی وہ راستہ ہے جس پہ چل کے خدا ملتا ہے۔'' جذب سے کہتے حکمت الٰہی کسی اور ہی دنیا میں پہنچے ہوئے تھے۔

''نانا! آپ مجھے قرآن کی تفسیر کی کتابیں لا دیں گے؟ میں رب کو کھوجنا چاہتی ہوں۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' خواب کی سی کیفیت میں بولتی احمریں نے فرمائش کی تو نانا کھل اٹھے۔

''کیوں نہیں میری بچی نانا حاضر، کل ہی تمہاری فرمائش پوری ہوگی انشاء اللہ۔'' وہ ہنستے ہوئے کروٹ بدل کے سوگئے۔ نانی کب سے سو رہی تھیں۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اس نے آنکھیں بند کیے قرآن کی آیات کا ورد شروع کر دیا پھر کب وہ نیند کی وادی میں گئی وہ خود بھی نہ جان سکی۔

☆☆☆

ان کا سوپ کچھ اقساط ریکارڈ کرواتے ہی آن ایئر آ چکا تھا۔ اس کی ریٹنگ سکندر بخت کے میگا ڈراما سیریل کو کاٹ رہی تھی۔ نئی ماڈل گلیمرس تھی، ہائی ایجوکیٹڈ تھی مگر بھرپور محنت کے باوجود کردار میں وہ جان نہیں لا پائی تھی جو کردار کی مانگ تھی۔ سکندر بخت اسے کاسٹ کر کے خوب پچھتایا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ نئے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سفیر احمد کے سوپ کی ریٹنگ بہت ہائی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کا کریڈٹ فلک ناز کو دینے پہ مجبور تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگلے پروجیکٹ میں فلک کو ضرور شامل کرے گا۔

وہ اس وقت ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے وسیع و عریض ہال میں بیٹھا اسی سوچ میں غرق تھا جب اس کی نظر سامنے کی ٹیبل پہ بیٹھی فلک پہ پڑی وہ اٹھ کے اس کے ٹیبل کی طرف چل دیا۔

''ایکسکیوز می! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس نے ادب سے اجازت مانگی تو ہال میں بے مقصد نظریں گھماتی فلک کی نظر پینتالیس سالہ سکندر بخت کے چہرے پہ ٹک گئیں۔

''وائے ناٹ؟ ویسے بھی یہ ٹیبل ریزرو نہیں ہے پبلک پلیس ہے۔ یہاں کی کرسیاں میری پراپرٹی نہیں ہیں کہ مجھ سے اجازت مانگی جائے۔'' شانے اچکاتے ہوئے اس نے اس بات کا اظہار کیا کہ اس کے ہونے نہ ہونے سے فلک ناز کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔

''میم سب سے پہلے تو آپ کو اپنے سوپ کی کامیابی پہ مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ کے سوپ کی ریٹنگ میرے ڈرامے ہی نہیں کئی سینئر اور منجھے ہوئے لوگوں کے ڈراموں کی ریٹنگ کو کاٹ رہی ہے۔'' اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا جو مقابل بیٹھی فلک ناز کو غرور کے ساتویں آسمان پہ بٹھا گیا تھا۔

''دیکھیں سکندر صاحب! اس کا کریڈٹ سفیر احمد جیسے اچھے ڈائریکٹر کو جاتا ہے۔ جس نے کاسٹ بہت سوچ سمجھ کے چنی کہ ہر کردار انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ آتا ہے۔ کوئی بھی پروجیکٹ مفروضات یا اوہام کی بنیاد پہ کیے گئے فیصلوں پہ ہٹ نہیں ہوتا۔ کڑی محنت اور گاڈ گفٹڈ ٹیلنٹ سے ہٹ ہوتا ہے۔ جو مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔'' سرسری انداز اختیار کیے وہ بھگو بھگو کے مار رہی تھی۔

''پہلے جو ہوا آپ وہ مت سوچیں۔ اب بہت جلد میں ایک نیا پروجیکٹ شروع کرنے والا ہوں جس کے لیے آپ کو وقت نکالنا ہوگا۔'' ساری شرمندگی بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے مقصد کی بات کی۔

''ابھی تو میں اس سوپ کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں، لیکن تب تک اگر میں وقت نکال پائی تو ضرور آگاہ کروں گی آپ کو۔'' مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ سجاتے ہوئے وہ آرڈر سرو کرتے ویٹر کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ یعنی صاف صاف یہ کہا جا رہا تھا کہ اب تم دفع ہو سکتے ہو۔

''اوکے آپ اپنا لنچ انجوائے کریں پھر ملاقات ہو گی۔'' وہ بھی زبردستی مسکراتا ہوا اپنی ٹیبل پہ جا بیٹھا۔ کس قدر

مغرور عورت ہے، دل چاہتا ہے دو تھپڑ رسید کر کے اسے اس کی اوقات یاد دلا دوں۔'' تنفر سے سوچتے سکندر نے آرڈر کیا۔ اب وہ دانستہ اس چیئر پہ بیٹھا تھا جس کی فلک کے ٹیبل کی طرف پشت تھی۔ ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے اِدھر اُدھر دانستہ متوجہ ہوا کہ اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکے۔

''ہیلو سر! کیسے ہیں آپ؟ میں لیٹ تو نہیں ہوئی؟'' سہانی نے آتے ہی خوشگوار لہجے میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

''تم لیٹ نہیں کافی لیٹ ہو۔ نیو ٹیلنٹ کے نام پہ میں تو تمہیں کاسٹ کر کے پچھتا رہا ہوں۔ تمہیں نہ وقت کا احساس ہے نہ ایکٹنگ کی سمجھ۔ تم سے تو بہتر تھا کہ میں کسی سینئر اداکارہ کو کاسٹ کر لیتا۔'' بالوں میں انگلیاں پھنسائے بال نوچتا وہ اپنا سارا غصہ سہانی پہ اتار گیا تھا۔

''سوری سر میں اپنی پرفارمینس بہتر بنانے کی کوشش کروں گی۔ دیکھیے گا چند ہی اقساط میں رزلٹ آپ کے سامنے ہوگا۔ اور یہ سینئر اداکارائیں، یہ بڈھی گھوڑیاں اب ہمارا کیا مقابلہ کریں گی انہیں اب گھر بیٹھ کے اللہ اللہ کرنا چاہئے۔'' اس کی نظر بے نیازی سی فلک پہ پڑ چکی تھی تب ہی وہ نخوت سے کہتی ہوئی پانی کے گھونٹ کے ساتھ غصہ اندر اتارنے لگی کہ بہرحال غلطی تو اسی کی تھی جو ایکٹریس ہونے کے زعم میں جان بوجھ کر لیٹ آئی تھی۔

''باتیں نہیں مجھے رزلٹ چاہیے مس سہانی ورنہ معذرت سے کہتا ہوں کہ مجھے بہت جلد آپ کو اس پروجیکٹ سے الگ کرنا ہوگا۔'' قطعیت بھرے لہجے میں دبا دبا اشتعال تھا۔

''نہیں سر! آدھے سے زیادہ ڈراما ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اب کیسے آپ مجھے اس ڈرامے سے الگ کر سکتے ہیں۔ یہ ناانصافی ہے۔'' لمحے کے ہزارویں حصے میں سہانی کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ یہ پروجیکٹ وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ التجائیہ لہجے میں کہنے لگی۔

''بالکل میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہ انتہائی فیصلہ نہ کروں تو اپنے کام پہ فوکس کرو۔ اپنی پرفارمینس میں وہ جان پیدا کرو کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔'' ویٹر کھانا سرو کر رہا تھا سکندر بخت تنبیہی لہجے میں بات مکمل کرتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جبکہ خاموش بیٹھی سہانی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کے رہ گئیں۔ دل میں اسے صلواتیں سناتی اپنی پلیٹ پہ جھک گئی۔

فلک ابھی کھانا کھا ہی رہی تھی جب اسے ماما کا فون آیا وہ اسے کہیں اچانک جانے کا بتا رہی تھیں پھر بہت سی ہدایت دیتیں فون بند کر گئیں۔ فلک کاندھے اچکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ابھی اسے شوٹ پہ بھی جانا تھا۔

☆☆☆

نانا دوسرے دن اس کی فرمائش پوری کرنے کی نیت سے گھر سے نکلے تھے۔ مگر خون میں لت پت واپس آئے۔ ایک تیز رفتار ٹرک نے بڑی بے رحمی سے انہیں کچل دیا تھا۔ وہ آواز جو لوگوں کو ہدایت کے لیے بلاتی تھی وہ خاموش ہو چکی تھی۔ وہ لب جو ہمیشہ رب کی ثنا میں رطب اللسان رہتے تھے آج خاموش تھے۔ دھاڑیں مار مار کے روتی احمریں جیسے اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔

''کیوں چھوڑ کے چلے گئے مجھے نانا! کون لا کے دے گا مجھے اب گفٹ۔ کون پوری کرے گا میری فرمائشیں۔'' وہ نانا کی چارپائی کا پایا پکڑے بلک رہی تھی۔

''بس بیٹی! چپ اس طرح نہیں روتے مردے کو تکلیف ہوتی ہے صبر کر اور اپنے نانا کے لیے دعا کر۔'' نانی کو تسلی دیتی پڑوسن سکینہ اسے سنبھالتے ہوئے بولی۔

''پھر کیسے روتے ہیں چاچی! میرے نانا، میرے دوست، میری سہیلی، میری ماں، میرے باپ سب کچھ ہی تو وہ تھے پھر بھی۔ انہیں کہو اٹھ کے مجھے سکھا دیں۔ نانا انہیں نا مجھے رونے کا قرینہ سکھا دیں۔ چاچی کہتی ہیں ایسے نہیں روتے۔'' گلوگیر لہجے میں چاچی سے کہتی وہ پھر نانا سے مخاطب ہوئی تھی۔

''بس میری جان! بس اب نانا واپس نہیں آئیں گے۔ اب تمہیں ان کے خواب پورے کرنے ہوں گے۔ ان کے بنائے ہوئے لائحہ عمل پہ چلنا ہوگا۔ جانتی ہو نا یہ راستہ صبر سے شروع ہوتا ہے۔'' نجمہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کے اسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا تو اس نے سرخ پڑتی کٹورہ سی آنکھیں نانی پہ جما دیں۔

''نانی! جب انسان کی سب سے قیمتی چیز اس سے چھن جائے تو اسے سکون آتا ہے، نہیں نا، تو مجھے کیسے آئے؟'' وہ ہچکیوں کے درمیان پوچھ رہی تھی۔

''ہاں نہیں آتا صبر لیکن صبر کے سوا چارہ بھی تو نہیں کوئی۔'' نانی کے لہجے میں رچی سوگواریت جیسے اس کے دل کو ٹکڑوں میں تبدیل کر گئی۔

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ضبط سے کہا۔ ''ہاں ٹھیک کہتی ہیں آپ اب ہمیں ہی خود کو سنبھالنا ہے۔'' ساڑھے پندرہ سال کی چھوٹی سی لڑکی لمحوں میں بڑی ہوگئی تھی۔ نانی کو تسلی دیتی وہ اٹھ کے وضو کر آئی اس کی زبان اب قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے خود کو ویسے ہی اڑتے محسوس کیا۔

''بڑے ہی اچھے انسان تھے صوفی صاحب! غربت اور کم آمدنی میں بھی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اپنی روکھی سوکھی میں گزارا کیا۔ بس بھئی اللہ اپنے نیک بندوں کو جلدی بلا لیتا ہے۔'' چاچی سکینہ نے تاسف سے کہتے ہوئے ایک نظر نانا کی چارپائی کا پایا تھامے سر نہوڑائے بیٹھی احمرین کو دیکھا۔

''اری سکینہ! صوفی صاحب کی بیٹی کو بھی کسی نے اطلاع دی ہے کہ نہیں۔ بھئی جیسی بھی تھی ان کی بیٹی تھی، کیا ہوا جو ماں باپ کی فرمانبردار نہیں نکلی ہے تو ان کی بیٹی نا اطلاع دینا بنتا ہے۔'' سکینہ کی جٹھانی سلمی نے صوفی صاحب کی بیٹی کو برا کہتے ہوئے خود ہی تاویل پیش کی۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو آپا۔ میں ابھی خالہ سے پوچھتی ہوں۔'' گھٹنوں پہ دباؤ ڈال کے اٹھتی سکینہ نجمہ کو اٹھا کے دور لے گئیں۔ ایک لمحہ سوچ کے انہوں نے وہ نمبر چٹ پہ لکھ دیا جس پہ انہوں نے زندگی میں کبھی کال نہیں کی تھی۔ لاکھ ناراضگی کے باوجود حکمت الٰہی کا آخری دیدار کرنے کی سعادت سے وہ اپنی بیٹی کو محروم نہیں رکھ پائی تھی۔ یہ الگ بات کہ اطلاع دینے کے باوجود ان کی نانہجار بیٹی دوسرے دن رسم قل پہ پہنچی تھی۔

ظہر کے بعد رکھی گئی رسم قل میں سب عورتوں کے درمیان سفید چادر پہ سر جھکائے بیٹھی مشہور اداکارہ نیلم ناز اپنے باپ کو آخری بار نہ دیکھ سکنے کے ملال میں گرفتار تھی۔ اس نے کچھ ہی عرصے پہلے لاکھوں روپے لگا کے لیزر سسٹم سے میک اپ کروایا تھا۔ جو چھ ماہ تک قائم و دائم رہنے والا تھا۔ ان کے چہرے پہ سجے لائٹ پنک میک اپ پہ پاس بیٹھی عورتیں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ ان کا سفید لباس گو کہ سادہ تھا مگر پھر بھی اتنا قیمتی تھا کہ پاس بیٹھی سب عورتوں میں انہیں ممتاز کر رہا تھا۔ اس نے ناگواری سی نظر ان جاہل عورتوں پہ ڈال کے گٹھلیاں پڑھنا شروع کر دیں۔

''توبہ توبہ ایسے لچھن ہوں تو باپ کا دیدار نصیب ہوتا بھی کب ہے۔ حد ہے میک اپ کر آئی جیسے باپ کی رسم قل میں نہیں ولیمے میں آئی ہو۔'' کچھ دور بیٹھی سلمی نے کانوں کو چھوتے ہوئے گوہر افشانی کی۔ تو پاس بیٹھی عقیلہ بھی نفصیحتے کہنے لگی:

''اے تب ہی تو صوفی صاحب! ملتے نہیں تھے اس سے۔ بھئی سچ کہتے ہیں اولاد ایک ہو پر نیک ہو۔ اللہ نے انہیں ایک ہی بیٹی دی وہ بھی ایسی کہ اس سے اچھا تو بے اولاد ہی رہتے۔''

نیلم سے اب ان عورتوں کی باتیں برداشت کرنا بہت مشکل ہو چلا تھا۔ وہ اٹھ کے کمرے میں آ گئیں۔ باہر تب نکلیں جب سب عورتیں گٹھلیاں پڑھنے کے نام پہ ادھر اُدھر کی سب چغلیاں کر کے ٹھنڈی ہو کے جا چکی تھیں۔ کسی کے پاس شیخ صاحب کی بیٹی کی داستان تھی جو ماں باپ کے سر پہ خاک ڈال کے جا چکی تھی اور کسی کے پاس نکڑ والے حکیم صاحب کی بیٹی کی طلاق کا قصہ تھا۔ غرض یہ وہ عورتیں تھیں جو بس اپنے دامن کے داغ نہیں دیکھتی تھیں۔ لوگوں کے عیب گنوانا اور جگہ جگہ اچھالنا جن کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ اماں کو ڈھونڈتی پچھلے صحن کی طرف بنے چھوٹے سے باغیچے کی طرف آ گئی جہاں رنگ برنگے پھولوں کے پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ سبز مخملیں گھاس ایسے صاف تھی جیسے اس پہ کوئی روز محنت سے رنگ بکھیرتا ہو۔ جگہ جگہ لگی موسم کی سبزیاں بھی بہار دکھا رہی تھیں۔ چھوٹے سے باغیچے میں بس ایک ہی درخت تھا۔ پیپل کا درخت۔ اسے یاد تھا یہ حصہ گھر بنتے وقت نجمہ بیگم نے بطور خاص خالی رکھوایا تھا... کیونکہ یہاں یہ درخت لگا تھا۔ جس پہ پرندوں کے گھر تھے۔ ابا نے لاکھ کہا کہ یہ زمین چھوڑ دیں گے تو رہائشی حصہ تنگ بنے گا مگر نجمہ بیگم نے ایک نہ سنی۔ رفتہ رفتہ اس خالی حصے میں نجمہ بیگم نے سبزیاں اگانے شروع کر دیں۔ محلے کی عورتیں اپنی پسند کی سبزیاں لے جاتیں اور پیسے رکھ جاتیں۔ اس طرح ان کے فیصلے سے نالاں نانا بھی بالآخر مطمئن ہو گئے۔ انسیت تو اس درخت سے نیلم کو بھی تھی۔ وہ جب بھی دکھی ہوتی اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کے رو کے غم ہلکا کرتی تھی۔ ان کی یہ عادت اس کے جانے کے بعد کب اماں نے اپنا لی انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ پیپل کے گھنے درخت کے گرد بنے پختہ چبوترے پر سر جھکائے بیٹھی نجمہ جانے کس سوچ میں تھیں کہ ذرا سی آہٹ پہ چونک گئیں۔

''اماں! ڈر کیوں گئیں میں ہوں آپ کی نیلم۔'' اس نے سامنے آتے ہوئے جلدی سے تعارف کروایا، مبادہ وہ

پہچاننے سے انکار نہ کر دیں۔ نجمہ بیگم نے ایک اجنبی سی نظر ان پہ ڈال کے منہ موڑ لیا۔

''اماں! آپ اب تک مجھ سے ناراض ہیں؟ دیکھیں مرضی سے زندگی گزارنے کا حق تو خدا بھی دیتا ہے۔ میں نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا فیصلہ کیا کوئی گناہ تو نہیں کیا تا جو آپ نے مجھے یوں مرا ہوا سمجھ لیا۔'' یاسیت بھرے لہجے میں شکوے ہی شکوے تھے۔

''بے شک رب نے اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار سب کو دیا ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اس کے فیصلوں پہ ان کا حق ہوتا ہے جنہوں نے یہ گزارنی ہوتی ہے۔ مگر فیصلوں کے اختیار میں اتنا آگے بھی نہیں جانا چاہیے کہ بات شملوں تک آ جائے۔ باقی مری ہوئی سمجھتی تو تمہیں اطلاع نہ دیتی کہ تیرا باپ مر گیا ہے۔'' بے لچک انداز میں بات کرتی نجمہ نے آخر میں بھیگے لہجے میں کہا۔

''اماں! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ مجھے شرمندگی ہو۔ آپ کی مرضی کے بغیر ہی سہی مگر میں نے نکاح کیا تھا۔ سنت ادا کی تھی۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔'' نیلم نے جیسے آج خود کو ہر گناہ سے بری الزمہ قرار دینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ نجمہ مسکرا دیں۔

''تمہیں وہ نام کا مسلمان مذہب سے بالکل نابلد وہ ڈائریکٹر ہی ملا تھا جس نے صوفی حکمت الٰہی کی بیٹی کو ڈراموں کی ہیروئن بنا دیا۔ کتنی خوشی سے تم اس کی راہ پہ چلیں اور اپنی بیٹی کو بھی چلایا کیا تمہاری نظر میں یہ گناہ نہیں۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی عاقبت لے ڈوبنے کو تم گناہ نہیں سمجھتیں۔'' نجمہ نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو کچھ شرمندہ سی ہو گئیں مگر صرف ایک لمحے کا احساس تھا۔

''ہم گنہگار بندے مذہب پہ نہیں چل سکتے اماں! جتنا ہو سکتا ہے میں کرتی تو ہوں: جب بھی ٹائم ملتا ہے نماز پڑھتی ہوں، ایک آدھ روزہ بھی رکھ لیتی ہوں۔'' اس کی وضاحت میں بھی بے پروائی تھی جو ازل سے اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

''مذہب کو اپنی سہولت کے مطابق اپنا لینے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔ تم کیا سمجھتی ہو اللہ تمہارے لیے دین کے دائرے وسیع کر دے گا؟ کتنی بڑی بھول میں ہو تم۔ تمہاری سہولت کے مطابق اصول میں رب کی مرضی کتنی شامل ہے اس بات پہ کبھی غور کیا تم نے۔'' ان کے لہجے میں سوال نہیں تازیانے تھے جو کسی بھی ذی ہوش انسان کو واپس لے آتے، مگر سامنے تو نیلم ناز تھی جو واپس آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جو بھلے ہی سجدے خدا کو کرتی تھی، مگر پوجتی دل میں سجائے ہوئے بتوں کو تھی۔

''اماں! میں یہاں آپ سے بحث کرنے نہیں آئی۔ میں آپ کو لینے آئی ہوں اب تو بابا بھی نہیں رہے۔ اب کیسے رہیں گی آپ یہاں۔ کیسے کریں گی گزر بسر؟ ویسے بھی جب بیٹی اتنی مشہور شخصیت ہو تو ماں کو کیا ضرورت ہے رلنے کی۔'' ان کے لہجے میں اسرار پنہاں تھا۔ وہ واقعی یہ چاہتی تھیں کہ نجمہ بیگم ان کے ساتھ چل کے ان کے عالیشان گھر میں رہیں۔ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر ملازمین پہ حکم چلائیں تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ ان کی بیٹی نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔

''جس نے مجھے آج تک نہیں رلنے دیا وہ مجھے اب رلنے دے گا؟'' دور فضاؤں میں اڑتے پرندوں پہ نظر جمائے وہ متبسم لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔

''اف نانی! آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ میں کچن میں رکھے سب برتن دھو بھی آئی۔'' وہ اپنی دھن میں بولتی آئی تھی نانی کے ساتھ بیٹھی ماں کو نہ دیکھ سکی۔ تب ہی چونک کر رخ موڑتی نیلم نے بھی اسے دیکھا۔ پندرہ سولہ سال کی سرو قد سی لڑکی کے چہرے میں ان کے پُرکشش نقوش کی جھلک تھی۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت گو ان کے اور فلک ناز کی گلابیاں چھلکاتی رنگت کے آگے پانی بھرتی تھی۔ مگر پھر بھی کوئی ایسا تاثر ضرور تھا جو اسے ان سے بھی زیادہ ممتاز کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کے نوخیز چہرے پہ چھائی معصومیت تھی... یا شاید کچھ اور جو وہ سمجھ نہیں پائی تھیں۔

''میں اصل میں نانی کے لیے اور اپنے لیے چائے بنانے لگی تھی آپ پئیں گی چائے؟'' وہ اپنی ماں سے یوں مخاطب تھی جیسے کسی اجنبی عورت سے مخاطب ہو۔ نیلم کے لبوں سے پھیکی سی مسکراہٹ پھوٹی تھی۔

''اماں! یہ میری ستارہ ہے نا؟'' استعجاب سے پُر لہجہ پہچان کے رنگوں میں رنگا تھا۔ ان کے گہرے اشتیاق پہ احمریں نے سر جھکا لیا تھا۔ اس کے ذہن میں ماں کی کوئی شبیہ نہیں تھی۔ اس کے لیے اس کی نانی ہی اس کی ماں تھی۔ اس میک اپ میں رنگے چہرے سے اسے کوئی مانوسیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں یہ میری احمریں ہے۔ تمہاری ستارہ تو اس دن ہی مر گئی تھی جب تم اسے میری گود میں ڈال کے اپنی رنگین دنیا میں کھو گئی تھیں۔'' انہوں نے تڑخ کر جواب دیا تو نیلم کی نظریں احساس ندامت سے جھک گئیں۔

’’ستارہ! بیٹا تم جاؤ اپنے لیے چائے بناؤ ہم دونوں کے لیے بھی بنا لو آج میں پہلی بار اپنی بیٹی کے ہاتھ کی چائے پیوں گی۔‘‘ ان کے لہجے سے جھلکتا مصنوعی التفات احمریں کے دل میں ماں کی محبت جگانے میں مکمل ناکام رہا تھا وہ پلٹ ہی رہی تھی جب نانی کی آواز پہ رک گئی۔

’’احمریں کہیں نہیں جائے گی۔ آج جو بھی بات ہوگی اس کے سامنے ہوگی... اور یہ تم اسے بار بار ستارہ بلانا بند کرو۔‘‘ نانی کے لہجے میں چٹختی چنگاریاں جیسے نیلم کی روح تک کو جلا گئی تھیں۔ وہ بے بس سی ہوگئی۔

’’اماں! آپ تو جانتی ہی ہیں۔ میں ان دنوں بہت بیمار رہتی تھی۔ چاہ کے بھی اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں کر پاتی تھی۔ ان دنوں مجھے فلک کے کیریر کی بھی فکر تھی۔ ان ہی دنوں ان دونوں کے پاپا بھی چل بسے۔ میں غم سے نڈھال تھی۔ آپ لوگوں کو منانے کی غرض سے میں نے اسے یہاں چھوڑا تھا۔‘‘ اپنی مجبوریاں بیان کرتی سامنے بیٹھی اس کی ماں کے درجے پہ فائز عورت ابھی بھی اس کے دل میں نرم گوشہ حاصل نہیں کر پائی تھی۔ وہ نانی کے سامنے دھری پلاسٹک کی پیڑھی پہ بیٹھی تھی۔ نانی کے گھٹنوں میں تکلیف تھی اس لیے وہ پاؤں کے بل نہیں بیٹھ سکتی تھی سو اس پیڑھی پہ بیٹھ کے وہ پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتی تھیں۔ کبھی کبھی نئے پودے بھی لگاتی تھیں۔

’’پھر ایسا چھوڑا کہ بھول ہی گئیں کہ تمہاری فلک کے علاوہ بھی کوئی اولاد ہے۔ یہ بے چاری کچھ کہتی نہیں تو یہ مطلب تو نہیں کہ یہ ماں کی محبت کو ترستی نہیں ہوگی۔‘‘ نانی کا لہجہ اب کے نم ہوا تھا۔ اس نے تڑپ کر نانی کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھا اور بولی:

’’نہیں نانی! میری ماں آپ ہیں۔ آپ میرے ساتھ تھیں تو کیسے میں ماں کے پیار کو ترستی، آپ نے ہمیشہ مجھے ماں سے زیادہ چاہا ہے۔‘‘ احمریں نے محبت پاش نظروں سے نانی کو دیکھتے ہوئے ان کا مان بڑھایا۔

’’میں اب کسی بات کی وضاحت دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ بس آپ میرے ساتھ جا رہی ہیں تو جا رہی ہیں۔ ستارہ تم بھی اپنا سامان پیک کر لینا کل ہم یہاں سے نکلیں گے۔‘‘ دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے نیلم نے ایک نظر احمریں پہ ڈالی جو بے چینی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

’’میں نے کہہ دیا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ میری ماں نے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا کہ نجمہ اب شوہر کے گھر سے مر کے ہی نکلنا۔ اب یہاں سے میری میت ہی اٹھے گی۔ ویسے بھی جس مقصد کے لیے تمہیں بلایا تھا وہ تو پورا ہو نہیں سکا۔ شاید تجھ جیسی ناہنجار اولاد کے نصیب میں باپ کا آخری دیدار تھا ہی نہیں۔ بہرحال اب تم جا سکتی ہو یہاں سے کوئی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔‘‘ اپنے تئیں وہ بات کو اختتامی مرحلے پہ پہنچا چکی تھیں۔ مگر نیلم اپنے ہاتھ سے تڑپ کا پتا کیسے جانے دیتی لمحوں میں بدک کر اٹھی تھی۔

’’میری فلائٹ لیٹ ہوگئی تھی میرا کیا قصور؟ بہرحال آپ نہیں جانا چاہتیں مت جائیں... مگر میں ستارہ کو اپنے ساتھ ضرور لے کر جاؤں گی۔‘‘ فیصلہ کن انداز میں نجمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے بات سمیٹی تھی۔

’’میری احمریں کہیں نہیں جائے گی۔‘‘ نانی کے لہجے میں احتجاج تھا جسے مکمل طور پہ نظرانداز کرتے ہوئے نیلم نے کہا۔

’’کیا چاہتی ہیں آپ؟ ابا تو اب رہے نہیں۔ کیسے سنبھالیں گی اسے؟ اس کی پڑھائی، اس کی کالج یونیورسٹی کی فیس، اس کی شادی کا خرچا کیسے کریں گی یہ سب، یہ سبزیاں بیچ کے؟ یا اس خیرات سے جو مسجد کے بانی پینشن کے نام پہ آپ کو دیں گے۔ یہ آپ کی بھول ہے کہ میں اپنی بیٹی کو یوں خیرات پہ سسک سسک کے پلنے کے لیے یہاں چھوڑ جاؤں گی۔ میں اسے لے کے ہی جاؤں گی سمجھیں آپ؟‘‘ سرکشی بھرے لہجے میں چلاتی نیلم اپنے قدموں کی دھمک چھوڑتی اندر چلی گئی تو پیڑھی پہ بیٹھی ساڑھے پندرہ سالہ لڑکی ڈر گئی ڈھ تو ستر سالہ نجمہ بیگم بھی گئی تھیں۔ تب ہی تو تاریک پڑتے احمریں کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں سمو کر بوسہ دیتی ہوئی بولیں۔ ’’تو فکر نہ کر‘‘ اور اسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر اس کی پیٹھ کو تھپکنے لگی تھیں۔ تب ہی انہیں محسوس ہوا کہ احمریں کے وجود میں کپکپاہٹ ہے۔ بے بسی میں ڈوبے دو آنسو ان کی گالوں پہ رینگتے ہوئے احمریں کے بالوں میں گم ہوئے تھے۔ وہ جانتی تھیں نیلم جو کہتی تھی کر کے چین لیتی تھی۔

☆☆☆

اسے ناز منزل آئے ایک ماہ ہو چلا تھا۔ یہ گھر وہ محل تھا جس کا تصور اس نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ کئی کنال پہ محیط یہ گھر شیشے کا سفید محل لگتا۔ باہر سے آنکھوں کو خیرہ کرتی اس کی خوبصورتی اندر آنے پہ دو چند ہو جاتی تھی۔ گھر کے چاروں طرف بنا لان اتنا وسیع تھا کہ اس کے پانچ چکر لگاتے

صبح سے شام ہو جاتی۔ مخملیں گھاس یوں سبز تھی جیسے اس پہ گرد کا سایہ تک کبھی نہ پڑا ہو۔ یہ کمال ہمہ وقت وہاں آن ڈیوٹی مالی کا تھا۔ اس وسیع و عریض لان میں کئی ہرے بھرے درخت تھے مگر سٹینگ ایریا سے بہت دور۔ لان میں پھولوں کے پودوں کی اتنی ورائٹی تھی کہ اسے سب پودوں کے نام تک نہیں آتے تھے۔ اندر آنے پہ وسیع و عریض لاونج آتا جو سامان تعیش سے بھرا پڑا تھا۔ کئی ملکوں کی نوادرات سے سجا لاونج گویا نانی کے سارے گھر سے بھی بڑا تھا۔ وال ٹو وال امپورٹڈ کارپٹ سے سجا یہ محل اس کی سوچ کی حد سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ ڈرائنگ روم میں رکھے نوادرات میں سے اسے ایک مٹی کی گڑیا بہت پسند آئی تھی جو روایتی لباس پہنے گھڑا کمر پہ ٹکائے ایک اسٹائل سے کھڑی تھی۔ اسے لگتا وہ بھی نوادرات میں سے ایک ہے۔ جسے اس کی مرضی کے بنا ایک بالکل مختلف ماحول میں لا کے سجا دیا گیا ہے۔ اس مٹی کی بے جان گڑیا اور سانس لیتی جیتی جاگتی احمریں میں ایک قدر مشترک تھی، وہ بھی بے بس بے زبان تھی اور احمریں بھی۔

اسے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا وہ لائٹ گرے کی تھیم پہ تیار کیا گیا تھا۔ کرسٹل کے قیمتی شو پیسز سے سجا یہ کمرا بھی اپنی مثال آپ تھا۔ دبیز قالین پہ پاؤں رکھنے پہ جیسے پاؤں ایک انچ اندر دھنس جاتا تھا۔ صوفے کا ڈیزائن اتنا خوبصورت تھا کہ کوئی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ کمرے سے ملحقہ اٹیچ باتھ اتنا بڑا تھا جتنا نانی کے گھر میں موجود اس کا کمرا تھا۔ وہاں اس کے استعمال کی ہر چیز موجود تھی۔ دھلے دھلائے سفید تولیے شیمپو، دو طرح کے شاور، الگ ڈریسنگ روم گویا دس بیس لاکھ تو صرف باتھ روم میں غرق کیے گئے تھے۔ اس کے کمرے میں موجود ڈریسنگ ٹیبل میک اپ کی جدید اشیاء سے اٹا پڑا تھا۔ کئی طرز کے پرفیوم، کئی رنگوں کی لپس اسٹک، کئی رنگوں کی نیل پالش، کیوٹکس، کئی شیڈز کی بیس، چوڑیوں کے اسٹینڈ میں سجی کئی رنگوں کی چوڑیاں۔ گویا اس کے آنے سے پہلے اس کا کمرا دنیا کی ہر سہولت اور ہر آرام سے آراستہ تھا۔ وہ اکثر ڈریسنگ ٹیبل پہ سجی چوڑیوں پہ ہاتھ پھیرتی جہازی سائز بیڈ پہ آبیٹھتی۔ بیڈ کا یہ ڈیزائن آج کل فیشن میں بہت ان تھا پھر بھی... نرم وگداز اسٹائلش بیڈ پہ جیسے کانٹے اگ آتے۔ اسے ہر چیز سے نفرت سی ہونے لگتی۔

اس کی سولھویں سالگرہ آ کے گزر بھی گئی۔ وہ نانی کے گھر ہوتی تو کیک کاٹ کے ان کے ہاتھ کا پلاؤ کھاتی۔ اتنا ہی اہتمام اس کو سرشار کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہاں ہر روز ایسی ڈشیز کھانے کو ملتی تھیں جو وہاں کبھی تصور میں بھی نہیں آئی تھی.. پھر بھی نجانے ایسا کیا تھا جو برداشت کی حدوں سے کہیں آگے تھا۔ وہ تینوں وقت کا کھانا کمرے میں کھاتی تھی۔ اسے جانے کیوں اپنی سگی ماں اور بہن سے عجیب اجنبیت محسوس ہوتی تھی۔ نیلم بھی اسے وقت دے رہی تھی یہاں ایڈجسٹ ہونے کا۔ فلک کے پاس تو خیر ٹائم ہی نہیں تھا۔ سفیر احمد کے سوپ کے علاوہ بھی اس کے پاس دو تین اور پروجیکٹ آ چکے تھے۔ جن میں مصروف تھی۔ موسم بدل رہا تھا نومبر کی شامیں اب ہلکی خنکی لیے ہوتی تھیں۔ وہ گلاس وال سے باہر دیکھ رہی تھی جب ہلکی سی دستک دے کے نیلم ناز اندر چلی آئیں۔ بیڈ روم چیئر پہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کے بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا۔

''کیسی ہو؟ کیا سارا دن کمرے میں گھسی رہتی ہو، باہر نکلا کرو۔ کہیں آیا جایا کرو۔ شیف سے اپنی پسند کی ڈشیز بنوایا کرو، تم تو لگتا ہے یہاں آ کے بھی وہیں ہو۔'' نیلم نے سنجیدگی سے کہہ کے جیسے اسے شرمندہ کرنا چاہا تھا۔

''نہیں ماما جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' لرزتے گھبرائے لہجے میں دی گئی وضاحت پہ نیلم نے ایک ناگوار نظر اس پہ ڈالی۔

''یہ ماما جی کیا ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ ماما کہا کرو یہ تو نہیں کہا تھا کہ ساتھ جی کا لاحقہ بھی لگاؤ۔ یہ پینڈوؤں والا انداز چھوڑ دو، ایک مہینا ہو گیا ہے تمہیں یہاں آئے۔ یہاں کا رہن سہن اپناؤ۔'' بری طرح ٹوک کر تضحیک آمیز لہجے میں نصیحت کی گئی تھی۔

''میں سوچ رہی ہوں کالج میں تمہارا ایڈمیشن کروا دوں۔ تمہارے پاس تو کوئی ڈھنگ کا جوڑا بھی نہیں اس کا مطلب ہے شاپنگ بھی کرنی پڑے گی پہلے۔ تمہاری تو چوائس ہی پینڈوؤں جیسی ہوگی میں شام میں خود ہی شاپنگ کرلوں گی جا کے تمہارے لیے۔ تم بس سبجیکٹ سوچ کے رکھو جو تم پڑھنا چاہتی ہو۔'' پُرسوچ انداز میں وہ خود ہی سوال خود ہی جواب دے رہی تھی والا معاملہ کر رہی تھی۔

''مجھے شروع سے سائنس سبجیکٹس پسند ہیں۔ میں وہ ہی رکھوں گی نانی چاہتی تھیں میں ڈاکٹر بنوں۔'' نانی کی یاد نے اس کی آنکھیں دھندلا دیں تھی۔

''نانی کیا چاہتی تھیں، یہ بات اب تم بھول جاؤ۔ تمہیں اب صرف وہ کرنا ہوگا جو تمہاری ماں یعنی میں چاہوں

گی۔'' اس کی بات کو قابل اعتنا نہ جانتے ہوئے فی الفور آرڈر دیتی وہ کمرے سے نکل گئی۔ گویا اس کے متفق ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہونا تو وہ ہی تھا جو وہ چاہتی۔

اگلے دن شام کو ملازمہ اس کا بلاوہ لے کے آگئی۔ وہ لاؤنج میں گئی تو فلک ناز بھی وہیں تھی۔ نیلم اسے ساتھ والے صوفے پہ بٹھائے اس کے لیے کی گئی شاپنگ دکھا رہی تھی۔ جس میں رنگ برنگی جینز پینٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس کے مختصر سوال میں تحیر تھا۔ شاپنگ بیگز بند کرتے نیلم کے ہاتھ ایک پل کو تھمے تھے۔ جبکہ فلک کے چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

''یہ تمہارے ڈریسز ہیں جو تم کالج پہن کے جاؤ گی اور کیا؟'' مختصر سوال کا مختصر جواب دے کے وہ چائے کا پوچھنے آتی ملازمہ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''کالج تو یونیفارم پہن کے جاتے ہیں نا۔ یہ تو کوئی نہیں پہنتا۔'' آنکھوں میں حیرت کا جہان بسائے اس نے کمزور سے لہجے میں توجیہہ پیش کی۔ موبائل پہ مگن فلک نے جیسے حظ اٹھایا۔

''بے بی! وہ نانی کے گھر جیسے غریب گھروں کی لڑکیاں پہنتی ہیں۔ ہمارے سرکل کی لڑکیاں اسی لباس میں کالج، یونیورسٹی جاتی ہیں۔ تم اب مولوی حکمت الٰہی کے گھر میں نہیں بلکہ مشہور ایکٹریس نیلم ناز اور فلک ناز کے ولا میں رہتی ہو۔'' تمسخرانہ لہجے میں باور کرواتی یہ اس کی بڑی بہن تھی جس کے سامنے وہ ملازمہ سے زیادہ نروس تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ملازمہ نے سکندر بخت کے آنے کی اطلاع دی۔ فلک اپنے کمرے میں تیار ہونے کے لیے بھاگی تھی۔ نیلم جانتی تھی آج ایک پروجیکٹ پہ سائن کروانے سکندر بخت آنے والا تھا۔ جس کا ڈراما اداکارہ سہانی کی ناقص اداکاری کی وجہ سے بس نارمل ریٹنگ دے سکا اسی لیے اس بار اس نے فلک کو سائن کرنا تھا۔

''میں جلد تمہارا کالج میں ایڈمیشن کروادوں گی۔ یہ لو کچھ پیسے رکھ لو تمہیں کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' وہ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی گود میں ڈال کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ انہیں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں جانا تھا فلک کی مورال سپورٹ کے لیے۔ احمریں گود میں رکھے کاغذ کے پرزوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے بے اختیار نانی کا گھر یاد آیا جہاں تنخواہ آتے ہی نانا نانی کی ہتھیلی پہ رکھ کے بے فکر ہو جایا کرتے تھے اور نانی اسے پاس بٹھائے حساب کتاب میں جت جاتی تھیں۔ یہ گھر کا خرچ، یہ اسکول کی فیس، یہ سبزیوں کے بیج، یہ تنگی تکلیف کے لیے۔ احمریں ان کے حساب پہ حیران ہوتی تھی۔

''اور نانی! سبزیاں بیچ کے جو پیسے آئیں گے ان کا کیا کریں گی؟'' احمریں کھلکھلا کے پوچھتی تو نانی کسی ننھے بچے کی طرح آنکھوں میں سارے جہان کی شرارت سموئے کہتیں۔

''سبزیوں کے پیسے سے میں اپنی احمریں کے لیے جہیز جوڑوں گی۔ پھر ایک دن اپنی احمریں کو دعاؤں کے سائے میں رخصت کروں گی۔'' دور آسمانوں پہ نظر جمائے جیسے وہ خوابوں کے دھاگے بن رہی تھیں۔ احمریں مسکرا دیتی۔

''بس کریں نانی! ابھی تو مجھے پڑھنا ہے بہت زیادہ۔ اتنا پڑھنا ہے کہ لوگ مجھ پہ رشک کریں۔ آسمان کا سب سے روشن ستارہ بننا ہے مجھے۔'' وہ آسمان پہ نظر جمائے جذب سے کہتی تو نجمہ خاتون دہل کے اس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ دیتیں۔

''خبردار آئندہ ایسی بات کی۔ تو احمریں ہے میری احمریں، ستارہ نہیں ہے، تو کبھی ہو بھی نہیں سکتی سمجھی تو۔'' نانی کے لہجے سے جھلکتی تشویش عجیب تر تھی۔ تب وہ حیران سی بس نانی کو نارمل کرنے کی کوششیں کرتی ہوئی ان کے ہیجان خیز رویے پہ الجھتی رہتی۔ کچھ باتیں لاعلمی کے عالم میں اتنا الجھاتی نہیں جتنا جان لینے کے بعد آگاہی کے عذاب میں مبتلا کرتی ہیں۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

اس کا کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ پہلا سال عجیب بے ترتیبی میں لوگوں سے ڈرتے ہچکچاتے گزرا پھر اس نے نا موافق حالات کو اپنے طرز پر ڈھالنا شروع کر دیا۔ کالج کے پہلے ہفتے میں ہی اس کی دوستی افشین سے ہوئی تھی۔ اس کے کالج کی بریلینٹ اسٹوڈنٹ جو ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک ہفتہ مزید گزرنے تک وہ اسے اپنے حالات بتا چکی تھی جس میں ہر قسم کی مدد کا وعدہ کر کے افشین نے ایک بہترین دوست ہونے کا ثبوت دیا۔ احمریں کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس نے افشین سے کالج یونیفارم منگوایا جو وہ رات کو سب کے سونے پہ پریس کر کے بیگ میں چھپا لیتی تھی۔ گھر سے وہ جینز شرٹ میں جاتی۔ کالج جا

کے کالج یونیفارم پہن کے اس کی چادر کو نماز کے انداز میں لپیٹ لیتی تھی۔ اس کا ایڈمیشن شہر کے بہترین کالج میں ہوا تھا مگر وہ کیا کرتی اس کے دل میں... دھرنا دیئے کسی ناراض بچے کی مانند بیٹھی احمریں نیلم ناز کے لاکھ مارنے پہ بھی نہیں مری تھی۔ کالج میں چھٹی ٹائم تھا۔ احمریں پینٹ شرٹ میں ملبوس افشین اور اس کے پاس بیٹھی عمارہ کو ہاتھ ہلاتی کالج سے نکل گئی۔

''افشین ! یہ احمریں! کچھ زیادہ ہی عجیب نہیں ؟'' عمارہ نے کالج کے گیٹ تک پہنچی ستارہ کی پشت کو گھورتے ہوئے افشین کو ہلکا سا ٹہوکا مار کے پوچھا۔

''ہاں یار! کچھ نہیں بہت زیادہ عجیب ہے... بلکہ عجیب بھی نہیں کہنا چاہیے، ناشکری ہے ناشکری۔'' اکتائے ہوئے لہجے میں کہتی افشین ستارہ کی ہر طرح کی مدد کرنے کے باوجود اسے حق پہ نہیں سمجھتی تھی۔

''کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔'' عمارہ، افشین کی کزن تھی مگر ان کے خاندانوں کی آپس میں بول چال نہیں تھی۔ اس لیے ایک کالج میں ہوتے بھی وہ افشین کو مخاطب نہیں کرتی تھی۔ یہ حال ہی میں ہوئی صلح کا نتیجہ تھا کہ وہ بہت عرصے سے دماغ میں گھومتے سوال کو نوک زبان پہ لے آئی تھی۔

''بھئی مطلب صاف ہے۔ جیسے یہ ایک مشہور اداکارہ کی بیٹی ہے۔ اگر میں ہوتی نا تو میں کم سے کم اس طرح کی حرکتیں نہ کرتی۔ ہم جیسی لڑکیاں کالج میں جینز پہننے کی حسرت لیے ہی واجبی سی تعلیم مکمل کر لیتی ہیں جبکہ یہ جینز پہ یونیفارم کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ اس کے کمرے میں ہر طرح کی کاسمیٹکس سجی ہیں مگر اسے دیکھا ہے۔ یوں بن کے آتی ہے جیسے کسی بھی قسم کے میک اپ سے اس کا منہ جل جائے گا۔ جانے یہ صبح منہ بھی دھوتی ہے کہ نہیں۔'' عمارہ کو وضاحت سے بتاتی افشین کے لہجے میں رشک و حسد تھا۔

''چلو چھوڑو ہمیں کیا۔'' شانے اچکاتی عمارہ نے بیگ اٹھاتے ہوئے وہ جملہ کہا جو ہر انسان تب بولتا ہے جب کوئی بھی پُر تجسس بات تفصیل سے سن کے اس سے حظ اُٹھا چکا ہوتا ہے۔ افشین کے چہرے پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ جلد ہی وہ اپنے بھائی کے ساتھ بائیک پہ گھر روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

احمریں جب گھر میں داخل ہوئی تو معمول کا سناٹا تھا۔ نیلم ناز پارلر گئی ہوئی تھی۔ جبکہ فلک شوٹ سے تھک کے آئی تھی تو سید ھے سونے چلی گئی۔ ان دنوں وہ ایک فلم کر رہی تھی۔ ایک مشہور پروڈکشن ہاؤس کے بینر تلے بننے والی اس فلم کو پاکستان کی ہیوی بجٹ فلم قرار دیا گیا تھا۔ احمریں ڈرائنگ روم میں ہی رک گئی۔ صوفے پہ بیٹھی وہ کارنر ٹیبل پہ رکھی مٹی کی گڑیا سے مخاطب تھی۔

''آج تیرا بھی چہرہ اداس لگ رہا ہے کیا تجھے بھی کسی کی یاد آرہی ہے ؟ میری طرح۔ مجھے تو سال ہو گیا نانی کو دیکھے ان کی آواز سنے۔'' کمر پہ گھڑا ٹکائے شان بے نیازی سے سامنے دیکھتی گڑیا اس کی ہمراز تھی۔ ابھی بھی گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے اپنی کہے گئی۔ ہوش میں تو تب آئی جب ملازمہ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص کو لیے اندر چلی آئی۔

''سکندر صاحب! آپ بیٹھیں میں بے بی کو جگاتی ہوں۔ بیگم صاحبہ تو پارلر گئی ہیں۔'' ملازمہ بولتے ہوئے اسے ایک صوفہ تک لائی تھیں۔ گو احمریں ایک ہی جست میں ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی تھی مگر وہ سکندر بخت کی نظروں میں آچکی تھی۔

''سنو یہ لڑکی کون تھی۔'' سکندر نے ملازمہ کو روکتے ہوئے پوچھا۔ اسے دیکھ کے ڈر کے بھاگ جانا سکندر کو عجیب لگا تھا۔

''جی سر! یہ ستارہ بی بی ہیں۔ فلک بے بی کی چھوٹی بہن۔'' ملازمہ نے نیلم کے دیئے ہوئے نئے نام سے احمریں کا تعارف کرایا۔ وہ پلٹنے لگی تھی جب سکندر پھر بولا:

''اسے پہلے تو کبھی یہاں نہیں دیکھا؟ سگی بہن ہے یا کزن؟'' نہ جانے کیوں اسے تجسس ہو رہا تھا ستارہ کے بارے میں۔

''جی جی سگی بہن ہے۔ یہ پہلے اپنی نانی کے پاس رہتی تھیں نا۔ اب ایک سال سے یہیں ہیں۔'' ملازمہ تفصیل بتا کے چل دی تو وہ سوچنے لگا کہ اس کے نئے پروجیکٹ کے لیے ایسے ہی چہرے کی ضرورت ہے جو واقعی کالج گرل لگے بھی۔ اسے تیس پینتیس سالہ فلک ناز اس رول کے لیے بالکل ہی غیر موضوع لگ رہی تھی۔ فلک کچھ دیر میں ہی ہلکا پھلکا میک اپ کیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ معذرت آپ کو انتظار کرنا پڑا اصل میں میں سو رہی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے میں آج کل فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں۔'' سلام کر کے سکندر کے مقابل رکھے صوفہ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے وہ بولی تو سکندر نے مسکرا کے سلام کا جواب دیا۔

''ایکچولی سوری تو مجھے کہنا چاہیے۔ اس دن گھر سے کال آنے پہ میں ایمرجنسی میں گھر کی طرف بھاگا اور کانٹریکٹ سائن نہیں کروا پایا۔'' وضاحت دیتا سکندر اس مخمصے میں تھا کہ بات کرے تو کیسے۔

''کوئی بات نہیں سکندر صاحب! جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ اصل میں ان ہی دنوں مجھے یہ فلم آفر ہوئی۔ اب شوٹنگ بھی شروع ہوگئی۔ اب شاید میں آپ کے پروجیکٹ میں حصہ نہ لے سکوں۔'' معذرت خواہانہ تاثرات چہرے پہ سجائے وہ اپنی بات کہہ گئی۔ سکندر کو لگا کہ اب بات کرنا اس کے لیے کچھ آسان ہوگا۔

''چلیں کوئی مسئلہ نہیں۔ پھر آپ کو کسی میگا پروجیکٹ میں شامل کریں گے۔ بھئی اب تو آپ فلم آرٹسٹ ہیں اب تو ہر کوئی آپ کو اعزازی طور پہ اپنے ڈرامے میں شامل کرنا چاہے گا۔'' سکندر کی بات پہ فلک کی اکڑی گردن فخر سے کچھ اور تن گئی تھی۔

''جی جی کیوں نہیں ایک آرٹسٹ کا تو کام ہی اچھے اسکرپٹ میں جان ڈالنا ہے۔ فلم آرٹسٹ ہوں تو کیا ہوا۔ اچھا کام مجھے جس بھی شعبے میں ملے گا میں ضرور کروں گی۔'' اس وقت مصنوعی عاجزی اس کے چہرے کو کتنا عجیب بنا رہی تھی وہ خود دیکھ لیتی تو ڈر جاتی۔ سکندر نے سوچ کے سر جھٹک دیا۔

''نیلم آپا نظر نہیں آ رہیں، کیا وہ کہیں گئیں ہیں۔'' اس نے سوال کیا تو فلک کچھ حیرت زدہ رہ گئی، کہ سکندر تو کام کی بات کے سوا کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا آج یوں ماما کی غیر حاضری محسوس کر رہا تھا۔

''ماما پارلر گئی ہیں آتی ہی ہوں گی۔ لیں وہ آ بھی گئیں۔'' فلک کی بات منہ میں ہی تھی جب نک سک سے تیار نیلم نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ رسمی سلام دعا کے اختتام پر ملازمہ ٹی ٹرالی گھسیٹتی اندر داخل ہوئی۔

''آپا! ابھی آپ کی چھوٹی بیٹی سے ملاقات ہوئی۔ اب جبکہ فلک میرا سیریل نہیں کر رہیں تو میری خواہش ہے کہ یہ رول آپ کی چھوٹی بیٹی ستارہ کرے۔ یوں اسے شوبز میں متعارف کروانے کا سہرہ بھی میرے سر جائے گا۔ ویسے بھی یہ ہیرو کی چھوٹی بہن کا رول ہے جو ایک کالج گرل ہے۔ تو کیا ہی اچھا ہو جائے کہ یہ رول ایک کالج گرل یعنی ستارہ ہی کرے تو...'' اب کے وہ بغیر رکے بڑے اعتماد سے مدعا بیان کر گیا تھا۔ نیلم خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوگئی تھی۔

گدھ (Valture)

چیل کی قسم کا بہت بڑا پرندہ، جو گلا سڑا گوشت اور مردار کھاتا ہے اس کے سر پر پر نہیں ہوتے، چنانچہ وہ مردہ جانور کے گوشت کے اندر اپنا سر گھسیڑتا ہے، تو اس کے پر لتھڑنے نہیں پاتے۔ گدھ تین قسم کے ہوتے ہیں۔

راج گدھ، سفید پشت گدھ اور سفید گدھ۔

راج گدھ ایک بڑا جسیم پرندہ ہے۔ اس کی لمبائی ڈھائی فٹ کے قریب ہوتی ہے، گویا وہ چیل سے دگنے ڈیل ڈول کا ہوتا ہے۔ یہ گدھ پاکستان میں بہت کم پایا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ اس جانور کا قد اونچا اور رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ بڑا پیٹو جانور ہے۔ مردار کے گوشت سے اپنے پیٹ کو ناکوں ناک بھر لیتا ہے اور زمین پر سیدھا بیٹھ جاتا ہے اس کے اردگرد چیلیں اور گدھ بیٹھے رہتے ہیں، جو گویا اس راجا کا دربار ہے۔ اس کی چھاتی سفید اور جسم کے دونوں طرف بھی سفید داغ ہوتے ہیں۔ جب تک یہ پیٹ نہ بھر لے مردار پر دوسرے جانوروں کو قریب نہیں آنے دیتا۔

سفید پشت گدھ پاکستان میں عام ہے۔ جنوری میں بچے انڈوں سے نکلتے ہیں، لیکن عموماً ایک ہی انڈا ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ کا نچلا حصہ نمایاں طور پر سفید ہوتا ہے باقی جسم خاکستری بلکہ سیاہ ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ کا سفید رنگ بازوؤں کے آخری سرے تک چلا گیا ہے۔ جب اڑتا ہے تو یہ سفید حصہ اوپر کی طرف ہو جاتا ہے۔

سفید گدھ جس کو مصری گدھ بھی کہتے ہیں، مذکورہ بالا ہر دو گدھوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی دو فٹ تک ہوتی ہے اور چال بطخ کی طرح۔ اڑتا ہوا دور سے خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن پاس سے بھدا اور ناگوار نظر آتا ہے۔ ٹانگوں اور چہرے پر بال نہیں ہوتے چونچ کا سرا خم دار ہوتا ہے۔ ٹانگیں چہرہ اور چونچ زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ بازوؤں کے سرے چوڑے اور کالے ہوتے ہیں اور جسم کے باقی حصے پر میلے سے سفید پر ہوتے ہیں۔ سفید گدھ اڑتے وقت اپنے پاؤں اور ٹانگیں سکیڑ لیتے ہیں مگر جب زمین پر بیٹھنا چاہتے ہیں تو کچھ دیر پہلے ٹانگوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں اور نیچے لٹکا دیتے ہیں اس طرح وہ بہ آسانی نیچے آ جاتے ہیں۔

مرسلہ: احمد شاہ، حیدرآباد

جبکہ فلک شا نے اچکاتی اپنی بے پروائی کا اظہار کرتی کمرے سے نکل گئی۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ ستارہ کو بخت پروڈکشن جیسا کامیاب پروڈکشن ہاؤس متعارف کروائے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی۔'' نیلم نے مسکراتے ہوئے جیسے ستارہ کے لیے یہ رول قبول کیا تھا۔ کانٹریکٹ پیپر اور اسکرپٹ وہ نیلم کے کہنے پر جاتے ہوئے یہیں چھوڑ گیا تھا۔ شوٹنگ کی ڈیٹ ایک ماہ بعد کی تھی۔ شوٹنگ شروع کرنے سے پہلے کئی معاملات تھے جنہیں سکندر کو منطقی انجام تک پہنچانا تھا۔ نیلم کو بھی یہ عرصہ غنیمت لگا کہ انہیں معلوم تھا ستارہ جیسے مولویانہ سوچ کی مالک لڑکی کو ایکٹنگ کی طرف مائل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ان کی سوچ کے عین مطابق ستارہ نے سنتے ہی انکار کر دیا تھا۔ جس کو اقرار میں بدلنے کے لیے نیلم ناز نے ہر حربہ آزمایا۔ جن میں سرفہرست اس کے کمرے میں کھانا نہ بھیجنا تھا۔ وہ کھانا اب بھی اپنے کمرے میں کھاتی تھی۔ اب نیلم اکثر اس کے کمرے میں کھانا بھیجنا دانستہ بھول جاتی تھی۔ خود وہ ایسی تھی کہ خود کچن میں جا کے کھانا نہ کھاتی۔ نیلم کا دل پھر بھی نہ پگھلتا وہ ہمیشہ سے فلک کی ماں تھی۔ ستارہ کی حیثیت اس کی نظر میں ترپ کے اس پتے سے زیادہ نہیں تھی جو اسے بے انتہا فائدہ پہنچانے والا تھا۔

''تو تم اپنی ضد نہیں چھوڑو گی چاہے میں اپنی جان لے لوں۔'' اس دن بھی بہت دیر بحث کے بعد کہا جانے والا ان کا جملہ جادو اثر ثابت ہوا۔

''ایسا مت کہیں ماما! آپ کی جان میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ آپ کے قدموں میں میری جنت ہے۔ آپ کی حکم عدولی گو یا رب کی ناراضگی ہے۔ ٹھیک ہے جو آپ کہیں گی میں وہ ہی کروں گی۔'' دل ہی دل میں خود کو رب کی رضا پہ راضی کرتے ہوئے وہ بولی تو اس کے لہجے میں شکست تھی وہ واقعی ہار گئی تھی۔

''میرے مالک! اگر آپ مجھے ایسے دیکھ کے خوش ہیں۔ تو میں بھی خوش ہوں آپ میرے ساتھ ہیں تو پھر مجھے دنیا سے کیسا ڈر۔'' اس کے لبوں سے نکلی سرگوشی جیسے ہوا میں تحلیل ہوتی ہوئی کہیں ساتویں آسمان پہ محفوظ ہوئی تھی پھر اس کے لرزتے دل نے بارہا اس بات کی صداقت کو محسوس کیا کہ جب خدا خود کسی کی حفاظت کا ذمّہ لیتا ہے تو کن کن وسیلوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

☆☆☆

اسے ڈرامے کی آفر نہیں ہوئی تھی گویا اس کے لیے آزمائش کا ایک در کھلا تھا۔ نیلم کے دیئے ہوئے اسکرپٹ کو پڑھنا، یاد کرنا اور ان کے سامنے پرفارم کرنا جیسے اس کی روٹین میں زبردستی شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ آرڈر بھی تھا کہ سونے سے پہلے پریکٹس ضرور کرنی ہے۔ وہ ایک گھنٹا جو ایکٹنگ کی پریکٹس کی غرض سے نیلم نے مختص کیا تھا وہ اس کے لیے عذاب تھا۔ وہ ایکٹنگ کی ابجد سے بھی ناواقف تھی۔ ہر بار ڈائیلاگز بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ سارا دن وقفے وقفے سے قرآن کی آیتوں کا ورد کرنے والی زبان پہ ڈائلاگ چڑھتے بھی تو کیسے۔ اس دن بھی وہ اسکرپٹ پہ نظریں جمائے لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ جبکہ اس کا دماغ لایعنی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کئی دن کے بعد فلک بھی آج گھر میں تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے سامنے والے صوفے پہ جا بیٹھی۔ نیلم آج شوٹ پہ تھی۔

''کیا ہوا بے بی! ڈائیلاگ نہیں یاد ہو رہے؟ اتنا ایزی تو ہے، نا جانے تمہیں کیوں مشکل لگتا ہے۔ ٹھہرو میں بتاتی ہوں۔'' دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس سے اسکرپٹ چھین کر ایک نظر ڈال کے ذہن نشین کیا پھر اسکرپٹ اسے واپس کرتی گلا کھنکھارتے ہوئے وہ سب ڈائیلاگز ایسے بولنے لگی جیسے وہ اسے پہلے سے ازبر ہوں، پھر داد طلب نظروں سے اسے دیکھتی واپس اپنی جگہ پہ جا بیٹھی۔ اس نے اپنی گود میں رکھا ہوا اسکرپٹ ایک طرف رکھا اور کھڑی ہو کے فلک کے انداز میں ہی بولی۔

''بھائی! آپ زندگی کو اتنا آسان کیوں سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ زندگی آپ کو آڑے ہاتھوں لے آپ کو اپنے مستقبل کے لیے سنجیدہ ہونا ہوگا۔ کہتے ہیں نا کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے تو اگر آپ سبین کو میری بھابی بنانا چاہتے ہیں تو پہلے خود کو اس مقام پہ لانا ہوگا کہ تائی امی کو آپ سے بہتر آپشن کوئی نہ لگے۔'' رواں لہجے میں ہیرو کی بہن کے ڈائیلاگ بولتی احمریں کے چہرے کے تاثرات فلک سے کہیں زیادہ بہترین تھے۔

''واہ بہت خوب، ایویں تم کہتی ہو کہ تم ایکٹنگ نہیں کر سکتی۔ تم نے تو مجھے شاکڈ کر دیا ہے۔ یقیناً مام ٹھیک کہتی ہیں تم ایک تراشیدہ ہیرا ہو بس تھوڑی سی گرومنگ کی ضرورت ہے۔'' اپنی جگہ سے اٹھ کے تالی بجاتی ہوئی مام کے اس ترپ کے پتے کی قائل ہوگئی۔ احمریں پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

وہ اتنی ذہین تھی کہ جو کرنا چاہتی کچھ کوشش کے بعد کر لیتی۔
فلک کی رپورٹ کے باوجود نیلم غیر مطمئن تھیں۔ اس رات نیند نہ آنے پہ پانی لینے باہر آتی نیلم کے دل میں جانے کیا سمائی کہ جگ کچن میں ہی رکھے وہ ستارہ کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ وہ رات کو پریکٹس کرتی ہے کہ نہیں۔ اس نے ہینڈل پہ ہاتھ رکھا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی ہیٹر کی ہلکی گرمائش نے سواگت کیا۔ دبیز قالین میں غائب ہوتی ان کے قدموں کی چاپ اسے دبے پاؤں آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی دیکھ رہی تھی کہ احمریں بیڈ پہ چت لیٹی آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ احمریں جواب ستارہ کہلانے لگی ہے وہ اس کی بات مان رہی ہے پھر بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوتی وہ نیم تاریک کمرے میں آگے بڑھنے لگیں۔ بیڈ تک پہنچ کر انہوں نے جھک کر اس کی آواز سننا چاہی تو وہ دنگ رہ گئیں۔ ستارہ کے لبوں پہ قرآنی آیات کا ورد تھا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو کے کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔
احمریں جب سے نانی کے گھر سے آئی تھی اس کا یہ معمول تھا آنکھیں بند کیے قرآن کی آیات پڑھتی اور یوں محسوس کرتی جیسے نانی پہلے کی طرح اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی ہیں۔ وہ اس قدر مگن تھی کہ نیلم کا آنا پھر الٹے پیروں لوٹ جانا اسے محسوس نہ ہوا۔

☆☆☆

ستارہ ناز نے گو سپورٹنگ رول کیا تھا۔ مگر اس کا پہلا ہی ڈراما اس قدر ہٹ گیا تھا کہ آفرز کی لائن لگ گئی۔ اس کے معصوم چہرے میں عجیب سی کشش تھی۔ آنکھوں میں بسا سوگوار سا تاثر بڑی بڑی آنکھیں کو اور بھی خوبصورت بناتا تھا۔ ڈراموں کی حد تک وہ نیلم کی بات مانتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے کریڈٹ پہ کئی ہٹ ڈرامے آ گئے۔ وہ گریجویشن کے آخری سال میں تھی جب اسے فلم کی آفر ہوئی جو نیلم نے اسے پوچھے بنا قبول کر لی۔ اتفاق سے فلک کی فلم بری طرح پٹی تھی جس کے بعد اسے ڈرامے بھی کم آفر ہونے لگے۔ اس کی بھی سب امیدیں ستارہ سے وابستہ ہو گئیں۔ اندر ہی اندر فرسٹریشن کا شکار ہونے کے باوجود وہ ستارہ کی کامیابی پہ خوش تھی۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ستارہ کے ہر پروجیکٹ کی پیمنٹ نیلم لیتی تھی۔ ناکافی کام ملنے کے باوجود نیلم اور فلک کی زندگی اسی شاہانہ طرز عمل پہ چل رہی تھی یہ سب صرف اور صرف ستارہ کی بدولت ممکن ہوا تھا۔
میں اس کا سپورٹنگ رول تھا۔ وہ جو روز باہر نکلتے وقت خود کو اللہ کے حوالے کرتی تھی۔ جو اللہ کو سوچتی تھی۔ جو دل سے خدا کو چاہتی تھی رب کب اسے چاہنے لگا وہ بھی نہ سمجھ پائی مگر جب ساتھ کام کرنے والے لوگ اسے دیکھ کے نظر جھکا لیتے تھے تو اس کا دل اپنے رب کے رحم پہ لبریز ہو جاتا تھا لیکن فلم کی آفر کاسن کے وہ پل میں پریشان ضرور ہوئی تھی مگر اسکرپٹ دیکھ کے مطمئن ہو گئی۔ ہیروئن کی سہیلی کا رول تھا۔ جو بہت مختصر تھا مگر پاور فل تھا۔ فلم کمپلیٹ ہو کے سینما میں کیا پہنچی کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ ستارہ پہ فلمائے گئے گانے کی شہرت پورے پاکستان میں مچ گئی۔ گو اس گانے میں ڈانس بس نام کا تھا۔ مگر گانے کے بول اور سنگر کی آواز اس قدر خوبصورت تھی کہ گانے کے بول بچے بچے کی نوک زبان پہ سج گیا تھا۔ وہ اب کھانا ان کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کے کھاتی تھی۔ ابھی بھی وہ تینوں ناشتے کے لیے اکٹھی ہوئی تھیں۔
''تم نے آج میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے ستارہ! آج میں بہت خوش ہوں۔'' اورنج جوس کے سپ لے کر نیلم نے ایک محبت پاش نظر اس پہ ڈالتے ہوئے کہا۔
''بالکل فلم کی افتتاحی تقریب میں جیسے سب مجھے مبارکیں دے رہے تھے مجھے لگا یہ ستارہ کی نہیں میری کامیابی ہے... ورنہ میری فلم کے فلاپ ہونے کے بعد تو ٹکے ٹکے کے لوگوں نے میرا مذاق اڑایا تھا۔'' فلک نے چشم تصور میں سہائی کے چہرے پہ سجی طنزیہ مسکراہٹ کو دیکھا۔
''چلیں میرے کسی عمل سے تو آپ لوگوں کو خوشی ملی۔'' اس نے سادہ سے انداز میں کہا تھا مگر فلک کو اس کا انداز جانے کیوں چبھا تھا۔
''لڑکیو! میرے پاس تم لوگوں کے لیے اس سے بھی بڑی خوشخبری ہے، بوجھو تو جانیں کہ وہ کیا ہے۔'' نیلم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''کہیں ستارہ کو کوئی اور فلم تو آفر نہیں ہوئی۔ یا پھر ایسا تو نہیں کہ آپ کو کوئی میگا ڈراما آفر ہو گیا ہو۔'' فلک کی قیاس آرائیوں پہ نفی میں سر ہلاتی نیلم قہقہہ لگا کے ہنس دی۔ اس نے ایک نظر جوس کے سپ لیتی لاتعلق سی ستارہ پہ ڈالی۔
''پاکستان کے سب سے کامیاب پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سکندر بخت نے مجھ سے ستارہ کا ہاتھ مانگا ہے۔'' نیلم کی جیسے باچھیں کھل رہی تھیں۔ ایک پل کے لیے ستارہ کا

ہاتھ لرزہ تھا۔
"واہ سکندر سے رشتے داری مطلب کئی برس کے لیے شوبز پہ ہماری اجارہ داری۔ یہ تو واقعی بہت بڑی خوشخبری ہے۔" فلک نے بوائل انڈا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا تو نیلم ناز سر دھننے لگیں۔
"تم اندازہ نہیں لگا سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ سکندر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شادی کے بعد بخت پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی ہر فلم میں لیڈنگ رول پہ پہلا حق ہمارا ہو گا۔" بے تحاشہ خوش ہو کے بتاتی نیلم نے ہاف فرائی ایگ میں کانٹا ٹکاتے ہوئے چھری سے پیس کر کے کانٹے میں سلائس کا ٹکڑا اور انڈا پروتے ہوئے منہ میں ڈالنے لگیں۔
"مگر میں خوش نہیں ہوں۔ نہ ہی میں شوبز کی کسی شخصیت سے شادی کر کے تمام زندگی اس تاریک راہ پہ چلوں گی جہاں نام نہاد عزت کے نام پہ یہ شان و شوکت ہے۔ عزت تو کہیں بھی نہیں اور مجھے ایسی زندگی بالکل منظور نہیں۔" مستحکم لہجے میں کہتی وہ بیگ اٹھا کے نکلتی چلی گئی۔
آج وہ کئی دن کے بعد کالج جا رہی تھی۔ اس کے فورتھ ایئر کے امتحانات قریب تھے۔ کالج میں بھی وہ خاموش خاموش تھی۔ آخر کلاس کے بعد کالج کے وسیع و عریض لان میں بیٹھی افشین نے اسے کریدنا شروع کر دیا۔ اسے کوئی بات کھٹکتی تھی تو وہ جان کے ہی رہتی تھی۔ سو اب بھی احمریں کچھ رد و کدح کے بعد اپنا ہر دکھ اس کے سامنے کھولتی چلی گئی۔
افشین جیسی مخلص دوست سے وہ کچھ چھپا سکتی بھی نہیں تھی۔ افشین سے اس کی دوستی اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کے اسرار پہ وہ پانچ چھ دفعہ اس کے گھر بھی ہو آئی تھی۔ اس کے گھر تھا ہی کون۔ وہ لوگ دو ہی بہن بھائی تھے، وہ اور اس کا بھائی توصیف احمد جنہیں عاطفہ خاتون نے بیوگی کے بعد کپڑے سی کر اور پیٹ کاٹ کر پالا تھا۔ احمریں کا توصیف سے بہت کم سامنا ہوتا تھا۔ سامنا ہوتا بھی تو وہ نظر جھکا کے گزر جاتا۔ اس کی یہ عادت احمریں کو بے حد بھاتی تھی۔ ان کے گھر کا مذہبی ماحول۔ عاطفہ خاتون کا اس کے یوں ناز اٹھانا۔ توصیف کا یوں اس کا احترام کرنا اسے سب بہت پسند تھا۔
"تم اگر برا نہ مناؤ تو میرے پاس تمہارے اس مسئلے کا ایک حل ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار یہ بات تم سے کرنا چاہتی تھی مگر تمہارے اور ہمارے درمیان یہ جو حیثیت کا فرق ہے نا یہ میری زبان پہ تالے ڈال دیتا ہے۔" افشین نے کچھ ہچکچاتے ہوئے بات شروع کی۔
"افشین تم جانتی ہو کہ تمہارے اور میرے درمیان حیثیت کا فرق کبھی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ایسا ہوتا تو میں اپنی ہر بات تم سے نہ کہتی۔" احمریں نے جیسے تسلی آمیز لہجہ اپناتے ہوئے اسے بولنے پہ آمادہ کیا۔
"بات دراصل یہ ہے کہ توصیف بھائی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ میں بھی تمہیں بھابی بنانا چاہتی ہوں۔ امی تو تمہارے گھر بھی آنا چاہتی تھیں میں نے روک دیا کہ کہیں وہاں سے انکار نہ ہو جائے۔" جوتے کی نوک سے مخملیں گھاس کریدتے ہوئے افشین بولی تو آر یا پار والا انداز تھا۔
"افشین! اب کی بار تمہاری امی ہمارے گھر آنا چاہیں تو روکنا مت۔ مگر میری ایک شرط بھی اپنے بھائی کو بتا دینا کہ میں کبھی بھی شوبز کی طرف مڑ کے نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے دین دار گھرانے میں میری اس خواہش کا بصد شوق احترام کیا جائے گا۔" اپنی بات مکمل کرتی وہ وہاں سے اٹھ آئی۔ اپنے تئیں اس نے اس ناگوار زندگی سے ہمیشہ کے لیے نجات کا حل ڈھونڈ نکالا تھا۔ گھر آتے ہی اس نے لاؤنج میں بیٹھی نیلم کے سامنے توصیف کا پرپوزل رکھ دیا جسے سنتے ہی وہ بپھر اٹھیں۔
"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ تم سکندر جیسے کامیاب انسان پہ اپنی دوست کے کلرک بھائی کو ترجیح دے رہی ہو۔" نیلم کے لہجے میں توصیف کے لیے حقارت تھی۔ اسے واقعی ایک پل کے لیے اس کی عقل پہ شک ہوا تھا۔
"آپ جو بھی سمجھیں مگر توصیف کی والدہ آئیں تو آپ انہیں انکار نہیں کریں گی... کیونکہ توصیف جیسا دین دار گھرانے سے تعلق رکھنے والا ہی وہ شخص ہے جو مجھے نانی جیسی عزت دار زندگی دے سکتا ہے۔" اس نے دوٹوک لہجے میں قطعیت تھی۔
"واہ جی وا مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔ میں نے کہا تھا نا مام! اس مولویانی کے اندر نانی کی روح گھسی ہے۔ وہاں کے تنگ نظر ماحول کی جہالت اس کے دماغ میں بسی ہے، یہ کبھی بھی آپ کی اور میری اُمیدوں پر پوری نہیں اتر سکتی۔" ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوئی فلک نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ جسے نظرانداز کرتی وہ اٹھ کے جانے لگی جب نیلم کی سرسراتی ہوئی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔
"اگر میں توصیف کی ماں کو ہاں نہ کہوں تو؟ کیا کر لو

گی تم۔'' ان کے لہجے میں چھپی سفاکیت اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا گئی تھی۔

''تو پھر میں نانی کے گھر چلی جاؤں گی۔ آپ کی ڈیمانڈ پہ کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے کرتے میں تھک چکی ہوں۔'' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔ جس پہ نیلم کا چہرہ مزید سپاٹ ہوا جبکہ فلک نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا۔

''نانی کے پاس کیسے جاؤ گی انہیں تو اس جہان سے گئے بھی کئی ماہ بیت گئے۔ جب تمہاری فلم کا پہلا پریمیئر تھا تب ہی تمہاری پیاری نانی اپنے پیارے اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔'' فلک نے بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب کہاں جاؤ گی۔

''نانی چلی گئیں اور آپ لوگوں نے مجھے بتایا تک نہیں۔ مجھے ان کا آخری دیدار تک نہیں کرنے دیا۔'' اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ نیلم کے چہرے پہ اب شرمندگی کے رنگ تھے۔

''بتا دیتی تو کیا کر لیتی تم؟ روک لیتی انہیں، نہیں نا۔ بس سب چھوڑ چھاڑ وہاں جا پڑتی۔'' شرمندہ لہجہ اس کے امڈتے آنسوؤں پہ بے اثر تھا۔ آنسو لڑیوں کی صورت گالوں پر لڑھکتے آ رہے تھے۔

''آپ بھی نہیں گئیں۔ کم سے کم آپ تو چلی جاتیں۔'' اس نے کمزور سا احتجاج کرتے ہوئے صوفے کی پشت تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔

''کیا کرتی وہاں جا کے جس سے رشتہ تھا وہ ہی نہیں رہیں تو کس کے پاس جاتی میں۔ محلے کی ان جاہل عورتوں کی ٹکے ٹکے کی باتیں سننے جاتی میں۔ وہ جاہل عورتیں جن کی نظر میں ان کے سوا سب برے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کے ہاتھ اچھی خاصی رقم محلے کی کرتا دھرتا اماں رمضانی کو بھجوا دی تھی۔'' وہ یوں کہہ رہی تھیں جیسے بس فرض ادا ہو گیا ہو۔

''بے بی! جاؤ کمرے میں جا کے غم مناؤ اور جب منا چکو تو ذہنی طور پہ خود کو سکندر سے شادی کے لیے تیار کرو، اور ماما نیک کام میں دیر کیسی سکندر کو فون کریں اور نکاح کی ڈیٹ فکس کریں۔ نیلم کے مقابل رکھے صوفے پہ نیم دراز ہوتے ہوئے اسے طنزیہ انداز میں دیکھتی فلک نیلم سے کہنے لگی۔ احمریں کا چہرہ غصے سے سرخ پڑا۔''

''یہ آپ لوگوں کی بھول ہے کہ اب میں آپ کی کسی بھی بات کو مانوں گی۔ توصیف سے شادی نہ بھی ہوئی تب بھی میں کسی دارالامان میں رہ لوں گی مگر شوبز میں مزید کام نہیں کروں گی اور یاد رکھیے گا دارالامان جانے سے پہلے میں ایک پریس کانفرنس کروں گی جس میں یہ انکشاف کروں گی کہ کیسے آپ نے اتنا عرصہ مجھے حبس بے جا میں رکھا اور مجھ سے جبراً مشقت کرواتی رہیں۔'' باغیانہ انداز میں کہتی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ پیچھے دونوں نفوس اس کی اس جرات پہ شاکڈ رہ گئے۔

☆☆☆

یہ وہ پہلی دفعہ تھی کہ اس نے کوئی ضد کی تھی اور یہ ہی وہ پہلی دفعہ تھی جب اس کی ضد پوری ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی کا یہ وہ واحد فیصلہ تھا جو اس نے گھبرا کے فوراً مگر اپنی سمجھ بوجھ سے کیا تھا۔ توصیف کی والدہ آئیں اور شادی کی تاریخ بھی رکھ گئیں۔ یہ سب اتنی اچانک ہوا تھا کہ نیلم ناز اور فلک ناز بس ششدر رہ گئیں۔ وہ شاید جان گئی تھیں کہ یہ ترپ کا پتا اب کھوٹے سکے میں بدل چکا ہے۔ فلک بھی اب پچھتا رہی تھی۔ نانی کے انتقال کی خبر ستارہ پہ بہت بے ڈھنگے انداز میں کھلی تھی...اور نیلم پچھتا رہی تھی کہ کاش وہ ستارہ کو سکندر کے پرپوزل پہ مجبور نہ کرتیں تو شاید سب ویسے چلتا رہتا جیسے پہلے چلتا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں شادی کا دن آ پہنچا جس کی تیاری انہوں نے بے دلی سے کی تھی۔ ایکٹریس ہونے کے باوجود ستارہ ناز کی شادی سال کی سب سے سادہ شادی قرار پائی تھی۔ ایک فلم نے اسے اس قدر عروج بخشا تھا کہ میڈیا والے اس تجسس میں لگ گئے کہ وہ شادی کے بعد شوبز سے رشتہ رکھے گی بھی کہ نہیں۔ یہ سوال صحافیوں کے لیے ایک معما تھا۔

وقت رخصت نیلم ناز نے سرگوشی کی صورت لاتعلقی کا اظہار اس کے کانوں میں انڈیلا تھا۔ فلک نے منہ موڑ کے ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ خاموش تھی کیوں کہ ان سے جڑی یہ زندگی وہ دل سے ناپسند کرتی تھی۔ اتنا عرصہ ان کے ساتھ رہ کے بھی محبت جیسی ناپید چیز نے ان کے درمیان پل کا کام کبھی نہیں کیا تھا۔

اس کا سسرال میں پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ وہ اس گھر کی اکلوتی بہو تھی۔ پورا محلہ جیسے سپر اسٹار ستارہ ناز کو دیکھنے کے لیے امڈ آیا تھا۔ کوئی کانوں کو ہاتھ لگا کے عاطفہ کی قسمت توبہ توبہ کرتا جا رہا تھا۔ کہ عاطفہ نے ضرور کوئی گناہ کیا جس کی سزا میں میراثیوں کی بیٹی ان کے نصیب میں بہو کے روپ میں لکھی گئی۔ کچھ حیران تھے کہ عام صورت توصیف میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ آسمانوں کی حور اس کے نصیب

میں لکھی گئی۔ غرض ان سب میں ایک بات مشترک تھی وہ سب فرشتے تھے جو ایک عام سی ایکٹریس پہ رائے دینے میں حق بجانب تھے۔ اب وہ رائے اچھی ہوتی یا بری یہ اس میراثن کا نصیب۔ افشین اس کے ساتھ سیلفیاں لے لے کر سوشل میڈیا پہ اپلوڈ کرنے میں مگن رہتی۔ وہ اسے منع کرتی رہ جاتی کہ اب تو وہ شوبز چھوڑ چکی ہے سو یہ سب بے فائدہ ہے۔ مگر افشین کچھ سننے کے موڈ میں ہی نہیں ہوتی تھی۔

توصیف ایک اچھا شوہر تھا، اس سے اچھا بیٹا اور بھائی تھا۔ ایک ہفتہ دعوتوں میں گزر گیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا راتیں پھر سے خنکی لیے ہوئے تھیں۔ گو اس کے پاس بری اور جہیز کے کئی جوڑے تھے مگر سب کام والے جو گھر میں پہنے نہیں جا سکتے تھے۔ توصیف اسے اور افشین کو لیے بازار آ گیا۔

بازار میں سجے رنگا رنگ ملبوسات گویا دیکھنے والے کو کھینچتے تھے۔ توصیف نے دو، دو سوٹ اس کے لیے اور افشین کے لیے پیک کروائے۔ عاطفہ خاتون کے لیے بھی دو سوٹ اور میچنگ شالیں خریدی گئیں اپنے لیے اس نے کچھ نہیں لیا تھا۔ شاپنگ مال میں پھرتے پھرتے ایک جگہ اس کی نگاہیں جم سی گئیں۔ ایک جگہ بہت خوبصورت برقعے ٹنگے تھے جس میں سے گولڈن ننھے ننھے ستاروں سے سجا عبایا اس قدر خوبصورت تھا کہ احمرین کی نگاہیں اس پہ سے پلٹنا بھول گئیں۔ عبایا پہننا اس کی شروع کی خواہش تھی۔ افشین کے پاس رنگ برنگے ہر طرز کے عبائے تھے۔

”توصیف مجھے یہ پسند آیا ہے پلیز یہ لے دیں۔“ وہ کچھ دور شرٹس دیکھتے توصیف کو بازو سے پکڑ کے کھینچ کے اس طرف لے آئی جہاں عبایا ٹنگا تھا۔

”کیا؟ یہ لینا ہے تم نے۔“ عبایا دیکھتے ہی وہ یوں قہقہے لگانے لگا جیسے اس نے کوئی بہت ہی مزاحیہ بات سن لی ہو۔

”یہ کیا کر رہے ہیں توصیف! پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہیں لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔“ اِکّا دُکّا گزرتے لوگ واقعی متوجہ ہو رہے تھے۔

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے کہ میری ہنسی نہیں تھم رہی یعنی تم اب عبایا پہنو گی جب کہ تم ڈراموں میں اور فلم میں آ چکی ہو۔ یعنی نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔“ اس کے منہ سے الفاظ نہیں جلتے ہوئے انگارے نکلے تھے۔ جس کی تپش احمرین کی روح تک کو جھلسا چکی تھی۔ آنکھوں میں آئی نمی اندر دھکیلتے وہ باہر کو بھاگ گئی تھی۔ پشیمان سا توصیف بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ گھر آنے تک وہ اس سے معذرت کر چکا تھا، وہ بھی اسے معاف کر چکی تھی۔ کھانا کھا کے وہ کمرے میں آئی تو توصیف اس کے فون سے کسی سے بات کر رہا تھا یکفخت اسے فطری تجسس نے گھیرا وہ خاموشی سے دروازے میں کھڑی اس کی باتیں سننے لگی۔

”جی جی احمد صاحب! کیوں نہیں آپ جیسی بڑی شخصیت کوئی پروجیکٹ شروع کرے اور ستارہ اس میں کام نہ کرے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“ وہ بات کر کے خاموش ہوا تھا شاید دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔ احمرین کے جیسے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ احمد ارسلان سے بات کر رہا تھا۔ احمد ارسلان کا شمار ملک کے جانے مانے پروڈیوسرز میں ہوتا تھا۔

”ارے میں نے کہا نا کوئی مسئلہ ہی نہیں، کل آپ ہماری طرف تشریف لائیں۔ کانٹریکٹ پیپر بھی سائن کر لیں گے۔ اور باقی معاملات بھی طے کر لیں گے۔ جی جی کیوں نہیں میں ابھی آپ کو ایڈریس ٹیکسٹ کرتا ہوں اوکے اللہ حافظ۔“ توصیف نے بڑے خوشگوار موڈ میں بات کو اختتامی رنگ دے کے فون آف کیا اور بیڈ پہ اچھال دیا۔

”تم نے مجھ سے پوچھے بنا کیسے میرے موبائل پہ بات کی؟ تمہیں افشین نے میری شرط نہیں بتائی تھی۔“ دروازے کے سانچے میں جسے اپنے بے روح وجود کو گھسیٹتی وہ کمرے میں داخل ہو کے آنکھوں میں بے یقینی کا جہان آباد کیے باز پرس کر رہی تھی۔

”سب سے پہلی بات کا جواب یہ کہ یہ میری بیوی کا موبائل ہے اسے میں کبھی بھی کہیں بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ دوسری بات کا جواب یہ کہ افشین نے مجھے تمہاری شرط بتا دی تھی۔“ اپنے پنجوں پہ گھومتا چہرے پہ شیطانیت سجائے وہ دانستہ خاموش ہوا تھا۔

”اب میری بھی پہلی اور آخری بات سن لو میں کل کسی سے نہیں ملوں گی۔ نہ اب کوئی ڈراما یا فلم کروں گی۔ یہ شادی سے بھی پہلے کا میں طے کر چکی ہوں۔“ اپنے تئیں وہ بات ختم کر کے واش روم کی طرف مڑی تھی.. مگر دوسرے ہی پل توصیف نے اس کا ہاتھ تقریباً مروڑتے ہوئے اسے اپنے مقابل کھڑا کیا تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو کوئی عرش سے اتری حور ہو تم جو میں نے دو کپڑوں میں تمہیں قبول کیا ہے۔ نہیں ستارہ ناز تم ایک ایکٹریس ہو تمہارا ایک ہٹ ڈراما مجھے لاکھوں کا مالک بنا سکتا

ہے۔ میری ماں نے جتنے جتنوں سے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے تمہیں نہیں لگتا کہ ان کے سکھ کے لیے مجھے اور تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ ایک اعلیٰ زندگی کے لیے مجھے تمہاری ایک کیا ہزار شرطیں بھی توڑنی پڑیں تو توڑ دوں گا۔'' احمریں کا ہاتھ گویا آہنی شکنجے میں تھا مگر اس کے برعکس توصیف کے لہجہ شہد آگہیں تھا۔ جیسے وہ سہج سہج کسی بچے کو اس کی نادانی پہ سمجھا رہا ہو۔ مگر اس کے سامنے کوئی بچہ نہیں بلکہ حافظہ احمریں کھڑی تھی جس کے سینے میں حقیقی معنوں میں قرآن اس طرح سمایا تھا کہ دنیا کی جگہ بچی ہی نہیں تھی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم چاہو گے تو میں جاب کر کے اس گھر کی ذمے داریوں میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔ جلد ہمارے حالات بھی بدل جائیں گے دیکھنا۔ مگر شوبز اب دوبارہ جوائن کبھی نہیں کروں گی مر کے بھی نہیں۔'' اس نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنایا اور جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑایا جو کہ سرخ پڑ چکا تھا۔

''تم اگر سمجھتی ہو... کہ شوبز چھوڑنے کے اس قدر احمقانہ فیصلے پہ تم مجھے ہمنوا کر سکتی ہو تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ اب تو مرتے دم تک تمہیں شوبز میں کام کرنا ہے خوشی سے کرو یا مجبوری سے۔'' اس کی بے بسی پہ مسکراتا وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ احمریں کو لگا اس کے پاس فیصلے کے لیے یہ ہی چند لمحات ہیں۔ کچھ ہی ساعتوں میں اس کا دماغ وہ فیصلہ کر چکا تھا جس کی ہمت آج تک اس کا دل نہیں کر پایا تھا۔ لمحوں میں اس کا دل اس ساری دنیا سے اوب گیا تھا۔ وہ چھپ جانا چاہتی تھی دنیا کے اس کونے میں جہاں غرض کے کشکول تھامے مکروہ چہرے فریب کی محبت اوڑھے نظر نہ آئیں۔ اس نے کچھ گھنٹوں پہ پہلے سیف میں ٹانگی ہوئی شال نکالی اور گھر سے نکلتی چلی گئی۔ ماں اور افشین کے دروازے بند تھے سو وہ ہر بات سے بے خبر تھیں۔

سڑک پہ چلتی اِکا دُکا گاڑیاں محوِ سفر تھیں۔ رات کی جولنا کی نا جانے کون سے درد خود میں سمیٹے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی آتے سرد ہوا کے جھونکے گویا ریڑھ کی ہڈی میں گھس کر سے کانپنے پہ مجبور کر رہے تھے۔ اوائل نومبر کی یہ رات واقعی تنی سرد تھی یا زندگی میں پہلی بار دربدری کا غم اس کی شریانوں میں دوڑتے خون کو منجمد کر رہا تھا اس کا الجھا ہوا ذہن اس بات کا فیصلہ ہی نہیں کر پایا۔

سڑک کے اطراف لگی سجی لذیذ پکوانوں کی دکانوں سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ریڑھی بان مختلف آوازیں لگاتے گزر رہے تھے۔ وہ اب سڑک کے اس حصے میں چل رہی تھی جو قدرے سنسان تھا۔ دنیا کی تمام آوازیں جیسے پیچھے رہ گئیں۔ چادر کا کونہ دانتوں میں دبائے احمریں کے دل میں سکون کی ایک لہر موجزن ہوئی تھی وہ جیسے دنیا سے دور ہو رہی تھی۔ ایک پل کو اس کی دھندلی آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا جیسے سامنے تاریک گھور اندھیرے میں ڈوبی سڑک نہیں بلکہ خالق کائنات کی مہربان پناہ ہو۔ یک لخت ساری زندگی کی تھکن عود کے آئی تھی۔ اس کے چلتے قدم اب بھاگ رہے تھے جیسے وہ جلد از جلد کچھ دور نظر آتی پناہ میں محفوظ ہو کر ہر غم بھلا دینا چاہتی ہو۔ تب ہی کوئی ہاتھ میں کچھ پکڑے اس کے سامنے آیا تھا۔

''کہاں بھاگ رہی ہیں میڈیم جی! کیا سمجھتی ہو کہ تم اگر مجھے کما کے نہیں کھلا سکتی تو تمہاری اس بوڑھی گھوڑی ماں اور لومڑی جیسی خاطر بہن کے لیے کچھ کرنے کے قابل میں تمہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اگر اللہ اللہ ہی کروانا ہوتا تو کسی ایکٹریس کو کیوں بیاہ لاتا۔ تمہاری شرط کے پیشِ نظر تمہارا انتظام پہلے کر لیا تھا میں نے۔ بڑا شوق ہے نا تجھے اللہ اللہ کرنے کا لے اب کر۔'' ایک ہی جست میں سامنے آتے توصیف نے ہاتھ میں پکڑا سیال اس کے چہرے پہ گرایا تھا۔ احمریں کو لگا اس کھولتے ہوئے سیال نے اس کے نقش تک پگھلا دیئے ہیں۔ دفعتاً ایک آنکھ صدا کے لیے سیاہی میں ڈوبی تھی۔ دل دوز چیخوں نے جیسے زمین و آسمان کو لرزایا تھا۔ وہ بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی چیخیں سرگوشی میں ڈھل کر ایک لفظ میں سمٹ گئی تھیں ''اللہ۔'' تیزاب اس کی زبان کو جھلسا نہیں پایا تھا جس سے شدید تکلیف میں بھی ایک نام ورد کی صورت نکل رہا تھا۔ یکلخت اسے لگا خالق کائنات نے اپنی محفوظ ترین پناہ میں اسے سمیٹا تھا۔ اس کے سن ہوتے اعصاب جیسے اسی سہارے کے منتظر تھے۔ نانی کی احمریں نے بالآخر وہ پا لیا تھا جس کی دھن میں وہ کتابِ عشق کی آیتوں سے عشق کرتی رہی اور بصد احترام انہیں اپنی سانسوں میں پرو لیا۔ اللہ کی طرف رخ کر کے اندھا دھند بھاگتی احمریں کو خدا مل گیا تھا۔ خدا تو اس کے ایک قدم پہ دس قدم اس کی طرف بھاگتا تھا جیسے وہ اس کی پہلی خواہش پہ لگنے والی آخری ٹھوکر پہ اسے اپنی پناہ میں نہ لیتا۔ بے شک ہم انسان ہی جلد بازی میں اپنے دشمن بن جاتے ہیں۔ خواہش شیطان کا وہ سب سے بڑا ہتھیار جس کے ذریعے وہ

انسانوں کو بہکاتا آیا ہے۔

یہ ہی وہ لمحہ تھا جب توصیف کے دل کو دیکھ لیے جانے کے خوف نے ایسے جکڑا کہ وہ اندھیری سڑک پہ اندھا دھند بھاگتا ایک گاڑی کی زد میں آ کے وہیں لقمۂ اجل بن گیا۔ بے شک رب چاہے تو کھڑے کھڑے انصاف کر دے، چاہے تو اپنی مصلحت کے تحت مقررہ وقت کے لیے ٹال دے۔ نہ جانے کس نے احمریں کے زخم خوردہ وجود کو سرکاری اسپتال کی دہلیز تک پہنچایا تھا۔

دوسرے دن یہ خبر ہر اخبار کی زینت بنی تھی کہ مشہور اداکارہ ستارہ ناز کو شوبز چھوڑنے پہ تیزاب سے جھلسانے والا ان کا شوہر نامعلوم گاڑی کی زد میں آ کر موقع پر ختم جبکہ ستارہ ناز کی حالت تشویشناک۔ یہ خبر نیلم ناز کے دل پہ زہر اثر ثابت ہوئی۔ وہ نیلم ناز جس کے لیے ستارہ صرف ایک ترپ کا پتا تھی۔ اس کے پتھر سے دل میں ممتا کے گہرے احساس کو جاگزیں کرنے کی قدرت رب واحد کے سوا کون رکھتا تھا۔ نیلم ناز کو فالج کیا ہوا فلک کی جیسے دنیا ہی اجڑ گئی۔ یہ وہ عورت تھی جس کے بھرم پہ وہ عرصہ سے درپیش ناکامیوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ماں کی اس حالت پہ وہ ستارہ کو جھولی بھر بھر کے بددعائیں دیتی تھی اور ایسا کرتے ہوئے ہیجان خیزی میں وہ کئی چیزوں کو زمین بوس کرتی جاتی۔

''اچھا ہوا تو دنیا کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہی بھیانک ہو گیا تیرا وہ چہرہ جو دنیا کو مجھ سے زیادہ خوبصورت لگتا تھا۔'' خالی گھر میں گونجتے اس کے قہقہے اس کی ذہنی حالت کے عکاس تھے۔ اس کا انجام بہت دور نہیں تھا۔

☆☆☆

''اللہ! کو کھوج لینے کی دھن اس کے اندر یوں رچی تھی کہ کوئی راستہ نہ نظر آنے پہ بھی یہ بس رب کو سوچتی رہی، اسے چاہتی رہی، اس کے آسمان سے اتاری گئی آیتوں سے عشق کرتی رہی۔ دنیا اسے عجیب سمجھتی تھی۔ درحقیقت تو عجیب یہ دنیا ہے۔ دنیا کو مقدم رکھ کر اللہ سے مغفرت مانگتی ہے۔ اس نے قرآن جیسی مکمل ضابطہ حیات پہ مبنی آفاقی کتاب سے عشق کیا۔ وہ کتاب جس کے پارے پارے میں خدا نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا۔ جس کے ذریعے اپنے بنائے ہوئے انسانوں کو یہ حکم دیا کہ اے انسانوں میرے محبوب پہ درود بھیجو۔ وہ کتاب عشق جس میں انسانیت سے عشق کی تلقین کی گئی، وہ ضابطۂ حیات جس پہ اگر تمام عمر کفر پہ قائم رہنے والے صدق دل سے چلے تو چند دنوں میں سنور جائے۔ اس کتاب سے عشق کرنے والی یہ عورت عجیب کیسے ہوئی۔ نیلم ناز نے اپنے انداز میں اور توصیف احمد نے اپنے انداز میں اس کے قرآن سے منور دل کو دنیا کی اتھاہ تاریکیوں میں پھینکنا چاہا مگر نا کام رہے۔ تخلیق کار نے جب اس کے دل کو بنایا ہی دین کی مٹی سے تھا تو دنیا میں کوئی بھی اس پہ دنیا کا رنگ کیسے چڑھا سکتا تھا۔'' فرحانہ تفصیل سے بتاتے ہوئے جیسے کسی اور ہی دنیا میں گم تھی۔

''بے شک تخلیق کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں اور کوئی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ خدا کی تخلیق پہ اپنی مرضی کا رنگ چڑھا سکے۔ جو ایسا کرتے ہیں خطا کار ٹھہرتے ہیں۔'' سمیرا کے لہجے میں اعتراف تھا۔ سمیرا کی نظر پھر بھٹک کر حضرت بی بی کی طرف اٹھ گئی جو تھک کے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ چکی تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کے حضرت بی بی کی جانب چل دی۔ پاس جانے پہ یہ انکشاف ہوا وسیع و عریض صحن کے احاطے میں چکراتے جانے کہاں سے حضرت بی بی کے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ چکا تھا۔ دھول سے اٹے سیاہ ہوتے پاؤں پہ خون کے قطرے ابھر آئے تھے جس سے بے نیاز حضرت بی بی اب گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے بیٹھے جھوم رہی تھیں۔ یکلخت اس کا دل ہمدردی کے گہرے احساس سے بھر آیا تھا۔ وہ آلتی پالتی مار کے حضرت بی بی کے سامنے بیٹھ چکی تھی بنا کسی کراہت کے، بنا ناک پہ دوپٹا اوڑھے۔ کانٹا حضرت بی بی کے پیر کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان چبھا تھا۔ سمیرا نے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے کانٹا نکالا تھا۔ ایک سسکی سی حضرت بی بی کے منہ سے نکلی تھی۔ اس نے فوراً بیگ سے رومال نکال کے بھل بھل نکلتے خون پہ سختی سے باندھا تھا۔ حضرت بی بی کی واحد آنکھ میں حیرت در آئی تھی۔

''حضرت بی بی! میرے لیے دعا کیجئے گا میں اپنی ''میں'' مارنے کی پوری کوشش کروں گی۔'' مختصراً کہتی وہ دربار کے داخلی دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ فرحانہ نے پھولتی سانسوں سے اس کے قدم کے ساتھ قدم ملائے تھے۔ سمیرا... رکشے میں بیٹھ کر نظر سے لحہ بہ لحہ اوجھل ہوتے دربار کو دیکھ رہی تھی۔ حضرت بی بی کی کہانی سن کے اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی تھی۔ اس میں وہ انقلاب آیا تھا جو اسے عشق حقیقی کے خوبصورت رنگوں میں رنگ گیا تھا۔

++



لمحہ آگہی

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم.....!
یہ ایک واقعہ ہے لیکن اس میں سبق ہی سبق ہے۔ ایسا سبق جو آپ کی زندگی کو خوش گواریت سے بھردے گا۔ ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں، اس کا آئینہ ہے۔

عالی مان آفاقی
(بہاولپور)

ابھرتے سورج کی کرنوں کا جال زمین کے رخ کو روشن کرنے کے لیے نیچے کی طرف اٹھتا دیکھ کر فضائے بسیط میں پرندوں کی چہچہے گونجی ہی تھیں کہ شوکت پورہ میں جاگی زندگی حرکت میں آگئی۔ دور کہیں کسی ادھڑی زمین پر ٹریکٹر چلنے کی آواز آنے لگی۔ رات بھر زمین کی زیبائش میں جتا کوئی بھلا مانس کسان صبح صادق سے دو گھنٹے پہلے کے آرام کے بعد ایک بار پھر کام میں جت گیا تھا۔ دودھ والا سائیکل کی گھنٹی بجاتا گلیوں میں چکر لگانے لگا۔ چھوٹے گھروں کے دروازے

کواڑوں کی بندش سے آزاد ہوکر ہوا کے دوش پر جھولنے لگے۔ بوسیدہ ہلتے پردوں کے پار گرہستی کو جا چھننے والی گوریوں کی کلائیوں میں چوڑیاں کھن کھن دبیز ہوا کی لہروں میں ارتعاش ڈالنے لگیں۔ رفت وپیش شروع ہوئی تو بڑے گھروں کے گیٹ بھی باڑوں میں بندھی بھینسوں، بکریوں کے گلے میں ٹن ٹن بجتی گھنٹیوں کی آواز میں آڑ نہ رہ سکے تھے۔ ایسے عالم میں کہ جہاں اکناف عالم کا چپہ چپہ پرسکون محسوس ہو رہا تھا، سرخ و سیاہ کھنگر یلی اینٹوں سے تعمیر شدہ اس گھر کا ماحول عجب ایک سراسیمہ سی چپ سے کراہ رہا تھا۔ بام و در اپنے کھلے پٹوں کے ساتھ جھولتے قیامت آچکنے کے بعد والی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ ناتمام خواہشوں کے گردشی اثرات جیسے محسوسات تھے کہ جو فضائی سکوت تک میں کسی نادیدہ انہدام کے گواہ ہو رہے تھے۔ کوئی تھا جس کی قسمت نے وجود ذات کی بنیادیں ہلا کر برسوں کی تعمیر کے بعد مکمل کھڑے خوابوں کو منہدم کر دیا تھا؟

ادھ کھلی کھڑکی سے کمرے میں سوت کاتتی بوڑھی رقیہ نے جھانکا تھا، لیکن کھڑکی سے طلوع ہوتا اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے کمرے سے باہر کوئی نہیں تھا۔ برآمدے کے احاطے میں بھٹک بھٹک کر اس کی نظر صحن میں دائیں طرف لگے ہینڈ پمپ پر جا رکی۔ پمپ کے ساتھ فرشی پکن پر اس کی بہو ریما گندے برتن بکھرائے بیٹھی تھی۔ پاس ہی تیل سے جلنے والا چولہا سالہا سال سے اپنی کارکردگی کے ثبوت کے طور پر ہمیشہ کی طرح کالک سے اٹا ہوا تھا۔ چولہے کے سہارے آگ کی گزشتہ جلن سے کھلکھلاتے توے کو اگر الٹا جاتا تو اس کا رنگ بھی چولہے سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔ ریما نے کچھ سوچ کر الٹا توا ہینڈل سے پکڑا اور دوبارہ چولہے پر دھر دیا۔ وہ معمول سے ایک دو روٹیاں زیادہ پکا لینا چاہتی تھی۔ فراز سارا دن گھر میں چارپائی توڑتا رہتا تھا۔ کوئی بھی چیز کم ہونے پر ایک دم سے واویلا مچانا اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ ریما نے آٹے کا پیڑا اٹھایا اور روٹی توے پر ڈالنے کے لیے ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔ دائیں بائیں رقصاں روٹی پر پڑتے اس کے ہاتھ رقیہ کے دل پر پڑنے لگے۔ صبح صبح کا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ فراز نے آج پھر ریما کی مار لگائی تھی اور ہمیشہ کی طرح کسی قسم کی آہ و فغاں اور دہائی دیے بغیر وہ چپ چاپ مار کھاتی رہی تھی۔ بسا اوقات اس کی اسی چپ کو فراز ڈھٹائی سے تعبیر کرتا اور اس کے تھپڑوں میں شدت آ جاتی تھی۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ اس پر گرجتا برستا فراز اس کی برداشت کو ڈھٹائی سمجھ کر اسے روئی کی طرح دھنکتا چلا گیا تھا۔ یہ ہر دوسرے دن کا معمول تھا۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو قصور ہمیشہ ریما کے سر ہوتا۔ کبھی وہ گستاخ شمار ہوتی، کبھی بدسلیقہ اور کبھی کردار باختہ۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ چونکہ عورت عورت کی دشمن ہوتی ہے، لہٰذا اس لیے بیوی کو اگر شوہر سے مار پڑے تو وجہ اکثر ساس بنتی ہے لیکن یہاں بے چاری رقیہ نے تو ویسے بھی گوشہ نشینی اختیار کی ہوئی تھی۔ کبھی جب میاں بیوی میں تلخ کلامی ہوتی تو مزید دبکی رہتی۔

مضمحل سی فضا میں سکوت کے وجود پر اب مطلق دھوئے جا رہے برتنوں کی آوازیں ضربیں لگا رہی تھیں۔ ریما نے آخری کٹوری صاف پانی سے کھنگال کر ٹوکری میں سلیقے سے رکھی اور رقیہ بیگم کی افسردگی بھری دید کی بے بس نگرانی میں دائیں طرف والے کمرے کی طرف بھاگی۔ جلدی سے خوشبودار صابن اٹھایا اور دوبارہ ہینڈ پمپ تک گئی۔ دروازوں پر لگی خس کی بوسیدہ ٹٹیاں پھڑ پھڑائیں تو رقیہ نے ارتکاز کیا۔ صابن سے چہرہ دھوتی ریما کے چہرے پر آلودگی سے بھرپور مٹی پڑی تھی۔ جھنجھلاہٹ بڑھی اور منہ پر ڈالا گیا پانی صابن کے ساتھ آنسوؤں کو بھی بہا لے گیا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ ریما رو رہی ہے۔ جب وہ گیلا چہرہ دوپٹے سے صاف کرتی برآمدے میں داخل ہوئی تو سڑ سڑ کرتی ناک سے اس کے رونے کا پتا چلتا تھا۔

''اماں میں آفس جا رہی ہوں۔ منے کا خیال رکھنا۔''

آرائش خم میں منہمک اس نے جلدی جلدی اطلاع فراہم کی۔ جواب میں رقیہ یوں پھیکے انداز میں ہنسی کہ اس کا دل کیا اپنے ان داغدار کھکھیاتے دانتوں پر خود ہی مکے برسا ڈالے۔ اس نے ہر طرح سے اپنے بیٹے کو عیش فراہم کیا تھا۔ اسے پڑھایا لکھایا اور بڑا آدمی بنانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی لیکن نہیں سکھایا تھا تو صرف عورت کی عزت کرنا۔ ورنہ شادی کے بعد کی اس کی دلفریب اور دلآویز ساعتیں یوں جہنم زار نہ بنتیں۔ اگر وہ اپنی ماں کی قدر بھی جانتا ہوتا تو بیوی پر بھی ہاتھ نہ اٹھاتا۔ ماں کی تو اس نے بھی قدر کی ہی نہیں تھی چہ جائیکہ بیوی، وہ تو اس کے نصیب میں لکھی موروثی باندی کی طرح تھی۔

ارائیوں کے ساتھ رشتہ داری میں بھٹی برادری کی پیڑھی چلی آ رہی تھی۔ پہلے رقیہ اس کے باپ کے عقد میں آئی اور اب رقیہ کی بھانجی ریما فراز کے عقد میں آگئی تھی۔ خاندانی روایت ہی سب کے دل و دماغ میں رہی تھی۔ دونوں کے مزاج اور طبیعت کے باہمی تضاد پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ اگر غور کر بھی لیا جاتا تو کون سا یہ رشتہ ختم ہو جانا تھا۔ وہ تو پیدا ہوتے ہی ایک دوسرے کے ساتھ منسوب کر دیے گئے تھے۔ اب حال یہ تھا کہ فراز کو ریما کا جاب کرنا کھٹکتا تھا۔ وہ جاب چھوڑ بھی دیتی، مگر فراز

نے کچھ کما کر دیا ہی نہیں تھا۔ سدا کا نکھٹو، کام چور۔
ہڈ حرامی تو شروع سے ہی اس کی طبیعت میں رچ بس گئی تھی۔
ریما خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ایک انسٹیٹیوٹ میں کام کرتی تھی۔ تنخواہ معقول تھی جس سے گھر کی گزر بسر آسانی سے ہو رہی تھی۔ فراز شادی سے پہلے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک معمولی سے عہدے پر فائز تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد کرپشن اور بے ایمانی کے الزام میں اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے کہیں پر کوشش ہی نہیں کہ اسے کوئی چھوٹی موٹی ہی سہی جاب مل جائے۔ جمع پونجی سب ختم ہوگئی۔ آخری ریما کا زیور ہی بچا تھا جو اس نے چاپلوسی اور اچھے مستقبل کے خواب دکھا کر ریما سے ہتھیا لیا۔ ریما بھی مشرقی وفا کا نمونہ تھی۔ وہ فراز کی باتوں میں آگئی اور اپنا سارا زیور اس کے حوالے کر دیا۔ فراز نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زیور بیچ کر ان پیسوں سے کوئی اچھا سا کاروبار شروع کرے گا۔ زیور بک جانے کے ایک ماہ بعد بھی حالات نہ سدھرے تو ریما کچھ پریشان سی رہنے لگی۔ ایک دو بار پوچھنے کی کوشش کی تو فراز نے غصے سے جھڑک دیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ فراز ایک ہی جست میں ترقی کی اونچی منزل پر پہنچ جانے کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ دھچکا تو ریما کو اس وقت لگا جب بغیر محنت کے سب کچھ پالینے کا خواہشمند فراز اپنے خوابوں کی فلک بوس اونچائی سے ایک دم ہی نیچے آگرا تھا۔ اس نے زیورات کی تمام رقم جوے میں ہار دی تھی۔ ریما کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اس پر چیخی چلائی اور ڈھیر سارے بے بسی کے آنسو بھی بہائے لیکن فراز پر اس سب کا مطلق اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ الٹا اسے ہی سناتا رہا۔ اس نے اسے منحوس، کردار باختہ، ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور نجانے کیا کیا قرار دیا تھا۔ وقتی ناراضی کے پیش نظر جب ریما نے روٹھ کر اپنے میکے جانے کی تیاری باندھی تو اپنے ٹھکانے پر بدستور سوت کاتتی بوڑھی رقیہ نے تاسف سے اسے دیکھا تھا لیکن بولی کچھ نہیں تھی۔ گھر میں سراسیمہ خاموشی کا راج تھا۔

”گھر کا کام بوڑھی ہڈیوں سے کیسے ہوگا؟“ رقیہ کی سوچ، ایک خوف، خاموشی۔
”اگر اس نے میکے جا کر اپنے بھائیوں کو سب بتا دیا تو؟“

فراز کی سوچ، ایک خوف، سراسیمہ خاموشی۔
”اگر فراز ضد میں مجھے لینے نہ آیا تو؟“
اس سراسیمہ خاموشی میں ریما کی سوچ بھی خوف سے جنمی تھی۔ وہ وقتی غصے کے وفور میں بہے جا رہی تھی۔ اسے کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا لیکن کچھ اندیشے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کرنے لگے......

گھر میں کھڑی اس کے دکھ درد کی ساتھی خاموشی کی زبان میں کلام کرنے والی ناپختہ دیواریں۔ گھر سے دائمی جدائی کا اندیشہ، مہربان ساس کا خیال لیکن پھر بھی اس کے خیال میں اس کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ وہ فراز کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ سوٹ کیس تیار کر کے اس نے منے کو اٹھایا اور قدم باہر نکالنے لگی۔ ”رک جاؤ۔“
وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ اس کے اپنے ہی وجود سے اٹھنے والی آواز تھی جس نے اسے پوری جان سے لرزا دیا تھا۔
”کسے سبق سکھانا چاہتی ہو؟ فراز کو؟ لیکن اسے اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے کہ تمہارے جانے سے وہ سبق سیکھے گا۔ وہ پیسے کا یار ہے۔ تمہارے پاس کم یا زیادہ کسی بھی شکل میں دولت تھی تو اسے تمہاری ضرورت تھی۔ اب نہیں۔ لے دے کے ایک زیور ہی تھا تمہارے پاس جو وہ پہلے ہی جوے میں ہار چکا ہے۔ اب تمہارے روٹھ جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ الٹا ایک جی کا بوجھ اس سے کم ہو جائے گا۔“
اس کے دہلیز پار کرتے قدم رکنے سے لگے تھے۔ شاید اس کی یہ متذبذب حالت نوٹ کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک محکم آواز سے چونک گئی۔ ”رک جاؤ۔“
اب کے بولنے والا فراز تھا۔ ”جانے سے پہلے ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر واقعی تم جانا ہی چاہتی ہو تو پھر واپس کبھی نہ آنا۔“

ریما کا اندیشہ حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا۔
”اگر اس کے دہلیز پار کرنے سے پہلے یہ آواز نہ پڑتی تو کیا ہوتا؟“ وہ سوچ کر لرز رہی تھی۔ اس ایک آواز نے اس کے قدموں کو لغزش سے بچا لیا تھا۔ اس کے خیال میں فراز اپنی آئی پر آگیا تھا لیکن جب وہ بے بسی، تکلیف اور شکر کی ملی جلی کیفیت میں آب آب آنکھیں لیے نڈھال قدموں سے واپس مڑی تو فراز کے چہرے کا اطمینان بتاتا تھا کہ اس کا اندیشہ زائل ہو چکا ہے۔ اب میکے نہیں جائے گی تو اپنے بھائیوں کو بھی کچھ نہیں بتا پائے گی۔ وہ بے بس انداز میں واپس مڑی اور سوٹ کیس چارپائی پر ڈال کر وہیں بیٹھ گئی اور منے کو گود میں لیے خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ فراز مطمئن نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ رقیہ نے بہت وقت بعد اپنی کھڑکی کے پاس والی جگہ چھوڑی اور اور چارپائی پر اس کے

پاس آبیٹھی۔ وہ جانتی تھی کہ ریما نے اب بھی اس سے اس کے بیٹے کی ایک بھی شکایت نہیں لگائی تھی۔ کوئی شکوہ نہیں کرتا تھا لیکن وہ تو سب دیکھتی تھی۔ حقیقت سے نظریں چرا نہیں سکتی تھی۔ بعض اوقات خاموشی کی زبان طنز کے نشتر سے بھی زیادہ کاٹ رکھتی ہے۔ نظریں جھکا کر تاسف سے ہاتھ مروڑتی ریما کا لرزتا سراپا سب کچھ بیان کر رہا تھا اور رقیہ کو پچھتاوا اندر تک چھیدتا جا رہا تھا۔

ریما کا رک جانے کا فیصلہ دانش مندانہ تھا۔ اب فراز بھی اپنے کیے پر کچھ نادم تھا اور کھلے انداز میں اس سے معذرت کر چکا تھا۔ گھر کی فضا ایک بار پھر پُرسکون ہوگئی تھی۔ فراز صبح سے نوکری کی تلاش میں نکلتا اور شام کو غصہ بھری تیوری پر بل اور چہرے پر ناکامی سجائے گھر واپس آجاتا۔ ریما کو اس کی دوست نگینہ نے کئی بار اپنے انسٹی ٹیوٹ میں جاب کی آفر کی تھی لیکن چونکہ فراز اس وقت خود بھی جاب ہولڈر تھا اور ریما کی جاب کے خلاف تھا، اس لیے ہر بار وہ انکار کر دیتی تھی۔ اب گھر کے حالات اور فراز کی مسلسل ناکامی سے شہہ پا کر اس نے فراز سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا تھا۔ یہ اس کے مان جانے کا اشارہ تھا۔ اگلے دن اس نے نگینہ سے بات کی اور انسٹی ٹیوٹ جوائن کر لیا۔ گھر کے حالات معاشی اعتبار سے سدھرنے لگے۔ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر کر جس فراز کی سوچ تک مفلوج ہوچکی تھی اور اس نے مجبوری کے تحت ریما کو جاب کی اجازت دے دی تھی، اب پیٹ سے کچھ فرصت ملی تو ایک بار پھر اس کے فرسودہ دماغ کی گرہیں کھلنے لگیں اور زبان کے قفل ٹوٹنے لگے۔ وہ گاہے گاہے ریما کو جتانے لگا کہ تم جتنا بھی کما لو آخر کو ہو تو ایک عورت۔ تمہارا گھر سے باہر نکلنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بعض اوقات وہ خوامخواہ ہی اس پر طنز کے تیر برساتا۔ الٹے سیدھے سوال کر کر کے اسے ڈپریس کرتا رہتا۔

آج صبح بھی انسٹیٹیوٹ میں ایک اہم میٹنگ میں شرکت کی غرض سے جب وہ گھر کے کام جلدی جلدی نمٹا رہی تھی تو فراز چارپائی پر نوابی شان سے بیٹھا اسے خشمگین نظروں سے گھور رہا تھا۔

''آج کس یار کے ساتھ انسٹیٹیوٹ جانا ہے؟ پہلے تو اتنی جلدی کبھی نہیں لگائی تھی۔''

وہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر کام میں ہی جت گئی تھی اور صبح کے اذکار کام کے دوران بھی اس کے زبان پر تھے۔ نور تڑکے کے وقت ہی فراز کی زہریلی زبان کی قہر افشانیوں نے اس کے وجود ذات میں دراڑیں ڈال دیں لیکن جواب میں ایک لفظ بھی کہنا گویا اپنی مصیبت کو آواز دینا تھا، سو اس نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور کام میں مشغول رہی۔

''بے وقوف سمجھتی ہے مجھے؟ تیری اس میسنی صورت پر لکھا سچ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ بتا کس کو ٹائم دے رکھا ہے؟ بتا ورنہ تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔''

ریما کی خاموشی کو اپنی شکست تسلیم کر کے احتسابی لہجے میں بے بنیاد الزامات لگاتے ہوئے اسے زدوکوب کرنے لگا۔ رقیہ بیگم نے واویلا مچایا اور اسے باز رہنے کے لیے جھڑکتی ہوئی اس کی طرف بھاگی اور ریما کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی۔ فراز نے بزور قوت اپنی ماں کو دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گری تھی۔ وہ آئی تو فراز کو ڈانٹنے اور سرزنش کرنے تھی لیکن اپنے بیٹے کے رویے سے ایسی گھائل ہوئی کہ نقشِ حیرت بن گئی۔ فراز ریما کو اپنی مرضی سے مار مار کر غصے سے تنتناتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا اور بوڑھی رقیہ چپ چاپ واپس اپنی جگہ جا بیٹھی۔ شوکت پورہ میں زندگی جاگ رہی تھی۔ فراز کے گھر سے اٹھتے شور نے تقریباً سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تھی لیکن معاملہ جاننے کے لیے کوئی بھی ان کے دروازے تک نہیں گیا۔ یہ ہر دوسرے روز کی کہانی تھی۔ روزانہ کی بنیاد پر ہونے والا ہنگامہ تھا جسے اب لوگوں نے اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔ ریما اپنے دکھتے جوڑ جوڑ کو بتکلیف وہ انداز میں سمیٹ کر اٹھی اور دوبارہ سے اپنے کام میں لگ گئی۔ اس گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کی شکایت اپنے والدین سے کرنے کے سلسلے میں اسے پہلے ہی فراز کی طرف سے طلاق کی دھمکی مل چکی تھی۔ وہ اپنے والدین کا مان رکھنے والی اولاد ثابت ہوئی تھی۔ مر تو سکتی تھی لیکن طلاق کا بدنما داغ لے کر والدین کی چوکھٹ پر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ جلدی سے تیار ہوئی اور رقیہ کو منے کا خیال رکھنے کا کہہ کر انسٹیٹیوٹ روانہ ہوئی۔

گیٹ پر سلپ بنواتے ہوئے اس کے جسم میں دکھن اس قدر زیادہ تھی کہ اس سے کھڑا ہی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور پختہ روش پر چلتے ہوئے جب اپنے ورک روم کی طرف رخ کیا تو احمد صاحب اپنے کمرے سے نکل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''محترمہ! آج کے دن تو وقت کا کچھ خیال رکھ لیتیں۔ اس قدر اہم میٹنگ میں آپ کی غیر حاضری نوٹ کی گئی ہے۔'' انہوں نے ناگوار سے لہجے میں اس کی سرزنش کی۔

''جج..... جی ان شاء اللہ میں کوشش کروں گی کہ.......''

"محترمہ! پتا نہیں آپ یہ کوشش کب کریں گی اور کب جا کے آپ کی یہ کوشش کامیاب ہوگی۔ روزانہ آپ کا یہی جواب ہوتا ہے۔ اگر کام کرنا ہے تو رولز فالو کرنے ہوں گے۔ دیٹس اٹ۔" انہوں نے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی اس کی بات کاٹ دی اور کھری کھری سنا کر بڑھ گئے۔ وہ مرے مرے انداز میں ورک روم کی طرف بڑھنے لگی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اسے بہت سے افراد کی ملی جلی ہنسی کی آواز آئی۔ کسی بذلہ سنج کے چٹکلے پر سب کھلکھلا رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اپنے آپ کو مصنوعی طور پر ہشاش بشاش کر چکی تھی۔

"السلام علیکم۔" لبوں پر دلنواز تبسم سجا کر اس نے سب کو اجتماعی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" سب نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"ارے ہماری ریما باجی آگئیں۔ ماشاء اللہ میں تو آپ کی پرسنالٹی سے بے حد متاثر ہوں لیکن افسوس آپ آج کی میٹنگ میں حاضر نہیں تھیں۔ کافی ادھورا ادھورا سا فیل ہوا ہمیں۔ کیوں دوستو؟"

دوستوں میں "خوش گلو" کے نام سے مشہور شبانہ نے اپنے انداز میں جھکتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ لے جا کر تعظیم پیش کرتے ہوئے کہا اور باقیوں سے اپنی بات کی تائید چاہی تو وہ بھی سب مسکرا پڑے۔

پاس کھڑی رضوانہ نے بھی آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تو وہ اپنی ویران خیالی سے ایک دم جیسے باغ و بہار کے سماں میں آ گئی تھی۔ رضوانہ گلے مل کر جب اس سے علیحدہ ہوئی تو اسے یوں لگا جیسے بادِ نسیم کا تازہ اور خوشگوار جھونکا اس سے ٹکرا کر گزر گیا ہو۔ یوڈی کلون کی مہک رضوانہ کے جسم سے اس کے کپڑوں میں منتقل ہوگئی تھی اور اس نے خود کو ریگزارِ زیست سے نکل کر رشکِ گلزار میں کھڑا پایا۔

"کتنی اچھی خوشبو ہے رضی! کہاں سے لیا ہے یہ پرفیوم؟"

ریما نے ایسے ہی بات بنانے کے لیے کہا۔

"رات ہی تمہارے بھیا بڑی چاہت سے میرے لیے لائے ہیں اسٹیٹ سے۔" اس نے چہک کر کہا۔ ریما کے دل میں حسد کی ایک لہر اٹھی اور وہ اپنی ناکامیوں پر جلتے ہوئے سوچنے لگی:

"کتنی خوش نصیب ہے رضوانہ۔ شوہر کا خوشگوار ساتھ بھی میسر ہے اور دنیا کا ہر سکھ بھی۔ ایک میں ہوں جو گھر کے اندر بھی کم حیثیت اور باہر بھی کم مایہ۔"

رضوانہ انسٹیٹیوٹ میں امیر کبیر اور مالی حیثیت سے مستحکم بنیاد کی حامل پہچانی جاتی تھی۔ کوئی بھی بات ہوتی تو وہ درمیان میں اپنے شوہر جمشید کا نام ضرور لیتی تھی۔ جمشید کا نام اس کی گفتگو کی پہچان تھا۔ اپنی ہر کامیابی، ناکامی، خوشی اور پریشانی میں بطور حوالہ، اور ہمدرد کی حیثیت سے جمشید کا نام ضرور لیتی تھی۔ کسی کو کہیں کچھ پریشان بھی دیکھتی تو یہاں تک کہہ دیتی تھی کہ میں جمشید سے تمہاری پریشانی کا حل پوچھ کر تمہیں بتاؤں گی وہ چٹکی بجاتے ہی تمہارا مسئلہ حل کردیں گے۔

کبھی کبھی اسے لگتا کہ معمول کے مطابق ملتے یہ جانے پہچانے لوگ بھی جیسے ڈپلومیٹک ہیں۔ چہروں پر چہرے سجائے اپنی مجبوریوں کو خوشیوں کے رنگوں میں چھپایا ہوا ہے۔ ان کی مسکراہٹوں کے تبادلے جھوٹے، معمول کی باتیں مصنوعی اور گل تر جیسے حلقوموں برآمد ہونے والے قہقہے کھوکھلے ہیں۔

لیکن جب بھی وہ کچھ غور سے رضوانہ کی طرف دیکھتی تو اسے اپنے ہی خیالات سے غیر متفق ہونا پڑتا...... اس نے غور کیا۔ پیازی مائل سفید گلاب جیسا چہرہ کھلا ہوا سا تھا۔ ہیروں جیسی چمکتی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ پوری محفل میں حسین لگ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ پیسے کی فراوانی اور مستقل خوشحالی نے اس کے روپ میں کچھ ایسا نکھار پیدا کیا ہے کہ فکر کی ہر لکیر بے پروائی کے اجالے میں مدغم ہے اور چٹکتے غنچے اور کھلے گلاب جیسا حسن دل میں سما جانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

"ارے بھئی یہ کہاں کھوگئیں یار۔ ریما باجی کیا ہو رہا ہے آپ کو خیر تو ہے۔" شبانہ اس کی اس قدر خیالی محویت سے ایک دم جیسے گھبرا گئی تھی... اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اسے ہوش آگیا۔ یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ میں تھا کوئی کھلا گلاب پنکھڑی پنکھڑی ہو کر بکھر گیا ہو۔

ورک میٹس کے درمیان گیدرنگ میں اس کا وقت اچھا گزرتا تھا اور وہ کچھ دیر کے لیے اپنی تکالیف بھول جاتی تھی.. مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو چہرہ بھی پڑھ لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ حالات کے کاتب نے چہرے کی کتاب پر کیا کچھ رقم کیا ہے، سب ان کے سامنے ہوتا ہے۔ یہاں بھی محسوس کر لینے کی حس لیے کافی لوگ موجود تھے، جنہوں نے ریما کی مصنوعی مسکراہٹ کے درمیان خندہ رو چہرے پر کھنچی مصائب کی کالی تحریر پڑھ لی تھی۔

"خیر تو ہے آج بھائی جان کے ساتھ پھر جھگڑا ہو گیا ہے؟"

نگین نے کہتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ نئی بات نہیں ہے چھوڑو اس سب کو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ میٹنگ کیسی رہی۔ کیا کچھ طے ہوا؟ کچھ تنخواہ بڑھنے کے چانسز ہیں یا نہیں۔" اس نے ایک بار پھر اپنا موڈ مصنوعی پن سے بہتر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا تو ان کے چہروں پر مردنی سی چھا گئی۔ اس نے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا تھا۔ ریما کی قسمت پر دل ہی دل میں تاسف کرتے ہوئے سب کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی سمٹ آئی۔ کچھ نے فراز جیسے شخص کے ساتھ اس کے گزارے پر اعتراض کیا تو کچھ نے فراز کی شان میں غیبتوں کے ایسے سلسلے اسٹارٹ کر دیے، جن کے پھیلاؤ میں معاشرے کے تمام مرد بلا امتیاز شامل کیے جا رہے تھے۔ رضوانہ نے کچھ عجیب نظروں سے ریما کو گھورا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

"ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہاں چل دی یار؟" ریما نے حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

"کہیں نہیں۔ یہیں پر ہوں۔ کام سے فراغت کے بعد میرا انتظار کرنا میں تمہیں گھر تک ڈراپ کر دوں گی۔" اس نے جاتے ہی جاتے عام سے لہجے میں کہا اور رکی نہیں۔ ریما اس کو جاتے ہوئے دیکھتی ہی رہ گئی تھی جبکہ کالی گھٹا جیسے آبشار جوڑے اور روشن چاند سے چہرے والی رضوانہ پروا کے نرم جھونکے کی طرح وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

رضوانہ کی گاڑی کی نرم سیٹ پر بیٹھتے ہوئے احساس کمتری کچھ زیادہ ہی اسے ستانے لگی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ پہلی بار گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ رضوانہ تو اکثر اسے گھر تک ڈراپ کر دیتی تھی اور کبھی جب انسٹیٹیوٹ جلدی پہنچنا ہوتا تو اسے گھر سے پک بھی کر لیتی تھی لیکن آج بات کچھ اور تھی۔ فراز سے پڑی چار چوٹ کی مار اور تذلیل نے اسے بے طرح سے ہرٹ کیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو کھائے جا رہی تھی۔

"آج خیر تو ہے کچھ زیادہ ہی پریشان اور کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو۔" رضوانہ نے پوچھا۔ اس کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری سرسری سا تھا لیکن اس کا اس طرح پوچھ لینے کی زحمت کرنا بھی ریما کو اچھا لگا۔ وہ اپنے بیزار ہوئی پڑی زندگی سے اس قدر اکتائی ہوئی تھی کہ ہمدردی کے دو بول کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی تھی کہ اپنے حالات کا رونا رو کر سب کی ہمدردیاں بٹورے۔ اس طرح واقعی میں اس کا دل ہلکا بھی ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رضوانہ کا حال پوچھنا ہی تھا کہ فراز کی طرف سے ملی ناخوشی اور روح تک میں پڑی خراشوں نے اس کے ہونٹوں پر آہیں ثبت کرنا شروع کر دیں اور اس نے اپنی غربت اور فراز کی شکایات کا پلندہ کھول دیا۔

"ریما ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟" اس کے خاموش ہونے پر رضوانہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی تھی۔

ریما نے چھاؤں کی نرم حدت جیسی آبشار زلفوں کے عقب میں اس کا چہرہ تاکا اور تلخ انداز میں مسکرا اٹھی۔ "کہو کیا بات ہے۔ نہیں برا مناؤں گی۔"

"دوسروں کو اپنی کمزوریاں کبھی نہ بتایا کرو۔ وہ ہمدردی کم کرتے ہیں اور ہمدردی کی آڑ میں تمہارے ہی چابک سے تمہیں مارتے ہیں۔ اپنے شوہر کی برائی کسی کے سامنے نہ کیا کرو۔ اس طرح تم اپنی وقعت کم کر لیتی ہو۔ اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں سے سمجھوتا کرنا سیکھو۔ لوگ تمہاری عزت کریں گے۔"

رضوانہ کے ناصحانہ لہجے میں بتائی گئی اس حقیقت سے اس کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کا ہلکا ہوا من ایک بار پھر بوجھل سا ہونے لگا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی تھی لیکن قبول نہیں کر سکتی تھی کہ فراز جیسے ظالم شخص سے اس حقیقت کو منسوب کیا جائے۔ اس کے دل و دماغ میں تلخی بھری زندگی جھیل جھیل کر رچی بسی نفرین زدہ تحریکیں جوش مارنے لگیں۔ وہ سوائے اس ایک بات کے کچھ بول نہ سکی:

"اگر تمہیں میرے جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو میں دیکھتی۔"

"میں تمہارے حالات سے واقف ہوں اور تمہاری مشکل ترین زندگی پر رنج بھی ہوتا ہے لیکن اسے کس طور بہتر کیا جا سکتا ہے، اس بارے میں کچھ سمجھانا دوست ہونے کے ناتے میرا فرض ہے۔"

"تم مجھے کس حیثیت سے سمجھا رہی ہو۔ کبھی کسی مشکل کا سامنا کیا ہے۔ کچھ تجربہ ہے تمہیں کہ ظالم شوہر کی جھوٹی تعریفیں کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ قسمت کی دھنی ہو نا...... اس لیے نصیحت کرنا بھی تمہارا حق بنتا ہے۔" رضوانہ کا یوں سمجھانا اسے بے سبب لگا تھا۔ اسے ہمدردی کی ضرورت تھی جبکہ پند و نصائح سے اس کے دامن بھر کر رضوانہ نے اس کی زندگی کے سیاہ رنگوں کو مزید گرد آلود کر دیا تھا۔

"اچھا یہ میرا ایڈریس ہے۔ کل شام کو اس پتے پر مجھ سے ملنے آ جانا۔ تمہارے جو بھی مسائل ہیں سب حل ہو جائیں گے۔" رضوانہ نے اس کے گھر کے پاس گاڑی روکتے ہوئے اسے اپنا کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے اس کا

منہ تکنے لگی۔
”کیا مطلب؟ جتنے بھی مسائل ہیں...... مطلب میں کچھ سمجھی نہیں۔“ وہ کنفیوز ہوگئی۔
”ابھی دیر ہو رہی ہے۔ کل شام اس پتے پر مجھ سے ضرور ملنا۔“ رضوانہ نے جلدی جلدی کہا اور اسٹیئرنگ پر گرفت کی۔ ریما دروازہ کھول کر باہر نکلی اور رضوانہ نے خدا حافظ کہہ کر گاڑی بڑھادی۔

☆☆☆

میدان زیست میں زندگی کے آئینے تاریک سے تھے۔ غم اور پریشانیوں کے ہجوم میں بے بسی کے لامحدود دائرے تھے کہ جنہیں گرہن کی سی بے رونق اُمید کے سہارے پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رضوانہ کی طرف سے ملی اُمید کی ایک واضح کرن سے وہ موج شادمانی کے زیر اثر ٹھیک سے سو بھی نہیں سکی تھی۔ صبح انسٹیٹیوٹ میں بھی اس کا وقت بڑی مشکل سے کٹا۔ اسے شام ہو جانے کا انتظار تھا۔ آج رضوانہ نہیں آئی تھی۔ گھر بھی اسے پبلک ٹرانسپورٹ کے سہارے دھکے کھا کھا کر جانا پڑا تھا۔ آخر طویل انتظار کے بعد جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے وہ فراز کی غیر موجودگی میں گھر سے یہ نیت کر کے نکلی کہ فراز کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی واپس آ جائے گی۔ بھیگی بھیگی سیلان زدہ ہواؤں میں دھیمی دھیمی رم جھم نے اس کی اُمید کو سوا کیا تھا۔
”ضرور رضوانہ کچھ مالی مدد کرے گی یا اپنے شوہر جمشید کی پہنچ کا سہارا لے کر فراز کی کسی اچھی سی جاب کا بندوبست کرے گی۔ اچھا ہے گھر میں رہ کر کچھ سکون تو ملے گا اور فراز کی چوبیس گھنٹوں کی چخ چخ سے بھی نجات ملے گی۔“ وہ سوچتی جا رہی تھی۔
مطلوبہ ایڈرس پر پہنچ کر اس نے ٹیکسی رکوائی اور بل ادا کر کے نیچے اتر آئی۔ رضوانہ کی پرشکوہ کوٹھی تین رفیع الشان منزلوں پر مشتمل تھی۔ جمشید لاج کے گیٹ سے ہی مکینوں کی اعلیٰ ذوقی اور امارت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ لان میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی موجودگی ریما کی پُرامن خواہشوں کی آمد کے لیے ماحول سازگار کرنے لگی تھی۔ پورچ میں کھڑی امپورٹڈ اور نیو ماڈل گاڑیاں ریما کے دل میں رضوانہ کا رعب مزید بڑھا گئیں۔ جمشید کے نام کا کارڈ دکھانے پر نوکر نے اسے احترام سے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہی محسوس کرنے لگی۔ یہاں بہاروں کی فسوں خیزی اور دل افروز اپنائیتوں کی سکوں ریزی ہے۔ یہاں کا لمحہ لمحہ حسین ہے اور دلوں میں کسی قسم کی کثافت نہیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی زندگی کی رات اپنی الاؤ جیسی کھولن ایک نئی صبح کی پھیلتی روشنی کے برف زار میں مدغم کرتی جا رہی ہے۔
کافی دیر بعد ایک بارعب آدھے سفید اور آدھے سیاہ بالوں والا ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔
”فرمائیے آپ نے کس سے ملنا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے۔“ وہ مہذب لہجے میں گویا ہوا تھا۔
”جی...... میں رضوانہ کے بلاوے پر یہاں آئی ہوں۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔“ جمشید کے بولنے کے انداز سے وہ دل ہی دل میں شوہر کے سلسلے میں رضوانہ کی تمام باتوں سے ایک بار پھر قائل ہوتے ہوئے شفاف لہجے میں بولی تھی۔ مگر جمشید کے چہرے پر حیرت چھا گئی تھی۔
”رضوانہ نے بلایا ہے؟ لیکن وہ تو اب یہاں نہیں رہتی۔“
”جی...... میں کچھ سمجھی نہیں۔ وہ آپ کی بیوی ہیں۔ یہاں نہیں رہیں گی تو اور کہاں رہیں گی۔“ اس نے حیرت سے کہا اور متذبذب انداز میں جمشید کا منہ تکنے لگی۔
”بیوی ہے نہیں، بیوی تھی۔“ اس نے سخت انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ.. وہ لوگوں کو ابھی تک دھوکا دے رہی ہے کہ وہ میری بیوی ہے۔ میں نے اس جھگڑالو عورت سے شادی کر کے ہی غلطی کی تھی۔ لوگوں کے سامنے میرے عیب بیان کرنے والی میری بیوی کیسے ہوسکتی ہے...... میں نے شادی کے کچھ عرصہ بعد اسے طلاق دے دی تھی۔“ وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ ریما سے مزید رکا نہیں گیا۔ وہ گم صم سی اٹھی اور واپس مڑی۔ اس کی آنکھوں سے نمکین جھرنے پھوٹ پڑے۔ اسے رضوانہ کی باتیں یاد آنے لگیں:
”عزت چاہتی ہو تو اپنی کمزوریاں کسی کو نہ بتاؤ...... ورنہ لوگ تمہارے ہی چابک سے تمہیں ماریں گے۔“
بظاہر ہنس مزاج نظر آنے والی رضوانہ کس قدر مظلوم اور اکیلی تھی۔ اس کا ادراک اب اسے ہوا تھا۔ اس نے بھی گھر کا سکھ نہیں پایا تھا لیکن کبھی بھی اپنی تنہائی اور پریشانی کا رونا رو کر اپنی وقعت کم نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں سے سمجھوتا کیا ضرور تھا لیکن طلاق ہو جانے کے بعد۔ اس وقت جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ریما نے اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے گھر تک کا راستہ طے کیا۔ اپنی پُرسوچ آنکھوں میں لبوں کی زبردستی مسکان کا اثر منتقل کیا اور اندر داخل ہوگئی۔ پہلے اس سے کہ بہت دیر ہو جائے، وہ بھی اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں سے سمجھوتا کر لینا چاہتی تھی۔

++

بھرم

محترم مدیر

السلام علیکم!

انسان خود میں ایک پہیلی ہے۔ وہ غنڈا تھا، لوگ اس کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے مگر جب اس کی بہن نے اپنی پسند کا ہم سفر منتخب کیا اور خاموشی سے گھر چھوڑ کر اس کے گھر چلی گئی تو پھر کیا ہوا، یہ ایک سبق ہے ہر انسان کے لیے۔

محمد وسیم نیازی

(کراچی)

منہ زور قسم کا نوجوان تھا۔ اس کے انداز بہت جارحانہ ہوا کرتے۔

ایک بار میں نے اسے محلے کے ایک دکاندار سے جھگڑا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جھگڑے کی وجہ تو مجھے معلوم نہیں تھی۔ میں اس وقات ہوٹل میں بیٹھا تھا جب شور سنا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ خود میں بھی دیکھنے کے لیے ہوٹل سے باہر آ گیا۔

اس وقت بالا ٹی ٹی نکال چکا تھا بلکہ اس نے دو ہوائی فائیر بھی کر دیے تھے۔ دکاندار سہم کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

کسی نے پیچھے سے آ کر میرے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ’’ارے وسیم صاحب۔ کن چکروں میں پڑ گئے۔ واپس چلیں۔ یہ تو روز کا معمول ہے۔‘‘

’’عزیز صاحب اس آدمی نے گن نکال لی ہے۔‘‘ میں پریشان ہو کر بولا۔

’’رہنے دیں آپ اندر آئیں۔‘‘ عزیز نے کہا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی عزیز کے ساتھ ہوٹل میں آ گیا۔ میں چونکہ اس محلے میں نیا نیا آیا تھا اسی لیے لوگوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ عزیز صاحب سے جان پہچان اسی محلے میں ہوئی تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔ ادب سے بھی دلچسپی تھی۔

ہم ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ باہر کا جھگڑا شاید ختم ہو چکا تھا۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، لیکن یہ آوازیں زیادہ پریشان کن نہیں تھیں۔

’’وسیم صاحب۔ آپ چونکہ اس محلے میں نئے نئے آئے ہیں، اسی لیے آپ کو بالا کے بارے میں نہیں معلوم۔‘‘

’’بالا کون؟‘‘

’’وہی جس نے گن نکال لی تھی۔‘‘ عزیز صاحب نے بتایا۔ ’’ایک نمبر کا غنڈا ہے۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ کئی بار جیل جا چکا ہے۔ پہلے ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ اچھا خاصہ نوجوان تھا۔ پھر نہ جانے کس کی صحبت میں پڑ کر ایسا ہو گیا۔‘‘

’’اسے سمجھانے والا کوئی نہیں ہے؟‘‘

’’کون سمجھائے؟‘‘ عزیز صاحب نے کہا۔ ’’ایک ماں ہے۔ ایک بہن ہے۔ ایک بات اور کہ اس کو اپنی بہن سے بہت محبت ہے۔ اتنی کہ اندازہ نہیں کر سکتے۔ بہن سے ڈرتا بھی ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ اس کا کسی سے جھگڑا ہو رہا ہے اور اس وقت اگر بہن سامنے سے نکل آئی تو اس کی جان نکل جاتی ہے پھر کہاں کا جھگڑا۔ کیسا جھگڑا۔ سب بھول جاتا ہے۔‘‘

’’یہ تو اس کی شخصیت کا اچھا پہلو ہوا نا؟‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں، بس یہی اچھا پہلو ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا ہے۔ کئی بار جیل بھی جا چکا ہے۔ غیر قانونی اسلحے رکھتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر گولیاں چلانے لگتا ہے۔ آپ اس کا تماشا دو دن بعد دیکھ لیجیے گا۔‘‘

’’دو دن بعد؟ کیا ہونے والا ہے۔ دو دن بعد؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’دو دن بعد شب برات ہے۔‘‘ عزیز صاحب نے بتایا۔ ’’دیکھیے گا کہ وہ کتنی گولیاں چلاتا ہے؟ ایسا لگے گا جیسے آپ جنگ کے میدان میں کھڑے ہوں۔ کون کون سا اسلحہ استعمال نہیں ہوتا۔ ٹی ٹی، شارٹ گن، ریپیٹر، کلاشن اور نہ جانے کیا کیا۔ اس کے غندے دوست بھی اس کارِ خیر میں

حصہ لینے اسی محلے میں آجاتے ہیں۔''

''کیا محلے والے کوئی ایکشن نہیں لیتے ؟''

''کون اس کے خلاف بولے۔ اگر کوئی ایکشن ہوا بھی تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ سزا ہو جائے گی۔ جیل سے باہر آکر اس کا وہی حال رہے گا اسی لیے کوئی کچھ بولتا ہی نہیں۔''

ہم دونوں چائے پی چکے تھے۔ بل ادا کر کے باہر آگئے۔ اسی وقت ہوٹل کے سامنے سے ایک لڑکی گزری۔ کیا لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت مہذب اور باوقار، اس کی چال بھی دلکش تھی۔ سراپا بھی دلکش تھا۔

''وسیم صاحب۔ یہ ہے بالا کی بہن۔'' عزیز صاحب نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا؟'' میں یہ سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ ''یہ بالا کی بہن ہے؟''

''جی ہاں۔ اسی بالا کی جس کی حرکت ابھی دیکھ چکے ہیں۔''

''کمال ہے۔ یہ تو پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہے۔''

''جی ہاں۔ سوشیالوجی میں ماسٹر کر چکی ہے۔ ایک بڑے اسکول میں پڑھاتی ہے۔''

''حیرت ہے۔ ایسے شخص کی ایسی بہن؟''

''جی جناب، اور اس لڑکی کو اپنے بھائی کی بدمعاشی کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی ہے۔ فائدہ تو یہ ہے کہ کوئی بھی اس کو چھیڑنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ایک دو بار کوشش بھی ہوئی تو بالا نے اس کی ایسی کی تیسی کر دی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اس نے اس شخص کو دھو کر رکھ دیا۔ ایسی مار لگائی کہ اس نے اس محلے سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔''

''چلیں یہ تو اس لڑکی کے لیے فائدے کی بات ہوگئی لیکن نقصان کیا ہے؟''

''نقصان یہ ہے کہ بالا کے ڈر سے اس بے چاری کا رشتہ ہی نہیں آتا۔'' عزیز صاحب نے بتایا۔

''یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بہت معقول لڑکی معلوم ہوتی ہے۔''

''بہت زیادہ۔ میں تو کئی بار اس سے باتیں کر چکا ہوں۔ بہت کلچرڈ لڑکی ہے۔''



عزیز صاحب اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور میں اس لڑکی کے بارے میں سوچتا ہوا اپنے گھر کی طرف آ گیا۔ کیسی کیسی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو وہ بدمعاش اپنی بہن سے اتنی محبت... کرتا ہے اور دوسری طرف اپنی حماقت سے اس کی راہ میں دیوار بھی بنا ہوا ہے۔

شب برات آئی اور عزیز صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ سامنے آ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو ملکوں کے درمیان جنگ ہو گئی ہو۔ بے تحاشہ فائرنگ نے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہی بالا اپنے دوستوں کے ساتھ فائرنگ کرتا پھر رہا تھا۔

ذرا سی دیر میں پورا محلہ جیسے کسی وبال میں مبتلا ہو گیا ہو۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ بالا کیسا آدمی ہے۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد اسی بالے کی بہن کے بارے میں ایک ایسی خبر ملی جس نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔ اس کی بہن نے کسی نوجوان سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ یہ حیرت انگیز خبر بھی عزیز صاحب نے سنائی تھی۔

خبر سناتے ہوئے وہ خود بھی پُر جوش ہو رہے تھے۔

''بھائی ان دونوں نے تو کمال ہی کر دیا۔''

''میں نے بھی اڑتی ہوئی خبر سنی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہوا؟''

''سب ہو جاتا ہے۔ آپ نے مرتا کیا نہ کرتا کی مثال تو سنی ہو گی۔'' عزیز صاحب نے کہا۔

''ہاں سنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس لڑکی نے تنگ آ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔ ورنہ کون اس بدمعاش کے سامنے آنے کی ہمت کر سکتا تھا۔''

''اور وہ نوجوان کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ظہیر نام ہے اس کا، پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ شریف آدمی ہے۔ کسی فرم میں اچھے عہدے پر کام کرتا ہے۔ اس نے بھی ایک بڑا رسک لیا ہے لیکن محبت سب سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ ایک بات اور بتا دوں۔''

''بتائیں۔''

''پلیز اس کا ذکر کسی سے نہیں کیجیے گا۔'' عزیز صاحب نے کہا۔ ''ورنہ وہ بدمعاش میری زندگی عذاب کر دے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ آپ جو بھی بتائیں گے وہ میرے سینے تک رہے گا۔''

''میں اس نوجوان کو جانتا ہوں۔'' عزیز صاحب نے بتایا۔ ''بالا ان دونوں کو تلاش کرتا پھر رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟''

''یہ تو آپ نے بہت خطرناک بات بتا دی۔'' میں نے کہا۔

''چلیں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ ساری صورتِ حال کیا ہے۔'' عزیز صاحب نے میری طرف دیکھا۔ ''بلکہ ایسا کریں۔ کہیں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اطمینان سے بات ہو گی۔''

ہم ایک پارک کے ایسے گوشے میں جا کر بیٹھ گئے جہاں سناٹا تھا۔

''وسیم صاحب۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ غزالہ اور ظہیر بہت دنوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں... بلکہ یہ سمجھ لیں کہ دونوں یونیورسٹی میں ایک ساتھ تھے۔ ان دونوں کے درمیان محبت اسی ماحول میں پروان چڑھی۔ دونوں نے ایک ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی ہوں گی۔ وعدے کیے ہوں گے، لیکن بالا کی وجہ سے غزالہ سہمی سہمی رہتی تھی۔ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں بالا کو پتا نہ چل جائے... کیوں کہ اس کا مزاج سب جانتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ محلے میں ہونے والی کہانیاں تو آپ کے علم میں ہوں گی۔''

''جی ہاں میں سن چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یسی بات نہیں کہ ظہیر نہ جانتا ہو، وہ بھی جانتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی محبت کا سفر جاری رکھا اور میں ان دونوں کی محبت کا گواہ تھا۔''

''آپ گواہ تھے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھائی، ظہیر میرے دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔ میرا بہت احترام کرتا ہے جس طرح بڑے بھائی کا کیا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ مجھے اپنا دوست بھی سمجھتا تھا۔ اپنی بہت سی باتیں مجھ سے شیئر کر لیتا تھا۔ اسی نے ایک دن بتایا کہ وہ میرے محلے کی ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اس کا نام غزالہ ہے۔ میں یہ نام سن کر چونکنا سا ہو گیا تھا۔''

''تم اس غزالہ کی بات تو نہیں کر رہے جو بالا بدمعاش کی بہن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔'' ظہیر نے کہا۔

''بالا کے بارے میں معلوم ہے کہ کتنا بڑا بدمعاش ہے۔ عزت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتا ہے۔''

''جی بھائی جانتا ہوں میں لیکن کیا محبت کے جذبے

پر پابندی لگائی جاسکتی ہے؟''

''نہیں ظہیر میاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔'' اس پر تو شہنشاہ اور ڈکٹیٹر بھی پابندی نہیں لگا سکے۔ بالا کیا بیچتا ہے۔''

''بھائی، غزالہ میرے ساتھ ہی پڑھتی ہے۔ وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ اگر اس کا بھائی غنڈا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ وہ کس جرم کی سزا برداشت کرے؟ نہ جانے اس کا بھائی کیا چاہتا ہے... وہ اگر ساری زندگی اپنی بہن کو گھر میں ہی رکھنا چاہتا ہے تو یہ الگ بات ہے ورنہ تو اسے اپنی بہن کا ہاتھ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں دینا ہی پڑے گا۔''

''بہت معقول بات تھی اس کی، لیکن کم بخت بالا کو کون سمجھاتا۔ کون اسے قائل کرتا۔ وہ تو قائل کرنے والے کی جان کو بھی اٹک جاتا تھا۔ ایک بار محلے کے ایک ماسٹر صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ان کے گلے پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کسی نے ایسی کوشش نہیں کی۔''

''کمال ہے۔ جوان بہن کے بھائی ایسے بھی ہوتے ہیں؟''

''ہاں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال اب ایسا ہوا کہ اس لڑکی نے وہی کیا جو ان حالات میں اسے کرنا تھا۔ اس نے اس لڑکے سے کورٹ میرج کرلی اور بالا بھنا تا رہ گیا۔''

''کیا بالا کو نہیں معلوم کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے اپنے طور تلاش کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ ظہیر اس لڑکی کو اپنے گھر بھی نہیں لے گیا ہے۔ دونوں کہیں اور رہ رہے ہیں جس کا علم سوائے میرے اور کسی کو نہیں ہے۔''

''کیا آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں۔'' عزیز صاحب مسکرا دیے۔'' میں جانتا ہوں۔ اگر کہو تو میں اس لڑکے یعنی ظہیر سے تمہاری ملاقات بھی کرواسکتا ہوں۔''

میرے دل میں بھی اس نوجوان کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ جس نے محبت کی خاطر اتنا بڑا رسک لیا تھا ورنہ دوسرے تو ایسی صورت میں پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ چلو چھوڑو۔ کون اس جھنجٹ میں پڑے۔ شادی تو کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی۔''

''عزیز صاحب، اس سے مجھے ضرور ملوایئے گا۔'' میں نے خواہش ظاہر کی۔

گرجدار چالیسیہ
(Roaring Forties)

وہ تند و تیز ہوائیں جو نصف کرۂ جنوبی میں 140 اور 50 درجہ عرض بلد کے درمیان چلتی ہیں۔ چونکہ یہ 140 عرض بلد سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں تندی و تیزی کے علاوہ مہیب گرج بھی ہوتی ہے اس لیے ان ہواؤں کو گرجدار چالیسیہ کہتے ہیں۔ یہ ہوائیں منقلب تجارتی ہواؤں کی ایک قسم ہیں۔ شمالی نصف کرّے میں یہ ہوائیں چونکہ زمین اور پہاڑوں سے ہو کر آتی ہیں اس لیے ان کا زور رکاوٹ کے باعث کم ہو جاتا ہے اس کے برعکس جنوبی نصف کرّے میں خشکی کا وجود کم ہے اور ہر جگہ سمندر ہی سمندر ہے ان ہواؤں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں اس لیے یہ ہوائیں یہاں بڑی تیزی سے چلتی ہیں اور ان میں ایک مہیب گرج بھی ہوتی ہے۔ ان ہواؤں کا رخ اگرچہ شمال سے جنوب کی طرف ہوتا ہے، لیکن زمین کی گردش کے باعث ان کا رخ مشرق کی طرف ہو جاتا ہے۔

گردباد (Cyclone)

وہ تند و تیز ہوائیں جو مدور اور گول خطوط متساوی الحرارت کے اندر چلتی ہیں۔ ان میں ہوا کا دباؤ مرکز میں کم ہوتا ہے اور چاروں طرف بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے یہ ہوائیں شمال نصف کرّے میں اپنی دائیں جانب اور جنوبی نصف کرّے میں بائیں جانب گھوم جاتی ہیں۔ ان ہواؤں کی حرکت شمالی کرّے میں گھڑی کی سوئیوں کے مخالف اور جنوبی نصف کرّے میں ان کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں دو قسم کے گردباد شامل ہوتے ہیں۔ ایک وسطی گردباد جو منطقہ معتدلہ میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرے مداری گردباد جو منطقہ حارہ میں نمودار ہوتے ہیں۔

مرسلہ: نجمہ فصیح، لاڑکانہ

''میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس طرح دو محبت کرنے والے جب چھپ کر اور ڈر کر شادی کر لیتے ہیں تو ان کی زندگی کس طرح گزرتی ہے۔ کیا انہیں ہر وقت خطرے کا احساس ہوتا رہتا ہے؟'' بے شمار سوالات تھے۔

دو ہی دنوں کے بعد عزیز صاحب راستے میں مل گئے۔ ''ارے بھائی وسیم صاحب میں تو آپ کو فون کرنے والا تھا۔''

''خیریت تو ہے؟''

''ہاں، ہاں۔ بالکل خیریت ہے۔ وہ ظہیر کا فون آیا تھا۔ اس کو مجھ سے کوئی کام ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو بھی لیتا چلوں۔''

''ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کس وقت چلنا ہے؟''

''بس ایک گھنٹا میں۔''

ایک گھنٹے بعد ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ ہمیں گلشن جانا تھا جو ہمارے علاقے سے فاصلے پر تھا۔

ان دونوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے رکھا تھا، اوپری منزل کا۔ عزیز صاحب نے بتایا کہ ظہیر اس وقت گھر ہی میں ہے۔ اس مکان کی گھنٹی بجائی گئی۔ کچھ دیر بعد ظہیر نے دروازہ کھول دیا۔ عزیز کا استقبال اس نے بہت گرم جوشی سے کیا تھا۔ عزیز نے میرا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ''وسیم صاحب بھی اسی محلے میں رہتے ہیں جس میں تمہاری مسز رہتی تھی یعنی بالا کے محلے میں۔''

اس وقت ظہیر نے معنی خیز نگاہوں سے عزیز صاحب کو دیکھا۔ یعنی وہ یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ خطرے والی تو کوئی بات نہیں ہے؟

''ظہیر میاں، تم ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔'' عزیز صاحب نے کہا۔ ''یہ بہت سلجھے ہوئے اور معقول انسان ہیں۔ یہ خود بھی اس جبر کے خلاف ہیں جس قسم کے جبر کا خوف بالا کی طرف سے ہے۔''

''جی ہاں ظہیر صاحب، میں ایک مختلف مزاج کا انسان ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں چونکہ ایک رائٹر ہوں اسی لیے ہر قسم کے جذبوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ زندگی میں نے محبتوں کے درمیان ہی گزاری ہے اور تمہاری اور تمہاری مسز کی جرأت کو خراجِ تحسین پیش کرنے آیا ہوں۔''

ان باتوں کے بعد ہی اس کو اطمینان ہوا تھا۔ اس نے اندر بلا لیا۔ وہ دو یا تین کمروں کا چھوٹا سا پورشن تھا۔

ایک کمرے کو انہوں نے ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ دو چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ افراتفری کے عالم میں تھے اسی لیے سامان وغیرہ نہیں لا سکے ہوں گے۔

ظہیر نے ہمیں بیٹھنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ وہی لڑکی جس کو دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا تھا جو اس بالے کی بہن معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بہت سلیقے سے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔

ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے اسے شادی کی مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھا لگا کہ آپ دونوں نے جو فیصلہ کیا اس پر قائم بھی رہے۔''

''ہم نے یہ فیصلہ یونیورسٹی ہی میں کر لیا تھا۔'' ظہیر نے کہا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ غزالہ کا بھائی کیسا ہے۔ اس کے باوجود محبت اگر خوف کھانے لگے تو پھر دنیا سے محبت کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

غزالہ بول پڑی۔ ''میں ہمیشہ اس بھائی کی وجہ سے شرمندہ رہی ہوں اور اب تک اسی کے خوف میں دن گزار رہی ہوں۔''

''تمہاری والدہ بھی تو ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں لیکن وہ بھی بھائی کے سامنے کچھ نہیں بولتی ہیں۔ بس ایک بار وہ مجھے ایک جگہ مل گئی تھیں۔ میں ان کو اس گھر میں لے کر آگئی۔ وہ بے چاری بھی ڈر رہی تھیں... کہ کہیں بالا دیکھ نہ لے۔''

''ظہیر میاں اب تمہارا کیا ارادہ ہے...؟ کیا اسی طرح خوف والی زندگی گزارو گے؟'' عزیز نے پوچھا۔

''کیا کیا جائے۔ بس محلہ بدلتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں؟''

''اگر آپ لوگ مشورہ دیں تو میں بالا کو سمجھانے کی کوشش کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''وسیم میاں، آپ کیوں اپنی عزت خراب کروانا چاہتے ہیں۔'' عزیز صاحب نے کہا۔

ان لوگوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی طرح بھی ہو بالا کا غصہ ختم کروانے کی کوشش کروں گا ایک ثواب کا کام بھی ہوتا میں اس کے بعد بالا کی تاک میں رہا۔ اس کو دور سے تو کئی بار دیکھا تھا لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ایک شام وہ مجھے تنہا ہی مل گیا۔ وہ پان کی دکان پر

کھڑا ہوا تھا۔ میں بھی اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور اپنی سگریٹ جلا کر ایک طرف ہو گیا۔ میں بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس بار وہ چونکا تھا۔ ''کیا بات ہے بھائی؟'' اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ''کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟''

''جی ہاں بالا صاحب۔ آپ ہی سے کام ہے۔'' میں نرم لہجے میں بولا۔

''بتاؤ۔ کیا کام ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے بول نا کیا بات ہے۔ تو نے میری کون سی زمین مار لی ہے کہ میں تجھ سے ناراض ہو جاؤں گا۔''

میں ڈر گیا کیوں کہ اس کا لہجہ بہت اکھڑ سا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے وہ میرا گریبان پکڑ لے گا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اگر میں نے ڈائریکٹ اس کی بہن کی بات کی تو مجھ پر حملہ کر دے گا اسی لیے میں نے ایک دوسری بات کی۔ ''بالا صاحب میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟ مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟ اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔

''بالا صاحب، ایک ایسی بات ہے جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا ہے بھائی؟'' اب وہ بالکل ہی پگھل گیا تھا۔

''چلیں کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ اطمینان سے بات ہوگی۔''

اس نے کچھ سوچا، پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''یار تم مجھے اچھے آدمی لگ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''چلو سامنے والے ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

ہم دونوں ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ خود اسی نے چائے کا آرڈر دیا تھا۔ ''ہاں صاحب بتائیں۔ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے۔''

''بالا صاحب۔ پہلے تو میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام وسیم ہے۔ میں ایک رائٹر ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔ انسانوں کی کہانیاں ان کے رویّوں کی کہانیاں ان کی عادتوں کی کہانیاں۔ شاید اسی لیے مجھ میں انسانوں کو پرکھنے کا ہنر آ گیا ہے۔''

''واہ یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ تو آپ نے مجھ میں کیا دیکھا؟'' یہ ایک واضح تبدیلی تھی۔ وہ تو تکار سے آپ پر آ گیا تھا۔

''بالا صاحب، آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اپنی بات کے دھنی انسان ہیں۔ جس کو ایک بار اپنا دوست کہہ دیں اس کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔''

''یہ بات تو ہے وسیم صاحب۔ اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ نے بالکل سچ کہا۔ جس کو اپنا دوست کہہ دیا کہہ دیا۔ جس طرح آپ کو کہہ رہا ہوں۔ آزما کر دیکھ لینا۔''

پہلی ملاقات کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔

وہ اپنی ساکھ کے برعکس ایک مناسب آدمی معلوم ہوا تھا۔ اس کی باتیں بھی بہت اچھی تھیں۔ اس نے بتایا کہ وہ انٹر کر چکا ہے۔ حالات کی وجہ سے آگے نہیں پڑھ پایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا۔

اس سے دو تین بار اور ملاقات ہوئی۔ وہ میری عزت کرنے لگا تھا جبکہ وہ محلے والوں کے لیے پہلے ہی کی طرح خوں خوار تھا۔

میری اس سے اچھی خاصی دوستی سی ہو گئی تھی۔ وہ جب ملتا زبردستی مجھے ہوٹل لے جا کر چائے پلواتا۔ یہ اس کے مزاج کا ایک الگ پہلو تھا۔

ہمارے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی سی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود ابھی تک میرا حوصلہ نہیں ہوا تھا کہ میں اس کی بہن کے موضوع پر بات کرتا۔ اس جیسے انسان کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ نہ جانے کس وقت دماغ پھر جائے اور خود میرے لیے وبال بن جائے۔

عزیز صاحب مجھ سے پوچھتے رہتے تھے۔ ''بھائی آپ نے اس گینڈے سے دوستی تو کر لی ہے لیکن کیا غزالہ کے بارے میں کوئی بات کی؟''

''نہیں عزیز صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمت نہیں پڑتی۔ اچانک ہی بھڑک اٹھے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔''

''یہ تو ہے، اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ وہ لوگ جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گزارنے دیں۔ وقت خود ہی کوئی راستہ نکال لے گا۔''

ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔

مجھے ایک دن اسی علاقے میں جانا پڑا... جس علاقے میں ظہیر اور غزالہ رہتے تھے اور وہیں ایک دکان کے پاس

میں نے بالا کو دیکھ لیا۔

''خدا خیر کرے۔ لگتا ہے بالا کو ان کا پتا چل گیا ہے اور اب ایک بڑا طوفان ان محبت کرنے والوں کے سروں پر منڈلانا شروع ہوگیا ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

میرا دل چاہا کہ میں بھاگ کر ان دونوں کو خبردار کر دوں کہ خطرہ ان کے سروں پر آ گیا ہے۔ وہ بھاگ سکتے ہیں تو بھاگ لیں۔ کم از کم وقتی طور پر مکان چھوڑ کے چلے جائیں، لیکن میں یہ سوچتا رہ گیا اور بالا اسی طرف چل پڑا جس طرف ان کا مکان تھا۔

میں کم از کم اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ بالا کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔

پھر یہ خیال بھی آیا کہ ہوسکتا ہے کہ بالا کسی اور کے گھر کی طرف جارہا ہو۔ میں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ احتیاط کی تھی کہ اس کی نگاہوں میں نہ آسکوں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے بالا کو اس مکان کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ دروازہ کھلا اور میں نے حیران ہوکر دیکھا کہ بالا کو کسی نے اندر بلا لیا تھا۔

میں اس وقت بھی اسی خوف میں مبتلا تھا کہ بس کچھ ہی دیر بعد اندر سے چیخنے چلّانے کی آوازیں آئیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور بالا اندر سے باہر آ گیا۔ اس کو دیکھ کر میں ایک طرف ہوگیا۔ وہ مجھے دیکھ نہیں پایا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کا رخ محلے کی ایک دکان کی طرف تھا۔

میں حیران ہوکر دیکھتا رہا۔

بالا نے اس دکان سے کچھ چیزیں خریدیں...اور دوبارہ اسی مکان کی طرف چل دیا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ اسی مکان میں رہتا ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر انتظار میں ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اس بار بالا اس مکان سے جلدی باہر آ گیا تھا۔

مگر اس بار بالا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ گرچہ میں نے چھپنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔

اس نے مجھے آواز دی۔ ''وسیم صاحب، وسیم صاحب۔''

میں رک گیا۔ وہ میرے پاس آ گیا۔ ''ارے آپ یہاں کہاں؟''

''وہ میں اپنے ایک دوست کے پاس آیا ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بالا تم؟ تم یہاں؟''

اس نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ''اب تو خیر بتانا ہی پڑے گا۔ آپ پر بھروسا ہے اسی لیے میں جانتا ہوں کہ آپ اس بات کو اپنے تک رکھیں گے۔ چلیں۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

ہم ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد بالا نے کہا۔ ''وسیم صاحب۔ یہ مکان میری بہن کا ہے۔ وہ اور اس کا شوہر اسی مکان میں رہتے ہیں۔''

مجھے تو یہ بات معلوم تھی، لیکن اس کا یہاں آنا مجھے حیران کررہا تھا۔

''وسیم صاحب۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیوں کہ آپ کیا ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ میں ان دونوں کو دیکھتے ہی جان سے ماردوں گا۔''

''ہاں۔ محلے میں تاثر تو یہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں اپنی بہن سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا...بلکہ یہاں تک بتادوں کہ یہ شادی بھی میرے علم میں تھی۔ ایک بار دل تو یہی چاہا تھا کہ میں ان دونوں کو مار ہی دوں، پھر بہن کی محبت غالب آ گئی اور میں نے اسے معاف کردیا۔ دونوں کو معاف کردیا...اور اب یہاں کبھی کبھی دونوں سے ملنے چلا آتا ہوں۔''

''لیکن یہ بات محلے والوں کو کیوں نہیں معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں کہ میں نے جان بوجھ کر یہ سب چھپا رکھا ہے اس لیے کہ اگر یہ بات عام ہو جائے تو میری ساکھ کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔''

''لیکن یہ بات چھپ تو نہیں سکتی ہے نا؟''

''ہاں، اور اس کا طریقہ میں نے یہ سوچا ہے کہ محلے کے کچھ معزز لوگ جیسے آپ ہیں۔ عزیز صاحب ہیں۔ یہ سب مل کر مجھے سمجھائیں گے اور میں ان دونوں کو معاف کر دوں گا۔''

''سمجھ گیا میں۔'' میں ہنس پڑا۔ ''یعنی تم اپنی ساکھ کے لیے یہ ڈراما کروگے۔''

وہ بھی ہنس پڑا، اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ انسان بھی کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے کیا کیا کرتا ہے۔

++



بازی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم......!
ایک اور سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ یہاں پاکستانی کمیونٹی میں ایسے ایسے قصّے، داستانیں بکھری ہیں کہ انہیں سمیٹنا مشکل ہے۔ زیر نظر سچ بیانی کی اصل کردار نوشابہ ہے جس کے صبر، استقامت اور محنت نے اسے دیارِ غیر میں ممتاز بنارکھا ہے۔
مونا شہزاد
(کلگری، کینیڈا)

اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے بیٹوں کوفخر ومحبت سے دیکھا۔ زندگی اس پر مہربان تو کبھی بھی نہیں رہی تھی، اس دشت کی سیاحی میں بارہا باراس کے پیر آبلہ پا ہوئے تھے اوراس کا دامن کانٹوں سے تارتار ہوا تھا مگراس کی اولاد ایک انمول تحفہ تھی جو کارزار کے اس پر خار

سفر کی تکلیف کو ماند کر دیتی تھی۔ وہ رب کی ہمیشہ شکر گزار رہتی تھی جس نے اسے سعادت مند اولاد سے نوازا تھا۔ وہ آج اپنی ساٹھویں سالگرہ کے دن ہمیشہ کی طرح اپنے بیٹوں کے ساتھ ایک ہوم لیس سینٹر میں آئی تھی۔ آج یہاں ان بے گھر لوگوں کے کھانے کا بہترین انتظام اس کے بڑے بیٹے کی جانب سے تھا جو کہ ایک نامی گرامی سرجن تھا۔ اس سلسلے کے انتظامات کے لیے وہ اس سے اجازت لے کر انتظامیہ کے آفس کی جانب چل پڑا جب کہ اس کا منجھلا بیٹا اس کے ساتھ ہال کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ انہوں نے ہر سال کی طرح اس سال بھی اس کی سالگرہ کے موقع پر رفاہی خدمات سرانجام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں آج وہ کمبل اور جیکٹوں کا عطیہ دینے کے لیے آئے تھے۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے چل رہا تھا اپنی ہر سالگرہ پر اس نے یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ غریب اور نادار لوگوں کی ضروریات پوری کر دیا کرتی تھی۔ آج بھی وہ اپنے ہاتھوں سے یہ کمبل اور جیکٹس نادار بے گھر لوگوں میں بانٹ رہی تھی۔ اسے خدمتِ خلق کر کے بہت راحت ملتی تھی۔ وہ ہر ایک بے گھر شخص کے بستر کے قریب رکتی ان سے چند باتیں کرتی اور پھر انھیں تحفے کے طور پر مطلوبہ اشیاء دیتی۔ وہ بھی اسے دل سے سالگرہ مبارک کہتے، چلتے چلتے وہ ایک بستر کے پاس رکی تو حیرت زدہ رہ گئی۔ بستر پر دراز ہڈیوں کا ڈھانچا کوئی انجان شخص نہیں تھا۔ یہ تو وہی شخص تھا جس کی بے وفائی نے نوشابہ سے بھاری خراج وصول کیا تھا۔ اس سرد مہر شخص کی سرد مہری نے اسے بھری جوانی میں خزاں رسیدہ کر دیا تھا۔ وہ بیاہتا ہوتے ہوئے بھی ساری عمر بیواؤں کی طرح رہی تھی۔ نوشابہ نے دیکھا کہ اس نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لی ہیں مگر اس کی آنکھوں کے گوشوں سے بہتے آنسو اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ انھیں بخوبی پہچان چکا ہے۔ اس کے چہرے پر خوف اور پچھتاوے کی حکمرانی تھی۔ نوشابہ کے دل میں درد کی تیز لہر ابھری، وہ چکرا سی گئی۔ اس کے بیٹے نے بستر پر پڑے شخص کو غور سے دیکھا اور تیزی سے ماں کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”اماں! ہم چلتے ہیں۔ باقی چیزیں منیجر صاحب خود بانٹ دیں گے۔“

اس کے بیٹے کی آواز سن کر بستر پر پڑے شخص نے آنکھیں کھولیں اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں کینسر سے مر رہا ہوں۔ کیا تم سب مجھے معاف نہیں کر سکتے؟“

اس کا بیٹا تلخی سے بولا۔ ”معافی؟ وہ بھی آپ کو؟ کس کس بات اور کس کس ظلم کی معافی آپ مانگیں گے؟ آپ کو تو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ جائیں اور اپنی وہی محفلیں سجائیں جن کے لیے آپ نے ہمیں کوڑی کوڑی کا محتاج کیا تھا۔“

اس کمزور شخص کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا نکل پڑا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر سسک سسک کر بولا۔ ”خدارا نوشابہ! اپنے بچوں سے کہو کہ مجھے معاف کر دیں، تم بھی مجھے معاف کر دو ورنہ مجھے موت بھی سکون سے نہیں آئے گی۔ میں روز جیتا اور روز مرتا ہوں۔ رحم کرو مجھ پر۔ میرا ماضی مجھے جینے نہیں دیتا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔“

وہ دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اس کے آنسو اس کے پچھتاوے کی غمازی کر رہے تھے۔ نوشابہ کا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، اس نے بیٹے کی جانب دیکھا مگر طارق نے نفرت سے اس بوڑھے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اماں! چلیں۔ کھلاڑی پھر کوئی بساط بچھا رہا ہے۔ اب ہم اس کے فریب میں آنے والے نہیں ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ماں کے کندھوں پر بازو رکھے اور وہ دونوں آفس کی جانب چل پڑے۔ وہ بیمار، مفلوک الحال شخص انھیں حسرت سے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

انھوں نے بقیہ سامان وہاں کے کیئر ٹیکر کے حوالے کیا اور وہ بوجھل قدموں سے چلتی اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگی۔ اس دوران میں اس کا بڑا بیٹا بھی دفتر سے فارغ ہو کر ان کے پاس پہنچ گیا وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر تھا کہ کیا قیامت آ کر گزر چکی ہے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی فکرمندی سے ماں کے زرد چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ ”اماں! بلڈ پریشر لو تو نہیں ہو گیا۔ آپ کیسے زرد پڑ گئی ہیں۔“

نوشابہ... اپنے بیٹے ظفر کی تشویش کو محسوس کر کے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں! بیٹا ایسی بات نہیں ہے۔“

اس کے منجھلے بیٹے طارق نے گاڑی چلاتے ہوئے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اماں! آپ کو علم ہے نا کہ بھابی اور بچے ریسٹورنٹ میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ علینہ بھی جاب سے سیدھی وہیں آجائے گی۔“

نوشابہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ آنسو تڑپ کر باہر آنے کے لیے بے تاب تھے مگر وہ انھیں بہنے کی اجازت ہرگز نہیں دینے والی تھی۔ جلد ہی وہ سب ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ یہ پاکستانی ریسٹورنٹ اپنے کھانوں کی وجہ سے بہت مشہور

تھا۔ اس کے بڑے بیٹے کی بیوی اور بچے پہلے سے ریزروشدہ میز پر بیٹھے ہوئے تھے انھیں اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھے۔ ٹیبل کے اوپر ایک خوبصورت دومنزلہ کیک پڑا ہوا تھا۔ جلد ہی اس کی بیٹی علینہ بھی پہنچ گئی۔ سب بڑوں اور بچوں نے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو گنگاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر سالگرہ کا کیک کاٹا۔ کیک کاٹنے کے بعد سب بڑے چھوٹے نے اسے تحائف دیئے پھر انھوں نے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔

نوشابہ نے محسوس کیا کہ اس کے بیٹے طارق کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے بے حد پیار کرتا ہے اور آج کے واقعے کے بعد اس کے لیے پریشان تھا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے اس کے کاندھے کو تھپتھپایا اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ٹھیک ہوں منا۔ اتنی فکرمت کیا کرو۔ تمہاری اماں فولادی عورت ہے۔''

طارق کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ سی آگئی۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ یہ فولادی عورت کتنے نرم و نازک دل کی مالک ہے اسی لیے تو ڈر رہا ہوں۔''

نوشابہ کے دل کی دھڑکن مزید بے ترتیب سی ہوگئی۔ اس نے بیٹے کو اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کی بیٹی بے اختیار ہی ہنستے ہوئے بولی۔ ''ایسے کیا راز و نیاز ہیں جو آج دونوں ماں بیٹا آپس میں کررہے ہیں۔''

نوشابہ نے گھبرا کر بیٹے کی طرف دیکھا مگر اس کا پُرسکون چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اصل بات کسی کو بتانے والا نہیں ہے۔

نوشابہ نے بیٹی کے معصوم چہرے کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''بھئی تمہارے بھیا کی پسند معلوم کررہی تھی۔ مسز آغا بہت دنوں سے مجھے رشتے دکھارہی ہیں۔''

علینہ نے مسکراتے ہوئے بھائی کو کہا۔ ''خدارا بھیا! اب ہاں کردو۔ اب تو بطور انجینئر تمہاری تقرری کتنی بڑی کمپنی میں ہوگئی ہے۔''

طارق نے بے خیالی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! بس جلد ہی۔''

کھانا ختم کرکے وہ سب گاڑیوں میں جا بیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ گھر پہنچ کر سب نے شب بخیر کہتے ہوئے اپنی اپنی خواب گاہوں کا رخ کیا۔ نوشابہ بھی اپنی خواب گاہ میں آکر بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ سارے دن کے روکے ہوئے آنسو بغاوت پر اتر آئے، اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا فلیش بیک گھوم گیا۔ نوشابہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ جب وہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو اس کے والدین ایک روڈ ایکسیڈینٹ میں فوت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد اس کے چچا نے اس کے سر پر دست شفقت دھرا مگر جلد ہی وہ بھی ہارٹ اٹیک کا شکار ہوکر جان سے گزر گئے۔ انھی دنوں میں چچا کے قریبی دوست مبین صاحب اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ کینیڈا سے پاکستان چھٹیاں منانے آئے ہوئے تھے۔ نوشابہ کے اکیلے پن کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھوں نے اس کا نکاح جھٹ پٹ اپنے بیٹے فراز سے کردیا۔ یوں نوشابہ نے کچھ ماہ کے اندر اندر ان کی مدد سے اپنے تمام اثاثے اور جائیداد بیچی اور رقم ڈالروں میں تبدیل کروا کر ان کے ساتھ کینیڈا چلی آئی۔ مبین صاحب اور ان کی بیوی فرزانہ بیگم بہت محبت کرنے والے لوگ تھے۔ نوشابہ کو ان میں اپنے والدین کی جھلک نظر آتی۔ وہ جی جان سے ان کی خدمت کرتی اور وہ بھی اسے اپنی بیٹی مانتے، مگر شب عروسی سے ہی فراز کا رویّہ اس کے ساتھ بہت نامناسب تھا۔ اس نے پہلی رات ہی اسے بتا دیا تھا کہ وہ بیوی بن کر بھی اس پر حق جتانے کی غلطی نہیں کرے گی اور نہ ہی اس کے معمولات زندگی بدلنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اپنے والدین کے برعکس نہایت ہی روکھا پھیکا اور بدتمیز شخص تھا۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے گھر آتا۔ کئی مرتبہ اس کے منہ سے انتہائی گندی بو آتی جو اس بات کی نشاندہی کرتی کہ وہ شراب کا بھی رسیا تھا۔ شادی کے بعد اس نے کبھی اس کے ہاتھ پر اپنی کمائی نہیں دھری تھی۔ اس کی تمام تر ضروریات اس کے ساس سسر پوری کرتے۔ اس نے اپنے سسر کے ہی مشورے سے اپنے والدین کے اثاثوں کی رقم کا سونا خرید کر لاکر میں محفوظ کرلیا تھا۔ اس کے سسر نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ کبھی وہ بھول کر بھی اس سونے کا تذکرہ فراز سے نہیں کرے گی۔ نوشابہ کو اس بات پر حیرت ہوئی مگر اس نے ان کی بات مان کر سرِ تسلیم خم کردیا۔ اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی کہ وہ بزرگوں کی ہر بات مانتی تھی اور پھر مبین صاحب سے تو ویسے ہی اسے اپنا ابا کی خوشبو آتی تھی۔

فراز کا رویّہ اس کے ساتھ بہت ناروا رہتا تھا مگر وہ ہمیشہ اس کا الزام خود کو ہی دیتی تھی، وہ یہی سوچتی۔ ''شاید اس میں فراز کا قصور نہیں ہے۔ وہ..... مغرب میں پروان چڑھا ایک ماڈرن لڑکا ہے۔ یکا یک اس کی شادی ایک روایتی مشرقی لڑکی سے کردی گئی جسے وہ جانتا بھی نہیں تھا۔''

وہ اپنے دل کو حیلے بہانوں سے بہلاتی رہتی۔ شادی

کے بعد تین سالوں میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسے دو خوبصورت بیٹے عطا کردیئے تھے۔ نوشابہ کا خیال تھا کہ شاید معصوم بچوں کو دیکھ کر فراز کا رویّہ بدل جائے گا اور وہ باپ بن کر بچوں سے محبت کرنے لگے گا مگر باپ بن کر بھی فراز کا رویّہ بدلا نہیں تھا۔ وہ باپ ہوتے ہوئے بھی باپ نہیں بن پایا تھا۔ اس نے کبھی بچوں کو رک کر دو گھڑی پیار نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کے سروں پر کبھی دست شفقت دھرا تھا۔ نوشابہ اور اس کے بچوں کے جملہ اخراجات متین صاحب ہی اٹھاتے تھے۔ ایک دفعہ نوشابہ نے دبے لفظوں میں فراز کو سمجھانا چاہا تو اس نے اسے بری طرح زدوکوب کیا۔ نوشابہ اگلے کئی دن اٹھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس دوران متین صاحب اور فرزانہ بیگم بہت رنجیدہ رہے تھے۔ نوشابہ نے ان دونوں کو کئی مرتبہ تنہائی میں روتے ہوئے پایا۔ اس کی تمام تر تسلی تشفی دینے کے باوجود وہ دونوں اس سے بار بار معافی مانگتے۔ نوشابہ دل ہی دل میں مزید دکھی ہوجاتی۔ وہ طویل نمازیں پڑھتی اور گھنٹوں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے شوہر کے بدل جانے کی دعائیں مانگتی۔ مگر شاید ابھی اس کی دعاؤں کی منظوری کا وقت نہیں آیا تھا یا شاید دعائیں بھی ان ہی کے حق میں قبول ہوتی ہیں جو خود راہ حق کے متلاشی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

شب و روز گزرتے جارہے تھے۔ فراز اسے زدوکوب کرنے کے بعد ایسا گھر سے گیا تھا کہ عرصہ تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی کوئی خیر خبر بھی کہیں سے نہیں مل رہی تھی۔ متین صاحب اور فرزانہ بیگم اچانک بہت بوڑھے لگنے لگے تھے۔ جوان نافرمان اولاد نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ گھر میں چھوٹے بچوں کی موجودگی کے باوجود ایک عجب سا سناٹا چھا گیا تھا۔ گھر میں موجود لوگ ایک دوسرے سے نظریں چراتے پھرتے تھے۔ نوشابہ دل ہی دل میں چور بنتے ہوئی سوچتی۔ ''فراز مجھے ناپسند کرتا ہے۔ اسی باعث بوڑھے والدین کو تنہا چھوڑ گیا ہے مجھے اس کی دلہن بنانے کی انہیں سزا دے رہا ہے۔''

وہ اکثر آئینے میں اپنے عکس کو غور سے دیکھتی کہ اپنا نقص تلاش کرسکے... مگر اس کا عکس اسے کچھ اور ہی دکھاتا اس کی گلابی رنگت، ستارہ آنکھیں، گلابی ہونٹ، ستواں ناک، صراحی دار گردن، سیاہ طویل زلفیں، بھرا بھرا سراپا اسے باور کرواتا کہ کوئی بھی مرد اس کے حصول کے لیے زندگی کی خوشیاں تج کرسکتا ہے۔ وہ اکثر دکھے دل سے آئینے کے آگے سے ہٹتی۔ اس کا قاتل رنگ روپ بھی فراز کو اس کا نہیں بنا سکا تھا۔ وہ تو ایک ردی شے کی مانند تھی جو گھر کے ایک کونے میں پھینک دی گئی تھی۔ شادی کے تین سالوں میں فراز نے گن کر ہی چند بار نشے کی حالت میں اسے ازدواجی حق سے نوازا تھا اور اس کے نتیجے میں دو پھول اس کی گود میں آگرے تھے۔

ایسی ہی گرمیوں کی ایک خاموش صبح تھی۔ نوشابہ نے بچوں کو اسکول بھیجا ہی تھا کہ متین صاحب نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ نوشابہ حسب عادت خاموشی سے تیار ہوکر ان کے ساتھ چل پڑی۔ نوشابہ پر حیرت کا پہاڑ تب ٹوٹا جب وہ وکیل کے دفتر پہنچے۔ متین صاحب نے اپنا ذاتی گھر، بزنس اور تمام رقم دیگر اثاثہ جات اس کے نام کردیئے۔ نوشابہ حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔ وہ دونوں واپسی پر تمام راستے خاموش رہے۔ نوشابہ نے دکھی دل سے سوچا۔ ''تو گویا پاپا نے فراز کو جیتے جی عاق کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

گھر پہنچ کر نوشابہ نے تمام قصہ اپنی ساس سے بیان کیا۔ یہ سن کر فرزانہ بیگم سسک سسک کر رو پڑیں اور کہنے لگیں۔ ''بیٹا! ہم دونوں تمہارے گناہگار ہیں۔ فراز عرصہ دراز سے بگاڑ کے راستے پر گامزن تھا۔ اس نے ہائی اسکول پاس کرتے ہی برے کام شروع کردیئے تھے۔ وہ جوئے کی علت کا شکار ہوگیا تھا۔ اس نے نشہ آور منشیات کے استعمال کے ساتھ ساتھ کئی گوری لڑکیوں کو اپنی دوستیں بھی بنا رکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ کئی کئی دن گزارتا، اکثر انہیں گھر لے آتا تھا، کوئی نوکری ٹک کر نہیں کرتا تھا۔ ایسے میں ہم اسے زبردستی پاکستان اس خیال سے لے گئے تھے کہ اس کی شادی کروادیں گے۔ ہمیں اُمید تھی کہ وہ شادی کے بعد سنبھل جائے گا۔''

متین صاحب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ''بیٹی! کاش میں نے تجھے اس زندان میں نہ جھونکا ہوتا۔ میں تیری شادی پاکستان میں کسی بھی لڑکے سے کرواسکتا تھا مگر میری غرض آڑے آگئی۔ تیرا رنگ روپ، شرافت اور کردار دیکھ کر مجھے لگا کہ میرے بھٹکے ہوئے بیٹے کو تو ہی سیدھی راہ پر لاسکتی ہے۔ مگر میں غلط تھا اس رزیل نے تو ان معصوم بچوں کا بھی پاس نہیں کیا جن کا وہ باپ ہے۔''

نوشابہ کے دل کو ٹھیس لگی جب اسے حقیقت کا علم ہوا کہ متین صاحب اور فرزانہ بیگم نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اپنے جواری اور بدقماش بیٹے سے اس کی شادی کی تھی۔ مگر پھر وہ اپنی روایتی نرم دلی سے مجبور ہوگئی۔ اس نے متین صاحب

کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولتے ہوئے کہا۔ ''پاپا! بس کیجئے۔ مجھے آپ دونوں سے کوئی گلہ نہیں۔ میرے نصیب میں جو تھا وہ مجھے مل گیا۔''

متین صاحب نے رقت بھری آواز میں کہا۔ ''نہیں بچے! یہ تیرا نصیب نہیں تھا ہماری لالچ نے تجھے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ میں نے اپنی جائیداد اور رقم اس لیے تمہارے نام کیا ہے تاکہ ہمارے مرنے کے بعد تم سڑک پر نہ آجاؤ۔ وہ ذلیل تو تجھے اور بچوں تک کو بیچ کھائے گا۔ خدارا! اس پر اعتبار مت کرنا۔''

نوشابہ نے تڑپ کر ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور روتے ہوئے بولی۔ ''خدارا پاپا! ایسی باتیں مت کریں۔ میں پہلے ہی بہت اکیلی ہوں۔ مجھ سے رب میری زندگی لے لے مگر آپ کا اور ممی کا سایہ میرے سر پر سلامت رکھے۔''

مگر شاید ہر دعا پوری نہیں ہوتی۔ اگلے ہی ہفتے متین صاحب اور ان کی بیگم ایک ٹریفک حادثے میں مارے گئے۔ ان کی گاڑی کے بریک فیل ہوگئے اور گاڑی سامنے سے آتے ایک ٹرالر سے ٹکرا گئی۔ ان کی وفات کے بعد نوشابہ معصوم بچوں کے ساتھ بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ ایسے میں فراز نجانے کہاں سے خبر سن کر واپس آگیا۔ اس کی واپسی سے نوشابہ کو کوئی خوشی تو نہیں ہوئی مگر ایک ڈھارس سی بندھ گئی کہ وہ بالکل اکیلی نہیں ہے۔

☆☆☆

نوشابہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے تو وہ ماضی سے واپس حال میں آگئی۔ رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن مزید بے ترتیب سی ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا اور آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ آسمان سے برف گر رہی تھی۔ دور دور تک برف کی سفیدی کی حکمرانی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ماضی اس کے سامنے بے نقاب کھڑا تھا۔

اسے یاد آیا کہ فراز واپس آیا تو وہ بہت بدل چکا تھا۔ اس نے اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور وعدہ کیا تھا کہ اب وہ ایک اچھا شوہر اور اچھا باپ بن کر اسے دکھائے گا۔ اس کے طور اطوار مکمل طور پر بدل گئے تھے۔ وہ اس سے بہت محبت سے پیش آتا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ایک نئے فراز کا جنم ہوا ہے۔ اس نے بچوں کو بھی پیار سے اپنا دیوانہ بنالیا تھا۔ نوشابہ جو متین صاحب اور فرزانہ بیگم کے غم سے بے حال تھی یہی سمجھی کہ شاید وہ پتھر دل پگھل گیا ہے۔ وہ یہ قطعی بھول گئی تھی کہ بچھو کی سرشت ڈنک مارنا ہوتی ہے۔ وہ فراز کے بدلے ہوئے

شائستہ سحر

سوانحی کرب تخلیقی اظہار میں داخلی احساسات کو فروغ بخشنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے فن پارے میں تخلیق کار کی ذات کی پرچھائیاں مشاہدہ کی جاسکتی ہیں۔ یہی ماجرا شائستہ سحر کے کلام سے اظہر من الشمس ہوتا ہے مشیت کی طرف سے انہیں پرکٹھن جیون ودیعت ہوا جس کی وجہ سے ان کی سخن سنجی میں ذاتی حوالے سے کرب کا پہلو اجاگر ہوا ہے ان کا اصل نام شائستہ پروین ہے اور ادبی نام شائستہ سحر ہے 23 ستمبر 1975ء میں میرپور خاص میں پیدا ہوئیں میٹرک کا امتحان 1989ء میں میرپور خاص سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا 1997ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو میں اردو ادبیات میں ایم اے کیا اسی سال شکیل احمد سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں اسی سال ہی ان کا اوّلین شعری مجموعہ ''عذابِ آگہی'' منصۂ شہود پر آیا۔

رویے کو ایک حقیقت سمجھ بیٹھی تھی۔ فراز کی محبت تو اس کے رگ و پے میں دوڑتی تھی وہ اس کی توجہ و محبت پاکر گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔ اس نے محبت کی آخری بازی کھیلنے کا فیصلہ کیا اور ایمانداری سے متین صاحب کا بزنس اور سارے اثاثے فراز کے نام کروادیئے۔ رہائشی گھر ہنوز اس کے نام تھا۔ فراز نے ضد کر کے اسے کہا۔ ''جان! چادر اور چار دیواری تو عورت کا حق ہوتی ہے۔ اس لیے جان من یہ گھر تمہارے نام ہی رہے گا۔''

نوشابہ اسی ادا پر فریفتہ ہوگئی۔ وہ روایتی...... مشرقی بیوی تھی اس کے ذہن میں ایک دفعہ بھی نہیں آیا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہورہی تھی۔ فراز کے خوبصورت چہرے کے پیچھے چھپا گھناؤنا چہرہ اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آنے والے وقت سے بے خبر محبت کی پینگ جھول رہی تھی۔ فراز نے دھیرے دھیرے گھر دیر سے آنا شروع کردیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر وہ ہمیشہ کام کی زیادتی کی وجہ بتاتا۔ وہ مسکرا کر اس کے کانوں میں پڑی بالیاں پیار سے چھیڑتا اور کہتا۔ ''ڈیئر! تمہارے اور بچوں کے سکھوں کے لیے تو ہی محنت و مشقت کررہا ہوں۔''

انھی دنوں نوشابہ کو احساس ہوا کہ وہ پھر سے اُمید سے ہے۔ اس نے فراز کو یہ خبر سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ زندگی بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ نوشابہ ساری فکر اور پریشانیوں کو بھول بیٹھی تھی۔ اس کی زندگی گھر اور بچوں کی مصروفیات کے بیچ گزر رہی تھی۔ نوشابہ نے محسوس کیا کہ فراز کچھ دنوں سے بہت پریشان تھا۔ اس کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اسے بزنس میں بڑا گھاٹا ہوا ہے اور اسے اس سے نکلنے کے لیے کچھ رقم درکار ہے۔ سادہ لوح نوشابہ یہ سن کر بہت پریشان ہوئی اس نے فراز کو تسلی تشفی دیتے ہوئے اپنے اور اپنی مرحومہ ساس کے سارے زیورات فراز کو دے دیئے کہ وہ انھیں بیچ کر اپنا نقصان پورا کرلے۔ زیورات لے کر فراز جو گھر سے رخصت ہوا تو پلٹ کر نہیں آیا۔ نوشابہ نے پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی لکھوائی۔ اس کے ذہن میں برے برے خیالات آتے رہے وہ یہی سوچتی تھی کہ شاید کسی چور اچکے نے اسے لوٹ کر اسے کوئی جانی نقصان پہنچا دیا تھا۔

نوشابہ کو بعد میں پتا چلا کہ وہ تو بہت عرصے سے اس سے جان چھڑوانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ بزنس اور تمام اثاثہ جات بیچ چکا تھا، جاتے جاتے اس کے زیورات بھی لے گیا تھا۔ اب نوشابہ کی آمدنی کا ذریعہ نہ رہا تو اس نے پاکستان سے لائی رقم سے خریدا سونا بیچا اور اخراجات شروع کردیئے۔ گھر بیٹھے تو قارون کے خزانے بھی ختم ہوجاتے ہیں یہ تو پھر چند ہزار ڈالر تھے۔ گھر میں جب کھانے پینے کے لالے پڑنے لگے تب اس نے اسکول میں بطور بس ڈرائیور نوکری کرلی۔ اس دوران اس کے حمل کا ساتواں مہینا شروع ہوچکا تھا۔ نوشابہ اکثر سوچتی۔ ”میں بچے کس کے پاس چھوڑ کر اسپتال ڈلیوری کے لیے جاؤں گی؟“

اس دوران اس کا بڑا بیٹا نو سال کا اور چھوٹا آٹھ سال کا ہوچکا تھا۔ مگر ہنوز وہ چھوٹے ہی تھے۔ سردیوں کی ایک سرد شام تھی۔ وہ بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی کہ اچانک کسی نے صدر دروازہ بری طرح دھڑ دھڑایا، نوشابہ نے پریشانی سے باہر کی جانب دیکھا۔ اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

مگر دروازہ کھٹکھٹانے والے جواب دینے پر آمادہ ہرگز نہیں تھے۔ نوشابہ نے ہمت کرکے دروازہ کھولا۔ اچانک آندھی وطوفان کی رفتار سے دو کالے اور دو گورے مشٹنڈے اسے دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے ریوالور اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ کوئی شریف لوگ نہیں ہیں۔ ان چاروں میں سے ایک گورا جو شکل وصورت سے ان کا باس لگ رہا تھا۔ اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے اس کے بڑھے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر بولا۔

”اس...... فراز نے تجھے گروی رکھتے وقت یہ نہیں بتایا تھا کہ تو اُمید سے ہے۔“

شور شرابے کی آواز سن کر اس کے دونوں بیٹے بھی بھاگتے ہوئے کچن سے باہر آگئے۔

ان کو دیکھ کر اس گورے کے ماتھے پر مزید شکنیں گہری ہوگئیں وہ ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون ہیں؟“

نوشابہ نے چکراتے دماغ اور خشک ہوتے ہوئے گلے سے جواب دیا۔ ”یہ میرے بیٹے ہیں۔“

یہ سن کر اس گورے پر جیسے پاگل پن کا دورہ سا پڑ گیا وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”تم فراز کی کون ہو؟“

نوشابہ نے فق ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے بیٹوں کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کی بیوی ہوں۔“

یہ سن کر وہ چاروں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ گورے باس نے اپنی جیب سے کاغذات اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ تجھے اور تیرے اس گھر کو جوئے کی بازی میں ہار گیا ہے۔ تو ان بچوں کے باعث میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ اس لیے شرافت سے کاغذات پر دستخط کردے اور بچوں کو لے کر گھر سے نکل جا۔“

اس کا چھوٹا بیٹا طارق نتھنے پھلا کر بولا۔ ”ہمارے پاپا ایسے نہیں ہیں۔ وہ ہماری مما کو بیچ نہیں سکتے۔ یہ ہمارا گھر ہے میں 911 کال کرتا ہوں۔“

گورے نے ریوالور اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو مرے گا اگر کال کرے گا 911؟“

نوشابہ نے دہل کر اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”بچہ ہے معاف کردو۔ میں ابھی کاغذات پر دستخط کردیتی ہوں۔“

اس نے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کاغذات پر دستخط کردیئے۔ وہ جان چکی تھی کہ بچھو اسے ڈس چکا تھا۔ بے وفائی اور ناروائی کے زہر نے اس کے جسم کو نیلا کردیا تھا۔ جوزف

نامی گورے باس نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو نجانے کیسے اسے خوف خدا آ گیا۔ اس نے اپنے گرگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اسے نرمی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت بے غیرت ہوں۔ ہر برا کام کرتا ہوں۔ کئی قتل بھی کر چکا ہوں، مگر تمہارے شوہر فراز جیسے...... سے میں کبھی نہیں ملا۔ اس نے تمہاری تصویر دکھا کر تمہیں بھی پچاس ہزار ڈالر کے عوض مجھے بیچ دیا ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس کی بیوی ہو اور اس کے تیسرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔ اس نے تو مجھے یہی کہا تھا کہ تم اس کی گرل فرینڈ ہو اور ایک ڈانسر ہو۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ نوشابہ یہ سب سن کر ایک عجب سی بے یقینی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں دہرایا۔ ”گرل فرینڈ؟ ڈانسر؟ پچاس ہزار ڈالر......“

اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں، اسے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بیہوش ہو کر گر جائے گی۔ اس کے ذہن میں اس کے سسر کی آواز گونجی۔ ان کو بھی یہی خدشہ تھا کہ فراز اسے اور بچوں کو بیچ کھائے گا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ جوزف نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر تم عقل مند ہو گی تو عدالت کے ذریعے اس...... سے طلاق لے لو گی... ورنہ وہ بچھو تجھے اور تیرے بچوں کو بیچ کھائے گا۔ کسی نے نہ خریدا تم لوگوں کو تو وہ بلیک مارکیٹ میں تمہارے اعضا ہی نیلام کر دے گا۔ جاؤ اپنا ضرورت کا سامان اٹھاؤ اور گھر سے نکل جاؤ اس سے پہلے کہ میرے اندر کا حیوان جاگ جائے۔ تمہارے دلال نے مجھے پچاس ہزار ڈالر کی ڈز لگائی ہے۔ زندگی میں پہلی بار جوزف اپنے شکار کو آزاد چھوڑ رہا ہے۔“

نوشابہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی، اس کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ سب انتہائی خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ اس نے بیٹوں کی مدد سے تین اٹیچی کیس کپڑوں اور چند ضرورت کی اشیاء کے تیار کیے، اپنی کچھ بقایا جیولری اپنے پرس میں رکھی اور کوٹ پہن کر وہ گھر سے باہر آ گئے۔ باہر برف کا طوفان شروع ہو چکا تھا۔ نوشابہ نے بچوں کے ہاتھ پکڑے اور تیزی سے بس اسٹاپ کی سمت چل پڑی۔ اس کے ذہن پر ایک عجب سا جمود طاری تھا۔ چلتے چلتے اسے ٹھوکر سی لگی اور وہ گر پڑی۔ تین اٹیچی کیس، دو معصوم بچے اور وہ خود اللہ تعالیٰ کی زمین پر بے یار و مددگار رات میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ان کی زندگی ایک عجب موڑ لے چکی تھی۔ اچانک طارق نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیاں ٹھنڈ سے شل ہو گئی تھیں۔ نوشابہ نے ہمت کی اور اٹھ کر بچوں کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”پریشان مت ہو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“

اسے اچانک اپنا سپروائزر جان یاد آیا۔ اس نے پرس سے ڈائری نکالی اور قریبی فون بوتھ سے اسے روتے ہوئے فون کیا۔ وہ جلد ہی گاڑی لے کر اسے لینے آ گیا۔ جان ایک بوڑھا ساٹھ سالہ سفید فام شخص تھا۔ وہ اسکول بس ڈرائیورز کا سپروائزر بھی تھا۔ نوشابہ کی اس سے جان پہچان صرف ہائے ہیلو تک ہی محدود تھی۔ فراز کی حرکات و سکنات کے باعث نہ ہی متین صاحب اور فرزانہ بیگم کسی سے ملتے جلتے تھے اور نہ ان کی وفات کے بعد نوشابہ نے کسی سے ملنے جلنے یا دوستی بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ فراز کے گم ہو جانے کے بعد بچوں کی اسکول بس چلانے کا خیال بھی اسے اخبار سے ملا تھا جس میں انھوں نے ضرورتِ ڈرائیور کا اشتہار دے رکھا تھا۔ یوں وہ بطور اسکول بس ڈرائیور بھرتی ہو گئی تھی۔ بوڑھا جان عام ڈرائیورز کے ساتھ بہت کھڑوس ہوتا تھا مگر نجانے کیوں ہمیشہ اس سے نرمی سے ہی بات کرتا تھا۔ کسی وقت میں اس نے اسے اپنے گھر کا نمبر دیا تھا جس کے باعث آج وہ اس سے رابطہ کر پائی تھی۔ نوشابہ بچوں کو لے کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جان نے اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور گاڑی کا رخ اپنے گھر کی جانب کر دیا۔ جلد ہی وہ اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا گھر کافی چھوٹا تھا مگر بیسمنٹ میں ایک کمرے کا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ بنا ہوا تھا، اس اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں ایک جانب چھوٹا سا کچن اور ایک جانب باتھ روم بنا ہوا تھا۔ ہال کمرے میں ایک سنگل بیڈ اور ایک ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک صوفہ اور ایک ٹی وی پڑا ہوا تھا، ایک جانب دیوار گیر کپڑوں کی الماری تھی۔ جان نے اس کا سامان وہاں رکھتے ہوئے اسے وہیں سو جانے کا کہا۔ بچے نئی جگہ اور ماحول سے خائف تھے مگر لیٹتے ہی سو گئے۔ البتہ نوشابہ کا ذہن کئی جہتوں میں سفر کرتا رہا۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی پر رونا آ رہا تھا کہ کشتی کا ناخدا ہی اسے ڈبونے کا باعث بنا تھا۔ اسے یہ سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ اس کے سر کے سائیں نے اسے ایک بے جان چیز کی طرح قمار بازی میں داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کے اور بچوں کے سر سے چھت تک چھین لی تھی۔ اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ فراز ایک بچھو تھا جس کی سرشت میں صرف ڈسنا ہی تھا۔

اس نے سختی سے آنسو صاف کیے اور فیصلہ کیا کہ اب اسے اپنے بچوں کے لیے ماں اور باپ دونوں بننا تھا۔ یہ سوچ کر اسے ایک ہمت اور سکون سا میسر ہوگیا اور وہ سوگئی۔ صبح اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی، وہ اور بچے نہا دھو کر جب اوپر آئے تو بوڑھا جان ان کے لیے ناشتا بنا رہا تھا۔ نوشابہ اور بچوں نے خاموشی سے ناشتا کیا اور پھر بچے گرم کپڑے پہن کر باہر برف میں کھیلنے چلے گئے۔ جان نے نوشابہ کو کافی کا کپ پکڑایا اور دونوں لیونگ روم میں آبیٹھے۔ نوشابہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کوئی بیسمینٹ کرائے پر مل جائے گی۔ میں ایک دو روز میں چلی جاؤں گی۔''

جان نے کافی پیتے ہوئے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''نوشابہ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تم ابھی کرایہ افورڈ نہیں کرسکتی۔ اگلے دو ماہ میں تمہاری ڈلیوری ڈیو ہے۔ تم دو چھوٹے بچوں اور ایک شیر خوار بچے کے ساتھ کیسے نوکری کروگی؟''

نوشابہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے جان نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھا دیا ہو۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں لے کر سسک پڑی۔

جان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ''تم کچھ عرصہ میری بیسمینٹ میں بطور کرایہ دار رہ سکتی ہو۔ میں تمہارے بچوں کا بھی خیال رکھ لیا کروں گا۔ اس دوران میں تم کوئی دوسری پارٹ ٹائم جاب کرلو۔ اس طرح تمہیں میٹرنٹی لیو پیسوں کے ساتھ مل جائے گی۔''

نوشابہ نے تشکر آمیز نظروں سے جان کو دیکھا۔ جان ہنس کر بولا۔ ''ایسے مت دیکھو۔ میں بھی انسان ہوں اور دل رکھتا ہوں۔ مجھے تم میں اپنی مرحومہ بیٹی میری دکھتی ہے۔ کاش اس وقت میں احساس کرتا تو میری بیٹی خودکشی نہ کرتی۔''

اس طرح نوشابہ اور بچوں کی زندگی کی گاڑی چل پڑی۔ نوشابہ اسکول بس ڈرائیونگ کے ساتھ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بھی نوکری کرتی۔ وہ ساتوں دن مشین کی طرح کام کرتی۔ اس کی غیر موجودگی میں بچوں کا خیال جان رکھتا۔ اس حادثے کے بعد ویسے بھی اس کے بیٹے سمجھدار ہوگئے تھے۔ ان کا بچپنا اور بے فکری جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔ آخر کار فروری کی ایک سرد صبح نوشابہ دردزہ سے اسپتال گئی اور وہاں اس نے ایک گل گوتھنی بیٹی کو جنم دیا۔ اس نے اس کا نام علینہ رکھا۔ ڈلیوری کے تیسرے دن وہ واپس گھر آگئی۔ اس سارے عرصے میں جان ایک بہترین دوست، مشفق بزرگ ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کا اور بچوں کا بھرپور خیال رکھتا۔ اس کے پیار میں ایک باپ کی فکر نظر آتی تھی۔ علینہ کی پیدائش کے بعد کچھ ماہ نوشابہ کام پر نہیں جاسکی۔ اس کے ہاتھ میں بطور الاونس ماہانہ رقم بھی قلیل آتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ایک سال گزرا تو نوشابہ نے نوکری پر جانا دوبارہ شروع کردیا۔ جان کے مشورے سے نوشابہ نے مانٹریال کی سٹی بس چلانے کا امتحان پاس کرلیا اور اس کی تقرری بطور ڈرائیور ہوگئی۔ اب اس کا سارا دن بس چلاتے گزرتا، مگر اس کی تنخواہ کافی بہتر ہوگئی تھی اور کچھ مراعات بھی مل گئی تھیں۔ علینہ کو وہ صبح ڈے کیئر چھوڑتی اور اپنی شفٹ شروع کرلیتی۔ اس کے بچے خود ہی پیدل اسکول جاتے اور آتے تھے۔ وقت سست روی سے گزرتا جا رہا تھا۔ شاید وقت کا چلن یہی ہے کہ اچھے وقت کے گزرنے کا پتا نہیں چلتا اور برا وقت گزر کر نہیں دیتا۔ نوشابہ کے بیٹوں کو بخوبی احساس تھا کہ ان کی ماں ان کے لیے کتنی محنت کرتی ہے۔ وہ بھی اپنے اسکول میں بہت محنت کررہے تھے۔ وہ اسکول سے آکر اس کی مدد بھی کرتے تھے۔ یوں ہی وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ایک دن جان سویا تو اٹھا ہی نہیں۔ نوشابہ ایک دفعہ پھر ایک شفقت بھری چھاؤں سے محروم ہوگئی۔ جان کی تدفین کے بعد اس کا وکیل نوشابہ سے ملنے آیا اور نوشابہ کو پتا چلا کہ وہ اپنا گھر اور تمام اثاثے اس کے نام کرگیا تھا۔ یوں نوشابہ کے سر پر چھت قائم رہی۔ سال پر سال گزرتے گئے اس کے بچے جوان ہوگئے، اب اس کا ایک بیٹا مشہور زمانہ سرجن تھا جب کہ دوسرا بیٹا انجینئر تھا۔ اس کی بیٹی اکاؤنٹنگ پڑھ رہی تھی۔ اب وہ ایک اچھا معیار زندگی انجوائے کررہی تھی۔ اب اسے اپنی تقدیر پر صبر آچکا تھا۔ سالوں بعد جب اس کے زخموں پر کھرنڈ آچکا تھا۔ آج فراز کی ہوم لیس سینٹر میں موجودگی نے اس کے زخم ہرے کردیئے تھے۔ اس کی خراب صحت اور بے سروسامانی بتا رہی تھی کہ وہ ایک ہارا ہوا جواری تھا۔ نوشابہ ماضی سے حال میں واپس آگئی اس نے اپنی آنکھوں سے نکلتے آنسو صاف کیے اور دکھی دل سے بولی۔ ''فراز! تھوہر کی فصل کاشت کرنے والا تھوہر ہی کاٹتا ہے۔ صرف سانس لینا زندگی کا نام نہیں ہے۔ آج تم زندہ ہوتے ہوئے بھی مردے سے بدتر حال میں تھے۔ تمہارے سگے بیٹے نے تمہیں دیکھ کر ان دیکھا کردیا۔ تم نے ایسی اندھی بازی کھیلی کہ تم اپنی زندگی بھی اس بازی کے نتیجے میں ہار گئے۔ افسوس صد افسوس......''

رات کا سکوت اس کی بات کی تائید کررہا تھا کہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔

++

ہم نشیں ٹھہرا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم……!
ایک سچ بیانی ارسال خدمت ہے لیکن استدعا ہے کہ اسے عقل کی کسوٹی پر نہ پرکھیں۔ ایسے لاتعداد واقعات ہم آپ نے دیکھے ہوں گے جس کی عقل توجیح نہیں دے سکتی مگر اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے۔

تنزیلہ احمد
(اوکاڑہ)

پہاڑوں اور وادی سمیت ہر شے اسے دعوت نظارہ دیتی تھی؛ اور وہ ہمیشہ کی طرح اس دعوت پر لبیک کہتی ہوا کے دوش پر آئے پیغام پر لبیک کہتی دھنک رنگ آنچل لہراتی دوڑی چلی آئی تھی۔ مسحور کن ہوا کی خوشگواریت اسے چھیڑ رہی تھی۔ یہاں کتنا سکون تھا۔ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی سدا بہار ہریالی، پتھریلی زمین پر کہیں کہیں بھوری گھاس، آسمان سے باتیں کرتے قد آور درخت اور انتہائی خوشنما و دیدہ زیب رنگوں کے پھول بوٹے۔

ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اس نے سانس بحال کی اور خود کو خوشبو کے حصار میں پایا۔ مانوس خوشبو کو لمبی سانس بھر کر اس نے اپنے اندر اتارا۔ تب ہی کانوں کے پاس محبت کی غماز گہری آواز سرسرائی۔ ''تم آ



گئی! میں جانتا ہوں میری ماہ رخ میرے بہت آس پاس ہے۔''

مسکراہٹ دباتی وہ چھپاک سے پتھر کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ ''تم کیسے جان لیتے ہو؟''

''بالکل ویسے ہی جیسے تم مخصوص مہک سے میری موجودگی محسوس کرلیتی ہو۔'' اس کی جھیل سی گہری آنکھوں کو اپنی سحر انگیز آنکھوں میں جکڑ کر جواب دیا گیا تو مزید سوال جواب اس کے اندر ہی کہیں دم توڑ گئے۔ اسے لگا وقت کا وہ حسین پل وہیں تھم گیا ہے۔ دبیز خاموشی کا راج تھا اور زماں و مکاں سے بے نیاز ایک دوسرے کو نہارتے ہوئے دو پریمی......

☆☆☆

وہ اسے کئی دنوں سے بغور جانچ رہی تھیں۔ اس کے اطوار میں آئے بدلاؤ انھیں بخوبی نظر آرہے تھے۔ گو کہ وہ بظاہر گھر کے کاموں میں مصروف تھی مگر بہت کھوئی کھوئی سی، وہاں ہو کر بھی وہاں نہ تھی۔ بلاوجہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی دیکھ کر انھوں نے اسے ٹوکا......

''ماہ، تمہارا دھیان کدھر رہتا ہے؟ پاگل ہو گیا جو اکیلی ہی بنا بات مسکرائی جارہی ہو......'' چند فٹ کے فاصلہ پر ہونے کے باوجود اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی۔

''ماہ......'' تیز آواز پر وہ ہڑبڑا کر ان کی طرف پلٹی۔ ہاتھ میں تھامی پلیٹ دھڑام سے زمین بوس ہوئی تھی۔

''افففف! تیری حواس باختگی میری سمجھ سے باہر ہے۔ کوئی عقل مت ہے تجھے کہ نہیں؟''

''کیا ہوا اماں؟ اب یوں چیخو گی تو میں بوکھلاؤں گی ہی...... پیار سے آواز بھی تو دے سکتی تھی ناں؟'' منہ پھلا کر کہتے ہوئے وہ صحن میں بچھے تخت پر ان کے ساتھ آبیٹھی۔ اب کے بوکھلانے کی باری اماں کی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھتے خوشبو کے جھونکے ان کے چاروں اور پھیل گئے تھے۔ ایسی مسحور کن خوشبو جو روم روم جکڑ لے۔

''کون سی خوشبو لگائی ہے تو نے؟ اور تیرے پاس یہ خوشبو آئی کہاں سے؟ تجھے ایک بار پہلے بھی منع کیا تھا کہ اتنی تیز خوشبو مت لگایا کر......'' ان کے گھر کنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور وہ اسے یک ٹک دیکھے گئیں۔

ہرے کانچ سی شفاف آنکھیں، بے داغ دودھیا چمکتی رنگت...... جسامت اور قد و قامت قابل رشک...... وہ سراپا حسن تھی۔ زیر لب آہستگی سے ''ماشاءاللہ'' کہہ کر انھوں نے اسے اپنے گلے سے لگالیا۔

''میری دھی تو بہت پاک اور معصوم ہے اور زمانہ بہت گھاگ...... محتاط رہا کر۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوتا اماں، تو میری فکر میں نہ گھلا کر۔'' ان کی آغوش میں چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے کہا تو انھوں نے اسے خفگی سے پرے دھکیل دیا۔

''بس تیری یہ ہی باتیں مجھے کھٹکتی ہیں۔ اللہ میں کیا کروں اس کا، کس ڈبی میں چھپالوں؟ ایک تو ہے نصیبوں ماری، نہ ماں باپ، نہ ہی کوئی بہن بھائی۔ میں بوڑھی جان اس کی رکھوالی کیسے کروں؟''

دادی نے ہی اسے پالا تھا وہ انھیں اماں پکارتی تھی۔ اپنی اماں کی روز کی دہائی کو چٹکیوں میں اڑا کر کھلکھلاتی ہوئی وہ کچن کی طرف چل دی...جب کہ اس کے ہر اٹھتے قدم پر ان کا دل ڈول رہا تھا۔

پہاڑی کے ہموار حصے پر بنے دو کمروں کے گھر میں صرف دو نفوس رہائش پزیر تھے۔ سالوں پہلے شمالی علاقہ جات کی زمین اتنی بری طرح لرزی تھی کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگئے، گھر ڈھے کر زمین بوس ہوئے اور کئی قیمتی جانیں نگل گئے۔

زلزلہ جیسی آفت وادی کے کئی گھروں پر قیامت بن کے ٹوٹی تھی۔ اس قیامت نے ماہ رخ سے اس کے والدین اور چھوٹا بھائی چھین لیا تھا۔ صد شکر کہ اسے دادی کا سہارا تھا ورنہ وہ پتا نہیں کس در پر رل رہی ہوتی۔

☆☆☆

کوئی مہینا ڈیڑھ بھر قبل جنگل میں لکڑیاں چنتے ہوئے ماہ کا سامنا اس سے ہوا تھا۔ چند دن اسے محسوس ہوتا رہا جیسے کام کرتے ہوئے وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی طاقت محسوس کرتی، کام خود بہ خود آسان ہو جاتے۔ پہاڑی راستے پر مشقت طلب کام کرنے کے باوجود نہ تھکن ہوتی اور نہ گھبراہٹ۔ اس دن وہ اپنے دھیان میں ہنستی کھیلتی چھڑی لہراتے ہوئے چلتی جارہی تھی کہ دیودار کے درختوں کے پیچھے اسے سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ چونکی ''کک، کوئی ہے؟ کون ہے وہاں؟ سامنے آؤ......''

آن کی آن میں درختوں کی اوٹ سے ایک چہرہ نمودار ہوا اور وہ اپنی جگہ پر جم گئی۔ ایسا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج سے پہلے تو اس نے کبھی یہ صورت وادی میں نہیں دیکھی تھی۔

"آپ...... کون ہیں؟" انتہائی خوبرو نوجوان کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ ماہ کو اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہی تھیں۔

"میں شہزاد ہوں۔" اس کی آواز کا جادو ماہ کی سماعتیں جکڑ چکا تھا۔

وہ روز ملنے لگے تھے۔ اس کے سنگ وقت تھم جاتا۔ وہ دنیاداری بھول جاتی۔ گھر میں دادی کے ساتھ ہو کر بھی وہ اس کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ ایک عجیب سی سرشاری اس کے پورے وجود کا احاطہ کیے رکھتی۔ دادی بہت کوشش کے باوجود بھی پوتی میں آئے بدلاؤ کی وجہ جاننے سے قاصر تھیں۔

گھر کے کام کرتے ہوئے وہ اسے خود سے باتیں کرتے، دھیرے دھیرے مسکراتے دیکھتیں تو ہول جاتیں۔ اس کی حالت پر وہ تشویش میں مبتلا ہوئیں اور عجیب وغریب سے خیالات نے دل میں گھر کر لیا تھا۔

"ہے بھی تو اتنی حسین اور جنگل میں آنا جانا بھی رہتا ہے۔"

وہ اسے باہر کے کام کرنے سے نہیں روک سکتی تھیں۔ ہاں ان کے پاس ایک علاج ضرور تھا۔ ماہ کو بتائے بنا انھوں نے پینے والے پانی کے برتن پر منزل پڑھ کر پھونکنی شروع کر دی تھی۔ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر وہ غیر محسوس طریقے سے ماہ پر پھونک دیتی تھیں۔

جب سے انھوں نے قرآنی آیات اس پر پھونکنا شروع کیں ماہ کی طبیعت میں چڑچڑاپن آنے لگا تھا۔ وہ نڈھال سی رہتی اور کبھی کبھی تو وہ انھیں ایسی اجنبی نظروں سے دیکھتی کہ ان کا دل کٹ کے رہ جاتا۔

☆☆☆

"ارے اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیسے ہماری کشمیری انار جیسی بچی سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے، نہ وہ رنگ روپ، نہ جوانی کی رونق۔" نچلی وادی سے اماں کی سہیلی اچانک ملنے آئی تھیں اور ماہ رخ کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔

"میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ اچھی بھلی ہوتی تھی۔ دنوں میں ہی کملا گئی ہے۔ پتا نہیں گم صم سی رہنے لگی ہے، کبھی دیکھوں تو خود کلامی کر رہی کبھی اکیلی مسکراتی رہتی ہے۔ اگر کبھی ٹوک دوں تو مجھے ایسی سرد اور اجنبی نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ لگتا ہے کہ میری ماہ ہے ہی نہیں۔"

"ہمم! مجھے لگتا ہے اس پر کوئی اثرات وغیرہ ہیں۔

کیمائس (Chamois)

ہرن کی طرح کا ایک جانور۔ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ قد میں بکری کے برابر لیکن پھرتیلا اس قدر کہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں میں رہتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو آسانی سے پھلانگ جاتا ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کی کھال سے کیمائس چمڑا بنتا ہے۔ جس سے دھاتی چیزوں کو پالش کر کے چمکایا جاتا ہے۔ نر اور مادہ اکتوبر اور نومبر میں اختلاط کرتے ہیں اور مئی اور جون میں بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک دن کے بعد ہی بچے اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اس عجیب جانور کی عمر طبعی 20، 25 برس ہوتی ہے چونکہ اس کے گوشت اور چمڑے کی مانگ زیادہ ہے' اس لیے اس کے شکار پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ کہیں معدوم نہ ہوجائے۔ شمالی ایران اور روس کا کیمائس عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حسین فرجاد، لاہور

پیر بابا کے پاس کیوں نہیں لے کر گئی؟"

"نہیں مانتی کیا کروں؟ چھوٹی بچی تھوڑی ہے جو گھسیٹ کر زبردستی لے جاؤں۔ خود سے کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونکتی رہتی ہوں اور عجیب بات ہے کہ تب سے یہ زیادہ بجھی اور حواس باختہ رہنے لگی ہے۔"

"تم میرے ساتھ چلنا۔ ہم اس کے لیے پیر بابا سے بات کر کے تعویز لائیں گے۔ اسے پہنا دینا ان شاءاللہ سب ٹھیک ہوجائے گا......" انھوں نے رازداری سے کہا تھا جب کہ کچن میں بیٹھی ماہ ان کی بات بخوبی سن اور سمجھ چکی تھی۔

☆☆☆

"ماہ! ماہ! میری بچی اٹھ بھی جاؤ۔" صبح سے وہ کئی بار اسے پکار چکی تھیں۔

دن کب کا چڑھ چکا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ انھوں نے اسے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی تو ہاتھ یکلخت واپس کھینچ لیا۔ اس کا وجود انگارے کی طرح دہک رہا

تھا۔

"یا اللہ! اسے کیا ہو گیا؟ رات کو تو ٹھیک سوئی تھی۔ ایک دم اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا......"

ان کے سامنے چارپائی پر انجانی آگ میں جلتی، ہولے ہولے دھڑکتے دل والی ماہ بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔

"کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میں کیا کروں؟"

گو کہ ماہ کچھ دن سے نڈھال اور عجیب سی ہو رہی تھی مگر ایسی حالت تو ان کے وہم و گمان میں بھی نا تھی۔ ابھی چند دن قبل تو وہ بابا جی سے اس کے لیے حفاظت کا تعویز بنوا کر لائی تھیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ بچی پر نادیدہ مخلوق کا سایہ ہے، سات دم ہوں گے، اکیس دن پڑھائی کریں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا مگر یہاں تو سب الٹا پڑ گیا تھا۔

"جلدی سے کسی بچے کو بھیجتی ہوں کہ وادی کے ڈاکٹر کو بلا لائے۔" بڑبڑاتے ہوئے متوحش سی وہ کمرے سے باہر جاتے ہوئے رک گئیں۔

ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی اور ایک عجیب سا احساس ان کے رونگٹے کھڑے کر گیا۔ ماہ رخ کے آس پاس سے انھیں وہی پُراسرار سی دھیمی دھیمی خوشبو اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہائے اللہ! ڈاکٹر کو بلاؤں یا بابا جی کے پاس جاؤں؟" وہ خود سے الجھی۔

کچھ سوچ کر چاروں قل کا ورد کرتی ہوئی وہ ماہ کے قریب چلی آئیں، اس کے گلے کو ٹٹولا اور دبک کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"میرے خدایا! تعویز کہاں گیا؟ میں نے خود اسے پہنایا تھا...... بابا جی نے کہا تھا کہ کسی بھی حالت میں تعویز نہیں اتارنا......"

ہمت جمع کر کے وہ باہر کی جانب تیز قدموں سے چل دی۔ انھیں بابا جی کو اطلاع کرنی تھی۔

☆☆☆

ماہ کو لگتا کہ زمانے گزر گئے ہیں انھیں ملاقاتیں کرتے ہوئے اور تعلق تو جیسے صدیوں پرانا تھا۔ ایک اس کا ہی ساتھ تھا جس نے اسے دنیا بھلا دی تھی۔

آج پھر وہ بنا ڈرے جھجکے اپنے شہزادہ عالم سے ملنے آ پہنچی تھی۔

گول شیشوں اور رنگین کڑھائی سے سجا سرخ فراک اس کے سراپا پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ پاؤں میں پہنی پائل کی مدھر تان ہر سو بکھر رہی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اسے دیکھتے ہی گنگناہٹ میں تبدیل ہوئی، ہوا نے درختوں کے پتوں سے سرگوشی کی اور مست ہو کر جھومنے لگی۔

وہ پہلے سے محو انتظار تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ جم گئی۔ ساری دنیا کی رنگینی و رعنائی اس کے شاہ زادے کی وجاہت و مردانگی کے سامنے ماند پڑ رہی تھی۔ اگر اس کا پیراہن دلہن جیسا تھا تو وہ بھی دولہا ہی لگ رہا تھا۔

"یہ ظالم سماج ہمیں کبھی ایک ہونے نہیں دے گا۔ مجھ سے محبت کرتی ہو ناں؟" کانوں کے انتہائی پاس سرگوشی ہوئی تو اس کا سر خود بخود اثبات میں ہلا۔ ماہ کی رضا مندی اسے مل چکی تھی۔

"تو پھر میرے ساتھ چلو گی؟" جزبات سے بوجھل آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور وہ موم کی طرح پگھل گئی، دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی اور آنکھیں بار حیا سے جھک گئیں۔ ایک مان سے اپنی طرف بڑھے ہاتھ کو تھامنے کے لیے وہ آگے بڑھی۔ سرشاری کے عالم میں اپنا آپ اسے سونپ کر ماہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ وہ کچھ بھی سنائی اور دکھائی دے رہا تھا جو آج سے پہلے اس کی نظروں کے عین سامنے ہو کر بھی اوجھل رہا تھا۔ ماہ کو لگا وہ کسی اور جہاں میں تھی۔

☆☆☆

پریشانی کے عالم میں پہاڑی راستہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا...... خوب مشقت کر کے وہ بابا جی کی رہائش تک پہنچی تو معلوم پڑا کہ وہ اہم کام نپٹانے دوسری وادی تک گئے ہیں، واپسی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ کیسا ستم ہوا کہ بابا جی وادی میں موجود ہی نہ تھے۔

وہاں سے وہ سیدھے ڈاکٹر تک پہنچی تھیں۔ اسے ساتھ لیے دوپہر میں جب وہ گھر داخل ہوئیں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ماہ کا بے حس و حرکت ٹھنڈا وجود ان کا منتظر تھا۔ ڈاکٹر نے سرسری سا چیک کیا اور تاسف سے نفی میں گردن ہلا دی۔ اس کے الفاظ ان پر بم کی مانند گرے تھے۔ "آپ نے بہت دیر کر دی۔ اسے شاید گردن توڑ بخار ہوا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا......"

دروازے کی دہلیز پکڑ کر وہ گرتی چلی گئیں۔ ان کے بڑھاپے کا واحد سہارا بھری جوانی میں انھیں بے آسرا کر گیا تھا۔ پُراسرار خوشبو ان کی ماہ رخ کو ہمیشہ کے لیے نگل چکی تھی۔

++

بولنا منع ہے

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم......!

ایک اور سچ بیانی ارسال کررہا ہوں گوکہ اسے مزاح کے انداز میں لکھا ہے مگر ہے دلچسپ ، آپ خود ملاحظہ کرلیں۔

ظفر حامد

(کراچی)



میں اسے جانتا بھی نہیں تھا لیکن اس نے میری جان کھا لی تھی۔

میں ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ میرے دوست ابھی تک نہیں آئے تھے۔ ہم اس ہوٹل میں روزانہ ہی بیٹھا کرتے تھے۔ ہم خیال لوگوں کا ایک گروپ بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان دنیا بھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ سیاست، تجارت، فلسفہ، شاعری، مذہب۔ غرض کہ ہر موضوع پر بات ہوا کرتی اسی لیے ہم میں سے ہر ایک شام کے بعد ہوٹل میں آکر بیٹھ جاتا۔ چائے چلتی رہتی۔ باتیں ہوتی رہتیں۔

اس دن میں ذرا جلدی آگیا تھا۔ میں نے اپنے لیے چائے منگوائی تھی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا کہ وہ میرے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ ہلکی ہلکی شیو لیکن بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ لباس بھی مناسب تھا۔

''آپ کو برا تو نہیں لگا۔'' اس نے بڑے مہذب انداز سے پوچھا۔

''کس بات کا؟''

''یہ جو میں پوچھے بغیر آ کر بیٹھ گیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں تو'' میں نے جواب دیا۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ ''جناب میں تو آپ کا شکر گزار رہوں گا... ورنہ اس دور میں مروت نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ نہ جانے انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مجھے بیٹھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا لیکن آپ نے تو میرا دل جیت لیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی کچھ اچھے لوگ باقی ہیں جہاں میں۔''

''نہیں۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے اپنی عادت کے مطابق مختصر سی بات کی۔

''ارے صاحب۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ نیکی کے کتنے درجے ہوا کرتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کی پیسوں سے مدد کر دی جائے بلکہ کسی سے خوش اخلاقی سے بات کر لینا بھی نیکی ہے۔''

''جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ پچھلے سال میں کراچی سے لاہور جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ بس رک گئی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں ٹرین سے کیوں نہیں گیا؟''

''نہیں کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''بہت سے لوگ بسوں سے سفر کرتے ہیں۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''آپ شاید بات ٹال رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''حالانکہ حیرت ہونی چاہیے کیوں کہ اس عمر میں بسوں کا سفر تکلیف دہ ہو جاتا ہے لیکن میرا شوق ذرا مختلف ہے۔ مجھے راستے کے مناظر سے لطف اندوز ہونا بہت اچھا لگتا ہے اسی لیے میں بسوں کے سفر کو پسند کرتا ہوں۔ شاید آپ کو نہ معلوم ہو کہ ڈیگال کو بھی بسوں کا سفر بہت پسند تھا۔ آپ سوال کریں گے کہ یہ ڈیگال کون تھا؟''

''جی نہیں میں نہیں پوچھوں گا۔'' میں چڑ کر بولا۔ ''کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھا۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ مجھے اس سے وحشت سی معلوم ہونے لگی تھی۔ شاید اس کو زیادہ بولنے کی بیماری تھی۔

جبکہ میں اس کے برعکس تھا۔ میں دوستوں کی محفل میں بھی زیادہ نہیں بولتا تھا... یا پھر اسی وقت بولتا جب کسی معاملے پر مجھ سے رائے لی جاتی... اور یہ بندہ تھا کہ بولے ہی چلا جا رہا تھا۔ اور وہ بھی بے تکی باتیں۔ جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب ڈیگال کا مجھ سے کیا تعلق؟

''دیکھیں آپ شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''جی نہیں، کس بات کی ناراضگی؟''

''تو پھر آپ کیوں نہیں بول رہے جبکہ میں اتنا بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ میری عادت ہے۔ میں کم بولتا ہوں۔''

''ارے یہ تو بہت اچھی عادت ہے۔'' وہ لہک اٹھا۔ ''بزرگوں نے کہا ہے کہ زیادہ بولنا بے وقوفی کی علامت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی بھی یہی سوچ ہو گی۔ کیوں کہ آپ ایک پڑھے لکھے انسان دکھائی دے رہے ہیں۔''

میرا دل چاہا کہ اسے جھڑک کر اٹھا دوں۔ اس نے تو انتہا کر دی تھی لیکن میں ایسا نہیں کر سکا کیوں کہ کچھ بھی ہو...' وہ ایک مہذب انسان دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس کو بولنے کی بیماری تھی تو وہ الگ بات تھی۔

''جناب۔ میری خواہش ہے کہ آپ کچھ اپنے بارے میں بھی بتائیں۔'' اس نے کہا۔ ''پلیز''

یہ اس نے اس انداز سے کہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بتانے میں کوئی حرج نہیں محسوس ہوا۔ میں نے بتانا شروع کیا۔

''جناب میرا نام ظفر حامد ہے اور میں...''

ابھی میں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ہوٹل کے باہر مجھے اپنا ایک دوست اظہر دکھائی دے گیا۔ اظہر بھی اسی محفل سے تعلق رکھتا تھا۔ یعنی ہوٹل والی محفل۔ اس کو دیکھ کر جان میں جان آ گئی تھی۔ وہ بھی کسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ... رہا تھا۔ میں نے اشارہ کیا کہ وہیں کھڑا رہے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

میں نے اس آدمی سے کہا۔ ''جناب مجھے معاف کریں۔ میرا دوست باہر کھڑا مجھے بلا رہا ہے۔'' میں نے اظہر کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں جا رہا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اظہر کے پاس آ کر میں نے کہا۔ ''یار فوراً یہاں سے نکل لو۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔'' میں اظہر کا ہاتھ تھام

کرا سے ہوٹل سے دور لے آیا۔
”خدا کے بندے۔ کیا بدحواسی ہے؟“
”یار، میں ایک چکر میں پھنس گیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔
”ایک بندہ ہے۔ خدا جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس سے میری کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا پھر اس نے جو بولنا شروع کیا تو میرا دماغ خراب کر دیا۔ پاگل ہو کر بھاگا ہوں۔“
”اور وہ باتیں کیا کر رہا تھا؟“ اظہر نے پوچھا۔
”کچھ بھی نہیں۔ فالتو کی بکواس۔ میں تو ذرا سی دیر میں خودکشی کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم دکھائی دے گئے ورنہ ہوسکتا ہے کہ میں اس کو مارنا شروع کر دیتا۔“
اظہر ہنس رہا تھا اور میری جان جل رہی تھی۔ بہرحال ہم بہت دیر کے لیے کسی اور ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔
جب واپس آئے تو وہ بندہ جا چکا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ہمارے دوسرے دوست بھی آ گئے... اور ہماری محفل جم گئی۔
دوسرے دن کی بات ہے کہ وہ کم بخت میرے گھر پہنچ گیا۔ ابھی صبح ہی ہوئی تھی۔ میں دفتر جانے کے لیے اپنے گھر سے باہر ہی نکلا تھا کہ وہ کسی آسیب کی طرح سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے دیکھ کر بھونچکا ہو گیا تھا۔ ”تم؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم کیسے آ گئے؟“
”ظفر صاحب۔ میں ہوٹل والوں سے آپ کا پتا معلوم کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ صبح صبح اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کہیں نکل نہ جائیں۔“
”لیکن کیوں؟ ایسی کون سی قیامت آ گئی تھی؟“ مجھے غصہ آنے لگا تھا۔
”آپ کو شاید اندازہ نہ ہو کہ دل کی خلش کیا ہوتی ہے۔ میں رات بھر اپنے آپ کو برا بھلا کہتا رہا کہ خدا کے بندے تو نے ظفر صاحب کا پورا تعارف کیوں نہیں حاصل کیا۔ اف۔ اس خلش کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ زندگی میں یوں تو اور بھی الجھنیں ہیں۔ اب ایک نئی الجھن لے کر کیا کروں۔ دو دن کی زندگی ہے۔ اس زندگی میں بھی اگر تو نے ایک شریف انسان سے تعارف حاصل نہیں کیا... تو ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک بار حکیم لقمان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ...“
”دیکھیے بھائی۔ میں اس وقت دفتر جا رہا ہوں... اور مجھے حکیم لقمان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ پلیز اس وقت مجھے جانے دیں۔“
میرا خیال تھا کہ میرے اس جملے کے بعد وہ ناراض ہو جائے گا لیکن اس کے برعکس اس نے خدا کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔ ”یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ اس نے کہا۔
”کس بات کا شکر ادا کر رہے ہیں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
”آپ ذرا اپنے جملے پر غور کریں۔ آپ نے یہ فرمایا کہ پلیز اس وقت مجھے جانے دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے مجھے اجازت دیدی ہے کہ اس وقت تو میں آپ کو جانے دوں لیکن آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں۔ کسی بھی وقت۔ سمجھدار کے لیے اتنا اشارہ ہی کافی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ میں پھر ملوں گا۔ خدا حافظ۔“
میں اس انوکھے انسان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جس طرح میرے پاس آیا تھا۔ اسی طرح ایک طرف چلا بھی گیا۔ عجیب ہی آدمی تھا۔
اس شام جب میں نے اپنے دوستوں کو یہ کہانی سنائی تو وہ سب ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔ ”واقعی یار۔ تمہارا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہوگا۔“
دو چار دنوں تک خیریت رہی۔ وہ دکھائی نہیں دیا۔
لیکن ایک دن ایک اور تماشا ہو گیا۔ میرے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ بہت معقول قسم کے لوگ تھے۔ میرے ہونے والے سسر کسی سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر تھے۔ بہت ہی باوقار قسم کی پرسنالٹی تھی ان کی۔ ایک صبح وہ راستے میں مل گئے۔ میری ہونے والی سسرال میرے فلیٹ کی بلڈنگ کے پاس ہی تھی۔ اسی لیے مکرم صاحب اکثر مل جایا کرتے تھے۔ گھر میں ملازم کے ہوتے ہوئے وہ صبح کے وقت سبزیاں لینے خود ہی آ جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا شوق تھا۔
اس صبح میں اپنے لیے حلوا پوری لینے نکلا تھا کہ مکرم صاحب مل گئے۔ میں نے سلام کیا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے کہ اچانک ایک آواز سنائی دی۔ ”ارے بھائی کہاں ہیں آپ؟“
میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی بندہ کھڑا تھا جس نے مجھے ذہنی بیمار کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے اخلاقاً اپنے ہونے والے سسر صاحب سے اس کا تعارف کروا دیا۔ بس مصیبت ہی ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر بولنا شروع کر دیا۔ ”جناب۔ میں اسی لیے تو آپ کا احترام کرنے لگا ہوں کہ آپ اپنے بڑوں کا احترام کرتے ہیں... ورنہ اس دور میں کون

اپنے سسر کو لفٹ دیتا ہے۔ میں بتاؤں ایک بار میرے ساتھ کیا ہوا۔ یہ واقعہ اب سے پانچ چھ سال پہلے کا ہے۔ میں ایک دن کسی کام سے مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا۔ جو کہ......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دیکھیں صاحب۔ اس وقت ہم لوگ کوئی ضروری بات کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے شام میں مل لیں۔"

لیکن وہ اتنی آسانی سے کہاں جانے والا تھا۔ اس نے میری بجائے مکرم صاحب سے کہا۔ "جناب۔ یہ ہے صورتِ حال۔ انسان نہ جانے اتنا تلون مزاج کیوں ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ گھنٹوں ایک دوسرے کی باتیں سنتے رہتے تھے۔ کیا مجال کہ ماتھے پر شکن بھی آجائے اور ایک یہ زمانہ ہے کہ ذرا دیر کھڑا رہنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ تو میں یہ بتا رہا تھا کہ مارکیٹ میں میرے ساتھ کیا ہوا۔"

اس وقت مکرم صاحب نے ہمت دکھائی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آؤ میاں۔ ذرا میرے ساتھ چلنا۔ ایک ضروری کام ہے۔" پھر اسی پھرتی سے انہوں نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ "اچھا بھائی۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔ اس وقت ہم ضروری کام سے جا رہے ہیں۔"

میرا ہاتھ تھام کر انہوں نے تیز تیز ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں بھی ان کا ساتھ دینے لگا کیوں کہ میں تو خود ہی پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

"کیوں میاں۔ کون تھا یہ آدمی؟" مکرم صاحب نے کچھ دور آنے کے بعد پوچھا۔

"کیا بتاؤں انکل۔ اس نے تو میری جان عذاب کر رکھی ہے۔" میں نے کہا۔ "زبردستی گلے پڑ گیا تھا اور میں اس سے بھاگتا پھر رہا ہوں۔"

"میاں ایسے لوگ وقت برباد کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان سے جان چھڑا لو۔"

"جی ہاں۔ اب تو یہی کرنا ہوگا کہ سختی سے منع کر دوں اس کو۔"

میں نے اظہر سے جب یہ واقعہ بیان کیا۔ تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "بھائی۔ اب تمہیں اس کے لیے کوئی حکمت عملی اپنانی ہو گی۔" اس نے کہا۔

"بتاؤ۔ کیا کروں اس کا علاج؟"

"ایک طریقہ ہے۔ تم اس سے بھی زیادہ بولنا شروع کر دو۔" اس نے بتایا۔ "اتنا بولو۔ اتنا بولو۔ کہ وہ بوکھلا کر بھاگ جائے۔"

"ہاں یہ تو میں کر سکتا ہوں۔ حالانکہ زیادہ بک بک کرنا میرے مزاج کے خلاف ہے۔ لیکن ایسے بندے سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب تو کرنا ہی ہوگا۔ اب سامنے آجائے تو میں اس کو بتاتا ہوں کہ بولنا کس کو کہتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بولو گے کیا؟"

"اس کی پرواہ مت کرو۔ دانشوروں کی صحبت میں بیٹھ کر اتنا تو آ ہی گیا ہے کہ اس کی زندگی حرام کر دوں۔"

اس کی بدقسمتی تھی یا میری خوش قسمتی وہ مجھے دوسرے ہی دن مارکیٹ میں دکھائی دے گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو اس کی بیوی معلوم ہو رہی تھی۔

وہ دونوں سبزیاں خرید رہے تھے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ "ارے جناب کہاں تھے آپ؟" میں نے کہا۔ "میں تو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ آپ کو کیا معلوم کہ یہ تلاش کیا چیز ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہوا یوں کہ میں ایک دن اپنے ایک دوست سے ملنے لاہور گیا۔ اس کا مکان پرانی انار کلی میں تھا۔ انار کلی تو دیکھی ہو گی آپ نے۔ ارے صاحب کیا بتایا جائے۔ اس کے ہر گھر میں تاریخ بولتی ہے۔ کیا کیا نہیں ہے وہاں۔ آپ اگر دہلی گیٹ سے اندر جائیں تو سب سے پہلے دائیں ہاتھ پر ایک مسجد دکھائی دے گی۔ میں اس مسجد کے بارے میں بتاؤں کہ وہ مسجد ایک زمانے میں..."

وہ بوکھلا گیا تھا۔ وہ جی جی کرتا رہا۔ اس کی بیوی بھی حیران اور پریشان ہو رہی تھی۔

میں نے ذرا سانس لی تو وہ بول پڑا۔ "ظفر صاحب۔ میں اس وقت اپنی مسز کے ساتھ ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔"

"جی ہاں۔ ملاقات تو ہونی ہے۔ کیوں کہ یہ دنیا بہت مختصر ہے۔ آپ کہیں بھی جائیں راستے ایک ہی طرف نکلتے ہیں۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ حکیم لقمان اپنے مالک کے لان میں پانی دے رہے تھے کہ ایک مسافر چلتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔ اس کے پاس گھوڑا بھی نہیں تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اس زمانے میں سفر پیدل ہی ہوا کرتا تھا۔ تو اس مسافر نے پوچھا کہ جناب فلاں جگہ کتنی دور ہے۔ تو اس حکیم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور لان میں پانی ڈالنے میں

انتبــــــاہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تا کہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

مصروف رہا۔"
"دیکھیں جناب۔ میں اس وقت اپنی مسز کے ساتھ ہوں۔آپ مجھے بعد میں بتایئے گا۔"
"یہ کیسے ہوسکتا ہے جناب۔آپ جانتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ بعد میں ملاقات ہوگی۔اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ملنا نہیں چاہتا۔میں ایک بار کا واقعہ بتاؤں ہوا یہ کہ میرے ایک ماموں ہوا کرتے تھے۔ وہ افیم کھاتے تھے۔یہ افیم بھی بہت عجب نشہ ہوتا ہے۔انسان کو بے حس کر کے رکھ دیتا ہے۔اس کی کاشت جن علاقوں میں ہوا کرتی ہے وہاں اسے ڈوڈا کہتے ہیں۔اس سے بہت سی چیزیں بنتی ہیں۔"
میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر بے بسی کے آثار تھے۔میں دل ہی دل میں اس کی حالت دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔اس نے میری زندگی تلخ کی تھی۔اس وقت میں اس کو برباد کر رہا تھا۔
اچانک اس کی بیوی مجھ سے مخاطب ہوگئی۔" بھائی صاحب اس وقت ہم پر رحم کریں۔جانے دیں ہمیں۔"
"بھابی۔اس وقت آپ نے اس بے رخی کا ثبوت دے کر اچھا نہیں کیا۔شاید آپ کو نہ معلوم ہو کہ میں نے کس انداز کی زندگی گزاری ہے...اور آپ کے یہ شوہر صاحب کس بلا کے آدمی ہیں۔میں نے ان میں کئی خوبیاں دیکھی ہیں وہ اس زمانے میں کہاں۔"
لیکن ان دونوں نے میری بات ہی نہیں سنی۔اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما اور بہت تیزی سے اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں اس طرح مڑ مڑ کر میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی بلا ان کے پیچھے لگ گئی ہو۔ پھر جب وہ میری نگاہ سے اوجھل ہوگئے تو میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک ہنستا رہا تھا۔میں نے اس کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔اُمید تھی کہ اس سے جان چھوٹ گئی ہے۔یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔جو میں نے حاصل کر لی تھی۔
میں کہیں اور جانے کی بجائے اظہر کے گھر کی طرف چل دیا۔اسی نے مجھے جان چھڑانے کی یہ ترکیب بتائی تھی۔اظہر گھر پر ہی تھا۔مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوگیا تھا۔کیوں کہ عام طور پر ہم شام کو ہوٹل ہی میں ملا کرتے تھے۔
"ارے......آؤ یار۔" وہ خوش ہو کر بولا۔"ویسے خیریت تو ہے نا۔"اس نے پوچھا۔
"ہاں ہاں۔بالکل خیریت ہے۔" میں نے بتایا۔"میں تو اس لیے آیا تھا کہ تمہیں آج کی روداد سنا دوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ مرحلہ اتنا آسان بھی ہوسکتا ہے۔اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی...اور میں نے اسی وقت اسے پکڑ لیا۔کیا بتاؤں اس کی بیوی کتنی اچھی صورت شکل کی ہے۔اس کی ستواں ناک قیامت کی ہے...اور اس کے ہونٹ بھینچنے کا انداز اور بھی غضب کا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان خود خوبصورت نہیں ہوتا...بلکہ اس کی عادتیں اسے خوبصورت کر دیتی ہیں۔اس سلسلے میں قلوپطرہ کا ایک قول سننے کے قابل ہے۔"
"بھائی۔تم تو اس کے بارے میں بتاؤ۔اس کے ساتھ کیا ہوا۔تم تو ایک کہانی لے کر بیٹھ گئے۔"
"وہی تو بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔"کہانی کچھ یوں ہے کہ تم جانتے ہو کہ میں اکیلا آدمی ہوں۔اپنے کھانے خود ہی بنایا کرتا ہوں۔ ہوٹل کے کھانے مجھے پسند نہیں ہیں۔ایک بار میرے ساتھ ایسا ہوا کہ میں نے بندر روڈ کے ایک ہوٹل میں کھانا کھا لیا تھا۔اب کیا بتاؤں ...کیا ہوا تھا میرے ساتھ ڈائیریا ہوگیا تھا۔خدا کی پناہ۔کیا بیماری ہے۔میرے دوست بندے کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔پتا ہی نہیں چلتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ایک بار روم میں یہ مرض وبائی صورت اختیار کر گیا تھا۔"
لیکن میں اظہر کو اس سے زیادہ نہیں بتا سکا۔کیوں کہ اس نے دروازہ بند کر لیا تھا...اور میں باہر ہی کھڑا رہ گیا تھا۔
پتا نہیں کیوں۔اظہر کا یہ رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔میں تو اس کا گہرا دوست تھا لیکن اس گہرے دوست کو کیا ہوا تھا۔
صرف اسی کو نہیں بلکہ سب کو۔ ہر ایک کا یہی حال تھا۔میں جب کسی کو کچھ سمجھانے لگتا تو وہ میرے پاس سے اٹھ کر چل دیتا۔ایک دن میں نے خود اپنا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ میں بھی بہت بولنے لگا ہوں۔خدا جانے میں نے یہ عادت کہاں سے اپنالی تھی۔انسان کو اتنا بھی نہیں بولنا چاہیے لیکن کیا کروں۔ کسی کو دیکھتے ہی زبان میں الجھن ہونے لگتی۔دل چاہتا کہ بس بولتا ہی رہوں۔بولتا ہی رہوں۔
اور اسی لیے میں تنہا ہو کر رہ گیا ہوں۔ہوٹل والے دوست بھی جان چھڑا کر نکل جاتے ہیں۔
اور آپ جانتے ہیں ان دنوں میرا سب سے گہرا دوست کون ہے؟ جی ہاں وہی جس سے میں جان چھڑایا کرتا تھا۔ہم نے ایک کمپرومائیز سا کر لیا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو میں سنتا ہوں...اور جب میں بولتا ہوں تو وہ سنتا ہے۔اچھی گزر رہی ہے دل خود کفیل سے۔
++



دوڑ

مکرمی مدیر سرگزشت
السلام علیکم……!
میں کوئی رائٹر نہیں ہوں لیکن بچپن سے ناول کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے۔ گزشتہ دنوں سرگزشت میں ایک ایسی سچ بیانی پڑھی جس نے مہمیز کیا کہ میں بھی اپنے ایک ادھورے عشق کی داستان قارئین سرگزشت کو سناؤں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔
منیر الحسن
(سرگودھا)

ایک دوڑ لگی ہوئی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان۔

وہ دوڑ تھی ایک لڑکی کے حصول کی۔ اس کا نام صحیفہ تھا۔ بہت خوبصورت اور اسٹائلش لڑکی تھی۔ اس کا نام بھی اسی کی طرح خوبصورت تھا۔

زمان بھی اس کا طلب گار تھا اور اتفاق سے مجھے بھی وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

ایک تیر سا تھا جو اس کو دیکھتے ہی سینے پر چل گیا تھا۔

ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب عشق اپنا کمال دکھاتا ہے تو پھر ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی ہے۔ محبوب ایک طرف ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس کالج میں اس سے بھی زیادہ

خوبصورت لڑکیاں ہوں۔ اس سے بھی زیادہ اسٹائلش ہوں۔ اس سے زیادہ تر و تازہ اور خوشبوؤں سے مہکی ہوئی ہوں لیکن صحیفہ کی بات ہی اور تھی۔

وہ بھی کچھ ایسے ہی مزاج کی تھی۔ وہ ہم دونوں ہی کو وقت دیا کرتی۔ یونیورسٹی میں کبھی میرے ساتھ ہوتی کبھی زمان کے ساتھ اور کبھی ہم دونوں کے ساتھ۔

ہم تینوں چونکہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے اسی لیے ہم نے کبھی ایک دوسرے سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن ایک بار ایسا ہو گیا کہ میں نے باقاعدہ رقابت محسوس کی۔

ایک شام میں نے ان دونوں کو ایک شاپنگ سینٹر میں دیکھ لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بہت خوش نظر آرہے تھے۔

حالانکہ یہ کوئی ایسی .... نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی میں کئی بار ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ چکا تھا اور کئی بار زمان نے بھی مجھے صحیفہ کے ساتھ دیکھا ہو گا لیکن مزاج اور موڈ کا کیا بھروسا ہوتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس شام مجھے ان دونوں کا ساتھ اچھا نہیں لگا۔

شاید ایسا ہی ہوتا ہو۔ جب کوئی چیز قریب یا دسترس میں ہوتی ہے تو اس کی اہمیت اتنی محسوس نہیں ہوتی لیکن جب اس کے چلے جانے کا دھڑکا لگ جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ارے یہ تو میری زندگی کے لیے بہت اہم ہے۔ میں تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی میں ایک درخت کے نیچے خاموش بیٹھا تھا کہ صحیفہ مجھے تلاش کرتی ہوئی آگئی۔ ''ارے احمد...... یہاں بیٹھے ہو؟ میں نے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کیا۔''

''خیریت؟'' میں نے روکھے لہجے میں سوال کیا۔ ''ایسی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

''یار تمہارے ساتھ مارکیٹ جانا ہے۔'' وہ میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ''کل میں زمان کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن اس نے تو بور کر دیا۔''

اچانک ایسا لگا جیسے ہوا کا کوئی تازہ جھونکا مجھے چھوتا ہوا گزر گیا ہو، یا بارش کے بعد سب کچھ نکھر گیا ہو۔

میں نے لہک کر کہا۔ ''کیوں نہیں؟ کتنی دیر میں چلو گی؟''

''دیر کیسی بس چل دو۔''

ہم دونوں اس طرف آگئے جہاں میں اپنی گاڑی کھڑی کیا کرتا تھا۔ اس دن اس نے نہ جانے کیا کیا الم غلم شاپنگ کی تھی۔ اس کے بعد اس کو لے کر ایک ہوٹل میں آگیا۔ یہ ہمارا پسندیدہ ہوٹل تھا۔ ہم اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ کبھی ہم تینوں یا ہم دونوں۔

میں نے جب کافی کا آرڈر دے دیا تو صحیفہ نے کہا۔ ''احمد! تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''مجھے بھی تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے لیکن پہلے تم بتاؤ۔''

''یار، کل زمان نے مجھے پروپوز کیا ہے۔'' وہ بولی۔

اس نے تو یہ سرسری طور پر کہا تھا لیکن میرے لیے تو یہ ایسا تھا جیسے میرے سر پر بم پھٹ گیا ہو۔

''خیر تم بتاؤ۔ تم کو کیا بات کرنی تھی۔'' اس نے پوچھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ مجھے بھی یہی کہنا تھا تو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ ہنس پڑی اور دیر تک ہنستی ہی چلی گئی۔ ''واہ۔ یہ تو خالص فلمی سچویشن ہو گئی۔'' اس نے کہا۔ ''مزہ آگیا۔ کیا کہتے ہیں اس کو۔ رقیب روسیاہ۔ ہے نا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ روسیاہ کون ہے۔ تم دونوں تو اچھے خاصے فیئر ہو۔ گورے رنگ والے۔''

''مذاق اڑا رہی ہو؟''

''نہیں یار۔ اس فلمی سچویشن پر ہنس رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یقین کرو۔ اگر کوئی ایسا قانون ہوتا کہ میں تم دونوں سے شادی کر سکتی تو دونوں سے کر لیتی لیکن مجبوری ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ سنا ہے کسی زمانے میں ڈوئیل لڑی جاتی تھی۔ اب تو خیر اس کا دستور نہیں ہے۔ یہ اچھا ہی ہے۔''

''یار میں تیری خاطر یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ''کیسی باتیں کرنے لگے ہو؟''

''کیوں ان باتوں میں کیا برائی ہے؟ یہ سب تو نیچرل ہے۔ کوئی بھی کسی کو پسند کر سکتا ہے اور تم تو شروع سے میری پسند رہی ہو۔''

''کچھ ایسی ہی باتیں زمان بھی کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔

''تم اپنا بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہیں ہم دونوں

میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو کس کا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''صاف صاف بتادوں''

''ہاں۔ ہاں۔ میں بھی صاف صاف سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا......؟'' میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔''

''کیا کسی اور کو پسند کرتی ہو؟''

''ہاں......اس نے بتایا۔ وہ تم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے اور ہم شاید بہت جلد ایک بھی ہو جائیں۔''

''صحیفہ۔تم نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔''

''میں نے تو زمان کو بھی نہیں بتائی۔'' اس نے کہا۔ ''دیکھو۔ بات یہ ہے کہ محبت ڈھنڈورا پیٹ کر نہیں کی جاتی۔ یہ ایک امانت کی طرح ہوتی ہے۔ اس کی دل میں رکھ کر حفاظت کی جاتی ہے اسی لیے تم دونوں کو پتا نہیں چل سکا ہوگا اور جہاں تک دوستی کا سوال ہے تو تم دونوں ہمیشہ میرے دوست رہو گے۔''

میں ایک دم سے بجھ کر رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے تمہارا چہرہ کیوں اتر گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''کم از کم اس خوش نصیب سے ملاقات تو کروادو۔'' میں نے کہا۔

''جب شادی میں آؤ گے تو خود ہی دیکھ لو گے۔''

''کیا شادی بھی ہونے والی ہے؟''

''ہاں، بہت جلد۔ اس کے گھر والے بہت زور دے رہے ہیں کہ دو تین مہینوں میں شادی ہو جائے۔''

میں بہت اداس سا واپس آیا تھا۔ اس نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اب کہنے کو رہ کیا گیا تھا۔ میں نے صحیفہ کے حوالے سے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے اور ہو سکتا ہے کہ ایسے ہی خواب زمان کے بھی ہوں۔

میں اور زمان ایک ہی محلے کے تھے۔ ہم دونوں کا بچپن بھی ایک ہی جیسا تھا۔

محلے کے پاس ایک ریلوے لائین تھی جس کی دوسری طرف ایک میدان تھا۔ ہم بچے اسی میدان میں جا کر پتنگیں اڑایا کرتے تھے۔ بہت مزہ آتا تھا اور جب ٹرین کی سیٹی سنائی دیتی تو ہم سب پتنگوں کو چھوڑ کر پٹڑی کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے اور چھک چھک کرتی ریل کو گزرتے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی مسافر بھی ہماری طرف ہاتھ ہلا دیتا اور ہم خوش ہو جاتے۔

کیسی خوشی تھی۔ جب پتنگوں سے اکتا جاتے تو کوئی اور کھیل شروع کر دیتے لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ مغرب سے پہلے گھر واپس آجائیں۔ چھوٹا سا علاقہ تھا۔ مدنا پور۔ ہم وہیں کے رہنے والے تھے۔

میرے ابو پانی کے محکمے میں کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ جو بارش ہوتی ہے تو یہ پانی بھی ابو بادلوں کو لا کر دیتے ہیں اسی لیے میں اکثر ضد کرنے لگتا تھا کہ ابو بارش کیوں نہیں کراتے۔ اتنے دن ہو گئے۔

زمان کے ابو کی دکان تھی پرچون کی۔ ہمارے یہاں کا سامان بھی ان ہی کی دکان سے آیا کرتا تھا۔

تو ہم نے اسی طرح ایک ساتھ زندگی گزاری۔ میٹرک بھی ایک ساتھ کیا۔ کالج میں بھی ایک ساتھ ہی داخلہ لیا۔ ہمارے دکھ اور سکھ ایک تھے...... ہمارے خواب ایک ساتھ تھے۔

ہماری محبتیں دوسروں کو رشک میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

پھر یہ ہوا کہ ہم نے صحیفہ کو دیکھ لیا۔ ایک ایسی لڑکی جس کو حاصل کرنے کی ہر کوئی خواہش کر سکتا تھا۔ ہم بھی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

وہ ایک بے تکلف سی لڑکی تھی۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ہی اسے پسند کرتے ہیں۔

میرے اور زمان کے درمیان اسے حاصل کرنے کی ایک دوڑ سی لگ گئی تھی۔ بظاہر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم تینوں ہی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔ ایک ساتھ ایکٹیویٹی کرتے۔ ایک ہی ساتھ کینٹین جا کر چائے پیتے۔

انتہا یہ تھی کہ ہم کپڑوں کے رنگ بھی ایک دوسرے کی پسند کے انتخاب کیا کرتے تھے۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔ ''یار مجھے مردوں کے جسم پر سفید رنگ بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک وقار سا ہوتا ہے۔ سفید ویسے بھی پاکیزگی کی علامت ہے۔''

لطف یہ ہے کہ دوسرے دن ہم تینوں ہی سفید لباس پہن کر آئے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے رہے تھے۔ زمان نے پوچھا۔ ''صحیفہ اب تم نے کیوں سفید پہن لیا؟''

"میں نے سوچا کہ تم دونوں تو سفید پہن کر آؤ گے ہی تو کیوں نا میں بھی تمہارا ساتھ دوں۔"

"تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ ہم تمہاری بات پر عمل کریں گے؟"

"اس لیے کہ تم دونوں نے ہمیشہ میری بات مانی ہے۔" اس نے کہا۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے آج تک اس کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں زمان کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے تو اس ایک شعر بھی سنا دیا تھا۔

تو جان بھی مانگے تو میں ہنس کر تجھے دے دوں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی

میں نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا تھا کہ اگر میں نے شادی کی تو اسی سے کروں گا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار رنگ بھرے تھے... ورنہ زندگی میں تھا ہی کیا۔

میں نے ایک عام سے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ غریب والدین تھے لیکن ان میں اولاد کو تعلیم دلانے کا حوصلہ تھا۔ میرے بعد دو اور بھائی اور ایک بہن تھی۔ وہ سب تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

میرے ابو کی یہ خواہش تھی کہ ان کی اولادیں خوب تعلیم حاصل کر لیں تا کہ یہ بے رحم معاشرہ انہیں احترام کے ساتھ دیکھے اور یہی حال زمان کے گھر کا تھا۔ اس نے بھی کچھ اسی قسم کی زندگی گزاری تھی۔

ہم دونوں جوان تو ہو گئے تھے لیکن ہم دونوں کی زندگی میں ایک اہم عنصر کی کمی رہ گئی تھی اور وہ تھا رومانس۔ حالات نے ایسا باندھ کے رکھا تھا کہ اس طرف دیکھنے یا سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

جب بڑے ہوئے تو محلے کی دو تین لڑکیوں نے التفات تو کیا لیکن ہم ان کی طرف راغب ہی نہیں ہو سکے۔ اس لیے نہیں کہ وہ عام گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں... بلکہ اس لیے کہ ان میں سے کسی سے بھی ہم ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں تھے۔ انسان تعلیم حاصل کر لے تو کم از کم اس کا ذوق تو بدل ہی جاتا ہے۔

پھر ہمیں صحیفہ دکھائی دے گئی۔ ہمیں سے مراد یہ ہے کہ ہم دونوں نے اسے ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔ اس وقت ہم کینٹین سے باہر کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شدید گرمی تھی۔ ایک بڑا سا درخت تھا۔ جس کے نیچے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔

ہم کالج کی لڑکیوں پر تبصرے ہی کر رہے تھے کہ صحیفہ دکھائی دے گئی۔ وہ ایک اور لڑکی کے ساتھ سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ ہم دونوں ہی اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی پرسنالٹی کی چھاپ پہلی ہی نگاہ میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔

"یار کون ہے یہ لڑکی؟" میں نے زمان سے پوچھا۔

"میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔" اس نے کہا۔ "پہلی بار دیکھ رہا ہوں، لیکن نائیلہ سے پتا چل جائے گا۔"

"کون نائیلہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو اس کے ساتھ بیٹھی ہے۔ اس کو میں جانتا ہوں۔ وہ سوشیالوجی میں ہے۔ میرا دوست ہے نا اسلم اس کی دوست ہے۔"

اس دوران اتفاق سے نائیلہ کی نظر ہم دونوں پر پڑی.... وہ زمان کو جانتی تھی اسی لیے اس نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔ زمان نے اشارے سے اسے بلا لیا۔ وہ ہمارے پاس آ گئی۔

"ہیلو...... کیسے ہو تم؟" اس نے زمان سے پوچھا پھر میری طرف مڑ کر بولی۔ "تم کیسے ہو؟"

نائیلہ کسی حد تک مجھے بھی جانتی تھی۔

"یار یہ بتاؤ۔ یہ قیامت کون ہے؟" زمان نے پوچھا۔

"اس قیامت کا نام صحیفہ ہے۔" نائیلہ نے بتایا۔

"اور یہ صحیفہ کہاں اترا ہے؟" اس بار میں نے پوچھا۔

"انگلش ڈیپارٹمنٹ میں۔" نائیلہ نے بتایا۔

اس کے بعد اتفاق ایسا ہوتا رہا کہ ہم تینوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ میں زمان اور صحیفہ۔ ہم تینوں اپنی اپنی فیکلٹی سے باہر آتے تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ نظر آتے۔ کیا خوبصورت دن تھے۔

رفتہ رفتہ میں صحیفہ کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی توجہ میری ہی طرف ہے۔ زمان سے اس کی صرف دوستی ہے لیکن اس شام جب میں نے اسے زمان کے ساتھ دیکھا تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ شاید میں نے اظہار میں دیر کر دی تھی... اور زمان بازی لے گیا تھا۔ اسی لیے میں نے صحیفہ سے وہ بات کر دی تھی جو میرے دل میں تھی۔ یعنی اس کو اپنانے کی بات۔

لیکن صحیفہ نے جو کچھ کہا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ہی شاید بے وقوف تھا جو اب تک نہ جانے

کس اُمید پر اس کا انتظار کیے جارہا تھا اور صحیفہ کیسی لڑکی تھی جس نے آج تک ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔

میں نے دوسرے دن زمان کو بتایا۔ ''یار، یہ صحیفہ تو چھپی رستم نکلی۔''

''وہ کیوں؟''

''اس نے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہے۔''

''ہاں یار۔ اس نے یہ بات مجھے بھی بتائی ہے۔'' زمان کا لہجہ مرجھایا ہوا تھا۔ ''بہر حال ہمیں کیا۔ ہم تو اس کی اچھی زندگی کی دعا ہی کرسکتے ہیں۔''

وقت گزرتا چلا گیا۔ ہم نے اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ اس کے بعد ہماری راہیں الگ ہوگئیں۔ ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی کسی محکمے میں چلا گیا۔ کوئی بیرونِ ملک چلا گیا۔ کسی کے ساتھ کچھ ہوگیا۔ کسی نے شادی کرلی۔ ہوتا بھی یہی ہے۔ کالج یونیورسٹی تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کا گروپ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ گھومنا۔ کینٹین میں بیٹھ کر چائے پینی۔ گپ شپ کرنی۔ ایک دوسرے کے ساتھ آؤٹنگ کرنی... اور نہ جانے کیا کیا' پھر وقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ کردیتا ہے۔ بہت کم ایسے ہوتے جن سے دوستی اس کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔

ہم الگ ہوگئے۔ یہاں ہم سے مراد ہے کہ صحیفہ کی شادی ہوگئی۔ میں نے ایک بینک میں ملازمت کرلی۔ زمان نے اپنا کاروبار شروع کردیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم دونوں کی بھی شادیاں ہوگئیں۔

ایک بات اور کہ میری اور زمان کی دوستی برقرار رہی۔ اپنی اپنی شادی کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست رہے۔ ہماری بیویاں ایک دوسرے کی دوست ہو گئیں۔

ہفتے میں کم از کم ایک دن ہم ایک دوسرے کے گھر ضرور جاتے تھے۔

ہماری بیویاں بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔ صحیفہ کبھی کبھی یاد آجایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ بیرونِ ملک چلی گئی تھی۔ اس نے ایک بار فون کرکے بتایا تھا کہ اس کی بھی زندگی خوش گوار گزر رہی ہے۔

پھر بہت دنوں کے بعد شاید سات یا آٹھ برسوں کے بعد ایک شام اچانک میں نے ایک مارکیٹ میں صحیفہ کو دیکھ لیا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا اور ایک پیاری سی بچی بھی تھی۔

ہم اچانک ایک دوسرے کے سامنے آگئے تھے۔ ہم نے ایک ہی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ صحیفہ ابھی تک ویسی ہی تھی جیسا ہم نے دیکھا تھا۔ اس کی تازگی اور شگفتگی پہلے کی طرح تھی۔

''اوہ منیر۔ تم؟ مائی گاڈ۔ یہ تم ہی ہو نا؟''

''ہاں، میں ہی ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے اس آدمی سے میرا تعارف کروایا۔ ''ان سے ملو۔ یہ میرے شوہر ہیں، جنید اور یہ میری بچی ہے سارہ۔''

ہم کچھ دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پتا چلا کہ وہ لوگ بس کچھ ہی دنوں کے لیے پاکستان

گردوں کی صفائی (Dialysis)

ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے مریض جب بے ہوش ہوجاتا ہے تو اسے کم کرنے کے لیے مریض کے گردے صاف کردیئے جاتے ہیں۔ یہ بڑا نازک اور مشکل عمل ہے۔ اس عمل کے ذریعے گردوں کو خالص محلول سے صاف کرکے فاسد اور زہریلا مادہ خارج کردیا جاتا ہے، جو گردوں کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے پیٹ میں جمع ہوجاتا ہے۔ گردوں کی صفائی کے دو طریقے ہیں، ایک خون کی نالیوں کے ذریعے جسے ہیموڈیالیسس کہا جاتا ہے اور دوسرا پیٹ میں سوراخ کرکے کیا جاتا ہے اس عمل کو پیراٹونیل کہتے ہیں۔ ڈیالیسس کے دوران ایک طرف سے تو مریض کے اندر 200 ملی لیٹر پانی جاتا ہے تو دوسری طرف گندا مواد جس میں پیپ وغیرہ بھی شامل ہوتی ہے خارج ہوتا ہے۔ پاکستان میں گردوں کے مخصوص ماہرین نفرالوجسٹس کی شدید کمی ہے اس ضمن میں 1995ء میں نفرالوجسٹس کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی اور پاکستان سوسائٹی آف نفرالوجی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس وقت ڈاکٹر ادیب رضوی اس ضمن میں بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مرسلہ نہال اختر ہاشمی، لاہور

آئے تھے۔ اس سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ اس کو بھی بہت کچھ کہنا تھا۔ وہ اپنی سسرال میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ان دونوں کو کھانے کی دعوت دے دی۔

......اس کے بعد میں نے زمان اور اس کی بیوی کو بھی مدعو کرلیا۔ میں نے زمان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں نے کس کی دعوت کی ہے۔ بہر حال زمان اور اس کی بیوی وقت سے پہلے آگئے۔ یہ عام سی بات تھی۔ اس کی بیوی پہلے آکر میری بیوی کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔ ایسا ہی میری بیوی کیا کرتی...اور ہم ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہتے...اور جب میز لگ جاتی تو پھر دونوں آکر اعلان کرتیں کہ تشریف لائیں۔ ڈنر تیار ہے۔

آج بھی ایسا ہی ہو رہا تھا لیکن زمان کے لیے ایک تجسس سا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔ ''یار بتا تو سہی۔ کس کو بلا لیا ہے؟''

''جب وہ لوگ آئیں گے تو خود ہی دیکھ لینا۔''

اور جب وہ لوگ آئے تو زمان دیکھتا رہ گیا۔ ''ارے صحیفہ تم؟''

''ہاں، میں اور یہ میرے ہسبینڈ جنید اور یہ میری بچی سارہ۔''

''خدا کی پناہ اس آدمی نے اشارہ بھی نہیں دیا کہ کون آرہا ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار اگر بتا دیتا تو سسپنس ہی ختم ہو جاتا۔'' میں نے کہا۔

کچھ دیر میں ہماری بیویاں بھی آگئیں۔ سب ہی آپس میں گھل مل گئے تھے۔ صحیفہ کا شوہر جنید بہت خوش مزاج قسم کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس کا سینس آف ہیومر بھی بہت اچھا تھا۔

صحیفہ کا انتخاب واقعی بہت اچھا تھا۔ اس نے برسوں پہلے یہی کہا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے اس کو پروپوز کیا تھا...اور زمان بھی پروپوز کر چکا تھا۔ اس وقت صحیفہ نے انکار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے...اور اس کا جیون ساتھی ہمارے سامنے تھا۔

ایک مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان جو یہ سن سن کر ہنس رہا تھا کہ ایک زمانے میں میں اور زمان دونوں ہی صحیفہ کے دیوانے ہو رہے تھے۔

گفتگو کے دوران مجھے صحیفہ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اسے مبارک باد دی۔ ''صحیفہ تمہارا انتخاب بالکل درست تھا۔ جنید ہی جیسے آدمی کو تمہارا ہم سفر بننا چاہیے تھا۔''

''لیکن یہ انتخاب میرا نہیں میرے والدین کا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں؟ تم تو کسی کو پسند کرتی تھیں نا؟''

......''نہیں میں کسی کو پسند نہیں کرتی تھی۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''یاد کرو۔ جس دن میں نے تم کو پروپوز کیا تھا اس دن تم نے ہی بتایا تھا۔''

''وہ میں نے غلط بیانی کی تھی۔'' اس نے کہا۔

''غلط بیانی؟ وہ کیوں؟''

''تاکہ تم دوستوں کے درمیان محبت قائم رہے۔ فرض کرو اگر میں تم میں سے کسی ایک کی ہو جاتی تو کیا تمہارے گھر کا یہ ماحول ہو سکتا تھا جو آج میں دیکھ رہی ہوں۔ رقابت ایک زہر کی طرح رگوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے...مگر میرے ہاں کرتے ہی رقیب بن جاتے۔ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنا گوارہ نہیں کرتے۔ اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، اسی لیے میں نے ایک فرضی پسند کی کہانی سنا دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم دونوں میرے ...راستے سے ہٹ گئے اور اپنی اپنی زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ تم دونوں نے ان سے شادیاں کیں۔ جن کے لیے تمہارے درمیان رقابت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اسی لیے تم آج بھی ایک دوسرے کے دوست ہو۔ تمہاری بیویاں ایک دوسرے کی دوست ہیں اور میں جس طرح پہلے تم دونوں کی دوست تھی۔ آج بھی ہوں۔ یاد رکھو۔ یہ دستور رقابت بہت بری چیز ہوتی ہے۔ یاد رکھو۔ رقابت بہت عام سی چیزوں سے شروع ہوتی ہے۔ عام سی پرفیوم، عام سی گاڑی، کچھ بھی ہو۔ لیکن اگر دوستی قائم رکھنی ہے تو کبھی اس چیز کی تمنا نہ کرو جو تمہارے دوست کو پسند ہے۔ خاص طور پر محبت۔ یہ بہت پرسنل معاملہ ہوتا ہے۔ سمجھ گئے۔''

صحیفہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ وہ کوئی دانشور نہیں تھی لیکن اس نے بہت سلیقے سے بات سمجھا دی تھی۔

وہ واپس چلی گئی۔ خدا کرے جہاں ہو خوش رہے....

میں اور زمان آج تک ایک دوسرے کے دوست ہیں اور رہیں گے۔ ہم نے ایک ہی ٹارگٹ کے لیے دوڑ لگانی چھوڑ دی ہے۔

++



جے ڈی

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم ......!
میں نے مختصر پیرائے میں اپنے ایک دوست کی حالاتِ زندگی بیان کی ہے۔ امید ہے کہ گزشتہ سچ بیانیوں کی طرح یہ بھی پسند کی جائے گی۔

سید محمود حسن
(کراچی)

مجھے جب بھی اپنے پیارے اور عزیز ترین دوست J.D کی یاد آتی ہے تو دل اداس ہو جاتا ہے۔ جے ڈی کا اصل نام جمال الدین تھا، پر وہ اپنے آپ کو جے ڈی کہلوانا بہت پسند کرتا تھا، اس کی انسان دوستی اور ہمدردانہ طبیعت نے اسے ممتاز اور ہردل عزیز بنا رکھا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے، جب ایک بڑی پرائیویٹ کمپنی میں جاب ملی تھی۔ میں وہاں پر بالکل نیا تھا سارے ہی لوگ اجنبی تھے، میں لوگوں سے اور لوگ مجھ سے بات کرتے ہوئے بچتے تھے، ظاہر ہے انسان آہستہ آہستہ ہی کسی بھی نئے ماحول کا عادی ہوتا ہے۔

میری پوسٹنگ اکاؤنٹ برانچ میں ہوئی جہاں خالد صاحب انچارج تھے، ایک پٹے والا چاچا قادر، اور ایک سینئر کلرک تھا، جو کہ کیش اور بل، اکاؤنٹ وغیرہ کے معاملات دیکھتا تھا، اس وقت کمپیوٹر اتنا عام نہیں ہوا تھا، صرف چند مخصوص اداروں کے پاس ہی کمپیوٹرز تھے۔

میں نے نیا نیا کمپیوٹر سیکھا تھا کہ اس ادارے میں جاب مل گئی، میری پوسٹنگ جے ڈی کے ساتھ ہی تھی، وہ اور میں گپ شپ لگایا کرتے تھے۔

سر پر چنبیلی کا تیل لگا ہوا، جس کی خوشبو دور سے ہی آتی محسوس ہو جاتی تھی، جینز کی پینٹ، سادہ سی شرٹ، ہاتھ میں گھڑی، سر جھکائے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلتا۔ یہ تھا ہمارا دوست جمال الدین، جسے ہم جے ڈی کے نام سے پکارتے تھے، اس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ ضرور ہوتی تھی، جسے وہ ختم ہونے پر جیب سے لائٹر نکال کر جلا لیتا تھا۔

ہمیشہ آفس لیٹ آنا، یہ بھی اس کی خاصیت تھی اور جب اس سے پوچھو تو یہی بتاتا تھا کہ فلاں بوڑھے آدمی کو اس کی منزل تک ڈراپ کرتا ہوا آرہا ہوں، یا فلاں کی مدد کرتا ہوا آرہا ہوں، وہ کوئی جھوٹ بھی نہیں بولتا تھا اور یہی اس کی عادت اور مشغلہ تھا، آتے ہی سب کے لیے چائے منگوانا بھی اس کی عادت میں شامل تھا۔

جے ڈی ہم سب سے آفس میں بہتر تھا، اس کی عادتیں بھی اچھی تھیں، خوش اخلاق، خوش گفتار، اور کپڑے بھی سادہ ہی پہنتا تھا۔ اندرونِ سندھ اس کی کچھ زمینیں تھیں جو اس کا خالہ زاد بھائی سنبھالتا تھا، اس کے علاوہ چار مکانات تھے۔ جس کا کرایہ آتا تھا، گویا وہ مالی لحاظ سے ہم سب سے مستحکم تھا پھر وہ ہمیں بار بار چائے بھی پلاتا تھا اس لیے ہم اس کے گن گاتے تھے۔

میں نیا نیا تھا اور مالی پریشانی کا شکار بھی تھا تو جے ڈی نے میری مدد کی تھی۔ کیونکہ میں کسی بھی نئے آدمی سے کچھ مانگ نہیں سکتا تھا۔ اس کی پل پل قربانیاں اور کاوشیں مجھے یاد آتی ہیں تو آنکھ پرنم ہو جاتی ہے۔

''یار بھائی آپ کے پاس پچاس روپے ہوں گے۔'' میں نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ کہا، اس بھلے مانس نے سگریٹ سلگائی، اور کہا۔ ''یہ لو۔'' جیب سے اس نے ایک سو کا نوٹ نکالا اور مجھے دیا۔

''ٹھہرو یار گھر ہی تو جانا ہے چلے جانا، پہلے چائے تو پی لو۔'' اس نے پٹے والے کو آواز دی۔ ''ارے او چاچا قادر، یہاں آؤ دو چائے اور ساتھ میں بسکٹ بھی لے آؤ اور آپ کو تکلیف تو نہیں ہوتی نا میرے بار بار چائے منگوانے سے۔''

جے ڈی نے چاچا قادر سے پوچھا۔

''نہیں صاحب آپ کی وجہ سے تو مجھے بھی چائے مل جاتی ہے۔ اور باقی اسٹاف کو بھی۔''

پھر جے ڈی نے اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور مجھے دیا۔ ''بھائی یہ رکھ لو، آپ کے کام آئیں گے۔''

میں نے شرماتے ہوئے پیسے رکھ لیے اور کہا۔ ''بھائی تنخواہ ملنے پر واپس کر دوں گا۔''

''ہاں ہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' جے ڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ میری اور جے ڈی کی دوستی کی ابتدا تھی۔

جب میں بے روزگار تھا تو اِدھر اُدھر سے کچھ قرضہ لیا تھا پھر اپنی بہن کی جب شادی کرنا پڑی تو مزید قرضہ لینا پڑا اس طرح میری مالی حالت ابتر ہو گئی تھی اور مجھے اپنی بائیک بھی بیچنی پڑ گئی تھی۔ مجھے آفس آنے اور جانے کا مسئلہ ..... درپیش ہونے لگا۔

اس برے وقت میں بھی میرے جو شخص کام آیا تو یہ جے ڈی ہی تھا جو کہ میرے انتظار میں بائیک لے کر میرے گھر سے باہر قریبی چوراہے پر میرے انتظار میں کھڑا ہوتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ آفس لے جاتا تھا اور کبھی اس نے مجھے یہ نہیں کہا کہ یار آج بائیک میں پیٹرول تو ڈلوا دو البتہ وہ چائے پینے کا شوقین تھا، کہیں بھی کسی بھی ہوٹل پر ہم رک کر چائے ضرور پیتے۔ مجھے وہ چائے کا بل نہیں دینے دیتا تھا پھر بھی میں زبردستی چائے کا بل دے دیتا اور تب وہ مسکرا کر کہتا یار بڑے ٹرینڈ ہو گئے ہو، مجھے بھی چکر دے جاتے ہو۔

''چائے کے پیسے تم دو یا میں بات تو ایک ہی ہے۔'' میں اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ بہرحال یہ اس کی اعلیٰ ظرفی ہی تھی ورنہ آج کے اس پُرآشوب دور میں کون اتنا اچھا ہوتا ہے۔

وہ غریبوں کی مدد بھی کرتا تھا۔ کسی کے گھر میں شادی ہو، جنازہ ہو، جے ڈی دن رات حاضر رہتا تھا۔ محلے کی ہر خدمت کو وہ عبادت سمجھ کر کرتا تھا اور دوستوں کے لیے تو وہ تھا ہی ہیرو۔ میں اسے کہتا کہ یار جے ڈی تم لوگوں کے اتنا کام آتے ہو کل کو تمہارا کوئی وقت پڑا تو پھر کیا ہوگا۔

''او بھائی مجھے کسی سے کوئی لالچ نہیں ہے، مجھے اجر بھی اللہ ہی سے چاہیے، انسانوں سے کچھ نہیں۔ مجھے تو لوگوں کی خدمت کر کے سچی خوشی ملتی ہے۔''

جب ہم پکنک پر گئے تو جھیل میں ایک نوجوان لڑکا ڈوب رہا تھا، چیخ رہا تھا بچاؤ بچاؤ لیکن کوئی بھی اس کی مدد کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آ رہا تھا، وہ چیخ رہا تھا۔ اس کے گھر والے بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی اب رو رو کر چیخ رہے تھے، ارے کوئی ہے جو اس ڈوبتے ہوئے کو بچائے لیکن کوئی بھی جھیل میں کودنے کو تیار نہ تھا۔ یہ جے ڈی ہی تھا جس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھیل میں اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے چھلانگ لگا دی اور اس لڑکے کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہ ا ے جھیل کے کنارے لانے پر کامیاب ہوگیا، واقعی بڑی مشکل سے وہ اس بچے کو بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس لڑکے کے گھر والوں نے جے ڈی کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تم نے ہمارے بیٹے کو نئی زندگی دی ہے۔

میں نے کہا۔ ”اگر اس کی جان بچاتے ہوئے تم خود ڈوب جاتے تو کیا ہوتا؟“

”او میرے بھائی، جب موت آنی ہوگی تو آ کر رہے گی میں وقت سے پہلے نہیں مرنے والا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ واقعی اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

آج کسی کو خون کی ضرورت تھی تو جے ڈی نے دو بوتل خون دے دیا، ایک بوتل خود نے اور ایک کسی دوست سے دلوائی کیونکہ اس کی بات کوئی ٹالتا بھی نہیں تھا، وہ ایک ہر دلعزیز شخصیت تھا۔ کسی کو اسپتال لے کر جانا ہے، کسی کی فیس بھرنی ہے، کسی کی مدد کرنی ہے، وہ مدد کے لیے فوراً پہنچ جاتا۔

یہ تو میرے سامنے ہی کی بات ہے کہ ہمارے محلے میں ایک بیوہ کو مالک مکان گھر سے نکال رہا تھا، جے ڈی نے اس کا کرایہ بھی بھرا اور اسے گھر بیٹھے کام بھی دلوایا۔ کسی غریب کی بیٹی کو جہیز دینے کا مسئلہ ہو تو وہ بھی جے ڈی ہی حل کرواتا تھا۔ یعنی جے ڈی ایک سماجی شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا چھوٹے پیمانے پر ہی صحیح جو وہ کسی کے لیے کر سکتا تھا کرتا تھا۔

جے ڈی کے والد اس سے بہت مختلف تھے۔ چڑچڑے، بدمزاج اور ہر وقت گالیاں دینے والے، ہر خرابی کا ذمے دار جے ڈی کو ہی قرار دیتے۔

جب بھی اس کے باپ سے میری ملاقات ہوتی کبھی راہ چلتے، کبھی بس میں تو وہ شروع ہو جاتے، وہ نانجار، وہ کم بخت، اسے تو دوسروں کی غلامی سے ہی فرصت نہیں ہے۔ تم اس کے دوست ہو اسے سمجھاؤ کہ وہ انسان کا بچہ بن جائے اور میں جواب میں صرف ہاں ہاں کر کے ہی رہ جاتا۔ ظاہر ہے جے ڈی کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔

جے ڈی بھی اپنے باپ سے پریشان رہتا تھا جو کہ ہر وقت اسے گالیاں دیتا رہتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی اپنے باپ کے رویے کی وجہ سے ذہنی مریض جیسا بن چکا تھا پھر اسے فقیرے جیسے دوست ملے تو اس نے غم بھلانے کے لیے چرس کا سہارا لے لیا۔

اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب جے ڈی کے والد کو دل کا عارضہ لاحق ہوا تو یہ جے ڈی ہی تھا جو کہ ان کو اسپتال لے کر جاتا، ان کا چیک اپ کراتا اور پھر واپس گھر لاتا۔ ان کی خدمت کرتا۔ یعنی اس نے ایک لائق اور فائق اولاد ہونے کا حق ادا کیا۔

لیکن اب اس کا کیا کریں کہ جے ڈی نشے کا عادی ہو چکا تھا: اس کی وجہ سے باپ کا اس کے ساتھ تلخ رویّہ تھا۔

والد کی موت کے بعد جے ڈی ان کی ساری جائداد کا وارث ہو گیا تھا۔ ان کے مکانات، زمین اور بہت سا پیسا سب اس کو مل چکا تھا۔ پیسا آنے کے بعد اس نے غریبوں کی مدد میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

جے ڈی کی تمام عادتیں اچھی تھیں، بس اس میں ایک ہی خرابی تھی کہ چرس پیتا تھا۔

اس کے دوست عرفان جو کہ فینا کے نام سے مشہور تھا کار میکینک تھا اور اس کی ایک کار ریپئر رنگ کی بڑی دکان تھی، دوسرا فقیرا جو کہ بنیادی طور پر کارپینٹر تھا، جے ڈی کے گہرے دوست تھے۔ روزانہ رات کو جے ڈی، عرفان عرف فینا، رفیق عرف فقیرا، کار ورکشاپ کے ایک کمرے میں بیٹھتے اور پھر چرس کی سگریٹوں کا دور چلتا اور اسی طرح رات گزرنے لگتی۔ ... جب صبح قریب ہوتی تو سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

ان کی یہ بیٹھک تقریباً روز کی تھی۔ یہ نشہ بازی کی عادت حقیقت میں انہیں تباہ کر رہی تھی لیکن جے ڈی اس سے زیادہ اس لیے متاثر ہوا کہ اب وہ دن میں بھی چرس بھری سگریٹ پینے لگا تھا جس کے برے اثرات اس کی صحت پر نمایاں ہونے لگے تھے اور وہ پہلے کے مقابلے میں کمزور ہونا شروع ہو گیا تھا۔

”او یار لاؤ سگریٹ سلگاؤ کچھ غم تو بھلا دیں، کچھ کش لگائیں۔“ جے ڈی کہتا۔

اس کا دوست فقیرا جس کا نام تو رفیق تھا پر اسے سب فقیرا کہتے تھے، چرس کی سگریٹیں بناتا اور تینوں دوست چرس

کی سگریٹیں پیتے، چرس کے مسلسل استعمال نے جے ڈی کی صحت پر برا اثر ڈالا اب تو وہ دن میں دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ چرس پینے لگا تھا۔

تینوں دوست چرس کی سگریٹیں سلگاتے اور اس کا دھواں مجھے بھی متاثر کرنے لگتا۔ میں روز تو ان کے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا مگر جب بھی بیٹھتا تو جے ڈی کو اکیلے میں سمجھانے کی کوشش کرتا۔

''یار جے ڈی تو یہ نشہ کرنا چھوڑ دے، یہ تجھے کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ فقیرا اور فینا تو چھڑے چھانٹ ہیں مگر تو اب شادی شدہ ہے، دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کے لیے سوچ۔''

مگر وہ میری باتوں کو ٹال جاتا اور ایک قہقہہ لگا کر کہتا، اے بے زیادہ فلاسفر بننے کی کوشش نہ کیا کر، کسی دن تو بھی ہمارے ساتھ کش لگا کر دیکھ، یہ دوسری دنیاؤں کی سیر کراتی ہے۔''

اس کی گرتی ہوئی صحت اور نرم مزاجی سے اس کے خالہ زاد بھائی نے فائدہ اٹھایا۔ وہی خالہ زاد بھائی جو اس کی زمینوں کو سنبھالتا تھا اس نے کہا کہ آپ کی صحت ٹھیک نہیں رہتی. آپ بے فکر رہیں زمین میرے نام کردیں جو کچھ آمدنی ہوگی آپ کو گھر بیٹھے مل جایا کرے گی۔

جے ڈی نے زمین اس کے نام کردی۔

مجھے جب یہ بات پتا چلی تو بہت دکھ ہوا کہ جے ڈی کیسے اس خالہ زاد بھائی کی باتوں میں آ گیا۔

اسے گردے میں درد رہنے لگا تھا لیکن اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی بس معمولی دوائیں لیتا رہا، اس نے نشہ کرنا بھی نہ چھوڑا۔ ہم ایک دو، دوست جو اس کے ساتھ مخلص تھے اسے سمجھاتے تھے. لیکن وہ بعض نہ آیا ہر بار کہتا، یار چار دناں دی زندگی اے، کچھ کھا لے پی لے ... موج اڑا، وہ ہنسی مذاق میں ہماری نصیحت کو ٹال دیتا۔

ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ اس کے گردے اب زیادہ عرصے تک نہیں چل سکیں گے، اگر کوئی اس کو گردہ ڈونیٹ کردے تو شاید بات بن جائے مگر جے ڈی جو سب کی مدد کیا کرتا تھا، اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ دوائیوں پر چلتا رہا پھر ڈائلسز پر آ گیا۔

جے ڈی کو گردہ صرف ماں باپ یا بہن بھائی کا ہی لگ سکتا تھا، اس کا ایک بھائی جو کہ ابھی چھوٹا تھا وہ تو اس قابل نہیں تھا کہ اسے گردہ دے سکے۔ اس کی بہنوں نے بھی صاف انکار کردیا، اگر ایک گردہ ہم نے دے دیا تو ہماری زندگی تو آدھی ہوجائے گی یا کیا پتا ہم زندہ ہی نہ رہ سکیں۔

ساری اُمیدیں دم توڑتی چلی گئیں۔ جے ڈی، موت سے قریب ہوتا چلا گیا، قریب تر اور قریب تر پھر ایک رات اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی مرنے کے وقت بھی وہ کہہ رہا تھا، ہر انسان کا وقت مقرر ہے کوئی شخص وقت سے پہلے نہیں مر سکتا، لگتا ہے میرا بھی وقت آ گیا ہے۔

اور وہ جے ڈی جو سب کے کام آیا کرتا تھا اس کے کوئی بھی کام نہ آیا... جب وہ بیمار ہوا تو صرف چند وفادار دوست ہی تھے جو کہ اسے اسپتال لے کر جاتے تھے اور دوا دلا کر لاتے تھے ۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ دنیا مطلب دی او یار، کہ یہ دنیا صرف مطلب کی ہے، ہم اپنے اردگرد بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں جن میں سے مخلص، وقت پر کام آنے والے نہایت قلیل لوگ ہوتے ہیں، باقی لوگوں کو ہم ابن الوقت کہہ سکتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ موت سے قریب ہوتا چلا گیا۔ چھ مہینے وہ ڈائلسز پر چلا اور پھر مجھے ایک رات یہ اندوہناک خبر ملی کہ جے ڈی اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

وہ بہت جلد... ہی اس دکھوں بھری دنیا کو چھوڑ گیا تھا اس کا ذمہ دار کون تھا، وہ رویئے جس نے اسے نشے کی طرف دھکیلا یا پھر کسی کی نصیحت کو نہ ماننا، یہ سارے عوامل جے ڈی (جمال الدین) کو موت کی طرف دھکیل کر ..... لے گئے تھے۔

ہماری آنکھوں میں آنسو ہیں اس کی اچھائیاں، نیکیاں ہمیں اس کی بھرپور یاد دلاتی ہیں، وہ اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو بچوں کو بھی چھوڑ گیا کاش وہ ہماری نصیحت کو مانتا اور نشہ نہ کرتا تو اس کی زندگی بھی ایک عام انسان کی طرح ہوتی۔ بس وہ یہی کہا کرتا تھا کہ میاں ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرو گے پھر تو شاید خوابوں میں ہی ملیں۔ جے ڈی کے یہ الفاظ میں کبھی بھی بھول نہیں سکتا۔

جے ڈی کی یادیں آج بھی ہمیں تڑپاتی ہیں، اس کی اچھائیاں، نیکیاں، لوگوں کے کام آنا بے شک جے ڈی جیسے لوگ ایک طویل عرصے میں پیدا ہوتے ہے. کیونکہ یہ دنیا مطلب کی ہے. اور آج کے اس مادہ پرستی کے دور میں اچھے لوگوں کا ملنا نایاب ہے۔ وہ اس دنیا میں آیا بھی اور چلا بھی گیا، بلاشبہ وہ ایک انسان دوست اور انسانیت کا درد رکھنے والی شخصیت تھی جو کہ ہمیں جوانی کے عالم میں داغ مفارقت دے کر چلی گئی۔

+ +

میری عمراسی سال کے قریب ہے۔ میں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے جواب دھند لا گئی ہیں ایک زمانہ دیکھا ہے۔ معاشرے میں ظلم، ناانصافی اور زیادتی کے بے شمار واقعات دیکھ چکا ہوں۔ میری چار بیٹیاں تھیں، میں نے دو بڑی بچیوں کی شادیاں احسن طریق سے کر دیں، وہ اپنے گھروں میں خوش باش تھیں۔ تیسری بچی سعدیہ کے فرض کی ادائیگی کے لیے میں دن رات پریشان رہتا تھا اور خدا سے دعا کرتا تھا کہ میری بیٹی کے لیے کوئی خوش قسمت بر مل جائے، میری پریشانی دیکھ کر میرے دور کے ایک رشتہ دار راول نے اپنے بیٹے انشاء کے لیے میری بیٹی کا رشتہ مانگا۔ راول اور انشاء کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ہمارا خاندان تو ان سے تعلق کی وجہ سے بدنام ہو گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کا کام ڈکیتی رہزنی اور چوریاں کرنا تھا۔ انشاء تو اپنے علاقے میں بہت بڑا جواڑی مشہور تھا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھلا کس طرح اپنی شریف النفس بیٹی کا ہاتھ ان کے حوالے کر سکتا تھا۔ میں نے اس رشتہ سے انکار کر دیا۔

راول انکار سنتے ہی میرے خلاف ہو گیا اس نے طرح طرح کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ میں خدا پر توکل کر کے بیٹھا رہا۔ میرا ایمان پختہ تھا کہ خدا کی طرف سے بہت بہتر کوئی سبیل نکل آئے گی اور میرے پیاسے من کو قرار آ جائے گا۔

خدا نے ایک فرشتہ صفت شخص میرے دروازے پر بھیج دیا۔ ارسل حافظِ قرآن بچہ تھا۔ قرأت اس کی بہت پیاری اور قابل سماعت تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی محفل میں شرکت کر کے... قرآن سناتا تو دور دور سے لوگ اس کی آواز سن کر ٹھہر جاتے اور قرآن مجید کی تلاوت سننے لگتے۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے کس قدر اچھا بر مجھے بیٹی کے لیے عطا کر دیا ہے۔ میرا ایمان سچ ثابت ہوا کہ جس طرح کی نیت ہو خدا اس طرح کا صلہ عطا کر دیتا ہے۔

ارسل کے والد حافظ طیب اپنی علاقائی مسجد میں امام اور خطیب تھے۔ اس حوالے سے ان کی علاقے میں بہت عزت تھی۔ میری بیٹی سعدیہ بھی ورد و وظائف میں دلچسپی لیتی تھی۔ میں یہ جان

جائیں تو جائیں کہاں

محترم مدیر

السلام علیکم!

لوگوں کی زہر اگلتی زبانیں کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہیں، اس کا ایک ہلکا سا عکس، یہ کیسے زندگی تباہ و برباد کرتی ہے اسے ہی پیش کیا ہے۔

علی عمران ممتاز
(ملتان)



کر مطمئن ہوگیا کہ ان دونوں کی مثالی جوڑی خوب رہے گی۔

شادی کے لیے تاریخ طے کرلی گئی۔ حافظ طیب نے مجھے کہا تھا کہ تمام رسومات اسلام کے مطابق ہوں گی اور اسراف سے مکمل پرہیز کیا جائے گا۔ نہ ہماری طرف سے فضول خرچی ہوگی اور نہ ہی آپ جہیز وغیرہ کی تکلیف کریں۔ میں ذاتی طور پر اس رشتے سے بہت مطمئن تھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا تھا۔

برات نے جس دن آنا تھا، ہم لوگ انتظامات مکمل کر کے ان کا انتظار کرنے لگے۔ میرے تقریباً تمام رشتہ دار اور عزیز واقارب جمع تھے۔ برات کا جو وقت طے تھا وہ نہ پہنچ سکی تو ہمارے انتظار کی شدت کا رنگ بدل گیا۔ اس قدر تاخیر ہمارے لیے حیران کن تھی۔

پریشانی کے اس عالم میں اچانک گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس گہما گہمی میں مجھے کسی نے بلایا۔ میں تھکا ہارا اور خدا سے دعائیں کرتا ہوا گیا اور فون سننے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ کسی شخص نے میرا نام پوچھنے کے بعد ایسی خبر سنائی کہ میرے دل و دماغ پر آہنی ہتھوڑے چلنے لگے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکنا شروع ہوگئی اور یوں لگا جیسے سر پر آسمان گر پڑا ہو۔

کسی نے اندوہناک خبر سنائی تھی کہ حافظ طیب کے بیٹے ارسل کی برات جو آپ کے گھر کی طرف آرہی تھی کہ آدھ رستہ طے کرنے کے بعد ایک گاؤں کے قریب سڑک کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ظالم دہشت گردوں نے اندھادھند فائرنگ کردی جس میں سے ایک گولی دولہا کی گاڑی کے ڈرائیور کو لگی وہ گاڑی پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور گاڑی سڑک سے ادھر اُدھر ڈولنے لگی۔ دولہا کی کار کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر ہی براتیوں سے بھری بس آرہی تھی۔ جب کار کا توازن برقرار نہ رہا تو بس بھی کار میں آکر لگی جس سے دولہا ڈرائیور اور تین دیگر براتی موقع پر جاں بحق ہوگئے جبکہ بس میں سوار براتی شدید اور معمولی زخمی ہوگئے۔ وہ براتی جو محفوظ بچے ان میں سے ایک کے پاس کلاشنکوف تھی اس نے ان دہشت گردوں پر جوابی فائرنگ کی جس پر وہ بوکھلا گئے اور بھاگنے لگے۔ ان میں دو دہشت گرد ٹانگوں میں گولیاں لگنے کی وجہ سے فرار نہ ہوسکے اور نہ ہی مرسکے بلکہ بھاگ نہ سکنے کی وجہ سے زندہ گرفتار ہوگئے۔ ان دو میں ایک راول اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔

اس صدمہ سے میں نڈھال ہوگیا۔ میری بیوی تو بالکل برداشت نہ کرسکی اور موقع پر ہی دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہوگئی۔ جبکہ میری بیٹی کے بارے میں وہ لوگ جو پہلے بڑی تعریفیں کرتے تھے اور میری بیٹی کو خوش قسمت کہتے تھے اس منحوس ماحول میں بھی زبان بند نہ رکھ سکے اور اسے منحوس قرار دینے لگے۔ سعدیہ یہ دکھ برداشت نہ کرسکی اور اس قدر رنجیدہ ہوئی کہ اس نے سرخ جوڑا پہنے ہوئے ہی وہ خواب آور گولیاں جو میں اپنے استعمال کے لیے رکھے ہوئے تھا اسے زیادہ مقدار میں نگل لیں، خودکشی حرام موت کہلاتی ہے اور میری بچی بھی معاشرے کے طنز کی بھینٹ چڑھ کر حرام موت کو گلے لگا کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

وہ گھر جہاں کچھ دیر پہلے ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے جارہے تھے، میٹھے چاول تیار کیے گئے تھے اور ہر شخص نئے کپڑے پہنے اس خوشی کے موقع پر شریک تھا اب ہر کسی کی آنکھ اشکبار تھی۔ اتنے بڑے سانحہ پر صبر کیے بھی صبر نہ آتا تھا۔ جائیں تو کہاں اور کرتے تو کیا کرتے؟ کچھ سمجھ نہ آئی کہ مجھے کسی ناکردہ گناہ کی سزا ملی ہے یا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے......؟

اس چاردیواری سے ایک بیٹی کی ڈولی سرخ جوڑے میں اٹھنا تھی لیکن اب تو سفید جوڑے پہنے دو جنازے ایک ساتھ گھر سے قبرستان کی طرف جارہے تھے۔ سعدیہ اور اس کی ماں اتنا بڑا دکھ دے کر مجھے افسردہ کر گئیں۔ میں نے بھی مرنا ... چاہا لیکن نہ مرسکا۔

راول اور اس کا حواری گرفتار ہوئے تو انہیں مقدمہ درج کر کے جیل بھجوادیا گیا۔ پانچ سال تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ ہمارے ملک کا قانون بھی عجیب ہے ایک تو میرے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور مجھے ہی مقدمہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ حکومت کو چاہیے تھا کہ اسے سیدھا سادا دہشت گردی کا کیس بنا کر عبرت ناک سزا دی جاتی تاکہ آئندہ سے ایسا کوئی بھی بڑا سانحہ... رونما نہ ہو۔ مگر پانچ سال تک میں نے مقدمہ لڑا تو مجرمان کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ پھانسی پھر بھی نہ لگ سکی۔ بارہ تیرہ سال بعد وہی راول اور اس کا حواری اور دیگر مجرمان سزا کی مدت پوری کر کے آزاد ہوگئے اور اس نے ایک بار پھر مجھے دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ میں نے اسے واضح کہہ دیا تھا کہ تو نے میرا گھر اجاڑا تھا میں نے تجھے سزا دلوادی دنیا کی عدالت نے تجھے بہت کم سزا دی ہے۔ میں اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں لڑوں گا اور وہاں بھی تجھے سزا دلواؤں گا۔ اس کا میرا جھگڑا ہوگیا اور اس نے مجھے شدید زخمی کردیا۔ میں نے ایک بار پھر اس ظالم کے خلاف مقدمہ درج کروایا اور اسے جیل بھجوادیا۔ اب کی بار کیس صرف لڑائی جھگڑے کا ہی تھا اس لیے وہ ضمانت پر جلد رہا ہوگیا اور مجھے طعنہ زنی کرنے لگا۔

ان تمام معاملات سے اکتا کر میں نے اپنا علاقہ چھوڑ دیا اور لاہور میں رہائش اختیار کرلی... کیونکہ مقدمہ لڑنے کی مجھ میں قوت نہیں ہے۔

++

سیاست

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم...!
یہ سچ بیانی شیر شاہ کی ہے۔ ایک معروف سیاست داں کی لیکن میں نے اس کا نام اور مقام بدل دیا ہے۔ داستان میں بھی ہلکی سی تبدیلی کی ہے تاکہ قارئین کی دلچسپی برقرار رہے۔ امید ہے پچھلی سچ بیانیوں کی طرح یہ بھی قارئین کے معیار پر پوری اترے گی۔
امجد اقبال خان
(ساہیوال)

میں نے جب میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو میری عمر چھبیس سال تھی۔ باپ دادا اسی میدان کے شناور تھے لہٰذا یوں کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ شیر شاہ کے سر پر سیاست کا وراثتی ٹوکرا رکھ دیا گیا تھا۔ شیر شاہ کا باپ بہار شاہ الیکشن سے ڈیڑھ سال پہلے اپنی پوری زندگی صوبائی اسمبلی میں گزار کے فوت ہوگیا تھا تو باپ کی موت کے بعد شیر شاہ نے خاندانی روایت کے تسلسل کے لیے آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے اعلان کردیا تھا۔ لوگ اس کی سیاسی دنگل میں



انٹری پر خوش تھے اور اس کی انتخابی مہم کا خوشدلی سے خیر مقدم کررہے تھے کیونکہ جب سے موچیوں، کمہاروں اور دوسری نچلی ذات والوں کے بچوں نے پڑھنا شروع کیا تھا تو لوگوں کے شعور میں بھی اضافہ ہوا تھا اور وہ میرے کے پرکھوں کی روایتی سیاست کو بوجھ سمجھنے لگے تھے۔ اب میری صورت میں ایک انسان دوست، ہمدرد اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان علاقے میں سیاسی راہنما کے طور پر سامنے آیا تھا تو لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں مقبول سیاستدان بن گیا تھا۔ ویسے بھی اہل علاقہ کئی دہائی سے بے سود سیاست کو دیکھ دیکھ کر اکتا گئے تھے۔ میری صورت میں نئے سیاستدان کو دیکھنا اور قبول کرنا انہیں اچھا لگا تھا۔ میرے باپ دادا کی سیاست کا محور کبھی اہل علاقہ کی بہبود تو رہا ہی نہیں تھا۔ ان کے لیے سادہ لوح اور غریب عوام کا کام صرف اور صرف انہیں ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچانا تھا۔ اسمبلی میں پہنچ کر وہ علاقے کو بھول جاتے تھے اور ان کا زیادہ تر وقت صوبائی دارالحکومت میں گزرتا تھا۔ تاہم انتخابات سے چند ماہ قبل وہ لوگوں کے دکھ سکھ میں شرکت کرنے کے لیے آجاتے تھے۔ اس کے برعکس میں نے سیاست میں قدم رکھتے ہی خود کو عوام کا خادم بنالیا تھا۔ عام لوگوں میں ہی اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ان کے مسائل سنتا اور انہیں حل کرتا تھا۔ میں نے قلیل مدت میں صحتمند سیاست کا صحیح تصور اور حقیقی سیاستدان کا موزوں عکس پیش کیا تھا لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں انتخاب ہار جاتا۔

☆☆☆

آپ نے میرا مختصر تعارف پڑھا۔ اب میں اپنی کہانی کا باقاعدہ آغاز کرتا ہوں۔ جیسا کہ آپ جان ہی چکے ہوں گے کہ میں الیکشن جیت گیا تھا۔ میرے الیکشن جیتنے کی دیر تھی کہ مبارکبادوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ علاقے کے تمام ہی بااثر لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لیے آئے......اور غیر متوقع طور پر دانیہ شاہ بھی آئی۔

دانیہ شاہ پینتالیس سال کی درازقامت، پُراعتماد، خوبصورت اور بااختیار عورت تھی۔ جسم پر کسی حد تک چربی کی مقدار بڑھ چکی تھی مگر اس چیز نے اسے اور بھی باوقار بنادیا تھا۔ دانیہ شاہ بھی سیدزادی تھی اور سیاست اسے بھی وراثت میں ملی تھی۔ اس کا چونکہ کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے اپنے باپ کے مرنے کے بعد وہ سیاست میں وارد ہوئی تھی۔ گزشتہ دو الیکشن میرے والد بہار شاہ کے مقابلے میں ہار چکی تھی تیسرا الیکشن میرے مقابلے میں ہاری تھی۔

اس سے پہلے میں نے اسے صرف تصویروں میں دیکھا تھا مگر اس روز وہ شاہانہ انداز میں قدم اٹھاتی اور سر پر دوپٹا درست کرتی ہوئی اپنی کار سے اتر کر میری حویلی کی طرف بڑھی تو میرے خاص ملازم قادر بخش نے مجھے اطلاع دی۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ تقریباً دوڑتا ہوا آیا تھا اور جب بولا تو اس کے انداز میں حیرت تھی۔ میں اس وقت اپنی خواب گاہ میں تھا۔

''شاہ صاحب!'' اس نے بتایا تھا۔ ''دانیہ شاہ آئی ہے......''

میرے منہ سے کلمہ تحیر برآمد ہوا۔ ''دانیہ شاہ؟''

''جی شاہ صاحب! وہ اپنی کار میں ہے۔ صرف ایک گن مین اس کے ساتھ ہے۔ وہی ڈرائیور بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ ہے کہاں؟''

''میں نے اسے ڈیرے کی طرف آتے دیکھا ہے......''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھا، پھر توقف کے بعد کہا۔ ''قادر بخش! تم اس کا استقبال کرو۔ اسے بٹھاؤ۔''

''اچھا شاہ صاحب۔'' قادر بخش نے بصد احترام کہا پھر واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ مگر دروازے میں غائب ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر واپس آیا۔ ''آپ کے بارے میں کیا بتانا ہے؟''

''کہنا کہ شاہ صاحب آتے ہیں۔''

''اچھا جی۔'' قادر بخش نے کہا اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ دانیہ شاہ کا باپ سید ظاہر شاہ بڑا دبنگ اور دلیر انسان تھا مگر وہ اسمبلی میں پہنچنے کی حسرت اپنے دل میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوا کیونکہ اس کے مدمقابل بہار شاہ میرے والد ہمیشہ الیکشن جیت جاتے تھے۔ ہار اور مسلسل ہار نے ظاہر شاہ کو میرے باپ کا دشمن بنادیا تھا۔ اس نے کئی بار قاتلانہ حملے کروائے مگر ہر بار اپنے مذموم مقاصد میں ناکام رہا۔ کئی بار ان دونوں کے قافلوں میں ٹکراؤ ہوا، خونریزی ہوئی، جانی نقصان ہوا.. مگر پھر بھی سیاست کی بساط میرے والد (بہار شاہ) کے ہاتھ میں رہی۔

اقتدار اگلی نسل کو منتقل ہوچکا تھا.. مگر نتائج میں کوئی

تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہار اور جیت کی روایت کا تسلسل برقرار رہا تھا۔ دانیہ شاہ پانچ ہزار ووٹوں سے ہار گئی تھی... اور اب وہ میرے ڈیرے پر آئی تھی۔ نجانے کیا ارادے لے کر آئی تھی۔ جیت کی مبارکباد دینے آئی تھی یا پھر دشمنی کا سندیسہ...... مگر اس کا آنا مجھے بہت ہی عجیب لگا تھا۔ تاہم میں نے اس سے ملنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

میں نے تیار ہونے میں فقط دس منٹ لگائے تھے اور اب مجھے ڈیرے تک پہنچنے کے لیے پانچ سے سات منٹ درکار تھے۔ میں خواب گاہ سے نکلا تو میں نے کچھ فاصلے پر لینڈ کروزر کھڑی دیکھی۔ اسی اثنا میں قادر بخش تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میری جانب آیا۔

''ہاں کہو، قادر بخش!'' میں نے کہا۔

''دانیہ بی بی کو بٹھا دیا ہے شاہ صاحب! وہ آپ کی منتظر ہیں۔''

''چلو......'' میں نے کہا اور پھر ہم دونوں ڈیرے کی سمت چلنے لگے۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے ڈیرے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ یہ روایتی ڈیرہ تھا۔ وسیع برآمدے میں بڑے بڑے پلنگ اور کرسیاں موجود تھیں۔ یہاں بیک وقت دو سو افراد سما سکتے تھے۔

میں ڈیرے میں داخل ہوا تو دانیہ شاہ کو ایک کرسی پر شاہانہ انداز میں متمکن پایا۔ ماننا پڑا کہ سید زادی میں وقار اور رعب غضب کا تھا۔ اس کا سنہری پرس سامنے ہی میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے دانیہ شاہ کو دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا ہی چلا گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی مگر مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے کھڑے ہونا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''السلام علیکم!'' میں نے سلام کیا اور پھر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''وعلیکم السلام!'' اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔

''یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا آپ کو مبارک باد دیتی چلوں۔''

میں نے اسے بغور دیکھا۔ پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شکریہ۔ لگتا ہے آپ کا دل بہت بڑا ہے۔ سیاست میں جو انسان ہار برداشت نہ کرسکے، میں اسے سیاستدان مانتا ہی نہیں۔ آپ کے والد محترم تو میرے ابا جی کے دشمن بن گئے تھے۔''

''مجھے ہرا کر اچھا لگا ہوگا تمہیں۔'' اس کے انداز میں ترشی محسوس ہوئی۔

''نہیں، اپنے منشور کی جیت پر اچھا لگا۔ لوگوں نے مجھ پر بھروسا کیا، اچھا لگا۔'' میں نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ ''ویسے بھی سیاست میں افراد کی نہیں بلکہ منشور کی ہار جیت ہوتی ہے۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں دانیہ شاہ!''

''اس سے پہلے تمہیں صرف پوسٹروں اور بینروں میں دیکھا تھا۔ دل کو اچھے لگتے تھے کہ خوبصورت بلا کے ہو...... مگر اتنے ذہین نہیں لگتے تھے۔'' وہ آپ سے تم پر آگئی۔ پھر بولی۔ ''بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔ آخر لندن سے ڈگری لے کر آئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''خوبصورت تو آپ ہیں دانیہ شاہ! اور تعلیم یافتہ بھی۔ سنا ہے پنجاب یونیورسٹی سے سیاست کی ڈگری لی ہے آپ نے۔''

اتنے میں اس کے پرس میں موجود موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تو اس نے پرس سے موبائل نکال کر اسے بند کیا.. پھر اسے بڑے ہی پرتمکین انداز میں میز پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے غیر متوقع بات کی۔ ''پڑھ لکھ بھی گئے، سیاستدان بھی بن گئے، بہت خوش قسمت ثابت ہوئے ہو۔ شادی کا نہیں سوچا؟''

میں الجھ گیا۔ اگر وہ دوستانہ انداز میں یا مسکراتے ہوئے یہ سوال کرتی تو میں سمجھتا کہ شاید وہ یونہی تجسس کے لیے پوچھ رہی ہے یا پھر اپنی نسوانی جبلت سے مجبور ہوکر پوچھ رہی ہے کہ خواتین بالعموم ایسی باتیں بصد اشتیاق پوچھ ہی لیتی ہیں...... کیا ایک بڑی عہدیدار عورت اور کیا ایک عام عورت...... مگر اس نے یہ سوال بہت سوچتے بوجھتے اور سپاٹ انداز میں پوچھا تھا...... اب میں کیا جواب دیتا۔ وہ مجھ سے کم و بیش اٹھارہ انیس سال بڑی تھی۔ مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتی تھی۔

''کیا ہوا۔ تم تو سوچ میں پڑ گئے۔'' وہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔

میں نے کہا۔ ''ابھی میں نے شادی کے لیے سوچا نہیں۔ میں پڑھ رہا تھا۔ ابا جی میری شادی کا منصوبہ پورا نہ کرسکے۔ اب ان کی وفات کے بعد مجھ پر ذمے داریاں آن پڑی ہیں۔ ابھی چھ آٹھ سال تک تو میں شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔''

''حالانکہ ہم سیدوں میں جلدی کی شادیاں عام ہیں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''جب میری شادی ہوئی، اس وقت

میری عمر چودہ سال تھی۔ اب میری بڑی بیٹی کے بال بچے بڑے ہو رہے ہیں۔"

میں نے بے ساختہ کہا۔ "آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ آپ نواسوں، پوتوں والی ہوں گی۔"

وہ ہنس پڑی۔ "میں تمہاری بات کو جھٹلاؤں گی نہیں۔"

پھر بتانے لگی۔ "ایک مرتبہ چاچا بہار شاہ ہمارے گاؤں ایک شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئے تھے۔ سید وسیم عباس شاہ کی شادی تھی جو اب قتل ہو چکا ہے۔ میں بھی وہاں آئی تھی۔ میرے ڈرائیور نے ایک بارہ تیرہ سال کے گول مٹول سے بچے کی طرف اشارہ کرکے بتایا تھا کہ بی بی! وہ بہار شاہ کا بیٹا ہے۔ اس کا نام شیر شاہ ہے...... اور پھر اسی گول مٹول سے بچے نے بڑے ہوکر دانیہ شاہ کو الیکشن میں پچھاڑ دیا۔"

اس کے لہجے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ محض بات کر رہی تھی یا پھر اپنے اندر کی بھڑاس نکال رہی ہے۔ ایکدم اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر پھر میں نے یہ سوچ کر کہ شاید مجھے مسکرانا نہیں چاہیے...... ہونٹ بھینچ لیے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھرپور جثے کی عورت تھی۔ اس کا قد میرے برابر تھا۔

"میں اب چلوں گی شیر شاہ!" اس نے اپنا پرس اٹھالیا۔

"آپ تشریف لائیں، مجھے بہت خوشی ہوئی۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہم ملتے جلتے رہیں تو کوئی حرج نہیں۔"

"آپ جب چاہیں، مجھے یاد کیجیے گا۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھ سے بڑی ہیں دانیہ شاہ!"

اس نے اپنے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں کو مسکرانے کے لیے حرکت دی...... پھر سر پر عادتاً اپنا دوپٹا درست کرتی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی جہاں اس کا گن مین لینڈ کروزر میں اس کا منتظر تھا۔

اس کے جاتے ہی قادر بخش اندر آ گیا۔ میں وہیں بیٹھ کر سگریٹ سلگا چکا تھا۔

"شاہ صاحب! سب ٹھیک رہا؟" قادر بخش نے پوچھا۔

"ہاں، سب ٹھیک رہا۔" میں نے سگریٹ کا کش لگا کر جواب دیا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے شاہ صاحب؟"

میں نے کہا۔ "تم ابھی مجھے یہاں تنہا چھوڑ دو قادر بخش! میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔"

"جو حکم شاہ صاحب" کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

قادر بخش کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ وہ ابا جی کا بہت با اعتماد ملازم تھا اس لیے ان کے انتقال کے بعد میں نے قادر بخش کو سابقہ پوزیشن پر برقرار رکھا تھا۔ وہ اب میرا خاص آدمی تھا جسے کسی بھی وقت میری خواب گاہ میں آنے کی اجازت حاصل تھی اور وہ ہر سفر میں میرے ساتھ رہتا تھا۔ میں جب صوبائی اسمبلی میں ہونے والے اجلاسوں میں شرکت کے لیے لاہور جاتا تو وہ کئی کئی دن تک میرے ساتھ ہی ٹھہرتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے بھی جان لیا تھا کہ وہ واقعی بہت ہوشیار اور ذہین شخص تھا۔ اس کی صلاحیتوں پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

قادر بخش نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تو میں سگریٹ کے دھوئیں کے درمیان دانیہ شاہ کو دیکھنے لگا۔ اس کا یوں چلے آنا میری دانست میں کوئی عام بات نہیں تھی۔ میں کافی دیر تک وہاں اکیلا بیٹھا رہا اور اس نہج پر سوچتا رہا۔ تو کیا واقعی وہ دانیہ شاہ اتنے بڑے دل والی تھی کہ مجھ سے ہارنے کے بعد مجھے فتح کی مبارکباد دینے چلی آئی تھی؟ کیا واقعی وہ اتنے ظرف والی ہے؟

مجھے ابھی سیاست میں وقت ہی کتنا ہوا تھا۔ میں الیکشن تو جیت گیا تھا مگر ابھی مقامی سیاست کی باریکیوں سے ناواقف تھا۔ میرے ملازمین جو ابا جی کے زمانے سے تھے، مجھے مقامی سیاست کی اونچ نیچ سمجھاتے تھے اور مجھ پر یہ کھلا تھا کہ مقامی سیاست تو قومی سیاست سے بھی پیچیدہ ہے۔ جب ابا جی سیاست کر رہے تھے۔ اس وقت میں پڑھائی میں مصروف رہا تھا۔ ابا جی کا خیال تھی کہ موجودہ دور میں سیاستدان کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہیے، یہ ضروری ہے۔ اب جعلی ڈگریوں والے سیاستدان عنقریب پس منظر میں چلے جائیں گے۔ ابا جی نے خود تو بی اے کی پچیس ہزار روپے میں خریدی گئی جعلی ڈگری کے ساتھ عمر بھر سیاست کرتے اور ایوان میں پہنچتے رہے تھے مگر وہ آنے والے وقت کے تقاضوں سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میری تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی اور میں دو سال تک لندن میں بھی زیر تعلیم رہ چکا تھا۔

قادر بخش دانیہ شاہ کی آمد پر خاصا متفکر نظر آیا تھا۔ مگر میں نے اس پر کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ جب میں کافی دیر تک سوچتا رہا اور میرا ذہن مطمئن نہیں ہوا تو میں نے قادر بخش کو بلا لیا۔

''حکم شاہ صاحب!'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔

میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے بلاتمہید پوچھا۔ ''قادر بخش! دانیہ شاہ کی آمد کو تم کس نظر سے دیکھتے ہو؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ متذبذب ہو کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''جب وہ آئی تو تم بہت متفکر نظر آرہے تھے۔ مجھے لگا تم پریشان ہو اور کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

اس پر وہ چند ثانیوں تک بیٹھا موزوں الفاظ ڈھونڈتا رہا۔ پھر بولا۔ ''آپ کو علم ہی ہوگا کہ دانیہ بی بی کے باپ ظاہر شاہ نے درجنوں مرتبہ بڑے شاہ صاحب پر قاتلانہ حملے کروائے تھے۔ میں سید ذات کی دل سے عزت کرتا ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ ظاہر شاہ نہایت ہی کینہ پرور اور ظالم شخص تھا۔ وہ اپنی بہادری کے لیے مشہور تھا مگر اصل میں وہ کمزوروں اور غریبوں کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔ لوگوں کو ذلیل کرنا اور ان کی بہو، بیٹیوں پر بری نظر رکھنا...... یہ سب بیماریاں ظاہر شاہ میں موجود تھیں۔''

''یہ سب باتیں مجھے بھی معلوم ہیں مگر ظاہر شاہ مر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

قادر بخش بولا۔ ''دانیہ بی بی ظاہر شاہ کی بیٹی ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ظاہر شاہ پانچ شادیوں کے باوجود اولاد نرینہ سے محروم رہا تھا۔ دانیہ بی بی اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ظاہر شاہ نے جب یہ تسلیم کرلیا کہ اب نرینہ اولاد کی اُمید رکھنا بیکار ہوگا تو اس نے دانیہ بی بی پر توجہ دی۔ اس نے کم عمری میں ہی دانیہ بی بی کو اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا تھا اور اسے سیاسی داؤ پیچ سکھاتا رہا تھا۔ یہ دانیہ بی بی بھی اپنے ظلم اور کینے کی وجہ سے مشہور ہے۔ بس آپ سمجھ لیں کہ یہ دانیہ بی بی ظاہر شاہ کی فوٹو کاپی ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کھل کر کہو۔'' میں نے کہا۔

''میں نے بڑے شاہ صاحب کے ساتھ عمر گزاری ہے۔ ہمیشہ ان کا بھلا سوچا ہے اور جو بھی قدم اٹھایا ہے، ان کی بہتری کے لیے اٹھایا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''اب میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو بھی صحیح مشورہ دوں اور آپ کی بہتری کے لیے سوچوں۔''

''نکتے کی بات کرو قادر بخش!'' میں نے کہا۔ ''تمہاری بات میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔''

اس نے دوٹوک کہا۔ ''شاہ صاحب! آپ کو دانیہ بی بی سے بچ کر رہنا چاہیے۔ وہ الیکشن ہاری ہوئی ہے، ہمارے مقامی سیاستدان اپنے اعمال سدھارنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جیتنے والے اُمیدوار کے دشمن بن جاتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر وہ میری دشمن بن چکی تھی تو پھر اسے میرے ڈیرے پر یوں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے قادر بخش کی بات سن کر عجیب سا لگا تھا مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بات کو سرے سے درخورِ اعتناء ہی نہ سمجھا جائے۔

میں نے کہا۔ ''قادر بخش! دانیہ شاہ اپنے باپ کی طرح روایتی سیاستدان نہیں ہے، وہ پڑھی لکھی اور دانا عورت ہے...... اگر اس کے دل میں میرے لیے بغض ہوتا تو پھر وہ مجھے مبارکباد دینے کیوں آتی بھلا؟''

''فیصلہ تو آپ نے ہی کرنا ہے شاہ صاحب!'' وہ بولا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ آپ اس کی آمد کو نقارۂ جنگ سمجھیں۔ وہ ہار کے چپ بیٹھنے والی نہیں ہے۔ اب جب تک اگلے انتخابات نہیں آجاتے، وہ ہمارے خلاف سازشوں میں مصروف رہے گی۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دانیہ بی بی کے خاندان کے کئی افراد بھی اس کے خلاف ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی بیٹی اور اس کا داماد بھی اس کو پسند نہیں کرتے۔ اس کے دو بیٹے ہیں جنہیں اس نے پڑھائی کے لیے یورپ بھیج رکھا ہے اور یہاں پر اکیلی حکومت کر رہی ہے۔ اس کا شوہر بھی ایک نامی گرامی شخص ہے، سید زاہد حسین شاہ مگر یہ اس کو بھی خاطر میں نہیں لائی۔ اس کا دین ایمان طاقت ہے۔ اپنے مخالفوں سے انتقامی کارروائی کے لیے یہ مشہور ہے۔''

قادر بخش کی باتوں نے میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ ہم بسا اوقات عمارت کی ظاہری خوبصورتی دیکھ کر مبہوت رہ جاتے ہیں اور عمارت کے اندرونی کاٹھ کباڑ کو بھول جاتے ہیں۔ میں نے دانیہ شاہ کے لیے اپنے ذہن میں جو تصور قائم کیا تھا، قادر بخش کی باتیں اس سے یکسر مختلف تھیں۔ میں نے دانیہ شاہ کو معاملہ فہم، تعلیم یافتہ اور باشعور عورت سمجھ لیا تھا جبکہ قادر بخش مختلف کہانی سنا رہا تھا۔

''قادر بخش!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''حکم شاہ صاحب!'' وہ مستعد تھا۔
''دانیہ شاہ مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟''
''شاہ صاحب! وہ آپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی بھی ہتھکنڈا استعمال کر سکتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جب تک آپ موجود ہیں، وہ الیکشن نہیں جیت سکے گی۔ جب کوئی بندہ سیاست میں آتا ہے تو وہ جیتنے کے لیے ہی آتا ہے۔ وہ بھی جیتنے کے لیے ہر حد تک جائے گی......''
''ایسے میں مجھے کیسے ہوشیار رہنا چاہیے؟''
''آپ کو اپنی سیکیورٹی پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔'' وہ بولا۔'' آپ میں اور ایک عام انسان میں فرق ہے۔ بلاشبہ عوام کی طاقت آپ کے ساتھ ہے مگر یہ مٹھی بھر دشمن کسی بھی وقت بہت کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔ کتابی سیاست عملی سیاست سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ آپ کے ذہن میں شاید مہذب دنیا کا اور یورپی انداز سیاست موجود ہوگا مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا سیاسی نظام سب سے زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ہے۔ جہاں قانون بے بس اور کمزور ہوتا ہے، وہاں ایسے نظام بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔''
میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔''میں آیندہ سیکیورٹی کا خیال رکھوں گا۔ ویسے یہ شرمناک بات ہے کہ عوام کے منتخب نمایندوں کو یوں چھپ چھپ کر سیکیورٹی کے سخت حصار میں رہنا پڑتا ہے۔''
''سیاست اب ایک گیم بن چکا ہے شاہ صاحب! خصوصاً ہمارے ملک میں۔'' قادر بخش بولا۔''یہاں قدم پھونک پھونک کر رکھنے پڑتے ہیں۔''
میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں مستقبل کے لیے کچھ منصوبے موجود تھے۔ جنہیں عملی شکل دینا تھی۔
صبح ناشتے کے بعد میں اخبار پڑھ رہا تھا تو یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ میں نے گزشتہ روز اسمبلی کے اجلاس میں جو تقریر کی تھی، اس کی رپورٹ شائع کی گئی تھی۔ میں نے علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے جو تجاویز پیش کی تھیں اور اپنے حلقے کے مسائل کو جس طرح اجاگر کیا تھا، اخبار کے تجزیہ کار نے اسے سراہا تھا۔ علاوہ ازیں ایک مقامی اخبار نے میری تصاویر شائع کی تھیں اور مجھے اصول پرست اور غیر روایتی نوجوان سیاستدان کہا تھا۔
اسی دوران میں میرا ایک خاص آدمی جو دراصل سیکیورٹی انچارج تھا، بدحواسی کے عالم میں میرے پاس آیا۔
''سلام شاہ صاحب!''
میں نے بغور دیکھا۔''وعلیکم السلام۔ نصیر شاہ! خیریت؟''
''خیریت نہیں ہے شاہ صاحب۔''
''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر اس کے فق رنگ کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے ترشی سے پوچھا۔
اس نے بتایا۔''شاہ صاحب ہمارے پانچ آدمی مارے گئے ہیں۔''
یہ غیر معمولی بات تھی۔ مجھے دھچکا لگا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''
''شاہ صاحب! ان بدنصیبوں کی لاشیں ڈیرے پر پڑی ہیں۔'' نصیر شاہ نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ بتایا تو میرے رگ و پے میں طیش بھر گیا اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر ڈیرے کی طرف بڑھا۔ نصیر شاہ بھی میرے ساتھ چلتا ہوا آ رہا تھا۔
ڈیرے پر آ کر دیکھا تو واقعی پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ سب میرے خاص اور بااعتماد لوگ تھے جو اس وقت ساکت پڑے تھے۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔ ان کی مجروح حالت دیکھ کر میرے اشتعال میں مزید اضافہ ہو گیا۔
میں نے گھوم کر نصیر شاہ کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور کہا۔''یہ سب کیا ہے نصیر شاہ؟''
نصیر شاہ نے جھجکتے ہوئے بتایا۔''دانیہ شاہ کے گرگوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ دوسری طرف بھی پانچ سات لوگ مارے گئے ہیں۔''
''مگر دانیہ شاہ سے ہماری کیا دشمنی ہے؟'' میرے انداز میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔
''شاہ صاحب! وہ ہماری دشمن ہے۔'' نصیر شاہ نے یوں بتایا جیسے وہ میری کم علمی و کم عقلی پر ماتم کناں ہو۔
''مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔ سیاست میں کوئی ایک جیتتا ہے اور کسی ایک کو مات ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس بات پر دشمنی پال لی جائے۔'' میں نے کہا۔''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ ہوا کیا تھا؟''
وہ اپنی داڑھی کو کھجاتا ہوا کہنے لگا۔''شاہ اکبر موڑ پر ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہم ایک گاڑی میں تھے اور وہ دو گاڑیوں پر سوار تھے۔ دانیہ شاہ کے ایک آدمی نے ہمارے آدمی ظہور الٰہی کو پھبتی کسی تھی اور کہا تھا کہ تمہارے نئے آقا سے بھی نمٹ لیں گے۔ بس پھر ہمارے آدمی غصے میں آ گئے

اور فائرنگ شروع ہوگئی......''

وہ چپ ہوا تو میں نے اسے سخت نظروں سے گھورا۔ ''یعنی فائرنگ کا آغاز تم لوگوں نے کیا تھا؟''

اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ''جی شاہ صاحب۔''

''گدھے ہو تم لوگ۔'' میں نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا ضرورت تھی فائر کھولنے کی؟ اگر ابتداء تم لوگوں نے نہ کی ہوتی تو ہیں اس واقعے کی تحقیقات کرواتا اور ان لوگوں کو سزا ملتی۔ اب ہمیں پولیس سے بھی نمٹنا ہوگا۔''

اس نے وثوق سے کہا۔ ''پولیس کی فکر نہ کریں۔ وہ اس معاملے میں نہیں پڑے گی۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ ہمارے درمیان تو جھڑپیں چلتی ہی رہتی ہیں۔ پولیس خود کو حتی المقدور ہمارے معاملات سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔۔۔ کیونکہ دونوں پارٹیاں مضبوط ہیں۔ جب کارروائی شروع ہوتی ہے تو دونوں فریق خود کو بے قصور اور مخالف کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ پیسا چلتا ہے اور تعلقات استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے میں پولیس بیچ میں پس کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ہماری طرف سے دانستہ لاعلم رہتی ہے۔''

یہ جان کر مجھے واقعتاً حیرت ہوئی تھی۔ مقامی پولیس کا یہ رویّہ میرے لیے انکشاف انگیز تھا۔ شاید اسی لیے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قانون محض عام آدمی کو دبا کر رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ امیر طبقے کے لیے قانون کا کردار خاموش تماشائی کا سا ہے بلکہ بسا اوقات یہی قانون امیروں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

پھر میں نے بے دلی سے کہا۔ ''لاشوں کی تدفین کا بندوبست کرواور ان کے لواحقین کے لیے امداد کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔''

''جو حکم شاہ صاحب۔'' نصیر شاہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔

مجھ سے وہاں کھڑا نہیں ہوا گیا تو میں وہاں سے چلا آیا۔ میری ذہنی رو قادر بخش کی باتوں کی طرف پلٹ گئی۔ اس نے دانیہ شاہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، ناچار اس پر یقین کرنا پڑ رہا تھا۔

اتنے میں قادر بخش بھی وہاں آیا۔ وہ کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ شہر سے لوٹتے ہی میرے پاس چلا آیا۔ میں نے کہا۔ ''لاشیں دیکھ ہی لی ہوں گی تم نے۔''

''جی ہاں۔'' وہ افسردگی سے بولا۔ ''دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں نے دانیہ شاہ کے بارے میں پہلے ہی آپ کو خبردار کردیا تھا؟''

''فائرنگ کی ابتداء ہماری طرف سے ہوئی تھی قادر بخش۔'' میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ ''ایسا ہی ہوا ہوگا شاہ صاحب! مگر دانیہ شاہ کے کارندوں کو بھی بے قصور نہیں کہا جاسکتا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ''بے وقوفی تو ہمارے لوگوں نے کی ہے اگر یہ لوگ پہلے فائرنگ نہ شروع کرتے تو پھر امکان تھا کہ ایسی نوبت نہ آتی۔''

قادر بخش نے کہا۔ ''دانیہ شاہ نے اپنے لوگوں کو فساد کی کھلی اجازت دے رکھی ہے شاہ صاحب! وہ لوگ جان بوجھ کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور باتوں سے ہمارے آدمیوں کو اشتعال دلاتے ہیں۔ ان کا مقصد فساد ہوتا ہے۔ بڑے شاہ صاحب کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔''

''وہ لوگ اگر ہمارے لوگوں پر پھبتیاں کسیں گے تو کیا ہمارے لوگ احمقوں کی طرح خون بہانے پر تیار ہوجائیں گے؟'' میں نے سخت انداز میں کہا۔ ''کیا ہمارے لوگوں میں اتنی عقل نہیں ہے؟''

قادر بخش نے بتاتے ہوئے کہا۔ ''بڑے شاہ صاحب نے ہمارے لوگوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر دانیہ شاہ کی طرف سے ایسی کوئی حرکت سامنے آئے تو بھرپور جواب دیا جائے۔۔۔ ورنہ ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور دانیہ شاہ بے لگام ہوجائے گی۔'' پھر اس نے مزید کہا۔ ''یہ بات درست ہے کہ ہمیں بھرپور جوابی کارروائی کرنی چاہیے۔ آپ کے لیے بھی یہی مشورہ ہے۔ دانیہ شاہ کو کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ آپ نرم پڑ رہے ہیں۔۔۔ ورنہ وہ بہت مسائل پیدا کرسکتی ہے۔''

میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ مقامی سیاست کے جوہر آہستہ آہستہ مجھ پر کھلتے جارہے تھے اور مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ اس کارزار میں کیسی کیسی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''تم ابھی جاؤ قادر بخش!'' میں نے کہا۔ ''ان لاشوں کی تدفین کی نگرانی کرو۔''

''جو حکم شاہ صاحب۔'' قادر بخش نے کہا۔

میں نے پھر کہا۔ ''ان لوگوں کے لواحقین کی مالی امداد

بھی ضروری ہے۔ میں جلد ہی اس حوالے سے کوئی فیصلہ کرلوں گا۔ تم ان کے لواحقین کو تسلی دو۔"

"ایسا ہی ہوگا شاہ صاحب۔" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

میں حالات پر غور وفکر کرنے لگا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھے انتظامی امور میں بہت توجہ دینا ہوگی اور اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے مخالفین کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹنا تھا۔

☆☆☆

اسمبلی میں شرکت کے لیے میں اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ مجھے خبر ملی کہ دانیہ شاہ بھی آئی ہوئی ہے تو میں نے ملنے کی استدعا کی۔ ملاقات کے لیے جگہ بھی بتادی۔ مجھے بالکل اُمید نہ تھی کہ وہ میری پیشکش قبول کرے گی۔ مگر حیرت انگیز طور پر میں اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہوگیا۔ کیونکہ وہ ہوٹل کے دروازے سے اپنے مسلح گن مین کے ساتھ داخل ہو رہی تھی۔ سفید شلوار قمیص میں اور سر پر سفید دوپٹا لیے وہ بہت ہی پُرکشش اور باوقار عورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی سیدھی میری میز کی طرف آئی۔ میں نے کھڑے ہوکر استقبال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پُراعتماد مسکراہٹ نمودار ہوئی، پھر وہ سر کو ہلکا سا خم دے کر میرے مقابل بیٹھ گئی۔

"بہت شکریہ دانیہ شاہ کہ آپ نے نا صرف میری درخواست کو قابل عمل سمجھا بلکہ بروقت بھی پہنچ گئیں......"

اس نے کہا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو شیر شاہ! تم سے بات کرکے تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں جیتی ہوئی اور تم ہارے ہوئے اُمیدوار ہو۔"

میں نے اس کی بات تحمل سے سنی۔ پھر مدعا بیان کیا۔ "آپ کو اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ میں نے آپ سے ملاقات کی درخواست کیوں کی؟"

"شیر شاہ! میں جانتی ہوں، مگر تم اپنی زبان سے بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے کہا۔ "ہمارے لوگوں میں تصادم ہوا......میرے پانچ آدمی مارے گئے۔ اتنے ہی غالباً آپ کے لوگ کام آگئے......"

وہ میری بات پوری ہونے سے قبل ہی بے نیازی سے شانے اُچکا کر بولی۔ "یہ تو معمول کی کارروائی ہے...... ہر چند مہینوں کے بعد کہیں نہ کہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔"

"مگر میں سیاست کو جنگ نہیں سمجھتا۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "یہ سب کچھ ختم ہوجائے تو ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس خون خرابے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کو ایسی معاندانہ کارروائیاں ترک کرکے اگلے انتخابات کا انتظار کرنا چاہیے اور اس دوران میں خود کو عوام کے لیے کارآمد ثابت کرنا چاہیے۔"

اس نے موضوع ہی بدل دیا۔ "کتنی عجیب سی بات ہے۔ ہم دونوں عام لڑکی لڑکے کی طرح ایک ہوٹل میں مل رہے ہیں...ورنہ دستور کے مطابق ہمیں کسی مناسب جگہ پر ملنا چاہیے تھا۔ خیر، تم نے باہر سے تعلیم حاصل کی ہے......جو باہر سے پڑھتے ہیں انہیں اپنی تہذیب فرسودہ لگنے لگتی ہے......اور وہ انگریز کو ہر میدان میں راہنما سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ہوٹلوں میں ملنے والی روایت بھی ہم نے انگریز سے متاثر ہوکر ہی اپنائی ہے۔ اب ہوٹلوں میں بھلا کام کی بات کیسے ہوسکتی ہے؟"

"دانیہ بی بی!" میں نے سخت لہجے میں کہا کہ اس کی باتیں سن کر مجھے تپ چڑھ گئی تھی۔ "جگہ کوئی بھی ہو، فرق نہیں پڑتا۔ میں منطقی اور تعمیری بات کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ بھی سنجیدگی سے میری بات پر غور کریں گی۔"

اس نے ذرا ناراضی کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ یوں لگا جیسے اس کو میرے گستاخانہ لب و لہجے نے برہم کیا تھا۔ تاہم اس نے ضبط نہیں کھویا اور ذرا ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "کل شام چھ بجے مجھ سے میرے ڈیرے پر ملو......"

اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور جس طرح آئی تھی اسی طرح تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہوٹل کے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ مجھے اپنے ڈیرے پر بلا کر کیا ثابت کرنا چاہتی تھی؟ میں دیر تک ہوٹل میں بیٹھا اس موضوع پر سوچتا رہا......مگر کوئی مناسب اور اطمینان بخش نکتہ میرے ذہن میں نہیں آسکا۔

میں نے حویلی میں آکر قادر بخش کو یہ بات بتائی تو اس نے بلاتردد اور دوٹوک انداز میں کہا۔ "شاہ صاحب! آپ کو اس کے ڈیرے پر نہیں جانا چاہیے۔"

"اس کی وجہ؟"

"اس کی وجہ بہت واضح ہے۔ آپ انتخابات جیتے ہیں، وہ ہاری ہے۔ ابھی انتخابات کو زیادہ وقت نہیں گزرا، آپ جب اس کے ڈیرے پر جائیں گے تو لوگ آپ

کو دیکھیں گے اور طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ لوگوں کی نظر میں آپ کا تشخص متاثر ہوگا۔ یہ لازمی بات ہے...... آخر لوگوں کو تجسس تو ہوگا ہی کہ انتخابات جیتنے کے بعد شاہ صاحب اپنی حریف کے ڈیرے پر کیوں گئے؟ ہوسکتا ہے شہروں میں یہ عام سی بات ہو، مگر دیہی سیاست ذرا مختلف ہے۔ یہاں لوگ اور نہج پر سوچتے ہیں۔ ان کا زاویہ نظر ہی مختلف ہے۔'' قادر بخش نے دانشورانہ انداز میں کہا ''ویسے بھی دانیہ شاہ کی فطرت کوئی اچھی نہیں ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنا فائدہ نہیں بھولتی۔ اگر آپ برا نہ محسوس کریں تو میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دانیہ شاہ کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے...... وہ شیطان کھوپڑی والی عورت ہے۔''

''تم اس سے کافی بدظن ہو قادر بخش۔'' میں نے ذرا مسکرا کر کہا۔

''ایک عمر سے اس کے کارناموں کو دیکھتے دیکھتے اس کی فطرت کو اچھی طرح جان چکا ہوں۔''

''لیکن میرا یہ خیال ہے کہ ایک دفعہ مجھے دانیہ شاہ سے مل لینا چاہیے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس نے شام چھ بجے کا وقت دیا ہے۔ اس وقت خاصا اندھیرا پھیل جاتا ہے۔''

''پھر میرا ایک مشورہ ہے شاہ صاحب!''

''بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''آپ عام کار میں جائیں...... اس سے کسی کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ آپ وہاں گئے ہیں......''

''زبردست۔'' میں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ''بہت زبردست مشورہ دیا ہے تم نے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔''

''ایک درخواست اور ہے......''

''ہاں، ہاں۔ کہدو۔''

''آپ کے ساتھ صرف ایک شخص بطور ڈرائیور اور گارڈ جائے گا۔'' قادر بخش نے کہا۔ ''اور وہ شخص میں ہوں گا۔''

میں نے اس کی بات بلاتردد مان لی۔ ''او کے۔ ٹھیک ہے۔ تم تیاری رکھو قادر بخش! ہم ٹھیک پانچ بجے یہاں سے نکلیں گے۔ ہمیں چھ بجے دانیہ شاہ کے گاؤں پہنچنا ہے۔ وقت کی پابندی بہت ضروری ہے اس سے انسان کی قدر بڑھتی ہے۔''

قادر بخش نے سر ہلا کر کہا۔ ''آپ کا کہنا درست ہے۔ میں اب چلتا ہوں تاکہ کار تیار کروالوں۔''

''بالکل۔ تم جاؤ اور جلد از جلد یہ کام کر گزرو۔'' میں نے کہا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

دانیہ شاہ کے شاہانہ ڈیرے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر آئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

''ویلکم ویلکم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر خود بھی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ شاید وہ ہمیشہ سفید شلوار قمیص ہی زیب تن کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے سفید شلوار قمیص پر سفید ہی دوپٹا لیا ہوا تھا۔ سڈول اور خوبصورت پیروں میں پٹیوں والے سادہ سینڈل تھے چہرے پر ہلکا میک اپ تھا اور ہاتھ میں اینڈرائیڈ موبائل پکڑا ہوا تھا۔

''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔'' اس نے بھرپور مسکراہٹ میری طرف پھینکی...... انرجی سیور کی روشنی میں اس کے دانت چمکے۔

''میں نے کہا تھا کہ جب بھی آپ بلائیں گی...... میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' میں نے بھی جوابی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''بہت اچھے......'' اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''تم میرے ڈیرے پر آئے، مجھے اچھا لگا۔''

میں نے مدعے کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''تو کام کی بات ہو جائے......''

پہلے اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ آج وہ بہت سرور میں معلوم ہوتی تھی۔ پھر کچھ فاصلے پر ایک چارپائی پر موجود قادر بخش کی طرف اشارہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتی تھی؟

''قادر بخش!'' میں نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

وہ میرے پکارنے پر مستعدی سے بولا۔ ''حکم شاہ صاحب!''

''تم باہر میرا انتظار کرو۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر ''اچھا شاہ صاحب!'' کہتا ہوا ڈیرے سے باہر چلا گیا۔

جب کامل تخلیہ ہو گیا تو وہ زیرلب مسکراتے ہوئے

میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''ہاں تو لڑکے! اب کہو، کیا چاہتے ہو؟''

''امن۔'' میں نے یک لفظی جواب دیا۔

''امن کو کون خراب کر رہا ہے؟'' اس کا انداز محض سرسری سا تھا۔ جیسے یہ اس کے لیے غیر دلچسپ اور غیر اہم موضوع ہو۔

میں نے کہا۔ ''آپ جانتی ہی ہیں..... چند دن پہلے آپ کے لوگوں نے میرے لوگوں سے الجھ کر خون خرابا کیا ہے.....''

''شیر شاہ! تم بھول رہے ہو یا پھر کسی نے تمہیں صحیح بتایا نہیں ہے..... کہ فائرنگ کی ابتداء تمہارے لوگوں نے کی تھی۔''

''مجھے معلوم ہے مگر کسی شریف جانور کی دم کو بھی پکڑ کر مروڑنا شروع کر دیا جائے تو وہ غصے میں آجاتا ہے..... آپ کے لوگوں نے طیش دلایا تو میرے لوگوں نے فائرنگ کی۔'' میں نے ذرا مہذب اور دھیما لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''خیر جو ہوا، سو ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

اس نے میری آنکھوں میں دور تک دیکھا۔ ''دھمکا رہے ہو؟''

''نہیں۔ محض بات کر رہا ہوں اور میں تعمیری بات چیت کا قائل ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دھمکانے آتا تو یوں اکیلا نہیں آتا.....''

میں نے بات ختم کی تو وہ بھی چند لمحوں تک چپ بیٹھی رہی۔ میں اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

مگر وہ تو جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے وقت لے رہی تھی۔ اس کے پُرسکون چہرے پر ٹھہراؤ تھا۔ پھر جیسے وہ کسی منطقی فیصلے تک پہنچ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یوں نظریں چار ہوئیں تو میں نے نظریں پھیر لیں۔

''شیر شاہ!'' اس کی دھیمی آواز نے میری سماعتوں کو چھوا۔ ''تم چاہو تو یہ دشمنی مستقل دوستی میں بدل سکتی ہے۔''

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میں تو یہی چاہتا ہوں دانیہ شاہ! میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''دیکھ لو۔ امن کے لیے ہر قیمت چکانے کے لیے تیار ہو؟'' اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے اٹل انداز میں کہا۔ ''ہاں۔''

''تو پھر تمہیں مجھ سے نکاح کرنا ہوگا۔''

مجھے اپنے سماعت پر یقین نہیں آیا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا؟'' میرے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

وہ بڑے پُرسکون انداز میں بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے میرے ردِعمل کا لطف اٹھانے کے موڈ میں ہو...... حقیقت یہ تھی کہ اس کی بات میرے گیان میں بھی نہ تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ مذاق کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے اٹھارہ انیس سال بڑی تو تھی ہی کئی جوان بچوں کی ماں بھی تھی اور بقول خود اس کے، وہ نواسوں پوتوں والی ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا شوہر بھی حیات ہے۔ ایسے میں اس کی یہ پیشکش محض مذاق ہی ہو سکتی تھی۔ شاید اس نے میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ بات کہی تھی۔

مگر میں ذرا بھی نہیں گھبرایا تھا۔ ''دیکھیں دانیہ شاہ! بہتر ہوگا کہ ہم کام کی بات کریں...... ابھی چند روز پہلے ہمارے لوگ ایک تصادم میں کام آئے ہیں، ہمیں مذاق کے بجائے سنجیدگی سے اپنے مشترکہ مسائل کو بیٹھ کر حل کرنا چاہیے۔''

''شیر شاہ! میری باتوں کو مذاق مت سمجھو۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ''میں نے تمہیں جو پیشکش کی ہے، اس پر غور کرو۔ امن صرف اسی پیشکش میں پوشیدہ ہے۔''

''میں حیران ہوں اور سخت شرمندہ بھی کہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟''

''تمہیں نہ حیران ہونے کی ضرورت ہے، نہ شرمندہ ہونے کی۔'' اس نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''سیاسی شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ سیاسی شادیاں بڑے مقاصد کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں تو شادی کی ضرورت نہیں ہے...... میری آپ سے درخواست ہے کہ.....''

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''امن کی صورت صرف ہمارے نکاح میں پوشیدہ ہے شیر شاہ! مانا کہ میں عمر میں تم سے بڑی ہوں، مگر کیا بڑی اور بدصورت لگتی ہوں؟ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟ میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔ اس شادی کا تمہیں فائدہ یہ ہوگا کہ نہ صرف تم سیاسی مخالفت سے بچ جاؤ گے بلکہ بلا مقابلہ اسمبلی میں پہنچو گے۔ میں تمہاری

منکوحہ بن کر سیاست سے تمہارے حق میں دستبردار ہو جاؤں گی......"

"مگر آپ شادی شدہ اور جوان بچوں کی ماں ہیں۔ آپ کے بچوں کے بچے ہیں۔" میں نے الجھن زدہ ہو کر کہا۔ "مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہیں۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں بچپن کی اس شادی پر... جب میرے باپ نے مجھے زاہد شاہ جیسے بڈھے کے پلے باندھ دیا تھا، میں ابھی تک اسے بھگت رہی ہوں۔ جب مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ شوہر کیا ہوتا ہے، مجھے اس ہوس کے پجاری کے حوالے کردیا گیا تھا۔ اب وہ بیاسی سال کا بڈھا کسی بھی وقت مر کھپ سکتا ہے۔ کیا مجھے اپنے دل کی بات سننے کا کوئی حق نہیں ہے شیر شاہ!" وہ کٹیلے انداز میں بولی۔

"میں اب بھی پُرکشش ہوں، جوان ہوں۔ ایسے میں اگر میں تم جیسے سوہنے سجیلے کی نوکرانی بننے کے خواب دیکھنے لگی ہوں تو کیا برا ہے؟ جو ازدواجی خوشیاں ایک غریب عورت بھی حاصل کرسکتی ہے، وہ مجھے کیوں نہیں حاصل ہوسکیں۔ بولو شیر شاہ!"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ آیندہ ہمارے درمیان بات چیت بھی نہیں ہو پائے گی۔"

وہ بھی اٹھ کر چند قدم میرے قریب آئی اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "نہیں شیر شاہ! ڈرو مت۔ تم پڑھے لکھے اور خوبصورت نوجوان ہو۔ میں بھی کوئی عام عورت نہیں ہوں۔ تم سوچو، مجھ سے شادی کرنے میں کیا برائی ہے؟ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟ میں مانتی ہوں کہ تم مجھ سے کافی چھوٹے ہو۔ میں پینتالیس کی ہونے والی ہوں۔ مگر میرے دل میں ازدواجی زندگی کی حسرتیں موجود ہیں۔ میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گی کہ تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگو گے۔ مجھے کہنے دو کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

صورتِ حال کو اپنے اوپر سوار کرنے کے بجائے میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دانیہ شاہ! ہمارے مذہب میں ایک مرد بیک وقت چار بیویاں تو رکھ سکتا ہے مگر یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ ایک عورت ایک سے زیادہ شوہر بھی رکھ سکتی ہے......"

میرے تبصرے نے اور میرے ہلکے پھلکے انداز نے شاید اسے برگشتہ کیا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ بیک وقت لہرائے، گویا اس نے اپنی توہین محسوس کی تھی۔ "تم میرے شوہر کی فکر مت کرو۔ اسے راستے سے ہٹانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"ذرا تفصیل بتانا پسند کریں گی؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ بڈھا اب بالکل عضو معطل کی طرح گھر میں پڑا ہے...... یادداشت بھی بہت کمزور ہوچکی ہے اس کی۔" اس نے سفاکی سے کہا۔ "وہ موت کا انتظار کررہا ہے، اس کا یہ انتظار سیکنڈوں میں ختم کیا جاسکتا ہے......" پھر وہ چند قدم مجھ سے دور ہوئی۔ میں اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔ "تم صرف اپنے حصے کی فکر سنبھالو۔ تم چاہو تو سوچنے کے لیے وقت لے لو...... کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں ایک دو روز میں زاہد شاہ کو قدرتی موت سے ہمکنار کر کے اس سے پیچھا چھڑوالوں گی۔"

"کیا کوئی عورت اتنی سفاک بھی ہوسکتی ہے دانیہ شاہ!" میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ میری طرف پلٹی۔ پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بولی۔ "اس سے بھی زیادہ...... یہ تو کچھ بھی نہیں۔"

"یعنی جس انسان کے ساتھ آپ تیس سال تک منکوحہ کی حیثیت سے رہیں...... اسے قتل کردیں گی؟ یہ ہے طویل رفاقت کا ثمر۔"

وہ بھڑک اٹھی۔ شاید کوئی بھی خلاف مزاج بات سن کر بھڑک اٹھنا اس کی فطرت تھی "تم مجھے مت بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے، میں پچھلے پندرہ سال سے سہاگن ہونے کے باوجود بیواؤں کی سی زندگی گزار رہی ہوں۔ زاہد شاہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پندرہ سال پہلے ہی بیوی کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ سزا میں کیوں بھگتوں؟ ابھی میں پینتالیس کی ہوں، میں اب بھی اپنی زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کرسکتی ہوں۔"

"آپ ضرور اپنی زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کریں۔" میں نے کہا۔ "مگر میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔ کل کلاں اگر میں کسی وجہ سے اپاہج ہوجاتا ہوں یا پھر کسی بیماری کی وجہ سے ازدواجی تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں رہتا تو پھر میرا انجام بھی زاہد شاہ سے مختلف نہیں ہوگا...... ویسے بھی دانیہ شاہ! آپ حاکمانہ مزاج ہیں، آپ کی زندگی میں کوئی ضرورت مند نمائشی شوہر کی ذمے داریاں تو

نبھا سکتا ہے مگر حقیقی شوہر کبھی نہیں بن سکتا۔''
وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے بہت مارا ماری کی زندگی گزار لی، دشمنیاں بھی دیکھ لیں اور دوستیاں بھی...... مگر اب میں ایک عام عورت بن کر رہنا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر کے لیے، اپنے شوہر کے لیے جینا چاہتی ہوں۔ تم چاہو تو مجھ سے معاہدہ کروالو۔ میں نکاح کے فوراً بعد ہی سیاست سے دستبرادی کا اعلان کردوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے مقابلے میں کوئی نہیں آئے گا۔ تم ہر الیکشن بلامقابلہ جیت کر اسمبلی میں پہنچو گے۔''
میں نے کہا۔ ''بلامقابلہ جیتنے کا تو کوئی لطف ہی نہیں۔ میں ہر الیکشن میں مقابلہ کر کے اسمبلی میں پہنچوں گا۔''
''گویا تم انکار کررہے ہو؟'' اس نے پُرطیش نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔
''یہی مناسب ہے۔'' میں نے بصد سکون واطمینان جواباً کہا۔ ''آپ کے لیے بھی، میرے لیے بھی۔''
''میں امن کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔ سیاست انقلاب نہیں ہے جس میں خون خرابا ہو بلکہ سیاست تو بہبود کا ایک متحمل اور مستقل عمل ہے۔ یہ بات آپ کو سمجھنی ہوگی دانیہ شاہ! اگر آپ کو سیاست کرنی ہے تو پھر خود کو ایک سیاستدان ثابت کریں...... ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہماری سیاسی بساط پر جو لوگ قابض ہیں، وہ سیاستدان نہیں ہیں بلکہ تاجر، زمیندار، جاگیردار، صنعت کار اور غنڈے ہیں جو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سیاست کو اسیر کیے ہوئے ہیں۔ میں سیاست کو فلاحی اور پُرامن مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں۔''
''اگر تم انہیں کتابی باتوں کو لے کر بیٹھے رہے تو پھر اپنا ہی نہیں بلکہ ہم تمام سیدوں کا بیڑہ غرق کرو گے شیر شاہ!'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہاں کے کمی کمین بھی ہمیں للکارنے لگیں گے اور سیاست میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے پر تولنے لگیں گے۔''
''اسی کا نام جمہوریت ہے اور یہی اصل سیاست ہے۔''
''تم جیسے لوگ اس ملک میں زیادہ عرصے تک قدم جما کر سیاست نہیں کرسکتے۔ ابھی تو تم باہر سے آئے ہو اور آتے ہی ہمدردی کا ووٹ بھی لے لیا ہے تم نے...... مگر جلد ہی تم دم دبا کر واپس لندن بھاگتے نظر آؤ گے...... آہستہ آہستہ تم کو سیاست اور سیاسی چالوں کے اسرار و رموز سمجھ میں آئیں گے۔''
''یعنی آپ ان اسرار و رموز سے واقف ہیں؟''
''ہاں۔ اگلے انتخابات میں تمہیں دودھ اور پانی کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔ یہاں نظریاتی سیاست نہیں چلتی شیر شاہ! یہ ہمارے آزمائے ہوئے لوگ ہیں۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ لوگ کس چیز سے متاثر ہوکر ووٹ دیں گے۔''
''آپ کا شکریہ کہ آپ نے یہ معلومات مجھ تک پہنچائیں...... آپ یہ بتائیں کہ آپ سیاسی اسرار و رموز سے واقفیت کے باوجود آج تک کوئی الیکشن جیت کیوں نہیں پائیں...... پہلے میرے والد محترم کے مقابلے میں شکست سے دوچار ہوتی رہیں اور اب مجھ سے۔''
گو کہ میرا انداز استہزائیہ نہیں تھا مگر وہ جھینپ سی گئی۔ ''تم اپنے باپ کو جانتے نہیں ہو۔ وہ ہم سے بھی بڑا چالباز تھا۔ اس نے اپنے کارناموں سے تمہیں دانستہ لاعلم رکھا ہوگا۔''
''خیر، وقت بہت ہوگیا۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی باہر جانے کے لیے دروازے کی سمت بڑھا تو پیچھے سے اس نے مجھے رک جانے پر مجبور کردیا۔
''شیر شاہ!''
میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی بھرے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''گھر جا کر میری پیشکش پر غور کرنا۔''
میں نے بے نیازانہ انداز میں کہا۔ ''وقت ملا تو ضرور کروں گا۔''
''ذہن میں یہ بات رکھنا کہ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ مجھ سے شادی کا مطلب ہے کہ تم سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک بن جاؤ گے......''
''اور آپ کے فرزندان؟'' میرا انداز استہزائیہ تھا اس مرتبہ۔
''وہ میری باغی اور ناخلف اولاد ہے...... ان پر زاہد شاہ کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔'' وہ بولی۔
میں نے کچھ کہنا موزوں نہیں سمجھا اور پھر مڑ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے ہی مجھ پر دانیہ شاہ کا اصل کردار آشکار ہوچکا تھا۔
قادر بخش نے گہری نگاہ مجھ پر ڈالی مگر کوئی سوال نہیں کیا۔ ''چلیں شاہ صاحب؟''
''ہاں چلو'' میں نے کہا۔

اور اس نے کار اسٹارٹ کر کے روڈ پر ڈال دی۔

☆☆☆

میں موبائل کان سے لگائے کسی سے بات کر رہا تھا کہ قادر بخش ہاتھ باندھ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہا ہے یا پھر کوئی اہم اطلاع دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا میں نے جلدی جلدی بات ختم کی اور پھر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''کیا بات ہے قادر بخش!''

''ماہیا سندھیلہ آیا ہے شاہ صاحب!'' قادر بخش نے مؤدبانہ لب و لہجے میں بتایا۔

''کون ماہیا سندھیلہ؟'' میرے لیے یہ نام اجنبی تھا اس لیے استفسار کر لیا۔

''بہت نامی گرامی بدمعاش ہے شاہ صاحب! ڈکیتی اور قتل کے ان گنت کیسوں میں قانون کو مطلوب ہے۔''

میں نے اس کی بات قطع کی۔ ''وہ بدمعاش مجھ سے ملنے کیوں آیا ہے؟''

''ماہیا سندھیلہ بڑے شاہ صاحب کے لیے کام کرتا رہا ہے جی۔ بڑے شاہ صاحب اس کو بہت قریب رکھتے تھے......''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے دوچار ہو کر قادر بخش کو گھورا۔ ''ابا جی ایک قاتل اور ڈکیت کو قریب رکھتے تھے؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''شاہ صاحب! سیاست میں حاجی سے بھی تعلق رکھنا پڑتا ہے اور پاجی سے بھی۔ ہر طرح کے لوگوں سے وقت پڑنے پر کام لینا پڑتا ہے۔ صاحب کے گزر جانے کے بعد ماہیاہ آپ سے ملنا چاہتا ہے تا کہ دوطرفہ مفادات پھر سے طے کیے جا سکیں۔''

''دوطرفہ مفادات؟'' میں نے وضاحت طلب انداز میں اسے دیکھا۔

''جی ہاں۔'' قادر بخش بولا۔ ''دوطرفہ مفادات کا مطلب یہ ہے کہ ماہیا سندھیلہ بڑے شاہ صاحب سے کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتا تھا بلکہ ہوتا یوں تھا کہ وہ بڑے شاہ صاحب کا کام کرتا تھا اور بڑے شاہ صاحب اس کے کام آتے تھے۔ یہ تھا دوطرفہ مفادات کا سلسلہ...... مثلاً بڑے شاہ صاحب کے کہنے پر وہ ان کے دشمنوں کو ڈراتا دھمکاتا تھا اور کبھی کبھی کوئی بندہ بھی پھڑکا دیتا تھا۔ بدلے میں بڑے شاہ صاحب اس کو پولیس سے تحفظ فراہم کرتے تھے اور وہ آزادی سے اپنے جرائم جاری رکھ پاتا تھا۔''

مجھے یہ سن کر صدمہ ہوا۔ تو بابا بھی ایک روایتی سیاستدان تھے۔ اوپر سے اصولی اور شریف طبع جبکہ اندر سے مجرموں کو ڈھال فراہم کرنے والے۔

میں نے قادر بخش سے کہا۔ ''تم نے پہلے تو مجھے تصویر کا یہ رخ نہیں دکھایا تھا قادر بخش!''

''کون سا رخ شاہ صاحب؟'' وہ متعجب ہوا۔

''یہی کہ ابا جی سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ماہیا سندھیلہ جیسے مجرموں سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا کرتے تھے......''

''سیاست میں کون ایسا گٹھ جوڑ نہیں کرتا شاہ صاحب؟'' وہ کہنے لگا۔ ''سیاست تو نام ہی سمجھوتے کا ہے۔ اقدار پر سمجھوتا...... اصولوں پر سمجھوتا...... غیرت پر سمجھوتا...... ضمیر پر سمجھوتا۔''

''میں ماہیا سندھیلہ سے ملنا چاہوں گا......'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

قادر بخش بولا۔ ''وہ ڈیرے پر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

''چلو......'' میں نے کہا۔

میں نے ڈیرے پر جا کر ایک چارپائی پر تکیے کے سہارے نیم دراز میانے قد اور سانولی رنگت والے اس شخص کو دیکھا جس کا تعارف مجھے ماہیا سندھیلہ کے نام سے کروایا گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں بظاہر کوئی کشش، کوئی رعب نہ تھا۔ منہ کا دہانہ تنگ تھا اور ناک کے نیچے بڑی بڑی سیاہ خضاب لگی مونچھیں تھیں۔ البتہ چہرے سے درشتی اور نحوست کی پرچھائیاں مترشح تھیں۔ اس نے کاٹن کا کڑکڑاتا ہوا سفید شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ ایک شانے پر صافہ ڈالا ہوا تھا ایک جدید اور طاقتور کلاشنکوف ساتھ والی چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔

مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بدوضع چہرے پر خوش آمد سمٹ آئی۔ ایک چاپلوسی کا تاثر دیتی مسکراہٹ اس کے کثرت سگریٹ نوشی کے باعث سیاہ پڑ گئے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ ''شاہ صاحب! حضور والا! ماں متم۔ جی ٹھر گیا آپ کی زیارت کر کے۔'' وہ کسی بھانڈ کے سے انداز میں بولا اور پھر تیزی سے آگے بڑھا اور میرے گھٹنوں کو بصد عقیدت چھونے کے بعد میرے ہاتھ چوم کر کہنے لگا۔ ''بہار شاہ بہت ہی اچھے انسان تھے۔ میرا ہمیشہ انہوں نے اپنے بچوں کی طرح خیال کیا۔ ان کی موت کا دکھ بہت زیادہ ہے......''

مجھے حیرت تھی کہ ایک سفاک اور نامی گرامی مجرم مجھ سے یوں عقیدت سے پیش کیوں آرہا تھا؟

میں نے ایک چارپائی پر بیٹھنے کے بعد اسے اشارہ کیا۔ ''بیٹھو......'' میرے کہنے پر وہ بیٹھ گیا۔ میرا انداز لاتعلق سا تھا، شاید میری یہ سرد مہری اس نے بھی محسوس کی ہو۔ تاہم وہ یوں عقیدت سے بیٹھا ہوا تھا جیسے میں پیرومرشد اور وہ میرا مرید ہو۔

میں نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کہو، ماہیا!''

''سب سے پہلے تو حضور والا! ایم پی اے بننے کی مبارک باد قبول فرمائیں......'' وہ بڑی خوش آمدانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''شکریہ۔'' میں نے مختصراً کہا۔ ''تمہارے علم میں یہ بات تو ہوگی ہی کہ میں نے کچھ عرصہ بیرونِ ملک گزارا ہے، بسلسلہ تعلیم۔ ابھی ابا حضور کی وفات کے بعد سیاست میں قدم رکھا ہے اور دیگر ذمے داریوں کو بھی سنبھالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہ تو یہاں کے زیادہ لوگوں کو جانتا ہوں اور نہ اس انداز سیاست سے واقف ہوں جو ابا حضور کا تھا...... تاہم اتنا ہے کہ میں صاف ستھری اور فلاحی سیاست پر یقین رکھتا ہوں اور اپنے انداز میں سیاست کرنا چاہتا ہوں......''

''صاف ستھری اور فلاحی سیاست...... وہ کہاں ہوتی ہے جی؟'' وہ بڑے عامیانہ سے انداز میں ہنسا۔

میں نے اس کی بات نظرانداز کر کے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو ماہیا سندھیلہ! میں صاف صاف بات کرنے کا قائل ہوں......''

''وہ جی شاہ صاحب! اصل میں بات یہ ہے کہ میرے گینگ کے تین بندے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں...... بس یہی مشکل ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی۔ آپ بس حکم کریں گے، آگے جو کروں گا، میں کروں گا۔ نیست و نابود کردوں گا آپ کے بدخواہوں کو۔'' وہ جذباتی ہو کر بولا۔ ''شاہ صاحب! حضور! بندے بھی تینوں بہت اہم ہیں۔ ایک میرا جانشین ہے جی شاکی کو ڈھن...... دوسرے دو بندے بھی میرے پرانے وفادار ہیں۔''

''وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں، قانون نے انہیں بلاسبب ہی تو نہیں پکڑا ہوگا ناں۔''

میں نے کہا تو ماہیا سندھیلہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری ذہنی صحت پر شک ہو۔

پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم آپ کے نوکر ہیں۔ ماہیا سندھیلہ مرتا مرجائے گا، پر کبھی آپ سے غداری نہیں کرے گا۔ آپ ایک بار میرے سر پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں...... اللہ جنت نصیب کرے بہار شاہ حضور کو...... وہ تو اپنا سگا بیٹا سمجھتے تھے ماہیے کو۔ آپ کو شاید آپ کے لوگوں نے بتایا نہیں...... میں آپ کی بہت خدمت کرسکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ بہار شاہ حضور کی طرح آپ بھی مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیں۔ میں آپ کو اگلا الیکشن جتوانے کے لیے زمین آسمان ایک کردوں گا۔''

''میں سیاست پر خون خرابے اور جرم کی چھاپ نہیں لگنے دینا چاہتا۔ میں نے تمہیں ابتداء ہی میں بتادیا تھا کہ میں صاف ستھری سیاست پر یقین رکھتا ہوں۔ بہار شاہ اب زندہ نہیں رہے، اس لیے تمہیں بھی اب یہ خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ اب بہار شاہ کا بیٹا بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر تمہاری سرپرستی کرے گا۔'' میں نے دوٹوک اور ذرا سخت انداز میں کہا۔ ''تم اب جاسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ماہیا نے بھی بہ نظر تحیر مجھے دیکھا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔ اس نے جھک کر ساتھ والی چارپائی سے کلاشنکوف اٹھائی...... پھر چند قدم چل کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ''شاہ صاحب! حضور والا!......''

میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کو خاموش کرادیا۔ ''کچھ نہ کہو ماہیا سندھیلہ!''

''حضور......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''تم اب جاسکتے ہو۔''

وہ ضرورت سے زیادہ ہی ڈھیٹ ثابت ہوا۔ یکلخت میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سرکار آپ نے نظر کرم نہ کی تو میرا اور میرے گینگ کا کیا ہوگا؟ وہ پلسیے مجھے کاؤنٹر میں ماردیں گے۔''

''اٹھو۔'' میں نے تنفر آمیز انداز میں کہا تو وہ میرے سامنے بھیگی بلی بن کے ہاتھ سینے پر باندھ کر اور سر جھکا کر کھڑا ہوگیا یوں جیسے نماز پڑھ رہا ہو۔ وہ لوگوں کے لیے بدمعاش تھا، دہشت کی علامت تھا مگر میرے سامنے کیا تھا؟ میں نے سوچا۔

''ماہیا!''

''حضور!'' وہ منمنایا۔

''تم جا سکتے ہو۔'' میرا انداز اٹل تھا۔

''ایک بات تو بتائیں مائی باپ! کیا آپ نے ایک بار الیکشن جیت کر آئندہ سیاست سے توبہ کر لی ہے؟''

''میں نے پہلا الیکشن تمہاری مدد سے نہیں جیتا..... آئندہ بھی مجھے تمہاری مدد درکار نہیں ہوگی۔ سمجھ گئے۔'' میں نے درشت انداز میں کہا۔ ''اور ہاں! تمہیں بتا دوں کہ میں دوٹوک اور مختصر بات کرنے کا عادی ہوں۔ اب تم مجھ سے کوئی اُمید مت رکھو۔ میں نے لوگوں سے مجرموں کی پشت پناہی کرنے کے لیے ووٹ نہیں لیے۔''

جب اسے یقین ہوگیا کہ میں اپنے اسٹینڈ پوائنٹ سے کسی قیمت پر بھی نہیں ہٹوں گا تو اس کا لہجہ بدل گیا۔ کم ظرف اور مطلبی لوگوں سے بالعموم ایسی ہی توقع رکھی جاتی ہے۔ اس نے کلاشنکوف اپنے شانے پر منتقل کی، پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں پر رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''آپ کی یہ غلط فہمیاں جلد یا بدیر دور ہو جائیں گی کہ آپ یونہی بیٹھے بیٹھے ایمانداری، سچائی اور صاف ستھری سیاست کا پرچار کر کے الیکشن جیت سکتے ہیں۔ آپ کو علم ہی نہیں کہ سیاست میں کیسی سیاست کھیل کر الیکشن جیتا جاتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا کہ آپ اگلا الیکشن کیسے جیتتے ہیں، اگلا الیکشن دانیہ شاہ جیتے گی، وہ خوبصورت سیدزادی۔ بہار شاہ نے جو ساکھ بنائی تھی، اس کا خاتمہ آپ کے ہاتھوں ہوگا۔ بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سیاست ہوتی کیا ہے؟''

وہ یہ کہہ کر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں..... اس کے گھوڑے کے سموں کی دھمک سنتا رہا۔ تبھی قادر بخش اندر آیا ...''بات ہوگئی ماہیا سندھیلہ سے شاہ صاحب؟''

''ہاں۔'' میں نے اختصار کے ساتھ کہا۔

''سب ٹھیک رہا؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے بہت غصے میں گھوڑے پر سوار ہوتے اور یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کروں گا۔''

قادر بخش کا رنگ اڑ گیا۔ ''غضب کر دیا شاہ صاحب''

''ہوں؟'' میں نے اسے گھورا۔ ''کیا میں اس کی بات مان لینے کا پابند تھا؟''

''وہ بہت خطرناک آدمی ہے شاہ صاحب! اسے قابو میں رکھنا بہت ضروری تھا۔ وہ اگر ہمارے دشمنوں سے مل گیا تو بہت مسائل پیدا کرے گا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ کم از کم اسے جھوٹ موٹ کے تعاون کا یقین دلاتے..... چاہے دلی طور پر اس سے فاصلہ رکھتے۔ ہمارا دوٹوک عدم تعاون کا اظہار اسے برگشتہ کر دے گا۔ وہ بہت کینہ پرور شخص ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ خبیث سکون سے نہیں بیٹھے گا۔''

''اس کے تین اہم آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، وہ ان کی رہائی کے لیے آیا تھا۔'' میں نے بتاتے ہوئے کہا۔ ''اب بھلا میں کیسے ان کو چھڑوا سکتا ہوں..... وہ مجرم ہیں، انہیں سزا تو ملے گی ہی۔''

قادر بخش بولا۔ ''آپ یہاں کے نظام کو نہیں جانتے..... پولیس نے اس کے آدمیوں کو پکڑا ضرور ہوگا مگر ابھی تک ان کی گرفتاری کو خفیہ رکھا گیا ہوگا۔ انہیں عدالت میں پیش نہیں کیا گیا ہوگا۔ پولیس والے ان مجرموں کے پشت پناہوں کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہوں گے تاکہ وہ موٹی رقم لے کر آئیں اور مجرموں کو باعزت بری کروا کر لے جائیں۔ پولیس جانتی ہے کہ وہ ایسے گینگ سرے سے ختم نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ مجرموں کو پکڑ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں..... مجرم دوبارہ دندناتے پھرتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟''

''یہ بڑا عجیب نظام ہے قادر بخش! میرے تو دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں۔'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ ہاں مگر ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ خود کو کیچڑ سے بچائیں۔ اس آلودہ نظام کا حصہ نہ بنیں۔''

قادر بخش کچھ متذبذب ہوا، پھر بولا۔ ''میرا تو خیال ہے شاہ صاحب کہ اگر آپ پولیس کو کچھ دے دلا کر ماہیا سندھیلہ کے بندوں کو چھڑوا دیتے تو وہ آپ کا غلام بن جاتا۔ اس کی دوستی میں بہت فائدہ ہے۔ اگلے الیکشنوں میں اس کی ضرورت پڑتی ہمیں..... سیاست میں ایسی مفاہمتیں کرنی پڑتی ہیں۔ بڑے مقصد کے لیے وقتی طور پر کچھ کڑوے گھونٹ بھرنے پڑتے ہیں۔''

''قادر بخش! تمہاری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ

تمہیں اپنا سیاسی مشیر بنانے کا میرا فیصلہ درست نہیں ہے۔ تم میری اصول پسندی کو جانتے ہو مگر پھر بھی ایسا مشورہ دے رہے ہو۔'' میں نے ذرا سخت انداز میں کہا۔

''معافی چاہتا ہوں شاہ صاحب!'' وہ لجاجت سے بولا۔ ''مگر آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں الیکشن جیتنا اتنا آسان نہیں ہے، جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ لوگ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ الیکشن ہمدردی کا ووٹ لے کر جیتے ہیں......''

''کسی حد تک میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں......مگر ہم اگلا الیکشن ہمدردی کا ووٹ لے کر نہیں جیتیں گے بلکہ کارکردگی کا ووٹ لیں گے۔'' میں نے پُرتیقن لہجے میں کہا۔ ''مگر یہ بات بھی اپنی جگہ پر ہے کہ اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا جائے گا۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اباجی کی سیاست بھی ایک روایتی یعنی آمرانہ سیاست تھی؟ اس لیے میں ان کے نقش قدم پر چلنے سے قاصر ہوں۔ ہم اگر لوگوں کی خدمت کریں گے، انہیں عزت دیں گے اور ان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ترقیاتی کام کریں گے تو پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ہمیں ووٹ نہ دیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے یہاں سیاستدان عوام کی بہتری کے لیے کچھ کرتے ہی نہیں ہیں اور پھر یہ تھیوری بیان کرتے ہیں کہ یہاں کے عوام کسی نظریے کو ووٹ نہیں دیتے۔''

''شاہ صاحب! باوجود یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری عوام کا سیاسی شعور مردہ ہے اور یہ واقعی نظریاتی اور فلاحی سیاست کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ Damagogues کے ہاتھوں کھلونا بنتی رہتی ہے......میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ آخر عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنا بھی تو سیاستدان کا کام ہے۔''

''بہرحال۔ ماہیا سندھیلہ کے ساتھ میں نے جو سلوک کیا ہے، میں اس پر مطمئن ہوں اور اس قبیل کے ہر شخص کے ساتھ میرا یہی رویّہ ہوگا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم عوام کے نمائندوں کو ایسے غنڈوں کے ہاتھ کٹھ پتلی نہیں بننا چاہیے۔''

قادر بخش نے سر ہلا دیا۔ وہ متفکر نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دن کا آغاز مژدوں یا پھر فتنوں کے آغاز کے ساتھ ہوتا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو یا تو کسی خوش کن خبر کی نوید ملتی ہے یا پھر کسی المناک سانحے کا پتا چلتا ہے...... ہاں مگر یہ ہے کہ وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ گھومتا رہتا ہے، المیوں اور نویدوں کی پروا کیے بغیر۔

میری آنکھ کھلی تو حویلی کی عمر رسیدہ ملازمہ میرے کمرے کی صفائی میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح دوڑ کر میری سمت آئی۔ ''آپ جاگ گئے......''

''کیا بات ہے مائی!'' میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے بے چین تھی۔

''وہ جی...... قادر بخش تین مرتبہ صبح ہی صبح آکر آپ کا پوچھ کر گیا ہے۔ وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا آپ سے۔ میں اسے بتادوں کہ آپ جاگ گئے ہیں؟'' اس نے اجازت طلب انداز میں استفسار کیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ نجانے کیا بات تھی۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ قادر بخش جانتا ہے کہ میں تیار ہو کر خود ہی ڈیرے پر پہنچ جاؤں گا روزانہ کی طرح۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

ملازمہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ''تم قادر بخش کو میرے پاس یہیں بھیج دو۔''

''اچھا جی۔'' ملازمہ نے کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے متصلہ واش روم میں جا کر ہاتھ منہ دھونے کے بعد مناسب لباس پہنا اور جب باہر نکلا تو قادر بخش کمرے ہی میں موجود میرا انتظار کر رہا تھا۔

''السلام علیکم! شاہ صاحب۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام۔ قادر بخش، خیریت؟''

''شاہ صاحب، زاہد شاہ فوت ہوگیا ہے۔''

''اوہ......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میری آنکھوں کے سامنے دانیہ شاہ کا سراپا گھوم گیا۔ تو کیا یہ کام دانیہ شاہ ہی نے تو نہیں انجام دے ڈالا تھا؟ یہ سوال آپوں آپ ہی پردہ ذہن پر طلوع ہوگیا...... دانیہ شاہ نے کہا تھا کہ بڈھے کو اگلے جہان میں پہنچانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ عضو معطل کے مانند بیکار پڑا موت کا انتظار کر رہا تھا۔ دانیہ شاہ کے الفاظ کی بازگشت کانوں میں گونجنے لگی۔

''قادر بخش!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا۔

''حکم شاہ صاحب۔'' وہ مستعد تھا۔
میں نے پوچھا۔ ''زاہد شاہ طبعی موت مرا ہے؟''
''میں سمجھا نہیں شاہ صاحب!'' وہ الجھن میں پڑ گیا۔
میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ موت کی وجہ معلوم ہوئی تمہیں؟''

میرے اس بے تکے سوال نے اسے اور بھی کشمکش سے دوچار کیا۔ تاہم وہ بولا۔ ''وہ اسّی پچاسی سال کا ہو چکا تھا...... کافی عرصے سے بیمار بھی تھا۔ اس عمر میں وہ طبعی موت ہی مر سکتا ہے شاہ صاحب۔''

میں نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ذہن میں متواتر یہی وسوسہ کلبلا رہا تھا کہ زاہد شاہ طبعی موت نہیں مرا۔ میں نے اسے چند مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ تاہم یہ سن رکھا تھا کہ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والا سادہ سا انسان تھا اور نمود و نمائش سے دور بھاگتا تھا۔ دانیہ شاہ کا شوہر بن کر بھی اس نے ایک عام انسان کی مانند زندگی گزاری اور گمنامی کی چادر اوڑھے رہا۔

''اچھا آدمی تھا زاہد شاہ۔'' میں نے گمبھیر لب و لہجے میں کہا۔ ''خدا اس کو غریق رحمت کرے۔''

''ہاں جی۔ زندگی میں اس نے عورتوں کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اپنی بیوی کو تو زندگی بھر قابو نہیں کر سکا مگر دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنے رسوخ سے اور اپنی دولت سے قابو کر ہی لیتا تھا۔'' قادر بخش نے کہا۔ پھر وہ مستفسر ہوا۔ ''اب کیا پروگرام ہے شاہ صاحب، آپ جائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ ہم جنازے میں شریک ہوں گے۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' اس نے کہا اور پھر اجازت طلب کر کے وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میرے رگ و پے پر عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ زاہد شاہ قتل ہوا ہے...... زاہد شاہ کو قتل کیا گیا ہے...... میری سماعت میں یہ صدائے بازگشت گونجتی رہی۔ ہم انسانوں پر بڑا ظلم کیا گیا ہے ہمیں شعور بخش کر...... دنیا کی تمام تر برائیاں، تمام تر خرابیاں شعور کی مرہون منت ہیں۔ ہم شعور کی روشنی میں اندھیرے اقدامات کرتے ہیں۔ اگر زاہد شاہ کا قتل ہوا تھا تو پھر اس کا مطلب واضح تھا کہ اس کے خون کا بدلہ اس دنیا میں کوئی عدالت نہیں لے سکتی تھی۔ وہ مرنے والا بروز محشر ہی اپنی بیوی کا گریبان پکڑ سکتا تھا۔

ظاہر ہے علاقے کا نامی گرامی اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والا شخص فوت ہوا تھا، جنازے پر لوگوں کا سیلاب اُمڈ آنا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں جنازے میں شریک ہوا تو لوگوں کے ایک ہجوم نے مجھے گھیر لیا۔ اپنے ایم پی اے کو اپنے درمیان دیکھ کر اور بہار شاہ کے فرزند کو پہلی مرتبہ دیکھ کر سب میت کو بھول کر میری سمت متوجہ ہو گئے تھے۔ پھر قطاریں بنائی گئیں اور جنازہ پڑھا گیا۔

میری نظریں نجانے کیوں دانیہ شاہ کو تلاش کرتی رہیں، مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ یقیناً زنانے میں ہو گی۔ میں نے سوچا۔

رواج کے مطابق جنازے کے بعد باوجود یہ کہ میں حریف تھا۔ مجھے بڑی عزت اور بڑے اہتمام سے دانیہ شاہ کے ڈیرے پر لایا گیا اور خاطر تواضع کی گئی۔ میں نے دانیہ شاہ کے خاندان کے تمام افراد سے باری باری تعزیت کی اور دکھ کا اظہار کیا۔

پھر میں اجازت لے کر وہاں سے اٹھا اور باہر آ کر اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھا تو ایک ملازمہ بھاگتی ہوئی آئی......
پھر نصیر شاہ چند قدم چل کر میری طرف آیا۔ ''شاہ صاحب! اس عورت کو دانیہ بی بی نے بھیجا ہے۔''
''کیا کہتی ہے؟'' میں نے شیشہ مزید نیچے کر کے عورت کا جائزہ لیا جو کچھ ہی دور سر تا پا چادر میں لپٹی کھڑی تھی اور میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔
نصیر شاہ نے بتایا۔ ''کہتی ہے دانیہ بی بی نے آپ کو بلایا ہے۔''
''کہاں؟'' میں نے یک لفظی استفسار کیا۔
''اندر زنانے میں......''
یہ عجیب سی بات معلوم ہو رہی تھی۔ اگر میں زنان خانے میں جاتا تو چہ میگوئیاں ہوتیں اور قیاس آرائیاں شروع ہو جاتیں۔ مگر یہ بھی غیر مناسب بات ہوتی کہ میں دانیہ شاہ کے بلاوے کو نظر انداز کر کے وہاں سے چلا جاتا۔ میں حالت تذبذب میں تھا۔
نصیر شاہ جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے قادر بخش سے رائے طلب کی۔ ''کیا کہتے ہو قادر بخش!''
''اب جانا تو پڑے گا شاہ صاحب!'' قادر بخش نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔

''اوکے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور پھر دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔
وہ عورت لپک کر میری طرف آئی۔ ''بی بی آپ کو بلا رہی ہے۔''
''چلو...... کہاں چلنا ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں آپ کو لے چلتی ہوں۔ آئیں۔''
میں نے نصیر شاہ اور قادر بخش کو وہیں رک کر انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود اس عورت کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے حویلی کے اندر لے گئی۔ حویلی عورتوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، لیکن وہ مجھے ایسے راستوں سے گزار کر ایک کمرے میں لے گئی کہ مجھے کسی بھی عورت نے دیکھا نہیں تھا۔ یہ کافی وسیع کمرا تھا۔ اس میں ڈبل بیڈ اور کئی صوفے موجود تھے۔ اس نے ایک صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ یہاں بیٹھ جائیں......''
''دانیہ شاہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''میں انہیں بتاتی ہوں جا کر۔ آپ تھوڑا انتظار کریں۔'' اس نے کہا اور پھر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔
میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ دل کی حالت گومگوسی تھی۔ میں نے بہ نظر غائر کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے کو بیڈروم کے انداز میں سجایا گیا تھا۔ اگر لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ دانیہ شاہ نے مجھے زنانے میں بلا کر خصوصاً تنہائی میں ملاقات کی ہے تو یہ لوگوں کے لیے ہاٹ خبر بن جاتی، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر تھی کہ یہ موقع ذرا مختلف تھا۔ اس چیز کو مثبت بھی لیا جا سکتا تھا کہ ایم پی اے صاحب نے اپنی حریف سے تنہائی میں ملاقات کر کے تعزیت کی ہے۔
''یہ میرا بیڈروم ہے شیر شاہ!''
یہ آواز سن کر میں اپنی سوچوں کے حصار سے نکل آیا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ دراز قامت دانیہ شاہ سیاہ ماتمی لباس میں دروازے سے اندر داخل ہو کر میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ سیاہ لباس میں اس کا صرف بیضوی چہرہ نظر آ رہا تھا اور اسے دیکھنا اتنا مسحور کن ثابت ہوا کہ میں چند لمحوں تک تو یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔
''میرے بیڈروم میں خوش آمدید۔'' وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھی ہوئی تھی۔
میں نے ہمت مجتمع کی، پھر کہا۔ ''زاہد شاہ کی موت کا بہت افسوس ہے دانیہ شاہ!''
''ہر کسی کو ایک روز مر جانا ہے۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔
''سنا ہے مرحوم بہت ہی درویش صفت طبیعت کے انسان تھے۔'' میں نے رسمًا بات آگے بڑھائی۔
''ہاں میں جانتی ہوں۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ مجھے اس کا انداز برا لگا کہ ابھی چند لمحے قبل تو اس کے شوہر کا جنازہ ہوا تھا۔ اس کا یہ سکون کھل رہا تھا۔
''آپ کے تعلقات جیسے بھی رہے ہوں بہرحال وہ آپ کا شوہر تھا۔'' جب کوئی اور بات نہ سوجھی، تو میں نے کہا۔
اس پر وہ حسبِ عادت جلد برگشتہ ہوگئی۔ ''کیا مطلب ہے تمہاری اس فضول بات کا؟'' مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا، پھر ذرا پر ملائمت انداز میں کہنے لگی۔ ''شیر شاہ! میں سارا دن ایسی فضول رسمی باتیں سن سن کر عاجز آ چکی ہوں۔ اب تم تو ایسی باتیں نہ کرو۔ زاہد شاہ کی موت آ گئی تھی، اسے مرنا تھا...... سو مر گیا۔ بات ختم۔''
میں نے ذرا معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ویسے زاہد شاہ طبعی موت ہی مرا ہے نا شاہ زادی؟''
''کیا مطلب ہوا تمہاری اس بات کا ایم پی صاحب؟'' اس کی تیوری چڑھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے تاثرات مصنوعی تھے۔
میں نے کہا۔ ''مطلب یہ کہ انسان طبعی موت مرتا ہے یا پھر غیر طبعی...... یعنی حادثاتی۔''
''فکر مت کرو۔'' اس نے بڑے ہی بے باکانہ انداز میں کہا۔ ''زاہد شاہ کو طبعی موت سے ہی ہمکنار کیا گیا ہے۔''
میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہماری نظریں چار ہوئیں۔ اس کے ہونٹوں پر بھینچی بھینچی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر چشم زدن میں اس نے مسکراہٹ دبالی اور نظریں چرا لیں۔
''مجھے بھی یقین ہو گیا تھا شاہ زادی...... جب میں نے زاہد شاہ کی موت کی خبر سنی تھی۔'' میں نے متاسفانہ آہ بھر کے کہا۔ ''بے چارہ شریف آدمی زاہد شاہ۔''
وہ گویا ہوئی۔ ''شیر شاہ! میرا نام دانیہ شاہ ہے اور میں ظاہر شاہ کی بیٹی ہوں۔ میں جو سوچتی ہوں، ناممکن ہے کہ اسے عملی شکل نہ نصیب ہو۔ میں نے کہا تھا تم سے کہ زاہد شاہ موت کا منتظر ہے۔ اس کا انتظار ختم کر دیا گیا یا ہو گیا...... کیا فرق پڑتا ہے۔''
''مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے اس بات کا...... کہ آپ

الیکشن جیتنے کے سوا ہر کام کرسکتی ہیں۔''
میں توقع کررہا تھا کہ وہ آگ بگولا ہوجائے گی۔ تاہم ایسا نہ ہوا۔ وہ ہنس پڑی۔ ''میں اب الیکشن جیتنا بھی نہیں چاہتی۔''

''تو کیا سیاست سے کنارہ کشی کا پروگرام ہے۔''
''وہ مجھ سے زیادہ دوٹوک بات کرنے کی عادی تھی شاید۔ میری بات پر ردِعمل ظاہر کیے بغیر بولی۔ ''شیر شاہ! بلاشبہ عورت اک وقت میں ایک ہی شوہر رکھ سکتی ہے۔ اب تو میں بیوہ ہوں، بیوہ سے نکاح کرنا بہت پسندیدہ فعل ہے۔ تمہارا اعتراض تھا زاہد شاہ۔ وہ راستے سے ہٹ چکا۔''
''ہاں۔ اسے ہٹادیا گیا۔ مگر ابھی اس کی قبر پر مٹی ڈالی جارہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی بیوہ اتنی جلدی دوسری شادی کا سوچ بھی کیسے سکتی ہے...... بیچ میں عدت کی مدت پڑتی ہے۔''
''گویا عدت کے بعد تم......''
میں نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور کہا۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میرا آپ کی عدت سے کیا واسطہ۔ میں تو تعزیت کے لیے آیا تھا اور میرا خیال ہے کہ تعزیت ہوچکی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے دانیہ شاہ۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔
''بیٹھ جاؤ شیر شاہ!'' اس نے سنجیدگی بھرے انداز میں کہا۔
''میرے لوگ باہر میرا انتظار کررہے ہیں...... ویسے بھی میری گاڑی باہر روڈ کے اوپر کھڑی ہے۔ لوگ چہ میگوئیاں کریں گے کہ شیر شاہ کہاں گیا؟ میرا جانا مناسب ہوگا۔ خدا مقتول کو جنت میں اعلیٰ درجات سے نوازے۔''
میں نے لفظ مقتول پر زور دے کر کہا تو دانیہ شاہ نے خفگی سے مجھے گھورا۔
جب میں دروازے کی سمت بڑھا تو پیچھے سے اس نے کہا۔ ''باہر ملازمہ موجود ہے۔ وہ تمہیں باہر تک پہنچادے گی، مگر شیر شاہ! تم میرے بارے میں سوچنا......''

☆☆☆

اپنے ڈیرے پر پہنچ کر میں ایک پلنگ پر لیٹ گیا۔ ذہن سوچوں کے گرداب میں دھنسا چلا گیا۔ دانیہ شاہ کے کردار نے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہایت ہی سفّاک عورت تھی۔ تو کیا اس نے زاہد شاہ کو فقط میرے لیے مارا تھا؟ طبیعت پر عجب اضطراب اور بے سکونی کا عالم چھایا ہوا تھا۔

پھر میں نے قادر بخش کو بلایا اور سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا کہ وہ قابل بھروسا آدمی تھا اور ان حالات میں وہی درست مشورہ دے سکتا تھا۔ میں اس کی ذہانت کا معترف تھا۔ علاوہ ازیں وہ سرد و گرم چشیدہ آدمی تھا اور ان باتوں کی اہمیت اور نزاکت کو بہت باریکی سے سمجھتا تھا۔ وہی ان حالات میں کوئی موزوں مشورہ دے سکتا تھا۔

میری باتیں سن کر وہ بھی حیران رہ گیا تھا۔ ''تو گویا زاہد شاہ کو قتل کیا گیا ہے؟''

''ہاں۔ چند روز پہلے دانیہ شاہ نے مجھے کہا تھا کہ زاہد شاہ موت کا منتظر ہے اور اسے اگلے جہان میں پہنچانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ آج کی ملاقات میں بھی اس نے تسلیم کیا کہ زاہد شاہ طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے مارا گیا ہے۔''

قادر بخش نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر بولا۔ ''ہمارے لیے قتل و غارت کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مگر دانیہ شاہ سے زیادہ بے رحم اور سفاک عورت زندگی میں نہیں دیکھی۔ کیا ایسی عورت سے آپ نکاح کرنے کا سوچ بھی سکتے ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اگر بہار شاہ زندہ ہوتے تو شاید مستقبل میں اس عورت کی شرانگیزیوں سے عاجز آ کر اسے راستے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہٹوا دیتے۔''

''اسے راستے سے کیسے ہٹایا جا سکتا ہے قادر بخش؟''

''ظاہر شاہ صاحب! ماہیا سندھیلہ جیسے کسی آدمی کے ذریعے اسے قتل کروایا جا سکتا ہے۔''

''نہیں۔ کسی کی جان لینا مجھے گوارہ نہیں۔'' میں نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس کی شرانگیزیوں کا سامنا کریں گے۔''

''شاہ صاحب! اب اگر اس نے ٹھان لی ہے تو پھر وہ آپ کو ہمیشہ مجبور کرنے کی کوشش کرتی رہے گی۔'' قادر بخش نے کہا۔ ''اس کی طرف سے ہمیں بہت زیادہ چوکنا رہنا ہوگا۔ بعید نہیں کہ وہ ہر حد عبور کر کے آپ کو قتل کروانے کی کوشش بھی کر گزرے۔''

''یہ اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اسے واضح جواب دے دیا ہے۔''

''دانیہ شاہ کا باپ ظاہر شاہ جیسا بھی تھا، وہ دانیہ شاہ کی طرح الٹی کھوپڑی کا نہیں تھا۔ یہ عورت تو بڑی منتقم مزاج واقع ہوئی ہے۔ جس کے پیچھے پڑ جائے، اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں......''

''ہاں ہاں۔ بولو۔''

اس نے کہا۔ ''آپ بہت کھرے ہیں شاہ صاحب! دوٹوک بات کرتے ہیں۔ جیسے آپ نے ماہیا سندھیلہ کو صاف جواب دے دیا تھا۔ اب اس کی طرف سے بھی مستقل خطرہ لگا ہوا ہے۔ دانیہ شاہ کو بھی سیدھا سیدھا جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''دیکھیں شاہ صاحب! آپ کو ماہیا سندھیلہ اور دانیہ شاہ جیسے لوگوں کے ساتھ بھی ویسا ہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جیسا رویہ بالعموم ہمارے یہاں کے سیاستدان عوام کے ساتھ روا رکھتے ہیں......''

''بات کچھ پلے نہیں پڑ رہی؟ تم کھل کر بتاؤ نا قادر بخش! کیا نصیحت کرنا چاہ رہے ہو؟''

''آپ کو ایسے خطرناک لوگوں کو دوٹوک جواب دینے کے بجائے انہیں تسلی دلاسوں اور جھوٹے وعدوں پر خوش رکھنا چاہیے۔ اگر ان لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو سلوک ہماری عدالتیں لوگوں کے ساتھ کرتی ہیں تو پھر رنجش کا امکان کم ہو جاتا ہے...... مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ جو بندہ آپ سے پچاس روپے مانگتا ہے۔ ایک دو مرتبہ اسے پانچ پانچ روپے دے کر تسلی دیں، اسّی فیصد امکان ہے کہ وہ صبر سے انتظار کرے گا اور ہو سکتا ہے اس کی ضرورت اس عرصے میں خود بخود پوری ہو جائے۔ بغاوت کا امکان کم ہی ہوتا ہے ایسے معاملے میں۔''

''ارے واہ قادر بخش! تمہیں تو اب میکیاولی کی طرح رموز سیاست پر کتاب لکھنی چاہیے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مگر مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے مشورے پر عمل نہیں کر سکتا۔ میں صاف صاف بات کرنے کا عادی ہوں اور اپنی یہ عادت برقرار رکھنا چاہوں گا۔ نتائج جو بھی ہوں گے، بھگت لیں گے۔''

''فی الحال تو ہمیں دانیہ شاہ کو بھگتنا ہے۔'' قادر بخش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مگر آپ ماہیا سندھیلہ کو بھی بھول مت جائیے گا شاہ صاحب! وہ بھی بڑا ہی کینہ پرور بندہ ہے۔ آپ کو نقصان پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کرے گا۔''

میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ محض ایک کمینہ شخص ہے۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس سے نمٹ لیں

گے۔"

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو میں شدید حیرت سے دوچار ہوا۔ یہ وہ جگہ تو ہرگز نہیں تھی جہاں سے ہر روز میں بیدار ہوا کرتا تھا...... یہ ایک مختصر سا مستطیل کمرا تھا اور میں اس کے کمرے کے وسط میں ایک میلی کچیلی، بوسیدہ سی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ جلد ہی مجھے صورتِ حال کا ادراک ہوگیا اور میں چھلانگ مار کر چارپائی سے اتر گیا۔ کمرا نیم تاریکی، نیم اجالے میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے چوبی دروازے کو ہلا جلا کر دیکھا مگر وہ باہر سے بند تھا' پھر میں نے ایڑیوں کے بل گھوم کر دروازے اور پورے کمرے کا جائزہ لیا...... ایک روزن کے سوا کوئی قابلِ ذکر شے موجود نہیں تھی۔ جو بہت بلندی پر واقع تھا۔ ہوا اور روشنی کا واحد ذریعہ وہ روزن ہی تھا۔ میں چند لمحوں تک پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑا ٹھوڑی مسلتا رہا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ سوچ کا گھوڑا بیک وقت کئی سمتوں میں دوڑنے لگا۔ ذہن میں کئی وسوسے اور خدشے سر اٹھا رہے تھے۔

"تو میں اغوا ہو چکا ہوں؟ مگر کون ہوسکتا ہے میرے اغوا کے پیچھے؟" میں نے اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا...... پھر میرے ذہن کی تختی پر ایک چہرہ طلوع ہوا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "دانیہ شاہ!"

ہاں۔ دانیہ شاہ کے سوا مجھے کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ ایسی حرکت انجانے ہاتھوں سے بھی متوقع تھی کہ میں ایم پی اے تھا اور کچھ مافیاز قسم کے لوگ مجھ جیسے لوگوں سے اپنے غیر قانونی کام نکلوانے کے لیے ایسی حرکتیں کرسکتے تھے تاہم میرا ذہن دانیہ شاہ میں اٹکا ہوا تھا۔

پھر میں نے دانیہ شاہ کو چھوڑا اور ان حالات کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا جو آخری بار مجھ پر بیتے تھے۔ مجھے بہت ہی ہنرمندانہ طریقے سے اغوا کیا گیا تھا۔ یوں کہ مجھے خبر تک نہ تھی کہ مجھے کب، کیسے اور کہاں سے اغوا کیا گیا تھا اور جب مجھے اغوا کیا گیا تو میں کس حالت میں تھا؟ میں مسلسل اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا مگر کچھ یاد نہیں کر پا رہا تھا۔

یہ کوئی عام بات نہیں تھی کہ ایک منتخب ایم پی اے کو یوں اغوا کرلیا جائے۔ قادر بخش اپنی سی کوشش کر رہا ہوگا اور پولیس دباؤ میں آکر حرکت میں بھی آگئی ہوگی مگر یہ بات تو ملک عزیز کے ہر باشندے کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری پولیس کس درجہ بے بس اور لاچار واقع ہوئی ہے۔ اگر دانیہ شاہ نے مجھے اغوا کروایا تھا تو پھر پولیس چاہے مجھے قیامت تک ڈھونڈتی رہتی...... مجھے بازیاب نہ کروا پاتی۔ وجوہات دو ہیں۔ پہلی یہ کہ ہماری پولیس کو محدود وسائل پر چلنا ہوتا ہے اور یہ محکمہ ابھی پوری طرح جدت سے ہم آہنگ نہیں ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں شخصیات قانون سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔ قانون کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور مسلسل فاقوں کی وجہ سے ہمارا قانون اتنا لاغر ہو چکا ہے کہ ان روڑوں کو عبور نہیں کرسکتا بلکہ منہ کے بل گرتا ہے۔

یہ بڑی پریشان کن سوچیں تھیں۔ تاہم میں نے خود کو پُرسکون رکھنے کی پوری کوشش کی کہ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی میں ہر قسم کے حالات میں اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنے کا قائل ہوں۔

یہ بات واضح تھی کہ جو کوئی بھی میرے اغوا کے پیچھے تھا، جلد سامنے آجاتا۔ مجھے یہاں بھوکا پیاسا رکھنے کے لیے تو ہرگز اغوا نہیں کیا گیا ہوگا۔

پھر میرے تخیل میں روشنی پھوٹی اور مجھے یاد آیا کہ میں آخری بار اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے دارالحکومت روانہ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ میری سیکیورٹی ٹیم بھی تھی اور قادر بخش بھی...... مگر پریشان کن سوال یہ تھا کہ یہ سب ہوا کیسے تھا؟ کوئی فائرنگ نہیں ہوئی، کوئی مقابلہ، کوئی خون خرابا نہیں ہوا تھا۔ پھر مجھے اغوا کیونکر کرلیا گیا؟ مجھے سیکیورٹی کے حصار سے اغوا کرنا غیر معمولی بات تھی۔ میرے اغوا کار یقیناً بہت ہنرمند اور پہنچے ہوئے لوگ تھے۔

دانیہ شاہ سے مجھے ایسی مہارت کی توقع نہیں تھی۔ اگرچہ قادر بخش ہر وقت ہی مجھے اس کی طرف سے خبردار کرتا رہتا تھا مگر میرے ذہن کے لیے یہ بات ناقابلِ قبول تھی کہ دانیہ شاہ مجھے اتنی آسانی سے اور اتنی مہارت سے اغوا کرواسکتی تھی۔ اس کا رعب و دبدبہ اپنی جگہ...... مگر وہ تھی تو ایک دیسی عورت، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنے ذہن میں روایتی دیہاتی عورت کو بٹھائے ہوئے تھی۔ اس کے گرگے کھلم کھلا فائرنگ کر کے خون خرابا تو کرسکتے تھے مگر اتنی مہارت سے کسی کو اغوا نہیں کرسکتے تھے۔

رفتہ رفتہ میرے ذہن سے دانیہ شاہ کی طرف سے گمان کمزور پڑتا چلا گیا۔ تو کیا میرے اغوا کے پیچھے کوئی اور

شخص تھا؟ مگر کون؟ بہت سوچ بچار کے باوجود کوئی نام ذہن میں نہیں آیا۔

بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے کب مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ میں تقریباً تین سے چار گھنٹوں تک کسی آنے والے کا انتظار کرتا رہا مگر کوئی نہیں آیا۔ کم بخت مجھے اس کمرے میں ڈال کر بھول ہی گئے تھے۔ اعصاب توڑ انتظار کے بعد مجھے یارا نہ رہا تو میں نے اٹھ کر دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

''دروازہ کھولو۔''

''کوئی ہے باہر۔''

''اوئے دراوزہ کھولو۔''

میں ساتھ ساتھ یہ آواز بلند آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا۔ مگر اس سرگرمی کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ میں مایوس ہو کر دوبارہ چارپائی پر جا بیٹھا اور اپنے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے (جو دروازہ پیٹنے کی وجہ سے سرخ ہو کر دکھ رہے تھے) پُراُمید اور کسی حد تک جھنجلائی ہوئی نظروں سے دروازے کی سمت دیکھنے لگا۔

☆☆☆

یہ انتظار بہت جاں گسل ثابت ہو رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ معدہ چیخ و پکار کرنے لگا تھا۔ میں نجانے کب سے یہاں قید تھا۔ بھوک کی شدت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے یہاں قید ہوئے کافی وقت بیت گیا تھا۔

میں نڈھال ہو چکا تو دروازہ کھلا، اور میں اپنی ناتوانی بھول کر یوں اٹھ کر دروازے کی سمت لپکا جیسے میرے پیچھے بھوت لگا ہوا تھا۔

''آرام سے حضور! آرام سے۔'' وہ یکلخت دروازے میں نمودار ہوا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

میں اسے اپنے روبرو دیکھ کر دم بخود رہ گیا..... میرے منہ سے بصد تنفر نکلا۔ ''تم! تمہاری یہ جرأت!''

''حضور! معافی چاہتا ہوں۔ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔''

''ماہیا سندھیلہ!'' میں نے اسے گھورا۔ ''تو تم یہاں تک گر گئے.....اور تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ تمہارا انجام کیا ہوگا۔''

''شاہ صاحب! ایک پتے کی بات بتاؤں؟'' پھر خود ہی بولنے لگا۔ ''انجام کی پروا کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر انسان آغاز میں انجام کی سوچنے لگے تو پھر آغاز سے آگے بڑھ ہی نہیں پاتا۔''

میں نے کہا۔ ''اپنی اوقات میں رہو اور یہ بتاؤ کہ کس کی شہ پر تم نے یہ جرأت کی ہے؟''

''گستاخی معاف شاہ صاحب حضور!'' وہ بہت ہی شیریں لہجے میں (جو دراصل طنز سے بھرپور تھا) بولا۔ ''ہم تو نوکر ہیں آپ کے۔ مگر مجبوری میں کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا...... میرے بندے پولیس کے پاس تھے۔ کچھ تو کرنا ہی تھا مجھے.....میری حاجت روائی آپ نہ کر سکے تو ناچار مجھ غریب کو دانیہ شاہ سیدزادی سے بات کرنی پڑی۔ دانیہ بی بی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا جبھی تو میرے آدمی آزاد ہو پائے ہیں.....''

''تو گویا یہ تمہاری اور دانیہ شاہ کی مشترکہ ملی بھگت ہے.....؟''

''توبہ توبہ۔ استغفار۔'' اس نے کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''دونوں کی نہیں.....صرف دانیہ بی بی کی۔ میں تو معصوم ہوں اور مجبوری سے مجبور ورنہ کی کہاں اتنی جرأت کہ آپ پر ہاتھ ڈال سکوں۔ میں تو ہمیشہ ہی آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ بہار شاہ جنت مکانی کے کام آیا کرتا تھا۔'' پھر وہ چالاک آدمی مزید کہنے لگا۔ ''مجبوری شاہ صاحب! مجبوری۔ مجبوری میں کیا نہیں کرنا پڑتا بھلا؟ دانیہ بی بی نے میرے آدمیوں کو چھڑا دیا، بدلے میں مجھے ان کی بات تو ماننی ہی تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ ماہیا! شیر شاہ کو اٹھا لو۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا یہ سن کر، مگر کیا کرتا، احسان فراموشی میری فطرت میں نہیں ہے۔ حکم تو بجا لانا تھا۔ سو، دل پر پتھر رکھ کر یہ گستاخی کر ڈالی......''

''مارنا چاہتے ہو مجھے؟'' میں نے اسے مردنگاہوں سے گھورا۔

وہ یکدم آگے بڑھا اور میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''کیسی باتیں کر رہے ہیں شاہ صاحب! حضور! ایسا کرنے سے پہلے میں اپنی جان نہ لے لوں؟''

میں اس کی چاپلوسی اور عیاری پر پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ کم بخت غضب کا اداکار تھا۔ وہ گویا اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ چور نہ سہی، چور کی لنگوٹی سہی۔ کچھ تو ہاتھ میں ہو۔

''تو پھر ہٹو راستے سے اور مجھے جانے دو۔''

''میں شرمندہ ہوں کہ ایسا نہیں کر سکتا۔'' وہ بولا۔ ''دانیہ بی بی ابھی تھوڑی دیر کے بعد یہاں آئیں گی۔ آپ

سے ملاقات کریں گی۔ پھر ہی بات بن سکے گی۔ آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں حضور!''

میں نے سرد آہ بھری۔ وہ کب تک آئے گی؟

''میری بات ہوئی ہے ان سے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ پہنچتی ہیں۔''

''مجھے بھوک لگی ہے.....'' میں نے کہا۔ ''تم نے اب تک مجھے بھوکا کیوں رکھا ہے؟''

وہ بولا۔ ''حضور! میں ابھی کھانا بھجواتا ہوں آپ کے لیے..... تگڑا سا۔ جب تک آپ آرام فرمائیں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے وہاں سے چلا گیا۔

''تو دانیہ شاہ اپنی اصل جون میں آہی گئی۔'' میں نے جھلنگا چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ کون سی تھی؟ مگر یہ بات تو واضح تھی کہ مجھے میرے علاقے کی حدود سے باہر قید رکھا گیا ہوگا۔ ورنہ میں کوئی عام انسان تو نہیں تھا۔ میرے آدمیوں نے میرے علاقے کا چپا چپا چھان مارا ہوگا۔ قادر بخش اور میری سیکیورٹی ٹیم کے ساتھ کیا ہوا تھا، یہ بات بھی پریشان کن تھی کیونکہ جب میں اغوا ہوا تو وہ لوگ میرے ساتھ ہی تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے سوچوں کے گھوڑے کو لگام دینی پڑی۔ دروازہ کھلا تھا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک مسلح تھا جبکہ دوسرے نے کھانے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ میں نے چارپائی سے اترنے کی زحمت نہیں کی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کھانے کی ٹرے میرے سامنے چارپائی پر رکھ دی گئی اور پھر وہ لوگ جس خاموشی سے آئے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔

میں نے کھانا ڈٹ کر کھایا..... یہ ناشتا تھا، لنچ یا پھر ڈنر۔ جو بھی تھا۔ سکون نصیب ہوا۔ پیٹ کی مفلسی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ پیٹ بھرا ہوا ہو تو انسان بد سے بدتر حالات میں بھی کوئی تدبیر کرنے لگتا ہے، کوئی حکمت عملی سوچنے لگتا ہے۔

اس کے بعد بھی گھنٹوں پر گھنٹے گزرتے گئے۔ ماہیا سندھیلہ جو گھنٹے ڈیڑھ کا کہہ کر گیا تھا، وہ گھنٹا کبھی نہیں آیا۔ میں سرتاپا محو انتظار رہا۔

نجانے کب میں سو گیا اور نجانے کب تک سوتا رہا۔ وقت کا حساب نہیں تھا۔ پھر بیدار ہو گیا۔ ذہن تازہ دم تھا مگر ماحول اور انتظار کی کوفت سے اعصاب پر پھر سے بوجھل پن سوار ہونے لگا تھا۔ کہاں رہ گئی تھی دانیہ شاہ؟ اب آمنا سامنا تو ہونا ہی تھا تو پھر وہ آ کیوں نہیں جاتی؟ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ مگر وہ کہیں مجھے اعصابی اور ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہی تھی؟ وہ بہت ستم پرور تھی۔ بہت اذیت کوش!

پھر دروازہ کھلا تو دروازے میں ماہیا سندھیلہ کی صورت نظر آئی۔ میری جھنجلاہٹ اور کوفت زبان پر آگئی۔

''کہاں مر گئے تھے؟''

اس کا چہرہ دھواں دھواں نظر آرہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''شاہ صاحب! مائی باپ!''

''دانیہ شاہ کہاں ہے؟'' قید میں ہونے کے باوجود میں نے ڈپٹ کر کہا۔

''میں آپ کو رہا کرنے آیا ہوں......'' وہ گڑگڑایا۔

میں نے اسے پُرتفتیش نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا استفسار دہرایا۔ ''دانیہ شاہ کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''غضب ہو گیا شاہ صاحب حضور! دانیہ بی بی کا چند گھنٹے پہلے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ان کی گاڑی کچل گئی تھی۔ تاہم وہ زندہ تھیں... مگر ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ اب وہ زندہ نہیں رہیں۔''

یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ میں چند لمحوں تک بے یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا رہا... پھر اپنے روبرو کھڑے ہوئے ماہیا سندھیلہ کو مخاطب کیا۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا مائی باپ!''

''مجھے رہا کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں جی۔''

''جانتے ہو مجھے رہا کرو گے تو میں تمہارا کیا حشر کروں گا۔''

''میں آپ سے رحم کی توقع رکھتا ہوں مائی باپ! میری کیا اوقات...... میں نے دانیہ بی بی کے کہنے پر یہ گستاخی کی تھی۔''

''تم اگر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو تو پھر میں معاف کر دوں گا تمہیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی یہاں۔ تمہارے رویے کی وجہ سے میں بھی نرمی برتنے پر مجبور ہوں......''

پھر اس نے اپنی گاڑی میں مجھے میرے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ راستے میں وہ چاپلوسی سے بولا۔ ''اب مجھے کوئی پروا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ آپ مجھے جان

سے بھی ماردیں تو یہ کم ہوگا۔ مجھ سے بہت بڑی گستاخی ہوگئی ہے۔''

جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ دراصل میں ابھی سیاست میں نووارد ہوں، اس لیے لوگوں پر جلدی اعتبار نہیں کرتا۔ لیکن تمہارے بارے میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کبھی مجھ سے غداری نہیں کروگے۔ مجھے تمہاری قدر کرنی چاہیے۔ شاید تمہاری انہیں خوبیوں کی وجہ سے میرے والدمحترم سید بہار شاہ تمہاری بہت قدر کرتے تھے۔''

وہ یہ سن کر جذباتی ہوگیا اور میرے ہاتھ پکڑ کر چومنے لگا۔ ''میں اپنی جان دے دوں گا مگر کبھی آپ کی خدمت سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یہ ماہیا سندھیلہ کا وعدہ ہے حضور سے!''

میں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ ''دانیہ شاہ کی موت پر مجھے افسوس ہے۔ ابھی ایک دو دن تو میں مصروف رہوں گا۔ پرسوں تم شام چھ بجے میرے ڈیرے پر آؤ ماہیا! میں تم سے تسلی بخش اور کارآمد بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں تنہا ڈیرے پر بیٹھ کر اپنے لوگوں کو اپنی واپسی کی خبر سنانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈیرے پر میرے تمام تعلق داروں اور ملازموں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ ان سب کو تمام تفصیلات سناتے ہوئے میں نے دانیہ شاہ کی موت کی خبر بھی سنائی۔ سب خوش تھے میری واپسی پر۔

پھر جب وہ سب رخصت ہوگئے اور مجھے تنہائی میسر آئی تو میں حسبِ معمول غوروفکر میں متفرق ہوگیا۔

انسان کی حیثیت کیا ہے؟ کہانی کے آغاز میں میں نے زندگی اور انسان کا جو فلسفہ بیان کیا ہے، آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا انجام بھی تمام انسانوں جیسا ہی ہوگا۔ پھر بھی طاقت و اختیار کے زعم میں زمینی خدا بن جاتا ہے اور خود کو ناقابل تسخیر سمجھ لیتا ہے... مگر اختیار و زعم کا قلعہ خواہ کتنا ہی مضبوط ہو، اس قلعے کی دیواریں خواہ کتنی ہی اونچی کرلی جائیں، موت ان دیواروں کو ایک ہی جست میں عبور کرلیتی ہے۔ پھر یہ زعم، یہ طاقت کا نشہ ...... چہ معنی دارد؟

حشر ساماں دانیہ شاہ نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے یوں چپکے سے بے وقت کی راگنی کے مانند موت آن دبوچے گی۔ وہ تو شاید جبراً مجھ سے نکاح کرنا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ضعیف شوہر کو بھی قتل کردیا تھا۔ مگر موت نے اس کے تمام ارادوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ قدرت انصاف کے تقاضے پورے کرنا جانتی ہے۔

☆☆☆

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

تیسرے روز شام چھ بجے حسب وعدہ ماہیا سندھیلہ میرے ڈیرے پر آیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ شاید میں اس سے تعاون کرنا چاہتا ہوں مگر اس کی خوش فہمیاں اس وقت دور ہوئیں جب درجن بھر پولیس اہلکار دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے ساتھ میں کئی بڑے افسر بھی تھے۔

''گرفتار کرلو اسے۔'' ایس ایچ او نے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا تو انہوں نے چشم زدن میں ہی ماہیا سندھیلہ کو بے بس کرکے ہتھکڑیاں پہنادیں۔

تب ایس ایچ او اور اس کا ماتحت افسر میری سمت آئے اور ممنون لہجے میں ایک بڑا افسر بولا۔ ''سر! قانون سے تعاون کرنے پر میں آپ کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔''

''یہ میرا فرض تھا۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ایک بات ذہن میں بٹھا لو لیاقت حسین! اگر یہ بندہ دوبارہ رہا ہوا تو پھر تمہاری خیر نہیں۔ میں یہ معاملہ اسمبلی میں اٹھاؤں گا۔ حرام کے لالچ میں کہیں اپنی نوکری نہ گنوا بیٹھنا۔ یہ شخص ان گنت لوگوں کا قاتل ہے اور غریبوں کے لیے خوف و ہراس کا سبب...... میں اسے ہمیشہ پس زنداں دیکھنا چاہوں گا۔''

ایس ایچ او نے کھسیا کر کہا۔ ''آپ فکر مت کریں سر! میں اس کا پکا بندوبست کروں گا اس مرتبہ۔''

صورتِ حال کا ادراک ہونے پر ماہیا سندھیلہ نے کینہ توز نظروں سے مجھے گھورا۔ ''یہ اچھا نہیں کیا آپ نے شاہ صاحب! سید ہوکر دھوکا دیا ہے۔''

''قانون کی مدد کو دھوکا نہیں کہتے جاہل۔'' میں نے کہا۔ ''میں بخوبی جانتا ہوں کہ مجھے اپنے علاقے کے لوگوں کو تم جیسے لٹیروں سے کیسے پاک کرنا ہے۔''

پھر وہ پولیس والے اسے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔

میدان سیاست کا ہو یا کوئی اور...... انسان کے اندر سچائی اور اچھائی کا جذبہ ہو تو پھر مشکلات کے باوجود راستے بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بات میں نے یعنی سید شیر شاہ نے اگلے کئی الیکشن متواتر جیتنے کے بعد سیکھی۔

++